حیات آفتاب

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب
گر دلیلش خواہی از وے رُو متاب

حبیب اللہ خان
ولایت منزل علیگڑھ

فہرست مضامین حیات آفتاب

انتساب

علی گڑھ اولڈ بوائز کے نام

اُن کے ایک نامور بھائی کا کارنامۂ حیات جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قابلیت، دیانت، خلوص، ایثار، انہماک اور اخلاقی جرأت کے ساتھ ملک و ملت کی خدمت کس طرح کی جاتی ہے۔

گرچہ خوردیم نسبتیست بزرگ
ذرۂ **آفتاب** تابانیم

پیش لفظ

ازنواب صدریار جنگ بہادر الحاج مولوی ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی

۱۹۵۶ء

علی گڑھ کے توطن و قیام میں جو بیش بہا فوائد حاصل ہوئے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم سے مخلصانہ گوناگوں تعلقات رہے۔ (غفر اللہ لہٗ)
یہاں اس کے اظہار کا موقع ہے کہ میں جو کچھ خدمت کانفرنس میں کر رہا ہوں اس کو ہمیشہ میں نے صاحبزادہ صاحب مرحوم کی نیابت تصور کیا ہے۔ اپنی ہستی کبھی مستقل محسوس نہیں کی۔

سوانح عمری کے متعلق میری ناچیز خدمات کی تفصیل "عرض حال" میں ہے۔ میرے عزیز انیس احمد نے جس وقت اشاعت سوانح کا ارادہ ظاہر کیا دلی مسرت مجھ کو حاصل ہوئی۔ ان کی سعادت مندی پر اور اشاعت سوانحعمری کا موقع حاصل ہونے پر مبارک باد دیتا ہوں۔

حبیب الرحمٰن

حبیب گنج

۱۲/۶/۴۷

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بہ حیثیت وائس چانسلر مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۱۹۲۴-۲۶ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض حال

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو حبیبِ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب (مرحوم و مغفور) کی وفات کے پانچ دن بعد راقم الحروف نے ۲۳ جنوری ۱۹۳۰ء کو مندرجہ ذیل نیازنامہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی آنریری سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمت میں ارسال کیا۔

جناب من،

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی قومی و علمی خدمات اظہر من الشمس ہیں اور انکا علم و احساس آپ کو مجھ سے زیادہ ہے کانفرنس کے قیام ترقی سرمایہ و عمارت میں جو کچھ اُن کا حصہ ہے وہ بھی آپ کے علم میں ہے اس لئے کانفرنس کے موجودہ مشاغل کے پیش نظر یہ موزوں و مناسب ہوگا۔ اگر اس کے ایسے مربی و سرپرست کے وقائع حیات کو یکجا کرنے اور مرتب صورت میں پیش کرنے کی خدمت وہ اپنے ذمہ لے تو اس فرض سے سبکدوش ہونے کے لئے جس مواد (Meterial) کی ضرورت ہو، ابھی وہ آسانی سے فراہم ہوسکتا ہے۔ مرحوم کی بہت سی تحریریں جو انکی زندگی پر روشنی ڈالتی ہیں میرے پاس موجود ہیں اور ان کے علاوہ ان کی زندگی کے بہت سے اہم واقعات

بھی میرے علم میں ہیں جو "انکی حیات" کی تالیف میں بہت ممد ہوں گے۔ میں اس بارے میں کانفرنس کی ہر ممکن امداد کے لئے تیار ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس تجویز پر غور فرما کر کانفرنس کو اولین فرصت میں اس کام کے شروع کرنے کی ہدایت فرمائیں گے۔

والسلام

خاکسار حبیب اللہ

نواب صاحب ممدوح نے بطیب خاطر میرے خط کو اس نوٹ کے ساتھ کہ "بہت مبارک تحریر ہے اور اس لحاظ سے کہ ایک احسان عظیم کا اعتراف ہے" سپرنٹنڈنٹ صاحب دفتر کانفرنس (خاں صاحب میر ولایت حسین) کے حوالے کیا کہ مجلس عاملہ میں جلد تر پیش کرکے منظوری حاصل کی جائے اس مجلس کا اجلاس ۲ر فروری ۱۹۳۰ء کو زیر صدارت نواب مسعود جنگ بہادر وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی منعقد ہوا اور میں نے اس خط متذکرہ کے مضمون کو بصورت رزولیشن پیش کیا جس کو مجلس مذکور نے بالاتفاق منظور کرکے آنریری سکریٹری سے خواہش کی کہ جس طرح مناسب سمجھیں اس کام کے لئے تدابیر عمل میں لادیں" چنانچہ کارروائی شروع ہوگئی اور سید معین الدین صاحب (مرحوم) مشہور مترجم "نپولین وغیرہ" کا تقرر "حیات آفتاب" کی تالیف کے واسطے ہوا۔ سید صاحب موصوف علی گڑھ آگئے اور میرے ساتھ ولایت منزل میں مقیم ہوئے۔ صاحبزادہ صاحب کی وفات کے بعد ہی میں نے ان کے روزنامچوں سے بہت سے نوٹ تیار کر لئے تھے۔ وہ سب میں نے سید معین الدین صاحب کو دیدیئے اور انھوں نے کام شروع کر دیا۔

صاحبزادہ صاحب نے ۱۸۸۶ء سے جب کہ وہ ایم۔ اے۔ او۔ کالجیٹ اسکول کے طالب علم تھے اپنا روزنامچہ شروع کیا تھا اور یہ سلسلہ باستثنائے چند مجبوری کے وقفوں کے مدت العمر جاری رہا۔ ان ضخیم روزنامچوں کے علاوہ ان کی بہت سی غیر مطبوعہ اردو اور انگریزی کی تحریریں اور یادداشتیں (جو کالج، کانفرنس، یونیورسٹی، مسلم لیگ، کونسل

صوبہ متحدہ، انڈیا کونسل لندن، مذہب اسلام، مسلمانوں کی دینی تعلیم، ملک کی عام تعلیم اور اقتصادی اور سیاسی حالات اور ضروریات پر مشتمل ہیں) آفتاب منزل میں موجود تھیں۔ اس "گنج گراں مایہ" کو جناب مرحوم کے منجھلے فرزند صاحبزادہ شہزاد احمد خاں نے بڑے بڑے صندوقوں میں محفوظ کرکے ولایت منزل میں پہنچا دیا اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ میٹریل بھیجنے سے قبل بہت سے کاغذات بالخصوص انڈیا کونسل کی اہم اور طویل تحریرین، پبلک اور پرائیوٹ مراسلت کو (جو بجائے خود وقت طلب کام تھا) سلیقہ کے ساتھ مرتب کر دیا چونکہ اس قیمتی ذخیرے سے صاحبزادہ صاحب کی پبلک اور پرائیوٹ زندگی پہ گہری روشنی پڑتی ہے سید معین الدین صاحب نے ہر کاغذ کو محنت اور غور کے ساتھ پڑھا۔ اقتباسات لئے اور ان سے صحیح واقعات اور نتائج اخذ کرکے دو سال کی مدت میں بڑی تقطیع پر باریک قلم سے خوشخط ۵۰۰ صفحوں کی سبق آموز اور دلچسپ سوانحعمری (حیات آفتاب) مرتب کر دی۔ اس موقع پر دلی احسان مندی کیساتھ سید صاحب موصوف کی نظر غائر اور محنت شاقہ کا اعتراف کرتا ہوں اور چونکہ موصوف اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اس لئے انکے واسطے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔

لیکن مارچ ۱۹۳۰ء ہی میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے صاحبزادہ صاحب کی تعلیمی اور قومی و ملکی خدمات کے اعتراف میں ایک دارالاقامہ از نام "آفتاب ہوسٹل" قائم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا اور اس کی تعمیر و فراہمی چندہ کی پوری ذمہ داری مجھ پر عائد کی تھی۔ ان فرائض کی انجام دہی میں مجھ کو بار بار اور طویل وقفوں کے واسطے علی گڑھ سے باہر جانا پڑتا تھا۔ ہنوز "آفتاب ہوسٹل" پوری طور سے مکمل نہ ہونے پایا تھا کہ وائس چانسلر سر سید راس مسعود کی پُر اصرار خواہش پر ایسوسی ایشن نے چند خاص اصول و قواعد کے تحت میں "آفتاب ہال" قائم کیا اور اس خدمت کا "قرعۂ فال" خاکسار کے نام پر ڈالا گیا۔ اور "ہال کونسل" کا چیرمین، مقرر کرکے اس ہال کے چلانے کی اہم ذمہ داری بھی

مجھ پہ عائد کی گئی - یہ کام نہایت پیچیدہ دشوار اور محنت طلب تھا۔ اور اس زمانہ کے خاص حالات کے لحاظ سے آفتاب ہال کی کامیابی پر یونیورسٹی کی توسیع اور ترقی کا انحصار تھا اسلئے مجھ کو ہمہ تن اس میں منہمک ہونا پڑا اور کسی دوسرے کام کے کرنیکا موقع نہ رہا۔

۱۹۳۴ء میں بیمار ہوگیا اور سلسلۂ علالت ختم نہ ہونے پایا تھا کہ فروری ۱۹۳۵ء میں سفر حجاز پیش آیا واپسی کے بعد پھر "آفتاب ہال" کے کاموں میں مصروف ہوگیا اور مئی ۱۹۳۶ء تک جب کہ یہ ہال ایسوسی ایشن کے انتظام سے نکالا گیا مجھ کو اس کے کاموں سے سبکدوشی نہ ہوئی اور میں سچائی کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ اس طویل عرصے میں "حیات آفتاب کا کام نہ کرسکا۔ العذر عند الکرام الناس مقبولٌ۔

ان ترددات سے یک گونہ فراغت کے بعد جب "حیات آفتاب" کو میں نے ہاتھ میں لیا تو یہ ضرورت محسوس کی کہ اسکا بالاستعاب مطالعہ مولوی سید طفیل احمد صاحب کی معیت میں ہونا چاہئے چنانچہ جناب موصوف کے قیام علی گڑھ کے مختصر وقفوں میں یہ کام ہوتا رہا۔ اور آخر کار ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ طویل وغیر ضروری تفصیلات کو کتاب سے حذف کرنا اور ترتیب" ابواب" وغیرہ کو بدلنا نہایت ضروری ہے اس مجوزہ کام کی نوعیت اور دقت کا اندازہ صرف مندرجہ ذیل واقعہ سے ہوسکے گا۔

ہماری درخواست پر حاجی انوار احمد زبیری نے جو کانفرنس کی ملازمت میں عرصہ چالیس سال تک وابستہ رہے اور جنھوں نے دس سال تک صاحبزادہ صاحب کی ذاتی نگرانی میں دفتر، سفارت، تعمیرات وغیرہ کے کام خوش اسلوبی سے کئے تھے موصوف کی خدمات کانفرنس" کو نہایت شرح و بسط سے چار سو صفحات میں قلم بند کیا تھا۔ سید معین الدین صاحب نے جب ان حالات کو شامل "سوانح" کرنا چاہا تو ان کو "اختصار" کرنے کی ضرورت بجا طور پر لاحق ہوئی لیکن اس کوشش میں ان سے یہ فروگذاشت ہوئی کہ چار سو صفحات کو انھوں نے سات صفحوں کے "کوزہ" میں بند کر دیا۔ چونکہ یہ افراط و تفریط دونوں ناقابل قبول تھیں

اس لئے یہ کام مجھکو از سر نو کرنا پڑا! اور اب یہ باب کانفرنس آخری شکل میں ۱۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ (۱؎ مسودہ کے صفحات سے مراد ہے)

اس منزل پر پہنچنے کے بعد مولوی سید طفیل احمد صاحب کی تحریک و کوشش سے مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی مرحوم دہلوی کی امداد ہم کو حاصل ہوگئی اور نظامی صاحب کی محنت اور لطافت آمیز توجہ سے مسودہ کتاب نئی ترتیب و شکل میں مرتب ہو گیا

اس مرحلے سے گذرنے کے بعد نظامی صاحب کے مرتب کئے ہوئے مسودہ کے نفس مضمون پر ان کی اور مولوی طفیل احمد صاحب کی معیت میں غور وخوض کرنے کی ضرورت تھی مگر مولوی صاحب کے تعلیمی، اقتصادی، وسیاسی مشاغل کل صوبہ متحدہ میں اس قدر وسیع ہو چکے تھے کہ وہ اب علی گڑھ میں ایک ایک دو دو دن سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ آخر کار چند کوششوں کے بعد موصوف نے کچھ زمانہ علی گڑھ میں بسر کیا اور ان ایام میں نظامی صاحب بھی ولایت منزل میں تشریف فرما رہے۔ پوری کتاب زیر بحث و غور رہی اور یہ قرار پایا کہ صاحبزادہ صاحب کی "سیاسی خدمات"، بالخصوص انڈیا کونسل کے کاموں کو مولوی صاحب از سر نو تحریر فرمائیں اور اسی طرح کانفرنس' وائس چانسلری اور مابعد کے واقعات کو راقم الحروف قلم بند کرے۔ چنانچہ ہم دونوں اپنے کام وقتاً فوقتاً باہمی مشورہ سے کرتے رہے اور صرف تین مسائل میں ہم دونوں پورے طور پر متفق الرائے نہ ہو سکے۔ اس لئے جناب خان بہادر قاضی عزیز الدین صاحب بلگرامی سے مشورہ کرنا پڑا اور قاضی صاحب کی خصوصی توجہ سے یہ مشکل حل ہو گئی اور بالآخر مسودہ کتاب نے موجودہ شکل اختیار کر لی۔ مگر اس کام کو جلد ختم کرنے میں ہم دونوں کی کمزور تندرستی جو پچھلے چند سال سے روبہ انحطاط تھی سد راہ ہوئی بہر حال تائید ایزدی سے یہ کام ختم ہوا

اس سلسلے میں مجھکو بے حد رنج و قلق ہے کہ اشاعت حیات آفتاب مولوی صاحب کی زندگی میں نہ ہو سکی۔ البتہ اس قدر اندوہ گیں تسکین ہے کہ مرض الموت سے پہلے قیام علی گڑھ

میں جناب مرحوم کل مسودہ کو ملاحظہ کے بعد اپنی پسندیدگی کا اظہار فرما چکے تھے - اور اس کے بعد ہی فوراً کل مسودہ نواب صدر یار جنگ بہادر کی خدمت میں ارسال کر دیا گیا تھا۔

اب جہاں تک کتاب کی اشاعت و تالیف کا تعلق ہے کچھ کرنا باقی نہ تھا لیکن گذشتہ ہولناک جنگ عظیم کے اثرات تمام ہندوستان پر طاری ہو چکے تھے اور افراد و ادارے بالخصوص تعلیمی ادارے ان کی زد میں آکر شدید مالی مشکلات میں پھنس گئے تھے کانفرنس بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ رہی اشاعت کتب تقریباً بند ہو گئی کیونکہ سامان طباعت کمیاب اور کنٹرول کے تحت میں آگیا - ان حالات میں اشاعت حیات آفتاب کا مسئلہ مجبوراً بار بار معرض التوا میں پڑتا رہا - اور اب بھی یہ عقدہ لاینحل حل نہ ہوتا اگر میجر جنرل انیس احمد خاں سلمہٗ (فرزند اصغر صاحبزادہ صاحب مرحوم) امداد کے واسطے آمادہ نہ ہو جاتے "قید جرمن" کی چھ سال کی صبر آزما و ہمت شکن مصائب سے نجات پاکر افضال الٰہی نے جب انکو علی گڑھ پہنچایا تو اُن کی پہلی توجہ اپنے نامور والد کی سوانح عمری کی اشاعت کی طرف ہوئی اور یہ اسی توجہ کا نتیجہ ہے کہ "حیات آفتاب" مطبع میں جاری ہے۔

شکر کہ جمازہ بہ منزل رسید
زورق امید بہ ساحل رسید (شبلی)

آخر میں مخدومی محترمی نواب صدر یار جنگ الحاج مولانا محمد حبیب الرحمٰن خانصاحب شروانی آنریری سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی توجہ خاص کا سپاس گزار ہوں جو جناب موصوف حیات آفتاب کی تالیف کے سلسلہ میں ہمیشہ مبذول فرماتے رہے۔

ع - شکر منت ہائے او چندانکہ منت ہائے او

خاتمۂ کلام کے مخاطب ملک کے مسلم نوجوان بالخصوص علی گڑھ کے طلبہ ہیں "حیات آفتاب" کی تالیف و اشاعت کا مقصد وحید یہ ہے کہ صاحبزادہ صاحب مرحوم کی گراں قدر ملی و ملکی خدمات کا ایک مختصر و صحیح خاکہ پیش ہو جس سے اندازہ ہو سکے کہ قابلیت، دل سوزی،

خلوص، ایثار، انہماک اور اخلاقی جرأت کے ساتھ ملک و ملّت کی خدمت کس طرح کی جاتی ہے - اگر نونہالانِ قوم نے اس اسوۂ حسنہ کی پیروی میں قدم اٹھایا تو خیال کیا جائیگا کہ ہماری ناچیز کوشش و محنت ٹھکانے لگی -

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است
تو بدیں آرزو مرا برساں

خاکسار

حبیب اللہ

ولایت منزل علی گڑھ

۵ / مئی ۱۹۴۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

باب اول

ولادت اور خاندانی حالات

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ۲۰ مئی ۱۸۹۶ء کو کنج پورہ ضلع کرنال میں پیدا ہوئے والد ماجد کا نام نواب غلام احمد خاں تھا جو کنج پورہ کے فرماں روا خاندان کے ایک رکن تھے۔ اس ریاست کی بنا نواب نجابت خاں نے اٹھارہویں صدی میں ڈالی تھی۔ نواب نجابت خاں "غورغشت" کے رہنے والے کاکڑزئی پٹھان تھے ۱۷۲۹ء میں ہندوستان آئے کچھ عرصہ تک لاہور اور ملتان میں شاہی صوبہ دار کی فوجی ملازمت میں رہے۔ اس کے بعد تین سو سواروں کی جمعیت کے ساتھ کرنال آئے اس زمانہ میں مغلیہ خاندان کے محمد شاہ کی فرماں روائی تھی دربار عیش و عشرت میں مصروف تھا ملک میں شاہی انتظام بگڑ چکا تھا ایسے موقع سے فائدہ اٹھا کر نجابت خاں نے کرنال کے قرب وجوار کے کچھ علاقہ پر قبضہ کرکے کرنال کے قریب دریائے جمنا کے کنارے نجابت گڈھ کی بنا ڈالی۔ اسی نجابت گڈھ کا نام بعد کو کنج پورہ ہوا۔ یہ نئی بستی مضبوط فصیلوں اور خندق سے محفوظ کرکے پٹھانوں اور دوسری قوموں سے آباد کردی گئی۔ اس کے بعد دہلی دربار سے صوبہ سہارنپور کے فوجدار کو نجابت خاں پر فوج کشی کرنے کا حکم پہنچا۔ جنگ کی نوبت آئی نجابت خاں کی فتح ہوئی آخر میں دہلی دربار نے نجابت خاں کو باقاعدہ نواب تسلیم کرلیا اور جس قدر ملک کا حصہ نواب نجابت خاں کے پاس تھا بدستور ان کے قبضہ میں رہا لیکن ایک ہی سال کے بعد مرہٹوں سے سخت جنگ

ہوئی نجابت خاں کو شکست ہوئی اور وہ مرہٹوں کے ہاتھ میں اسیر ہو گئے اسی اسیری میں
اُن کا انتقال ہوا۔

۱۷۶۱ء میں احمد شاہ درانی اور مرہٹوں میں پانی پت کی مشہور تاریخی جنگ ہوئی جس میں
مرہٹوں کی فاش شکست ہوئی اس جنگ میں نواب نجابت خاں کے بیٹے دلیر خاں نے احمد شاہ
کی طرف سے مرہٹوں کے خلاف ایسی جانبازی سے جنگ کی تھی کہ احمد شاہ نے اس کے صلہ
میں دلیر خاں کو کنج پورہ کا نواب کر دیا اور اس طرح یہ ریاست نواب نجابت خاں کے
خاندان میں بار دگر واپس آئی پنجاب کی بڑی بڑی ریاستوں میں کنج پورہ کی ریاست بھی شمار
ہوتی تھی۔ قدرت کے قاعدہ کے موافق جب امن و راحت کا زمانہ نصیب ہوا تو
خاندان کنج پورہ کے رئیس آرام طلب ہو گئے۔ سپہگری اور جفاکشی کی جگہ کاہلی اور عیش طلبی
نے لے لی۔ آخر سکھوں نے ریاست کا ایک بڑا حصہ نواب نجابت خاں کے جانشینوں سے
چھین لیا اب موجودہ حالت میں کنج پورہ کی ریاست کی آمدنی قریب سوا لاکھ روپیہ سالانہ
کے رہ گئی ہے خاندان کا شجرہ علیحدہ اس باب کے آخر میں دیا گیا ہے اُس سے ظاہر ہوتا
ہے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نواب نجابت خاں کی چھٹی پشت میں تھے نواب
نجابت خاں کا جس وقت انتقال ہوا اُن کے بیٹے اختیار خاں کی جاگیر میں چند گاؤں تھے
لیکن اختیار خاں کی وفات کے بعد یہ گاؤں اُن کے بیٹے سلطان خاں عرف جھبو خاں
سے اس وقت کے با اختیار نواب نے لے لئے چنانچہ جب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ۱۸۶۷ء
میں پیدا ہوئے تو اُن کے خاندان کی شاخ کے پاس نہ تو کوئی جاگیر تھی نہ کوئی وثیقہ یا گزارہ ریاست
کی طرف سے تھا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے دادا محمد نور خاں پہلے تو نواب کنج پورہ کے
ملازم تھے بعد کو ریاست کپورتھلہ میں نوکر رہے مگر زیادہ عمر نہ پائی اور اپنے بعد غلام احمد خاں
کو صرف آٹھ سال کا بچہ چھوڑ کر رحلت کر گئے۔ غلام احمد خاں کے تین بھائی تھے یعنی فتح محمد خاں
عبدالحکیم خاں، ابراہیم خاں اور ایک بہن بھی تھی کوئی ذریعہ آمدنی کا نہ تھا بیوہ والدہ نے

جس طرح ممکن ہوا بچوں کی پرورش کی اور اُس زمانہ کے حالات کے موافق تعلیم بھی دلوائی
چونکہ اس خاندان کے گزارہ کا اب کوئی ذریعہ نہ تھا اس لئے صاحبزادہ صاحب کے والد
غلام احمد خاں کو معاش کی ضرورت ہے۔ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور ملازمت کرنے پر
مجبور ہو گئے۔ صرف سولہ سال کی عمر تھی کہ انگریزی رسالہ میں فوجی نوکری کر لی لیکن کچھ عرصہ
کے بعد ایک درویش کے ارشاد کی تعمیل میں یہ فوجی نوکری چھوڑ دی۔ مشیت کے راز انسان
نہیں سمجھ سکتا دو یا تین ہی ہفتے گزرنے پائے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا ہولناک غدر شروع ہو گیا اور
غلام احمد خاں کے بڑے بھائی اور چند قریب کے رشتہ دار جو رسالہ میں نوکر تھے مارے گئے۔
رسالہ کی ملازمت چھوڑنے کے بعد غلام احمد خاں کو مصائب کا سامنا رہا شادی ہو چکی
تھی اس لئے خانہ داری کی ذمہ داری مصیبت بالائے مصیبت تھی۔ پہلے گھوڑوں کی تجارت
کی اس کے بعد نواب گنج پورہ کی نوکری کر لی لیکن چونکہ بڑے باحوصلہ تھے۔ بالطبع ایسی ملازمت
پسند نہ آئی اس لئے یہ نوکری چھوڑ کر ٹونک چلے گئے اور وہاں کامیابی نہ ہوئی تو واپس
آ گئے مگر ۱۸۶۲ء میں پھر ٹونک چلے گئے یہ زمانہ نہایت آزمائش اور عسرت کا تھا اس دفعہ
ٹونک میں اچھی جگہ مل گئی اور مختلف ذمہ داری کے عہدوں پر نہایت اسلوب اور سلیقہ سے
کام کیا اور ممتاز ہوئے لیکن ایسے ہونہار کے راستہ میں اب رشک و حسد اور درباری سازشیں
حائل ہونے لگیں۔ غیور اور بے لوث طبیعت نہ ان کا مقابلہ کر سکی نہ انھیں برداشت کر سکی
چنانچہ ۱۸۷۴ء میں استعفی دے دیا اوائل ۱۸۷۶ء میں گوالیار گئے چند روز کے بعد نوکر ہو گئے
جیاجی راؤ جیسے مردم شناس شخص گوالیار کے مہاراجہ تھے انھوں نے غلام احمد خاں کی قدر
کی دس سال مختلف ذمہ داری کے عہدوں پر کام کیا تھا کہ ۱۸۸۶ء میں مہاراجہ جیاجی راؤ
کا انتقال ہو گیا مادھو راؤ ولیعہد نابالغ تھے گوالیار میں کونسل آف ریجنسی قائم ہوئی اور غلام احمد خاں
بھی اُس کونسل کے ایک ممبر مقرر ہوئے۔ یہ تقرر یکم ستمبر ۱۸۸۶ء کو ہوا۔ ریاست کے انتظام کی
ہر شاخ میں خصوصاً صیغہ تعلیمات میں ایسی نمایاں خدمات انجام دیں کہ ریاست گوالیار کی

تاریخ میں یادگار رہیں گی۔ ان خدمات کے صلہ میں ریاست کے اوّل درجہ کے بارہ سرداروں میں سے ایک وہ بھی مقرر کئے گئے۔ ۱۸۹۴ء میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ان کو نواب کا خطاب عطا ہوا۔ اسی سال میں کونسل آف ریجنسی کی مدت ختم ہوئی اور نواب غلام احمد خاں معقول پنشن پر سبکدوش ہو گئے۔ پنشن حاصل کرنے کے بعد وہ چھ برس زندہ رہے اس زمانہ میں انھوں نے کئی سفر کئے اور اپنا زیادہ وقت اندھوں کی مدد اور تعلیم کے وسائل بہم پہنچانے میں صرف کیا وہ شعر بھی کہتے تھے اور اپنے نام کی مناسبت سے احمدی تخلص کرتے تھے "صبح نور" ان کے مذہبی، اخلاقی اور علمی مضامین اور نظموں کا اچھا مجموعہ ہے۔ اُن کے تمامی دور زندگی سے یہ ثابت ہے کہ وہ نہایت با اصول پختہ کار باحوصلہ صاحب تدبیر اور دانشمند شخص تھے بغیر کسی وسیلہ یا سفارش کے محض اپنے استقلال، قابلیت، محنت، مستعدی اور جفاکشی سے انھوں نے عزت اور ترقی حاصل کی۔ وہ ایسے زمانہ شناس اور تعلیم جدید کے ایسے قدردان تھے کہ اپنے دونوں بیٹوں کو ہندوستان اور انگلستان میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلائی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی والدہ بھی نہایت باسلیقہ اور سمجھدار خاتون تھیں سلطان احمد خاں اور آفتاب احمد خاں اُن کے دو بیٹے تھے اور ایک بیٹی بلقیس بیگم۔ ان دونوں سے پہلے جو بچے ہوئے وہ مر چکے تھے اس لئے ان تینوں سے ان کو بہت زیادہ محبت تھی لیکن باوجود اس کے تعلیم و تربیت کے معاملہ میں انھوں نے یہ بچے اپنے پاس سے جُدا کر دینا گوارا کئے اور سلطان احمد خاں کے ساتھ آفتاب احمد خاں کو جبکہ وہ گیارہ سال ہی کے تھے علیگڈھ بھیج دیا۔ ۱۹۱۷ء میں جبکہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ولایت میں انڈیا کونسل کے ممبر تھے اُن کی والدہ نے رحلت کی۔ صاحبزادہ صاحب اپنے والدین کے ہمیشہ حد درجہ مدّاح اور فرماں بردار رہے ان کا یہ کامل یقین تھا کہ اس دُنیا میں اُن کو جو کچھ کامیابی ہوئی وہ محض والدین کی محبت اور صحیح تربیت کی بدولت ہوئی۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا شجرہ نسب
(۱)
نواب نجابت خاں (بانی ریاست کنجپورہ)
(۲)
جلال خاں
خوشحال خاں
امان خاں
اختیار خاں
کمال خاں
دلیر خاں (نواب)
(۳)
عباس علی خاں
سرفراز خاں
دراز خاں
طرہ باز خاں
سلطان خاں عرف جیبو خاں
(۴)
احمد خاں
گل محمد خاں
محمد نور خاں
(۵)
ابراہیم خاں
نواب غلام احمد خاں
عبدالحکیم خاں
فتح محمد خاں
(۶)
صاحبزادہ سردار سر سلطان احمد خاں
صاحبزادہ آفتاب احمد خاں
بلقیس بیگم
(۷)
شمشاد احمد خاں
شہزاد احمد خاں
خاتون جہاں بیگم (مرحوم)
آباد احمد خاں
خورشید احمد خاں
زہرہ بیگم
(بریگیڈیر) انیس احمد خاں

باب دوم

تعلیم

فصل اول

وطن میں تعلیم

صاحبزادہ صاحب کی ابتدائی تعلیم چھ برس کی عمر میں اپنے وطن کنجپورہ میں شروع ہوئی۔ سب سے پہلے میاں جی یعقوب صاحب سے قرآن شریف پڑھا۔ اس کے بعد قصبہ کے ورنیکلر اسکول کی شاخ میں جہاں صرف پرائمری درجہ تک تعلیم ہوتی تھی داخل ہوئے اور وہاں کی تعلیم ختم کرکے ورنیکلر اسکول کنجپورہ میں پڑھنے لگے۔ اس مدرسہ میں اس زمانہ میں اردو نصاب کے علاوہ فارسی کی کتابیں مثل انتخابات گلستاں، بوستاں، سکندر نامہ وغیرہ کے پڑھائی جاتی تھیں ابھی یہ خواندگی ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ ۲۶؍جون [illegible] کو اپنے بڑے بھائی صاحبزادہ سلطان احمد خاں کے ساتھ مدرسۃ العلوم علیگڈھ میں داخل ہوئے لیکن چار ماہ بعد وہاں سے واپس آکر کرنال کے انگریزی اسکول میں داخل ہوگئے۔ اس زمانہ میں اور نیز زمانہ مابعد میں صاحبزادہ صاحب کے والد کو جب موقع ملتا تھا اپنے لڑکوں کو فارسی خود پڑھایا کرتے تھے اور پڑھانے کے ساتھ ورزش بھی کراتے تھے اس سے صاحبزادہ صاحب کو خود بھی کشتی کا شوق ہوگیا تھا (یہ شوق اُن کا تمام عمر قائم رہا اگرچہ ورزش کے اقسام عمر کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے) اور وہ اکھاڑہ میں جو ایک چہار دیواری سے محصور تھا کشتی لڑا کرتے تھے اور اپنے ہم عمروں میں سب سے زیادہ طاقتور سمجھے جاتے تھے۔ کشتی کا فن انھوں نے سید محمود علی شاہ صاحب سے سیکھا تھا جو کنجپورہ میں اس فن کے اُستاد تھے۔ [1]

[1] یہ حالات حکیم عمر دراز خاں کے ایک خط سے لئے گئے ہیں جو صاحبزادہ صاحب کے رفیق اور ہم درس رہے تھے۔

فصل دوم

علیگڑھ کالج میں تعلیم

کالج میں داخلہ

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے بچپن کا وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی طرف سے عموماً نفرت و بدگمانی تھی اگرچہ سرسید احمد خاں کی تعلیمی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا مگر مذہبی حیثیت سے عموماً مسلمان اُن کو اچھا نہ سمجھتے تھے اور پرانے مذہبی خیال کے مسلمان شرفا اپنے بچوں کو انگریزی پڑھانے یا سرسید کے مدرسہ میں بھیجنے میں تامل کرتے تھے مگر صاحبزادہ صاحب کے والد نہایت دوراندیش، ہوشمند اور تجربہ کار شخص تھے اُن کی دوربین نظر نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ بچوں کو کس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے اس لئے انھوں نے عام خیال کی پیروی نہ کی اور کم سنی ہی میں اپنے دونوں بچے علیگڈھ بھیج دئے۔ جیساکہ اوپر مذکور ہوا دونوں بھائی ۲۶ رجون ۱۸۷۸ء کو مدرسۃ العلوم علیگڈھ میں داخل ہوئے۔ اس وقت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی عمر گیارہ سال کی تھی اور کالج کو قائم ہوئے صرف تین سال ہوئے تھے۔ اس وقت یہ دونوں بھائی صرف چار ماہ علی گڈھ میں رہ کر وطن چلے آئے اور ۱۱ رمارچ ۱۸۸۰ء کو دوبارہ علیگڈھ اسکول میں داخل ہوئے اور پھر برابر یہیں تعلیم پاتے رہے۔ آفتاب احمد خاں اس وقت اسکول کی تیسری جماعت میں داخل ہوئے تھے صاحبزادہ صاحب نے اپنے روزنامچہ میں لکھا ہے "والدہ کو ہماری صحت اور زندگی کے متعلق ہر وقت فکر رہتی تھی مگر باوجود اس قدر محبت اور دلی لگاؤ کے جب والد مرحوم نے تھوڑی عمر میں ہم کو والدہ صاحبہ سے علیٰحدہ کر کے علیگڈھ بھیجنا چاہا تو والدہ نے اپنے مادرانہ محبت کے جذبات پر مردانہ وار جبر کر کے بخوشی رضامندی دیدی" اُس کے آگے لکھتے ہیں۔

"ہمارے خاندان کی اکثر بیبیاں والدہ سے کہا کرتی تھیں کہ تم نے کس طرح اپنے بچوں کو ایسی کم عمری میں پردیس بھیج دیا۔ لیکن والدہ ہمیشہ جواب میں فرمایا کرتی تھیں کہ بچوں کی جُدائی سے جو میرے دل پر گذرتی ہے اس سے میں ہی واقف ہوں۔ لیکن مجھ کو کیا حق ہے کہ اپنی ذاتی دلجمعی اور اطمینان کے لئے بچوں کی تمام زندگی برباد کردوں جب کبھی والدہ ہمارے متعلق خواب دیکھ لیتی تھیں یا جب کبھی ہمارے پاس سے خط آنے میں دیر ہوتی تو کئی کئی روز وہ راتوں کو جاگتی اور پریشان رہتی تھیں مگر باوجود اس کے ہماری تعلیمی بہبودی اور ترقی میں وہ کبھی سدِّ راہ نہیں ہوئیں انسان کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی خوش نصیبی یا نعمت نہیں کہ وہ ایسے والدین کے جو روشن خیال اور صالح ہوں گھر میں پیدا ہو اسی امر میں جس قدر خوش نصیب ہم اپنے آپ کو پاتے ہیں اس کے لئے خالق ذوالجلال کا شکر ادا کرنا ہمارے امکان سے باہر ہے۔"

مختصر یہ کہ صاحبزادہ صاحب کو خوش نصیبی سے والدین کی دوراندیشی کی بدولت بچپن ہی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایسے وسائل میسر آئے جو دوسروں کو کم ہاتھ آتے ہیں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ایسے زمانہ میں علیگڈھ آئے جبکہ طلبار کی تعداد بہت کم تھی اور تعلیم و تربیت کے لحاظ سے یہ دَور کالج کا بہترین زمانہ تھا۔ چونکہ ان کے والد نے دونوں لڑکوں کو سرسید احمد خاں کے سپرد کیا تھا اس لئے سرسید اُن پر خاص شفقت رکھتے تھے۔ آفتاب احمد خاں نے ۱۸۸۶ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا اس کے بعد ایف اے میں کالج کی خواندگی شروع ہوئی لیکن کالج میں کبھی باقاعدگی کے ساتھ انھوں نے نہ پڑھا۔ بات بات پر وہ کنج پورہ یا گوالیار بُلالئے جاتے تھے اور خواندگی کا سلسلہ ٹوٹ جاتا تھا حتیٰ کہ دُو۔ دُو ماہ تک گھر سے کالج کو واپس نہ آتے تھے۔ اسی دوران میں ۵ مارچ ۱۸۸۸ء کو اُن کی شادی محمد حسن خاں کی صاحبزادی سے ہوئی۔ محمد حسن خاں صاحب بھی خاندان کنجپورہ سے تھے اور ان کا شجرہ نواب نجابت خاں بانیٔ ریاست سے براہ راست ملتا ہے۔ علاوہ گھر آنے جانے کے اُن کا دماغ ہمیشہ کالج

کی بہبودی کے لئے اسکیمیں سوچنے میں مصروف رہتا تھا اور وہ یکسوئی کے ساتھ خواندگی پر متوجہ نہ ہونے پاتے تھے بالآخر سنہ ۱۸۹۱ء میں ولایت بھیج دیئے گئے۔

کاکس[1] کیمبرج اسپیکنگ پرائز

انگلستان کے جانے سے قبل آفتاب احمد خاں نے علیگڈھ میں کوئی خاص علمی امتیاز حاصل نہیں کیا تھا بجز اس کے کہ کیمبرج اسپیکنگ پرائز ان کو ملا تھا۔ یہ انعام سنہ ۱۸۸۸ء میں ہیرلڈ کاکس پروفیسر مدرسۃ العلوم نے (جو بعد واپسی انگلستان ممبر پارلیمنٹ بھی ہوگئے تھے اور بحیثیت ایک جرنلسٹ کے ممتاز و مشہور تھے) اپنے روپیہ سے قائم کیا تھا اس انعام قائم کرنے سے اُن کا یہ منشا تھا کہ علیگڈھ کے طلبہ میں عمدہ تقریر کرنے کا شوق و ولولہ پیدا ہو چنانچہ ہر سال یہ انعام اُس طالب علم کو دیا جاتا تھا جو سال کے اندر سڈنس[2] یونین کلب میں بہترین تقریریں کرے آفتاب احمد خاں کو سب سے پہلی بار یہ انعام لارڈ ڈفرن وائسرائے نے اپنے ہاتھ سے علیگڈھ میں دیا۔

ابتدائے طالب علمی کے کچھ دلچسپ حالات

بچپن میں کون پیشین گوئی کرسکتا تھا کہ زمانہ آئندہ میں صاحبزادہ صاحب ایک غیر معمولی شخصیت کے انسان ہوں گے اس لئے بچپن کے حالات تفصیل کے ساتھ محفوظ رکھنے کا کون خیال کرتا تاہم اُس عہد کے جو حالات اُن کے بعض ہمعصر طلباء سے معلوم ہوئے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحبزادہ صاحب بچپن ہی سے مہذب اور شریف مزاج تھے۔ بمقتضائے سن وہ کھیلتے بھی تھے لیکن شرافت اور اعتدال کے دائرہ سے متجاوز نہ ہوتے تھے۔ بچپن میں صاحبزادہ صاحب کو نماز کی طرف بہت توجہ تھی زمانہ طالب علمی میں سب سے پہلے جو انھوں نے انجمن بنائی تھی وہ "انجمن الصلوٰۃ" تھی صاحبزادہ صاحب کو اذان کہنے کا بہت شوق تھا مغرب کے وقت وہ اسٹریچی ہال کی ناتمام عبارت کے ایک ستون پر چڑھ کر اذان کہا کرتے تھے اور وہاں سے دوڑ کر پکی بارگ کے سامنے جماعت میں

[2] Siddons' Union Club　　[1] Mr Harold Cox

شریک ہوجاتے تھے اور تکبیر کہتے تھے اس لئے سرسید اُن کو نقیب المومنین کہا کرتے تھے۔

مولوی محمد عنایت اللہ بی۔اے (خلف خان بہادر شمس العلما مولوی محمد ذکاءاللہ مرحوم دہلوی) بھی اس زمانہ میں علیگڈھ میں پڑھتے تھے اور صاحبزادہ صاحب کے دوست تھے اور سرسید کے زمانہ ہی میں علیگڈھ کالج کے ایک ممتاز طالب علم خیال کئے جاتے تھے اور اپنی غیر معمولی علمی اور ادبی قابلیت کے لحاظ سے نظامت دارالترجمہ سرکار آصفیہ کے عہدہ پر مامور ہو گئے تھے مولوی عنایت اللہ صاحب اس زمانہ کا دلچسپ حال ایک خط میں اس طرح لکھتے ہیں۔

مولوی عنایت اللہ صاحب کا خط

میں جنوری ۱۸۸۱ء میں علیگڈھ اسکول کی تیسری جماعت میں داخل ہوا۔میں نے دو بہت گورے رنگ کے لڑکے دیکھے۔وہ یونین کلب کی عمارت سے مغرب میں جو بنگلہ تھا اس کے ایک کمرہ میں ٹھہرے ہوئے تھے ہنوز اُن سے باضابطہ ملاقات نہیں ہوئی تھی جب میں اسکول جاتا تھا انھیں دیکھا کرتا تھا کہ یہ بھی مدرسہ کو جاتے ہیں پہلے میری ملاقات بڑے بھائی سلطان احمد خاں سے ہوئی اس کے بعد آفتاب احمد خاں سے بھی ہوگئی میں اس وقت بارہ[۱۲] تیرہ[۱۳] برس کا تھا آفتاب احمد خاں مجھ سے کچھ بڑے تھے میں نے یہ دیکھا کہ وہ جس کام کو شروع کرتے اُس میں ہمہ تن مصروف ہوجاتے تھے اور ان کی اکثر باتوں میں دیرپائی تھی۔دوسرے لڑکے آج ایک کام شروع کرتے تھے دوسرے دن بھول جاتے تھے مگر آفتاب احمد خاں بہت دن اڑے رہتے تھے مثلاً جب دوسرے لڑکوں میں لڑائی ہوتی اور بول چال بند ہوجاتی تو ابھی گویا آنسو خشک نہ ہونے پاتے تھے کہ وہ پھر آپس میں مل جاتے بول چال شروع ہوجاتی لیکن اس کے خلاف اگر آفتاب احمد خاں کی کسی سے بول چال بند ہوجاتی تو مہینوں گذر جاتے کیا ممکن ہے کہ آفتاب احمد خاں بول چال شروع کریں لیکن مجھ سے ان کی بول چال کبھی بند نہ ہوئی گو وہ کسی کی محبت یا توجہ کے محتاج نہ تھے مگر میرے ساتھ ان کا ہمیشہ ایسا برتاؤ رہا کہ کبھی فرق نہ آیا محبت کے مقابلہ میں ان میں ہمدردی زیادہ تھی یعنی یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی

لڑکا اپنی مصیبت یا شکایت بیان کرے اور آفتاب احمد خاں سب کچھ بھول بھال کر اُس کے ہمدرد نہ بن جاتے ہوں۔ لڑکپن کی شکائتیں تھیں اور لڑکپن ہی کی ہمدردیاں اور محبتیں تھیں ہائے کیا زمانہ تھا آفتاب احمد خاں بچپن میں بڑے رٹو مشہور تھے رات میں دیر تک پڑھتے اور باآواز بلند پڑھتے تھے لیکن جب چھٹیوں میں گھر جاتے تو اکثر مہینوں کے بعد واپس آتے تھے اس کی وجہ سے ان کی مسلسل پڑھائی میں ہرج واقع ہو جاتا تھا جس زمانہ میں وہ کالج میں ہوتے تھے تو ہمیشہ محنت سے پڑھتے تھے۔ کم پڑھنے اور وقت ضائع کرنے والے لڑکوں پر اعتراض کرتے تھے میں اُن سے کئی جماعتیں اونچا تھا مگر میرے نہ پڑھنے پر ہنسا کرتے تھے اور واقعہ یہی تھا کہ میں بہت کم پڑھا کرتا تھا بعد کو مجھ سے وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ انٹرینس سے پہلے تم بالکل نہیں پڑھتے تھے پھر تم بھی میری طرح رٹو ہو گئے۔ ہم جیسے بے فکروں کا بڑا مشغلہ یہ تھا کہ کسی کمرے میں پہنچ گئے اور وہاں گپیں اُڑانے لگے مگر آفتاب احمد خاں ایسے لڑکوں میں نہ تھے وہ بہت کم آمیز تھے کسی کے کمرے میں جاکر بیٹھنا یا باتیں کرنا ان کی عادت میں داخل نہ تھا بلکہ اگر کوئی لڑکا ان کے کمرے میں ایسے وقت پر پہنچے جب وہ پڑھتے ہوں تو وہ اس سے صاف کہدیتے تھے کہ ہمارا ہرج نہ کرو۔

تمسخر آفتاب احمد خاں کو مطلق پسند نہ تھا وہ ہنستے ضرور تھے اور اُن کے دوست اُن سے مذاق کئے بغیر بھی نہ رہتے تھے لیکن ایسے مذاق پر وہ بیساختہ کہا کرتے تھے میاں کیا واہیات ہے۔ جب آفتاب احمد خاں انگلستان سے تعلیم پاکر اور بیرسٹر ہو کر آگئے تو ایک ملاقات میں برسبیل تذکرہ کہنے لگے "گانا سُننے کو بہت جی چاہتا ہے" یہ بات انھوں نے اس طرح کہی جیسے کوئی گناہ میں لذت رکھنے کا ذکر کرتا ہو میں ان کی یہ مشکل سمجھ گیا اور میں نے کہا قوالی تو فضول چیز ہے بہتر یہ ہے کہ پیشہ ور گانے والیوں کا گانا سُنا کیجئے اس پر وہ ہنسے اور اُن کے مُنہ سے وہی لڑکپن کا فقرہ نکلا "کیا واہیات ہے جی"۔

ہم چھوٹے لڑکوں نے ایک کرکٹ الیون تے علیحدہ بنائی پورے گیارہ کی یہ ٹیم نہ تھی۔ صرف

چھ۔ سات لڑکوں کی ایک ٹولی بن گئی غالباً یہ وہ زمانہ تھا کہ مولوی مشتاق حسین صاحب (نواب وقار الملک) نے چھوٹے اور بڑے لڑکوں کی تقسیم کرکے علیحدہ علیحدہ کمروں میں رکھا تھا اس تقسیم میں یہاں تک سختی کی تھی کہ اگر دو سگے بھائی بھی ساتھ رہتے تھے تو وہ بھی علیحدہ کر دئے گئے تھے۔ مگر کُنج پورہ والے دونوں بھائی اس قاعدہ سے مستثنٰی تھے اس ایلیون میں نفاق پیدا ہوگیا اور کچھ لڑکے خفا ہو گئے دو پارٹیاں ہوگئیں۔ آفتاب احمد خاں کی صورت شکل اور ہر کام میں غایت درجہ مستعدی ایسی تھی کہ وہ قدرتی طور سے اپنے دوستوں میں سرداری کی عزت حاصل کر لیتے تھے اور ان کے دوستوں کی پارٹی انھیں کے نام سے مشہور ہو جاتی تھی۔ میں آفتاب پارٹی میں ہوگیا اب جو کارروائی کی گئی وہ نہایت سخت تھی یعنی کرکٹ فیلڈ میں ایک عہد نامہ زبانی اس مضمون کا ہوا کہ مخالف پارٹی میں اس پارٹی کا کوئی لڑکا شریک نہ ہوگا اور اس عہد پر قسمیں لی گئیں۔ حلف دینے والے آفتاب احمد خاں تھے میں بھی اس معاہدہ میں شریک تھا لیکن کیا کہوں اس کے بعد جلد ہی جُرم اور گُناہ کا مرتکب ہوا یعنی چار پانچ ہی دن کے بعد میں قطعی بھول گیا کہ میں حلف کر چکا تھا۔ میں مخالف پارٹی میں جاکر کھیلنے لگا بس اب کیا تھا فوراً رپورٹ ہوئی اب جو اپنی پارٹی میں گیا تو سب کی نظریں پھری ہوئی تھیں ایک صاحب نے فرمایا بس آپ اب نہیں کھیل سکتے آپ نے قسم توڑی ہے۔ میں نے بہتیرا عذر کیا کہ بھائی مجھے یاد نہیں رہا مگر کون سُنتا تھا چیف پراسیکوٹر ظاہر ہے کہ آفتاب احمد خاں تھے مجھ پر خوب قہقہے لگے میں خفا ہوکر اپنے کمرے میں چلا آیا اور فیلڈ میں جانا چھوڑ دیا۔ تین چار برس ہوئے ایک دن یہی قہقہہ یاد کرکے خدا مغفرت فرمائے خوب ہنسے تھے۔ ایک دن میں اور آفتاب احمد خاں ٹفن کھاکر کمرے سے باہر نکلے یہ تیسرے پہر کا باضابطہ ناشتہ تھا جو فرسٹ کلاس[1] بورڈروں کو ملا کرتا تھا ہم دونوں اِدھر اُدھر پھرے اور بہت سخت بھوک معلوم ہوئی ہم دونوں پھر ٹفن کے کمرے میں آئے دوسرے لڑکے ٹفن کھاکر کمرے سے چلے جا چکے تھے ہم نے نوکر کو آواز دی اتفاق سے نوکر نیا تھا جو اسی زمانہ میں رکھا گیا تھا یہ نوکر آیا ہم نے کہا

[1] سکنڈ کلاس کے بورڈروں کو یہی ٹفن کا ناشتہ سہ پہر کے وقت ملتا تھا۔

ارے میاں کچھ کھانے کو بھی ہے ہمیں بہت بھوک لگی ہے اُس نے کہا مرغی کا قورمہ تیار ہوگیا ہے اور چپاتیاں پکنی شروع ہو گئی ہیں ہم نے کہا پھر لاتے کیوں نہیں یہ جمعہ کا دن تھا جمعہ کی شام کو کھانے میں مرغی کا قورمہ ملا کرتا تھا نوکر نے فوراً گرم گرم چپاتیاں اور دو رکابیوں میں بہت سا مرغی کا قورمہ سامنے لاکر رکھ دیا اور ہم نے کھانا شروع کر دیا جب نوکر چلا جائے تو خوب ہنسیں اور نوکر جب آئے تو چپ ہو جائیں آفتاب احمد خاں نے مجھ سے سوال کیا مرغی شام کو بھی ملے گی یا نہیں۔ میں نے کہا کوئی وجہ نہیں جو نہ ملے اس وقت خلاف قاعدہ ملی ہے شام کو قاعدہ سے ملے گی غرض خوب کھاپی کر کمرے سے باہر نکل گئے شام کو پھر موجود تھے میں اور آفتاب احمد خاں دسترخوان پر آمنے سامنے بیٹھے اور ہنسنا شروع کیا لڑکوں نے پوچھا کیوں ہنستے ہو جواب میں اور ہنسی آئی مرغی کی دو رکابیاں اور سامنے آئیں روٹی تو کیا کھائی جاتی مگر مرغی دونوں نے صاف کر دی اس واقعہ کا بعد کو جب ملتے تھے تو اکثر ذکر کرتے تھے آخر مرتبہ جب ۱۹۲۷ء میں ملا ہوں جب بھی اسی کا ذکر کرتے تھے۔

آفتاب احمد خاں لڑکوں کے کسی جھگڑے یا فساد میں کبھی شریک نہیں ہوئے مجھے جہاں تک یاد ہے کسی اُستاد نے انھیں کبھی سزا نہیں دی لیکن ایک دفعہ ایک طمانچہ ضرور کھایا تھا یہ طمانچہ ایسے مبارک ہاتھ کا تھا کہ آفتاب احمد خاں اس طمانچہ کا ہمیشہ فخر کے ساتھ ذکر کیا کرتے تھے یہ واقعہ وہ اس انداز سے بیان کیا کرتے تھے کہ سُننے والوں کو حسرت ہوتی تھی کہ ایسا طمانچہ انھوں نے بھی کھایا ہوتا۔ کالج میں یہ عقیدہ عام ہوگیا تھا کہ سرسید کے ہاتھ سے جو پٹتا ہے وہ بڑا آدمی ہوجاتا ہے واقعہ یہ تھا کہ اب جہاں کالج کا بڑا دروازہ (وکٹوریہ گیٹ) ہے اس کے سامنے احاطہ کی جالیوں کے قریب عنایت اللہ خاں والے کنوئیں سے لیکر ظہور گیٹ تک سید صاحب نے پانی کی ایک نالی پختہ اینٹوں کی ہوائی تھی تاکہ اس سے باغ میں پانی پہنچتا رہے۔ نئی نئی سرخ اینٹوں کی یہ ہموار نالی دور تک چاروں طرف سبزے میں بہت دلفریب تھی آفتاب احمد خاں جوتیاں اُتار کر اس نالی میں دوڑ رہے تھے جالیوں کے پیچھے سے سڑک پر گاڑی میں سید صاحب آرہے

تھے انھوں نے یہ دوڑ دیکھ لی اور کالج میں پہنچ کر آفتاب احمد خاں کو بلایا پہلے تو خوب خفا ہوئے اور پھر ایک طمانچہ رسید کیا کس کو خبر تھی کہ یہی طمانچہ کھانے والا بچہ خود سید صاحب کی جگہ بیٹھ کر ایک دن کالج نہیں بلکہ مسلم یونیورسٹی کا انتظام کرے گا۔

کالج اور اسکول کے سب اُستاد آفتاب احمد خاں سے بڑی خوشی کے ساتھ ملتے تھے اور ان کے ساتھ ایک خاص محبت اور توجہ رکھتے تھے مولوی خلیل احمد صاحب کے لطیفے اور مولوی عباس حسین صاحب کے ضلع جگت ویسے تو سب ہی طلبار کے لئے باعث لطف تھے مگر آفتاب احمد خاں انہیں یاد رکھتے اور ملنے والوں سے بیان کر کے خوب ہنسا کرتے تھے۔

سید صاحب کو بھی آفتاب احمد خاں سے ایک خاص اُنس تھا۔آفتاب احمد خاں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے تھے ایک دن کرکٹ فیلڈ میں کئی جگہ کھیل ہو رہا تھا آفتاب احمد خاں کا بھی الیون تھا سید صاحب گاڑی میں آئے ایک انگریز بھی ان کے ساتھ تھا گاڑی سے اتر کر دونوں کھیل دیکھنے لگے تھوڑی دیر میں سید صاحب نے آفتاب احمد۔آفتاب احمد کہہ کر پکارا آفتاب احمد خاں کھیل چھوڑ کر فوراً قریب گئے کچھ باتیں ہوئیں لیکن اس وقت معلوم نہ ہوسکا کہ کیا باتیں ہوئیں۔مگر بعد کو میں نے سنا کہ وہ انگریز گورنمنٹ کا بڑا معزز عہدہ دار تھا اُس نے آفتاب احمد خاں کو کھیلتے دیکھ کر سید صاحب سے پوچھا کہ یہ کہاں کا لڑکا ہے سید صاحب نے مذاق میں کہا یہ لڑکا آرمنیا کا ہے اس کے بعد آفتاب احمد خاں کو قریب بلایا اور انگریز کو بتایا کہ یہ خاندان کنج پورہ کا لڑکا ہے۔

آفتاب احمد خاں لڑکپن میں اس قدر گورے تھے کہ بالکل یورپین معلوم ہوتے تھے جوان ہوکر اُن کے بال کسی قدر بھورے رنگ کے ہوگئے لڑکپن میں بالکل سنہری وہ بھی ہلکے رنگ کے سُنہری تھے کالج کے بڑے لڑکے دونوں بھائیوں کو غُرغشتی کہا کرتے تھے۔غرغشتی حقیقت میں وہ تھے لیکن یہ لفظ لڑکوں کو ایسا غیر مانوس معلوم ہوتا تھا کہ اس کو مذاق کا کلمہ سمجھتے تھے۔

لڑکپن میں آفتاب احمد خاں کو کالج کے نقشے بنانے کا بہت شوق تھا ایک بڑے زرد کاغذ پر خطوط کے ذریعہ سے دکھایا تھا کہ پکی بارگیں کہاں تک بنتی ہوئی جائیں گی کالج کی عمارت کہاں

ہو گی مسجد کہاں ہو گی وغیرہ اس نقشہ سے مجھے بہت دلچسپی تھی اور شاید میرے سوا اور کوئی ان کا دوست اُن کے اس نقشہ نویسی کے کام کا قدر داں تھا۔

یہ نقشے تیار کرنے کے بعد آفتاب احمد خاں وطن چلے گئے جب واپس آئے تو میں نے نقشہ کا ذکر پھر ان سے کیا اور کہا کہ دوسرا بنائیے اس پر وہ کہنے لگے والد کو میں نے نقشہ دکھایا تھا وہ ناراض ہوئے اور کہا ایسے کام فضول ہوتے ہیں کوئی نقشہ نویس ریاست میں وزیر اور دبیر نہیں ہوا کرتا ہے اب میں نقشہ نہ بناؤں گا۔

ایک دفعہ باہر کی ایک کرکٹ ٹیم کالج ٹیم سے کرکٹ کا میچ کھیلنے آئی صرف ایک دن کا میچ تھا کچھ ہوا ایسی مخالف ہوئی کہ کالج والے ہارنے لگے رَن زیادہ کرنے باقی تھے اور کھیل ختم ہونے کی ساعت قریب آرہی تھی سب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں میں تماشائیوں میں تھا مایوس ہو کر اپنے کمرہ کی طرف چلا اسی حالت میں کیا دیکھا کہ آفتاب احمد خاں فیلڈ سے بھاگے ہوئے بورڈنگ ہاؤس کی طرف جا رہے ہیں۔

اس زمانہ میں اسٹریچی ہال پورا تعمیر نہیں ہوا تھا فقط ایک بڑے لمبے چبوترے کی شکل رکھتا تھا جس کے ایک حصہ پر چھپّر پڑا ہوا تھا اور یہی چھپّر ہماری مسجد تھی آفتاب احمد خاں دوڑے ہوئے اس چھپّر میں پہنچے جب میں قریب سے نکلا کیا دیکھتا ہوں کہ وہ قبلہ رو ہو کر سجدے کر رہے ہیں بہت سے سجدے کر کے وہ پھر فیلڈ کی طرف بھاگے مگر اتنے ہی میں ایک شور برپا ہوا اس ایک روزہ میچ میں کالج اتفاق سے اُس ٹیم سے ہار گیا جسے پہلے کئی مرتبہ ہرا چکا تھا۔

لڑکپن میں آفتاب احمد خاں کو نماز کا بہت شوق تھا لیکن یہ شوق دَوری تھا جب اُس کا دورہ اُٹھتا تھا تو جتنے دوست تھے سب کی نماز با جماعت کی پوری حاضری ہوتی تھی میری گرفتاری اس موقع پر خاص اہتمام کے ساتھ ہوتی تھی کیونکہ بے نمازیوں میں سب سے زیادہ بدنام تھا پڑھتا بھی تھا تب بھی کافر ہی سمجھا جاتا تھا۔ ہنسنے کا مرض اس زمانہ میں عام ہی نہ تھا بلکہ متعدّی بھی تھا آفتاب احمد خاں بھی اُن لڑکوں میں تھے کہ تھوڑے ہی حملہ میں صاحب فراش ہو جاتے

تھے۔اس ہنسنے کا ایک واقعہ سناؤں جس پر حیرت ہوگی شاہجہانپور کے ایک طالب علم محمد اختر
تھے بے انتہا خوش رہنے والے اور ایک خاص لٹک کے لوگ تھے عمر اُن کی بھی اُس وقت چودہ
پندرہ برس کی ہوگی ایک زبان انھوں نے خاص ایجاد کی تھی جس کا ایک لفظ مجھ کو اب تک یاد
ہے معنی وہ کچھ نہ رکھتا تھا مگر تلفظ اس کا "فلغ چینو" تھا اس کو محمد اختر عبرانی زبان کا لفظ کہتے تھے
اس قسم کے اور بہت سے الفاظ وہ نئے نئے تراشا کرتے تھے اور اگر کوئی لڑکا اُن سے ایسا سوال کرتا
تھا جسے وہ ناپسند کرتے تھے تو اسی زبان میں بے تکلف جواب دیا کرتے تھے میرا اور آفتاب احمد خاں
کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہوجاتا تھا۔جو باتیں سُن کر اب مسکرانا بھی دشوار ہے اس وقت سُن کر اُن سے
ہنستے ہنستے پیٹ میں درد ہوجاتا تھا۔پسلیاں دُکھنے لگتی تھیں محمد اختر بھی پکّی بارگ میں رہتے تھے۔
آفتاب احمد خاں تیرہویں کمرے میں رہتے تھے اور میں پانچویں نمبر میں تھا گرمیوں کا زمانہ تھا ہم تینوں
نے اپنے پلنگ شام کو بارگ کے سامنے پاخانوں سے اِدھر ہٹ کر چمن کے بیچ میں برابر برابر بچھائے
کھانا کھا کر سب اپنے اپنے پلنگ پر لیٹے۔محمد اختر صاحب نے اپنی ایجاد کردہ زبان میں ایک تقریر
شروع کی آفتاب احمد خاں کو ہنسی کا دورہ اُٹھا میں بھی اس مرض میں مبتلا ہوا اب محمد اختر نے تقریر
بند کرکے خود بھی ہماری نقل اُتارنے میں ہنسنا شروع کیا سب سے پہلے میں ہنستے ہنستے تھکا اسکے بعد
آفتاب احمد خاں بھی کچھ چپ ہوئے مگر محمد اختر کی ہنسی نہ رُکی جب ان کو آدھے گھنٹہ سے زیادہ
ہنستے ہنستے گزر گیا اور اُن کی ہنسی کم نہ ہوئی تو ہم دونوں نے انھیں ہنسنے سے منع کیا مگر اُن پر
کچھ اثر نہ ہوا۔میں اب بجائے ہنسنے کے کسی قدر پریشان ہوا آفتاب احمد خاں اختر کے ہنسنے پر
کبھی کبھی پھر بھی ہنسنے لگتے تھے مگر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ محمد اختر کی ہنسی کی آواز میں رونے کی
آواز بھی شامل ہے میں نے آفتاب احمد خاں سے کہا کہ اختر اب ہنستا نہیں ہے۔رو رہا ہے
تب ہم دونوں بہت پریشان ہوئے اتنے ہی میں اختر کی آواز نہایت بھیانک رونے کی ہوگئی ہم
دونوں اُسی وقت دوڑے ہوئے مولوی محمد اکبر صاحب منیجر کے پاس گئے رات کے دس بجے
ہوں گے مولوی صاحب تشریف لائے اور ہاسپٹل اسسٹنٹ ڈاکٹر کو جو کالج ہی میں رہا کرتے

تھے بلایا۔ انھوں نے آتے ہی کہا کہ خون دماغ کی طرف چڑھ رہا ہے اس کے بعد انھوں نے گردن پر رائی کا پلاسٹر لگایا اس کے بعد تھوڑی دیر میں محمد اختر ہوش میں آگئے اور پوچھا کہ گردن پر کیا لگایا ہے غرض اب وہ سخت بیمار ہوگئے پلنگ ان کا برآمدہ میں لے گئے صبح ہوتے ہی ڈاکٹر پھر آیا جمعہ کا دن تھا اور ہفتہ وار امتحان تھا اختر قلم کاغذ سنبھال سات بجے اسکول جانے لگے ہم نے منع کیا کہ اسکول نہ جاؤ اس کا انھوں نے اس طرح جواب دیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ جنوں کا اثر شروع ہوگیا ہے اس کے بعد وہ کچھ اچھے ہوگئے اور اپنے وطن کو چلے گئے مگر چلتے چلتے یہ حرکت کی کہ لیمپ کمرہ میں جلتا چھوڑ کر باہر سے قفل ڈالا کُنجی اپنے پاس رکھی اور شاہجہانپور روانہ ہوگئے۔ اس لیمپ کا قصّہ دوسری داستان ہوگیا یعنی پارک کے پیچھے سے رپورٹ آئی کہ ایک کمرہ میں جو مقفّل ہے رات کو روشنی ہورہی تھی کسی آسیب کا گزر ہے اُس کی تحقیقات کی گئی جنگلے سے دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک لیمپ بہت خفیف روشنی دے رہا ہے مولوی محمد اکبر صاحب تشریف لائے قفل توڑا گیا اور لیمپ بجھایا گیا لیکن مدّتوں تک محمد اختر کا کمرہ بھوت کا مسکن سمجھا گیا یہ قصّہ میں نے اس لئے لکھا کہ یہ واقعہ ایسا عجیب ہنسی سے شروع ہوکر جنون کا مقدمہ بن گیا کہ پھر کبھی نہ بھولا محمد اختر پھر کالج کو واپس نہ آئے ایک زمانہ کے بعد آفتاب احمد خاں سے کیمبرج میں اُن کی ملاقات ہوئی وہاں بھی اختر صاحب نے چند باتیں ایسی کیں جنھیں آفتاب احمد خاں ہنس ہنس کر سُنایا کرتے تھے کیمبرج میں چند ہفتہ قیام کرکے اگرچہ وہ کیمبرج میں داخل ہوگئے تھے وہ ہندوستان واپس چلے آئے۔

آفتاب احمد خاں کی طبیعت میں بچپن ہی سے بہت احتیاط تھی اس زمانہ کے قصّے ہی کیا تھے مگر کوئی بات اگر کہنے کی نہ ہوتی تھی تو کبھی نہ بتاتے تھے سوائے اس کے کہ کوئی بات چھپا رہے ہیں اور کچھ پتہ نہ چلتا تھا بچپن ہی میں اُن کی بات چیت میں ایک صفائی اور سچّائی تھی اور اسی صفائی اور سچائی کی وجہ سے جو بات وہ بتانی نہ چاہتے تھے سمجھنے والے اسکا پتہ چلا لیتے تھے جو بات کسی میں تعریف کی معلوم ہوتی تھی اس کی بہت تعریف کرتے تھے

لیکن جو بات بُری معلوم ہوتی اُسے بُرا کہکر زیادہ مذمت نہ کرتے تھے کسی کا مضحکہ کرنا یا کسی کو بے وقوف بنانا انھیں مطلق نہ آتا تھا۔ اس فن کے بڑے بڑے اُستاد دوسرے موجود تھے اور یہ نووارد کی تھوڑے دنوں بڑی مٹی پلید کیا کرتے تھے آفتاب احمد خاں لڑکپن میں بڑے دیر آشنا تھے لیکن جب ملاقات ہوجاتی تھی تو ہمیشہ ملتے تھے جس سے مخالفت ہوجاتی تھی پھر اُس کا ذکر زبان پر لانا گوارا نہ تھا ہر چیز میں ایک حد اور قاعدہ باندھنے کی انھیں لڑکپن سے عادت تھی پھر اُس سے ایک قدم آگے نکلنا نہ چاہتے تھے والدین کی عمدہ تعلیم و تربیت کا یہ نتیجہ تھا کہ جب باتیں کرتے تھے تو اُن کے قول نقل کرتے تھے۔ گویا ان کی مثال ہر وقت ان کے پیش نظر تھی۔ اب یہ طریقے فیشن کے خلاف ہیں۔ ماں باپ کے مقولے زبان پر لانا کجا۔ خدا کا کلام نقل کرنا بھی تہذیب کے حدود سے خارج ہے۔ بعض چیزوں میں زندگی میں رہبری کے لئے آفتاب احمد خاں خود سخت قاعدے وضع کرکے ان پر چلتے تھے اس لئے "چہ غم" طبیعتوں کو ان کی زندگی بڑی پابندیوں کی معلوم ہوا کرتی تھی۔

لڑکپن میں متمول لڑکوں کی طرح ان کو ولایت جاکر تعلیم ختم کرنے کا بالکل شوق نہ تھا صرف اپنے بڑے بھائی کے اصرار سے وہ ولایت گئے اور وہاں بڑی ناموری سے تعلیم ختم کی بچپن اور جوانی میں کوئی نہ کوئی قاعدہ زندگی کا اپنے لئے ایسا سخت تجویز کرلیتے تھے جس پر ان کے دوست اکثر اعتراض کیا کرتے تھے یا دل میں اعتراض رکھ کر ان سے کچھ نہ کہتے تھے ولایت جانے سے پہلے کہا کرتے تھے کہ انگریزی لباس میں مجھے پتلون سے سخت نفرت ہے میں کبھی نہ پہنوں گا۔ ۱۸۹۴ء میں جب ولایت سے واپس آکر سید صاحب سے علیگڈھ میں ملنے آئے تو اتفاق سے میں وہیں تھا اس وقت آفتاب احمد خاں بالکل ہندوستانی لباس پہنے ہوئے تھے میں نے باتوں باتوں میں پوچھا کہ ولایت میں آپ کو پتلون پہننے کا تو اتفاق نہ ہوا ہوگا ہنس کر چپ ہوگئے۔

روپیہ کے تحفظ کا آفتاب احمد خاں کو بہت خیال تھا لیکن مناسب موقع پر کشادہ دستی سے خرچ کرتے تھے فضول خرچی پر ضرور لکچر دیا کرتے تھے دُشمن بھی اگر فضول خرچ نہ ہو

تو تعریف کیا کرتے تھے تیر اُن بہت تھے اور رحمدلی خاندانی تھی مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ کنانی میں ایک آدمی تیر کمان بیچنے آیا تیر اصلی تھے یعنی ان کے پھل لوہے کے خوب تیز تھے کئی لڑکوں نے تیر کمان خریدے ان میں ایک آفتاب احمد خاں بھی تھے جس بنگلہ میں رہتے تھے اسکی کھپریل میں چوٹی پر ایک فاختہ بہت سست پروں میں گردن دبائے بیٹھی تھی آفتاب احمد خاں نے تیر مارا خدا معلوم آفت پہلے سے نقاہت تھی یا تیر کی ہوا لگ کر وہ نیچے آرہی پھر تو صاحبزادہ صاحب کی یاروں سے وہ تعریفیں کہیں کہ باید و شاید میں نے خود بہت دنوں تک تعریف کی لیکن آفتاب احمد خاں کو فاختہ کی جان کا بڑا افسوس تھا بندوق لگانے کا ایک زمانہ میں شوق ہوا مگر شکار کا شوق ان کو غالباً کبھی نہیں ہوا سانپ اگر نکلتا تھا تو ضرور لکڑی اینٹ ڈنڈا جو کچھ ہاتھ لگتا تھا لیکر موجود ہو جاتے تھے۔ مولوی عنایت اللہ صاحب موصوف نے صاحبزادہ صاحب کی تصویر جن الفاظ میں کھینچی ہے آگے چل کر وہ دُنیا کے سامنے کس طرح پیش ہوئی اس کا حال ناظرین کو اس سوانح عمری کے آئندہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔

ڈیوٹی یا انجمن الفرض

صاحبزادہ صاحب نے یہ انجمن شروع نومبر ۱۸۹۰ء میں قائم کی جس کی غرض یہ تھی کہ کالج کے لئے مستقل سرمایہ جمع کیا جائے اور نادار طلباء کے لئے وظائف فراہم کئے جائیں اس وقت کالج کو قائم ہوئے ۱۵ سال گذر چکے تھے مگر اس وقت تک طلباء میں قوم یا کالج کی عملی خدمت کرنے کے جذبہ کا ظہور نہ ہوا تھا صاحبزادہ صاحب کے دل میں جب یہ جذبہ پیدا ہوا تو انھوں نے نہایت ضبط اور خاموشی سے کام لیا اور سب سے اول اپنے ایک طالب علم دوست عبداللہ خاں صاحب جالندھری مرحوم سے اپنے خیالات ظاہر کرکے انھیں اپنا ہم خیال بنایا اس کے بعد مولوی بہادر علی صاحب (مرحوم) سے تذکرہ کرکے انھیں شریک کار بنایا۔ تیسرے نمبر پر سید طفیل احمد مرحوم صاحب سے اپنی اس تجویز کے متعلق گفتگو کی جو ہم خود سید صاحب مرحوم کے الفاظ میں درج ذیل کرتے ہیں۔

"ایک دن صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے مجھ سے کہا کہ سید صاحب نے قوم

سے بھیک مانگ کر کالج قائم کیا ہے مگر کالج کی ضروریات اس قدر زیادہ ہیں کہ جو کچھ ملتا ہے وہ سب خرچ ہو جاتا ہے اور افسوس کالج کی جس قدر ضروریات بڑھ رہی ہیں اُسی نسبت سے سید صاحب کی قوت گھٹتی جا رہی ہے اور وہ کالج چلانے کے افکار کے بوجھ سے دبے جاتے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی ایسا انتظام کیا جائے کہ کالج کے لئے مستقل سرمایہ فراہم ہو اور اُسکی آمدنی سے کالج کا خرچ چلے اور آئے دن کے افکار سے نجات حاصل ہو تمھاری اس معاملہ میں کیا رائے ہے۔ اس کا جواب میں نے دیا کہ اس میں رائے کی کیا بات ہے بلاشبہ یہ کام اچھا ہے یہ سُن کر صاحبزادہ صاحب نے فرمایا کہ اگر اچھا کام ہے تو تم بھی اس میں شریک ہو جاؤ۔ میں نے کہا سبحان اللہ جو کام سرسید انجام نہ دے سکے کیا اُسے ہم طالب علم انجام دے سکیں گے میری طاقت اور امکان سے تو یہ باہر ہے۔ صاحبزادہ صاحب نے کہا اس سے کوئی غرض نہیں کہ تمھارے امکان میں ہے یا نہیں میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمھارے نزدیک کالج کے لئے روپیہ جمع کرنا ایک ضروری اور نیک کام ہے یا نہیں اگر تم اُسے ضروری سمجھتے ہو تو بس ہمارے شریک ہو جاؤ اس پر میں نے صاحبزادہ صاحب کے رُعب میں آکر اقرار کر لیا اس کے بعد اسی وقت صاحب موصوف نے اپنی اسکیم سُنائی جو حسب ذیل ہے:-

اللہ اکبر ۔ اللہ اکبر ۔ اللہ اکبر

ہندوستان کے اسلام کی مُردہ حالت دیکھتے دیکھتے اور اس کے حال زار پر مرثیہ خوانی سُنتے سُنتے ہمارا دل پک گیا۔ کبھی ہم آسمان کا تاج تھے تو کیا آج تو ہم زمین کی خاک سے بھی زیادہ پامال ہیں۔ سید احمد خاں کی ہمہ تن اور صادق کوششیں اور قوم کا اُن کے ساتھ نا انصافانہ اور ظالمانہ برتاؤ دیکھتے دیکھتے ہمارا دل بے قابو ہو گیا خیر سرسید تو اپنے خدا کے سامنے اپنی عمر بھر کا سرمایہ پیش کر کے سرخرو ہو جائیں گے مگر ہم روسیاہ کے روسیاہ رہ جائیں گے۔

اب ہم کو اپنی فکر ہے سب طرف پناہ کے لئے دیکھتے ہیں مگر سوائے پیارے مدرسۃ العلوم کے ہم کو اور کوئی جگہ نظر نہیں آتی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے اور بھائی مدرسۃ العلوم سے بھاگتے

ہیں مگر ہم اسی کے ساتھ دل سے یقین رکھتے ہیں کہ آج اس سے یہ بھاگتے ہیں مگر کل کو یہی اس میں
آکر امن لیں گے اس لئے ہماری دل سے دعا ہے کہ اے خدا ان کو آج ہی یہاں داخل کرتا کہ
کل کو پشیمانی کے ساتھ اُن کو نہ آنا پڑے ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اس حصار تحفظ کی جڑ مضبوط نہیں
ہے جس بنیاد پر وہ قائم ہے پختہ نہیں ہے ہر وقت اندیشہ ہے کہ بنا بنایا ٹھاٹ کہیں بگڑ نہ جائے
مگر وہ خدا اور وہ خالق ذوالجلال جس نے تمام دُنیا کی بُنیاد کو قائم کیا ہے اور مستحکم کیا ہے اسی سے
اُمید ہے کہ اپنے صدقہ سے اس بنیاد کو بھی پائدار کرے گا یہ خیالات ہمارے دلوں کو بے چین کرتے
ہیں اور آخر کار مجبور کرتے ہیں کہ ہم خدا کا نام لے کر اُٹھیں اور اپنے مدرسۃ العلوم کی خدمت میں
اپنی عمر کا کچھ حصہ صرف کریں اور اگرچہ موجودہ حالت کے لحاظ سے ہمارا یہ ارادہ اُس پودنے کی
اُمنگ سے جو آسمان کو اپنے پیروں پر سہارنے کا عزم کرتا ہے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا ہے
لیکن خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ ارادہ کرنے والا پودنا لدھڑ ہاتھی سے بہتر ہے ہم کو سوائے اپنے خدا کے
اور کسی سے کچھ اُمید نہیں اُسی نے ہم کو یہاں بھیجا ہے اور وہی کافی وبس ہے اور وہ لوگ جن کو
خُدا نے دولت کے سمندر میں ڈُبا رکھا ہے ہم سے بالکل بے خبر ہیں وہ لوگ جن کو خُدا نے بغیر
کسی محنت یا مشقت کے سونے اور چاندی کے خزانے عطا کئے ہیں سمجھتے ہیں کہ ان کی خواہشِ
نفسانی کے لئے اُن کے سپرد کئے گئے ہیں اور نہیں غور کرتے کہ خُدا نے ان کو اپنے اور اپنی مسکین
مخلوق کے درمیان وسیلہ کیا ہے خیر اگر وہ غبن کرتے ہیں تو کریں مگر خوب سمجھ لیں کہ حاکم مطلق کے
سامنے سب حساب موجود ہے اگر ہم مسکینوں کو وہ خدا کا دیا ہوا نہیں دیتے تو نہ دیں اور خود
ہضم کر جائیں مگر کیا ہم اپنے معطی حقیقی سے بھی نہیں مانگ سکتے اور کیا وہ اس کے حضور میں بھی
بھانجی مار سکتے ہیں ان اپنے خیالات کو عملی شکل میں لانے کے لئے ہم نے ایک انجمن قائم کی جسکا
نام الفرض ہے اور اس کے ممبر خدام کے نام سے موسوم ہیں اور خُدام کے جلسہ کا نام لجنۃ الاخوان
ہے وہ خادم جس کے پاس الفرض کی کل کارروائی رہے گی امین کہلائے گا ہماری کارروائی
بالکل چپ چاپ مسلسل اور خُدا کے فضل سے مستقل ہوگی۔ کثیر اور مقید قواعد کی ہم کو ضرورت

نہیں خود ہمارا دل ہمارا سچا ہادی اور رہنما ہوگا۔

طریقہ انتخاب خدام اس خدمت میں صرف انھیں بندگان الٰہی سے شرکت کی درخواست کی جائے گی جن کے دلوں میں قدرتی طور پر قومی چھبن اور خاص کر ہمارے پیارے مدرستہ العلوم کی محبت ہوگی ہر ایک خادم کو چاہیئے کہ جس کسی کو وہ الفرض سکا ممبر یعنی خادم ہونے کے قابل سمجھے تو اس کا نام لجنۃ الاخوان میں پیش کرے۔ اگر سب خدام منظور کرلیں تو اس کو ملازمت میں شریک کیا جائے۔

طریقہ عمل۔

اوّل۔ ہر شخص سے جو لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتا ہے مدرستہ العلوم کے متعلق گفتگو کرنی چاہیئے اور سچائی اور حقیقت حال کی مدد سے اس کی اس قومی کام کی طرف توجہ دلانی چاہیئے۔

دوم۔ اپنے ذاتی چال چلن کی سند سے اور بورڈنگ ہاؤس کے واقعی حال کے بیان سے اُن بے بنیاد الزامات کو دور کرنا چاہیئے جو بدخواہان کالج نے لوگوں کے دلوں میں بٹھائے ہیں۔

سوم۔ ہر ایک مسلمان سے خواہ وہ عالم ہو یا جاہل ان برکتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہیئے جن کی مدرستہ العلوم سے قوم کی قوی اُمید ہے بشرطیکہ وہ متوجہ ہوں۔

چہارم۔ ایسی فکر کرنی چاہیئے کہ پُرانے اعلیٰ خاندانوں کے بچے جو بڑے ہو کر اور محلوں میں تعلیم پاکر اپنی جان و مال کو تباہ اور بزرگوں کے ننگ و ناموس کو ملیامیٹ کر دیتے ہیں وہ شروع سے یہاں تعلیم کے لئے آئیں اور تعلیم پاکر قوم کے قوتِ بازو بنیں۔

پنجم۔ عام طور پر مسلمانوں کو انگریزی اعلیٰ تعلیم کی طرف توجّہ دلانی چاہیئے۔

روپیہ کیوں کر جمع ہو

اوّل۔ قوم کے لئے مانگنے کو بجائے عار کے عزت خیال کر کے مسلمانوں سے

کچھ نہ کچھ مدرسہ کے لئے لینا چاہئے۔

دوم۔ ہندوستان کے کل شہروں میں اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ مسلمانوں کی شادی و دیگر تقاریب میں کم از کم ایک روپیہ ہمارے کالج کے نام کا دیا جائے اس لئے ہر ایک شہر میں ایسے لوگ تلاش کرنا چاہئے جو اس ثواب کے کام کو اپنے ذمہ لیں اور ہر ایک شادی میں کالج کا حق وصول کریں۔

سوم۔ ایسے شخص تلاش کرنے چاہئیں جن میں سے ہر ایک غریب طلبار کے لئے پچاس۵۰ روپیہ جمع کرکے الفرض کو دے ان کا نام عامل درجہ اوّل ہوگا یہ عامل درجہ اوّل اس پچاس۵۰ روپیہ کی رقم کو اس طریقہ سے جمع کرے گا کہ وہ پانچ ایسے شخصوں کو تلاش کرے گا جن میں سے ہر ایک دس۱۰ روپیہ کی رقم کو پانچ ایسے شخصوں کے ذریعہ سے جمع کرے گا جن میں سے ہر ایک دو۲ روپیہ جمع کرکے اُس کو دے ان دو روپیہ جمع کرنے والوں کا نام محصّل ہوگا محصّل اس دو روپیہ کی رقم کو اس طرح جمع کرے گا کہ عامل درجہ دوم سے جو اس کو پرچہ ملا ہے اور جس میں آٹھ خانے ہیں اس کی خانہ پُری اس طریقہ پر کرے کہ فی شخص کم از کم ۴ر وصول کر سکے گا باقی تفصیل ہر ایک خادم عامل درجہ اوّل کو پرچہ دیتے وقت سمجھا دے گا۔

چہارم۔ میلوں، نمائش گاہوں اور اسی قسم کے موقعوں پر خُدّام دوکانیں کھولیں گے اور ہر ایک چیز جو اُن کے امکان میں ہوگی معمولی سوداگروں کی طرح فروخت کریں گے اور منافع مدرسہ کو دیں گے اس وقت تک یہ چار طریقے سوچے گئے تھے اور انھیں پر عمل کیا گیا ہے آئندہ جس قدر ہماری قوت بڑھتی جائے گی اُسی قدر ہمارے کام کو محض خالق ذوالجلال کی مدد کے ساتھ ترقّی ہوتی جائے گی۔ کُل روپیہ وصول شدہ امین الفرض کے پاس اوّل جمع ہوگا اور اُنکے پاس سے سکریٹری مدرستہ العلوم کی خدمت میں جائے گا۔

طریقہ آمدنی۔ جو کچھ آمدنی ہوگی وہ دو طرح سے صرف کی جائے گی کچھ حصّہ غریب مسلمان طالبعلموں کو وظائف دینے میں صرف کیا جائے گا اور کچھ حصّہ کالج کی مستقل آمدنی

کے لئے جو اُس کے قیام کے لئے ضروری ہے جمع کیا جائے گا۔

ہدایت خاص - ہر ایک خادم کے دل پر لفظ الفرض نقش ہونا چاہیے وہ کہیں یا کسی حالت میں ہو الفرض اُس کی نگاہ کے سامنے رہنی چاہیے ہر ایک خادم کو چاہیے کہ سہ ماہی میں کم ازکم ایک مرتبہ امین کو اطلاع دے کہ اس نے الفرض کے متعلق اس عرصہ میں کیا کارروائی کی وہ کارروائی عملی طور پر ہو یا کسی رائے یا صلاح کی شکل میں تاکہ امین کل خدام کو ایک دوسرے کی کارروائی سے اطلاع دے سکے۔

"اسکیم یہاں ختم ہوئی"۔ صاحبزادہ صاحب نے مجھے یہ اسکیم سنانے کے بعد میرے دستخط کرائے اور مجھ سے کہا کہ اس انجمن کے قائم ہونے کا تذکرہ کسی سے نہ کرنا عام طور پر لوگ انجمن قائم کرتے وقت اپنے بڑے بڑے پروگرام شائع کرکے ان کی اشاعت و تبلیغ کرتے ہیں مگر پھر کچھ کرتے دھرتے نہیں اس لئے ہمیں چاہیے کہ اوّل ہم خاموشی کے ساتھ پوشیدہ طور پر کچھ روپیہ فراہم کریں اور کچھ کرلینے کے بعد اسے ظاہر کریں اُس زمانہ میں مولوی مظہرالحق صاحب مرحوم (جو بعد میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے) میرے اور صاحبزادہ صاحب کے مشترک دوست تھے۔ صاحبزادہ صاحب نے فرمایا کہ تم اس انجمن کا تذکرہ مظہر سے بھی نہ کرنا خود میں اُن سے کہوں گا۔ چنانچہ تنہائی میں صاحبزادہ صاحب نے اُن سے تذکرہ کرکے انھیں شریک کار بنالیا اور اس کے بعد اوروں کو ممبر بنایا مگر عرصہ تک خدام یعنی ممبروں کی تعداد محدود رہی"۔

اسکیم مذکور پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اس انجمن میں کوئی عہدہ بجز امین یا خزانچی کے نہ رکھا گیا تھا اور اس پر طلبار میں سے نہیں بلکہ پروفیسروں میں سے مسٹر (سر) ٹی۔ ڈبلو۔ آرنلڈ کو مقرر کیا تھا۔ طلبار کے لئے کوئی عہدہ نہ رکھنے کی غرض یہ تھی کہ اُن میں جاہ پرستی نہ پیدا ہو اور ان میں خلوص کے ساتھ قومی خدمت کرنے کے جذبات پیدا ہوں اس انجمن کے جلسے ابتدا میں بند کمرے میں منعقد ہوتے تھے اور کارروائی شروع ہونے سے قبل گویا تجدید ایمان کیلئے مندرجہ بالا اسکیم پڑھ کر سنائی جاتی تھی۔

ابتدا میں فراہمی چندہ کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ اتوار یا کسی اور تعطیل کے دن خدام علیگڈھ سے باہر اپنے صرفہ سے جاتے اور جو کچھ ملتا لیکر آتے اور روپیہ جمع کرنے کا کارڈ ہمدردان کالج کو دے آتے تھے تاکہ وہ روپیہ جمع کریں اس غرض کے لئے صاحبزادہ صاحب نے مولوی بہادر علی صاحب کی معیت میں ۱۵ ار نومبر ۱۹۰۸ء کو سب سے پہلا سفر آگرہ کا کیا اور ۱۶ ار نومبر کا اتوار وہاں صرف کیا ڈاکٹر کرم حسین صاحب کے جو وہاں میڈیکل کالج میں لکچرار تھے مہمان ہوئے ڈاکٹر صاحب نے جو اُسی زمانہ سے قومی کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں اس وفد کی پوری امداد کی دوسرا وفد جو مولوی مظہر الحق اور سید طفیل احمد پر مشتمل تھا سہارنپور گیا اور وہاں مولوی عبداللہ جان صاحب مشہور وکیل ٹرسٹی کالج کے یہاں ٹھہرا۔ چندہ کے کارڈ وغیرہ تقسیم کئے اور دعوت وغیرہ کے عوض میں تیس روپیہ نقد لائے مگر اس طریقہ سے چونکہ کافی روپیہ نہ ملتا تھا اس لئے سب سے پہلی بار کالج کے سالانہ اسپورٹس کے موقع پر ۱۲۔۱۳ ار دسمبر ۱۹۰۸ء کو مولوی مظہر الحق صاحب نے اپنے خرچ سے چائے کی دوکان کھولی دو روز میں اس سے سولہ روپئے پس انداز ہوئے انھیں لے جاکر مسٹر آرنلڈ امین کو دیا اور کہا کہ اس روپیہ کو انجمن کے فارموں وغیرہ کی چھپائی پر صرف کیا جائے اس لئے کہ اب تک جو چندہ وصول ہوتا تھا اُسے آرنلڈ صاحب محفوظ رکھتے تھے اور چھپائی وغیرہ میں جو کچھ صرف ہوتا تھا وہ اپنے پاس سے دے دیتے تھے اور طلبار سے کہتے تھے کہ تم سفر کا خرچ اپنے پاس سے کرتے ہو میں چھپائی کا خرچ برداشت کروں گا اور فرماتے تھے کہ جو روپیہ وظائف کے نام سے جمع کیا جائے وہ کُل کا کل وظائف کے لئے جمع رہے جب مولوی مظہر الحق صاحب نے یہ سولہ روپیہ عہ مسٹر آرنلڈ کو چھپائی میں صرف کرنے کو کہا تو صاحب موصوف نے اپنے اُسی اُصول کا اعادہ کیا اور کہا کہ یہ تو اصل سرمایہ میں جمع ہوکر وظائف پر صرف کیا جائے گا اور کسی کام میں نہ لگایا جائے گا اس پر مولوی مظہر الحق صاحب نے فرمایا کہ یہ روپیہ میں نے اپنے ذاتی روپیہ اور ذاتی محنت سے پیدا کیا ہے حتیٰ کہ دوکان پر یہی ڈیوٹی کا سائن بورڈ نہیں

لگایا اگر اُسے آپ وظائف کے علاوہ متفرق کاموں پر صرف نہ کریں گے تو میں اُسے واپس لیلوں گا تب آرنلڈ صاحب نے مجبور ہوکر یہ روپیہ متفرق اخراجات کے لیۓ مولوی مظہرالحق صاحب سے لے لیا اور ڈیوٹی میں یہ طے ہوا کہ دوکان سے جو کچھ ملا کرے اس میں سے متفرق اخراجات میں صرف ہو اُس کے بعد صاحبزادہ صاحب اور مولوی مظہرالحق صاحب نے چار کی دوکان دسمبر ۱۹۰۸ء میں الٰہ آباد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں کھولی اور یہ پہلا موقع تھا کہ سرسید کو ڈیوٹی کے قیام اور کام کا حال معلوم ہوا الٰہ آباد کانفرنس سے دوکان کے منافع اور چندہ سے ڈیوٹی کو پانچ سو روپیہ وصول ہوا اور آگے چل کر اُس سے اسٹیشنری کی مختصر مگر مستقل دوکان قائم کی گئی (خاں صاحب) میر ولایت حسین صاحب نے اس کو ترقی دے کر کالج کی مشہور بکڈپو کے درجہ پر پہنچا دیا جس کی آمدنی سے ہزارہا روپیہ وظائف میں دیا جانے لگا اس دوکان کے علاوہ تعطیلوں میں طلبار کے وفود اطراف ملک سے چندہ لانے لگے اور ان طریقوں سے لاکھوں روپیہ طلبار کی تعلیم پر صرف ہونے لگا۔ یہ خیر جاریہ اب تک جاری ہے علاوہ طلبار کی امداد کے اس انجمن نے طلبار میں ایثار و خدمت کا جذبہ پیدا کیا اور اس میں بڑا حصہ خود صاحبزادہ صاحب کے طرزِ عمل اور کیرکٹر کا تھا مثلاً جب علیگڈھ کی نمائش میں ڈیوٹی کی طرف سے چار کی دوکان ہوتی تھی تو وہ اپنے ہاتھوں سے چار کے برتن دھوتے اور مثل معمولی نوکروں کے کام کرتے تھے صاحبزادہ صاحب بازار میں سے کوئی اچھی مٹھائی بکتی دیکھتے تو اپنے داموں سے خرید کر اسے دوکان کی نذر کر دیتے تھے۔ خود جب دوکان میں کھاتے تو دام دیتے چنانچہ یہی حال مولوی مظہرالحق صاحب اور دوسرے خدام کا تھا کہ جو بسکٹ اور کیک ٹوٹ کر بکنے کے کام کے نہ رہتے انھیں خود کھا کر دوکان میں اُن کی قیمت جمع کر دیتے تھے۔

صاحبزادہ صاحب خُدا کے فضل سے بڑے تندرست اور توانا تھے وہ سالانہ اسپورٹس میں گولہ پھینکنے میں ہمیشہ یقینی طور پر پہلا انعام پاتے تھے جب ڈیوٹی قائم ہوگئی تو اس کے انہماک میں انھوں نے کھیل میں شریک ہونا چھوڑ دیا تھا وہ فٹ بال کے کپتان بھی رہے

تھے مگر قومی خدمت کے جنون میں سب چیزوں کو لہو ولعب سمجھ کر ان سے دستکش ہو گئے
تھے۔ ڈیوٹی قائم ہونے کے بعد سالانہ اسپورٹس میں گولہ پھینکنے کا اُن کا ارادہ نہ تھا وہ چارکی
دوکان میں کھڑے تھے کہ گولہ پھینکنے کا وقت آگیا ان کو فوراً خیال ہوا اور کہا کہ کیا وجہ ہے کہ
میں جاکر گولہ نہ پھینکوں اور جو انعام ملے اُسے ڈیوٹی میں نہ دوں چنانچہ اسی وقت بھاگے ہوئے
گئے اور انعام حاصل کرلیا تقسیم انعام کے جلسہ میں جب اُن کو انعام دیا گیا تو اس وقت انھوں نے
ڈیوٹی کو دے دیا اس کے بعد اکثر طلبار نے اپنے انعام کا کُل یا جزو اسی طرح ڈیوٹی کو دیدیا۔"
یہ حالات بتاتے ہیں کہ انجمن الفرض کا اثر طلبار میں کس طرح سرایت کر رہا تھا اسی وجہ سے کالج
کے ارباب حل وعقد نے اس انجمن سے بڑی بڑی اُمیدیں لگا رکھی تھیں اس کا پتہ مسٹر بیک پرنسپل
کالج کی اس تقریر سے چلتا ہے جو انھوں نے ۱۴ اپریل ۱۸۹۱ء کو صاحبزادہ صاحب کے ولایت
جانے کے وقت رخصتی ڈنر کے موقع پر کی تھی۔ اس تقریر کا مفصل ذکر تو آیندہ آئے گا خلاصہ یہ
ہے کہ انھوں نے انجمن الفرض کا ذکر کرتے ہوئے اس تحریک کا بانی صاحبزادہ صاحب کو بتایا تھا
اور کہا تھا کہ اس معیار کا کہ جب کالج کے طلبار فارغ التحصیل ہوکر اپنے روپیہ سے کالج کی کچھ
خدمت کریں گے تو کالج کا مقصد پورا ہوگا یہ تحریک پیش خیمہ ہے۔ صاحبزادہ صاحب کے انہماک
اور قومی جوش نے ان کے ہمعصروں پر بھی غیر معمولی اثر ڈالا۔ یہی نہیں کہ اُن سب نے مل کر
انجمن الفرض کو کامیاب بنایا جو آج تک کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے بلکہ اُن کے دوستوں کو قومی
رنگ میں رنگ دیا جس کا پتہ سید طفیل احمد صاحب کی اس گفتگو سے چلتا ہے جو صاحبزادہ
صاحب کے حالات کی تحقیق کے سلسلہ میں سوانح نگار سے (سید معین الدین صاحب مرحوم) ہوئی
سوانح نگار نے سید صاحب موصوف سے دریافت کیا کہ آپ کی رات دن کی محنت پر ہمیں
حیرت ہے آخر آپ کے آرام کا بھی کوئی وقت ہے ہر وقت آپ کے ہاتھ میں قلم ہے ابھی
آپ کانفرنس کے دفتر میں ہیں تو ابھی آپ مسلم یونیورسٹی اسکول میں ہیں آج آپ لاہور
میں ہیں اور کل جھانسی کی بُندیل کھنڈ ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں ابھی آپ بنارس سے

واپس آرہے ہیں جہاں مہینوں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اہتمام و انتظام کیا کل آپ بریلی اسلامیہ ہائی اسکول کا کام کرنے چلے جارہے ہیں آخر یہ کیا چکر ہے کہ سانس لینے کی آپ کو فرصت نہیں آخر یہ کیوں اور کس لئے یوں جان پر کھیلنا کیا معنی رکھتا ہے۔

سید طفیل احمد صاحب نے اس کا ایسا جواب دیا کہ دل ہل گیا جواب یہ دیا کہ ہمیں کچھ نہیں معلوم کہ ہم کیا کر رہے ہیں ہمیں جس راستہ پر صاحبزادہ صاحب نے ڈال دیا ہے اسی پر بے سوچے سمجھے ہم چلے جارہے ہیں۔

سید طفیل احمد صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ بالکل اس شعر کے مصداق ہے ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

صاحبزادہ صاحب کی طالب علمی کا یہ کارنامہ جو انجمن الفرض کے قیام کی صورت میں نمودار ہوا بتارہا ہے کہ وہ خلوص اور انہماک کے ساتھ کام کرتے تھے اُن کا لگایا ہوا یہ پودا جس کا بیج ۱۸۹۰ء میں بویا گیا تھا آج بھی ایک تناور درخت کی شکل میں یونیورسٹی میں موجود ہے۔ اس نے ہزاروں روپیہ سے غریب طلبار کو وظائف دئے ہیں جس کی مجموعی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہے اس انجمن کے سرمایہ سے ایک دارالاقامہ موسوم بہ ڈیوٹی ہوسٹل صاحب باغ کے اندر تیار ہوگیا ہے اور یونیورسٹی کے ڈاکخانہ کی عمارت بھی اسی انجمن کی مملوکہ ہے اور ان عمارتوں کے کرایہ کی آمدنی سے غریب طلبار وظیفے پاتے ہیں صاحبزادہ صاحب نے اپنے اس عظیم الشان کارنامہ پر کبھی فخر نہیں کیا۔ صاحبزادہ صاحب نے کبھی اس انجمن کا عہدہ دار بننے کی خواہش نہیں کی ہمیشہ خادم ہی بنے رہے آج جبکہ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں اس انجمن کے بانیوں میں صاحبزادہ صاحب کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنا ناانصافی ہے اس قسم کی غلطی اس انجمن کے موجودہ کارکنوں سے اس ایڈریس میں ہوئی تھی جو ۳ دسمبر ۱۹۳۰ء کو خدام انجمن الفرض نے ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر بہاولپور کو پیش کیا تھا اس ایڈریس میں

دوسری غلطی انجمن مذکور کی بنیاد رکھے جانے کا سنہ لکھنے میں ہوئی تھی یعنی بجائے ۱۸۹۰ء کے ۱۸۹۲ء لکھا گیا تھا اور یہ وہ سنہ تھا جبکہ صاجزادہ صاحب ہندوستان میں موجود نہ تھے غنیمت ہے کہ توجہ دلانے پر یکم اپریل ۱۹۳۱ء کے مراسلہ میں راقمان ایڈریس نے ان غلطیوں کا اعتراف کیا اور یہ لکھا کہ "بیشک ایڈریس میں غلطی ہوگئی تھی"۔ انجمن الفرض کی تجویز کے بانی صرف صاجزادہ آفتاب احمد خاں صاحب ہی تھے اور یہ خیال ۲۶ راگست ۱۸۹۰ء کو انھیں کو پیدا ہوا تھا اور ایڈریس میں ۱۸۹۲ء غلط چھاپا گیا۔

اخلاقی تربیت کی اسکیم

۱۸۹۰ء کے آخر میں صاجزادہ صاحب نے جبکہ وہ کالج کے طالب علم تھے مسٹر بیک پرنسپل کو بورڈروں کی اخلاقی تربیت کے متعلق ایک بسیط اسکیم انگریزی میں لکھ کر دی تھی اُس سے یہ معلوم ہوگا کہ طالبعلمی کے زمانہ سے ان کو دوسرے بورڈروں کے اخلاق درست کرنے کی کس قدر فکر تھی اسکیم کے پیش کرنے سے قبل انھوں نے ایک لمبی چوڑی تمہید لکھی ہے جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ دماغی تعلیم کے ساتھ دل کی اصلاح نہایت ضروری ہے کیونکہ قلب کی اصلاح سے روح کی نشو ونما ہوتی ہے اسی نکتہ کو ملحوظ رکھ کر یہ اسکیم بنائی گئی تھی وہ لکھتے ہیں "جہاں تک میں سمجھتا ہوں صرف نگرانی یا خارجی قواعد کی پابندی سے کام نہ چلے گا اس لئے ہم کو بیرونی اصلاح کے ساتھ ساتھ اندرونی اصلاح یعنی دل کی اصلاح بھی کرنی چاہئے اب تک جو کچھ کیا گیا ہے وہ محض جسم کے قابو میں لانے کے لئے کیا گیا ہے لیکن دل جو نیکوکاری کا مرکز ہے اُس کی اصلاح کا کچھ انتظام نہیں ہوا کہا جائے گا کہ ایسا کہنا کانوں کو تو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے مگر اس پر عمل کرنا غیر ممکن ہے اور یہ خیال نظری ہے عملی نہیں لیکن میرا ایسا خیال نہیں۔ کوئی نیک مقصد ایسا نہیں جس کا حصول غیر ممکن ہو یہ تو ممکن ہے کہ ہمیں کامل طور پر وہ حاصل نہ ہو اس کا بڑا حصہ ہم کو ضرور حاصل ہوسکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ہم اپنی سعی میں مستقل اور مضبوط رہیں اسی سعی کے استقلال اور مضبوطی کی ہمیں دوسری باتوں کے مقابلہ میں زیادہ ضرورت ہے اب

قصہ ماضی تو چھوڑنا چاہئے میں چند باتیں پیش کرتا ہوں ان پر توجہ کی جائے۔

بورڈر تین درجوں میں تقسیم کئے جائیں۔

۱- چھوٹا یا پہلا درجہ

۲- متوسط یا دوسرا درجہ

۳- بڑا یا تیسرا درجہ

گیارھویں سال کی عمر تک کے لڑکے (بورڈر) تو پہلے درجہ میں رکھے جائیں۔
بارہ سے سترہ سال کی عمر تک کے (بورڈر) دوسرے درجہ میں رکھے جائیں۔
سترہ سال سے زائد عمر کے بورڈر تیسرے درجہ میں رکھے جائیں۔
میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تمام بورڈروں کی نگرانی کے لئے ایک مسلمان منیجر رکھا جائے لیکن منیجر ایسا ہو جو نہایت اعلیٰ اخلاق سے متصف ہو وہ پورا تعلیم یافتہ ہو اُس میں قومی ہمدردی ہو یعنی ہر طریقہ سے وہ نہایت اہل ہو۔ اُس کا فرض یہ ہو کہ عموماً تمام بورڈنگ کے طلبار کی اخلاقیات کا نگراں رہے مسجد کے انتظامات اس کے سپرد ہوں اور لڑکوں کو ہر قسم کی سزا دینے کا اختیار رکھتا ہو۔ صرف کالج سے خارج کرنا پرنسپل کی اجازت سے ہو پرنسپل یا پروفیسر ہر ماہ کے آخر میں اخلاق، پاکیزہ زندگی، نیکی اور چھوٹے لڑکوں کی نگرانی کے طریقوں پر عمدہ لیکچر دیا کریں۔ تاکہ بڑے لڑکے نگرانی کے قواعد اچھی طرح سمجھیں سب سے بہتر چال چلن والوں کو سالانہ انعامات دئے جائیں اعلیٰ اخلاق اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنے والے اشخاص سوانح عمریوں کو کورس کے علاوہ مطالعہ میں داخل کیا جائے چھوٹے بچوں کو ہر صبح قرآن مجید مع اُردو ترجمے کے پڑھایا جائے اس اسکیم میں اُستادوں اور مانیٹروں کے فرائض بھی لکھے گئے ہیں لیکن جس زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے وہ اسکیم بنائی گئی تھی وہ وقت گذر چکا ہے اس لئے ہم نے طوالت کے خوف سے تفصیلات کو نظر انداز کر دیا ہے۔"

صاحبزادہ صاحب کی وہ دماغ سوزی جو انھوں نے اس اسکیم کے مرتب کرنے میں کی

تھی رائگاں نہ گئی اور منتظمین کالج کو کم و بیش اس کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں جب وہ تعلیم کے لئے انگلستان جا چکے تھے اس پر عملدرآمد شروع ہوا جس کی اطلاع ان کو [illegible] میں مولوی بہادر علی صاحب مرحوم کے خط سے ملی۔

صاحبزادہ صاحب نے یہ اسکیم اس زمانہ میں لکھی تھی جبکہ وہ سکنڈ ایر کلاس کے ایک طالبعلم تھے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ منجملہ کئی سو طلبار کے صرف ان ہی کو اخلاقی تربیت کا خیال کیوں پیدا ہوا اور اس خیال میں ایسی قوت کیوں تھی کہ اس کی بنا پر ایک قابل عمل اسکیم مرتب کر کے منتظمین کالج کے سامنے پیش کر دی اس کی صرف یہی وجہ تھی کہ وہ طالبعلمی کے زمانہ سے پاکیزہ چال چلن اور اعلیٰ اخلاق کے حامل تھے اور آخر وقت تک ان کی یہی حالت رہی۔

فصل سوم

انگلستان میں تعلیم

کالج سے رخصت

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور اُن کے بھائی صاحبزادہ سلطان احمد خاں کے انگلستان جانے سے قبل کالج کے اور طلبار بھی ولایت جا چکے تھے۔ ابتدائی زمانہ میں جب طلبار ولایت جاتے تھے تو اُن کو کالج کی طرف سے ڈنر دیا جاتا تھا اور اُن کو بڑی بڑی اُمیدوں کے ساتھ رخصت کیا جاتا تھا۔ لیکن جب اُن کی واپسی پر اُمیدیں پوری نہ ہوئیں تو سرسید نے اُس رسم کو ترک کر دیا تھا کیونکہ گذشتہ تلخ تجربہ کی بنار پر اُنکی یہ رائے قائم ہوگئی تھی کہ جو طلبار ہندوستان سے چھوٹی عمر میں ولایت جاتے ہیں وہ انکی توقعات کے مطابق وہاں کی اچھی اور اعلیٰ تعلیم کے اوصاف سے متصف ہوکر واپس نہیں آتے لیکن جب ۱۸۹۱ء میں یہ دونوں بھائی جانے لگے تو اُن کو خصوصیت کے ساتھ ڈنر دیا گیا تھا اس متروک رسم کو پھر تازہ کرنے کی وجہ سوائے اس کے دوسری نہیں ہوسکتی کہ صاحبزادہ صاحب کے اخلاق اور اُن کی قابلیت کا سید صاحب اور مسٹر بیک پرنسپل کالج پر ایسا اثر تھا کہ اس کی وجہ سے اُن کی ذات میں اُن اُمیدوں کی جھلک جو وہاں کی اعلیٰ تعلیم سے وابستہ تھیں نظر آنے لگی چنانچہ ۱۴ اپریل ۱۸۹۱ء کی شام کو جو ماہ صیام کی ایک مبارک شام تھی کالج کے ڈائننگ ہال میں اس دعوت کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کیا گیا جس میں ٹرسٹیان کالج اسٹاف اور طلبار کے علاوہ مقامی حُکام ضلع بھی شریک تھے۔ مسٹر بیک پرنسپل نے اس جلسہ میں ایک تقریر کی جس کے چند الفاظ یہ ہیں "اگر کالج کے طلبار فارغ التحصیل ہوکر اپنے وقت اور روپیہ سے کالج کی کچھ خدمت کریں گے تو یہ خیال کیا جائے گا کہ کالج کا مقصد پورا ہوگیا ورنہ تعلیم بیکار گئی ابھی تک یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسی معیار سے کالج کامیاب ہے یا نہیں کیونکہ ترازو کا پلہ ابھی ڈگمگا رہا ہے اور اپنی حالت پر قائم نہیں ہے معلوم نہیں کہ آخری نتیجہ کیا ہو لیکن ڈیوٹی

سوسائٹی کی تحریک سے جس کے بانی آفتاب احمد خاں ہیں یہ اُمید ہوتی ہے کہ کالج کی تعلیم کامیاب ہوئی" طلبہ میں سے حبیب اللہ خاں نے آفتاب احمد خاں اور سلطان احمد خاں کا جام صحت تجویز کیا جس کی تائید قطب الدین اور شوکت علی (بعدہٗ مولانا) نے کی اسکے بعد سرسید احمد خاں نے آفتاب احمد خاں اور سلطان احمد خاں کی نیکی سعادتمندی قابلیت اور اخلاق وعادات کو بیان کرکے نصیحت آمیز کلمات کہے اور جلسہ کے ختم ہونے پر دونوں بھائیوں کے سروں پر ہاتھ پھیر کر بزرگانہ شفقت کے ساتھ رخصت کیا اس موقع پر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے جو تقریر انگریزی میں کی تھی اُس کا ترجمہ یہ ہے :-

"اس انتہائی مہربانی اور محبّت کے متعلق جس سے آپ نے ہمارا جام صحت نوش فرمایا ہے مجھے نہیں معلوم کہ میں آپ سب صاحبوں کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں ہم حقیقت میں اس عزّت کے بوجھ سے دب گئے ہیں جس کا ہم اپنے تئیں اہل نہیں پاتے آپ نے کالج کے سب سے زیادہ نااہل طالب علموں کو اس قدر ممتاز فرمایا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ فرمانروایان کالج کی بڑی شفقت اور فیاضی ہے۔ ان کی فراخ دلی اور بہبودی کے خاص خیال کا جو انھیں اپنی قوم کے لئے ہے یہ ایک ثبوت ہے۔ حضرات ہم کو اس بات پر بڑا فخر و ناز ہے جبکہ ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم نے اسی کالج سے تعلیم شروع کی اور اسی کالج سے ہم انگلستان کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے جا رہے ہیں اسی کالج میں ہم برسوں ایسی بزرگ ہستی کی نگرانی میں رہے ہیں جو آنے والی صدیوں تک یاد رہے گی یہاں ہم نے ایسی ہوا میں دم لیا ہے جو ایک عظیم الشان شخص کے روح پرور اثر کی خوشبو سے معطّر تھی یقیناً کسی دوسرے کالج میں ہم کو ایسا نفع نہ پہنچ سکتا تھا۔ ہندوستان کے کسی کالج کو سرسید جیسا بانی نہ ملا ہے نہ مل سکتا ہے واجب الاحترام سرسید کے سایہ میں ہمارا نشوونما پانا بڑی بیش قیمت بات ہے حضرات جس قدر پوری طرح سے ہم اس کالج کے طلبا، سرسید کے قومی خدمات کو سمجھتے ہیں اوران کی قدر کرتے ہیں اس کو کوئی دوسرا نہ سمجھ سکتا ہے نہ قدر کرسکتا ہے اور یہ ہمارا فرض

ہے کہ ان خدمات کی ہندوستان کے مسلمانوں سے قدر کرائیں اور سمجھوائیں۔

میرے لئے یہ کہنا بیکار ہے کہ ہم کو اس کالج سے کیسی دلی محبت ہے کیونکہ اس کا اظہار زبانی کافی نہیں ہے بلکہ وہ ہمارے آئندہ کے کام اور خدمات ہیں جو ہم سے اس قومی کالج کے لئے ظہور میں آئیں گی۔

"حضرات۔ اگر میرا یہ عزم صمیم نہ ہوتا کہ آئندہ میں اپنے تئیں اس کالج سے ہرگز ہرگز جُدا نہ کروں گا تو یہ کالج اس وقت چھوڑتے ہوئے مجھکو ناقابل برداشت صدمہ ہوتا لیکن خُدا کے فضل سے ہمارا یہی قصد ہے کہ کبھی کالج کو پیٹھ نہ دکھائیں گے اور کبھی کالج سے بغاوت نہ کریں گے۔ اب ہم انگلستان جاتے ہیں ہمیں معلوم نہیں کہ وہاں کی ہوا ہم پر کیا اثر کرے گی لیکن عجائبات کی اس سرزمین کو جانے سے ہمارا اصل مقصد یہی ہے کہ ہم اس بڑی انگریزی قوم کی ان مخصوص خصائل کا مطالعہ کریں جن پر اس کی عظمت کی بنیاد قائم ہے۔ فیشن ایبل انگلستان کو یقیناً ہم صرف عیش کرنے کو نہیں جارہے ہیں بلکہ اس لئے جارہے ہیں کہ وہاں سچّی تہذیب و شائستگی حب الوطنی عزم و ہمّت اور انسانیت کا گہرا مشاہدہ کریں۔ ہماری دلی تمنّا اور آرزو یہی ہوگی کہ ہم اپنے تئیں ہندوستان کے اس اسلامی کالج کا صحیح نمائندہ ثابت کریں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اپنے تئیں اس مقصد میں ہم کہاں تک کامیاب ہوں گے لیکن مقصد تو ہمارا یہی ہے اور خدا مدد فرمانے والا ہے اس مضمون پر سردست مجھکو کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے لیکن واپسی پر انشاءاللہ تعالیٰ مفصل عرض کروں گا۔

کالج کے میرے رفیق طلبار نے ہمارے متعلق جو محبت آمیز کلمات اس وقت اپنی تقریروں میں کہے ہیں ان کا میرے قلب پر بڑا اثر پڑا ہے ان احباب کے درمیان میں برسوں رہا ہوں اور کالج کی تمامی زندگی میں یہ مجھ پر مہربان رہے ہیں اور دوستی اور ہمدردی کے برابر ثبوت دئے ہیں اگر مجھ کو اپنی ناچیز ذات کے ساتھ انصاف کرنے کی اجازت دی جائے تو میں عرض کروں گا کہ میں نے بھی ان کی برادرانہ شفقت و محبت کا اپنے تئیں نااہل ثابت نہیں کیا

ہے میں اپنے بورڈنگ ہاؤس کے دوستوں کو تمام عمر نہ بھولوں گا اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جس قدر اچھی طرح میں اُن کو جانتا ہوں اُتنا اپنے خاندان کے لوگوں کو بھی نہیں جانتا۔ آخر میں اجازت چاہتا ہوں کہ نہایت ادب اور شکرگذاری کے ساتھ تمامی کالج کے بزرگوں کا شکریہ ادا کروں جنھوں نے ہماری عزت افزائی فرمائی ہے ایسی عزت افزائی ہم کبھی فراموش نہیں کرسکتے اور اسی کے ساتھ اپنے کالج کے احباب کا سپاس گزار ہوں جنھوں نے میرے متعلق ایسے محبت کے اعلیٰ الفاظ استعمال کئے ہیں آخر میں سب صاحبوں کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے جنھوں نے بڑے جوش محبت سے ہمارا جام صحت نوش فرمایا۔"

صاحبزادہ صاحب کی اس تقریر پڑھنے کے بعد قدرتی طور پر دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جو عہد انھوں نے سرسید اعظم علیہ الرحمۃ کی موجودگی میں کیا تھا آیا اسے پورا کیا یا نہیں اس کا جواب آئندہ صفحات میں ملے گا اور ناظرین کو معلوم ہوگا کہ انھوں نے اس زبانی اور تقریری عہد کو عمل میں لاکر دکھا دیا۔

گوالیار سے انگلستان کو روانگی

۶ رمئی ۱۸۹۱ء کو عزیزوں اور دوستوں سے رخصت ہوکر ہر دو برادران ۸ رمئی ۱۸۹۱ء کو گوالیار سے بمبئی پہنچے۔ والد ماجد بمبئی تک رخصت کرنے گئے۔ ۹ رمئی کو ساڑھے چھ بجے شام کے جہاز نے لنگر اٹھا دیا مسٹر بیک پرنسپل کالج اور اُن کی ہمشیرہ مس جیسی بیک صاحبہ مسٹر جسٹس بدرالدین طیب جی مسٹر کیڈل آئی، سی، ایس (صوبہ متحدہ) اور مسٹر ڈبلو۔ سی بانرجی جو کانگریس کے مشہور پریسیڈنٹ ہوئے تھے اُسی جہاز میں انگلستان جارہے تھے جہاز میں صاحبزادہ صاحب کا مشغلہ کتب بینی تھا۔ اُس کے سوا چہار طرف کی فضا کا جو بحری سفر میں نظر آتی تھی مشاہدہ کرتے تھے اور اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ روزنامچہ میں درج کرتے تھے جس کے وہ سن شعور سے عادی تھے اُن کے اس سفر کا روزنامچہ اُن تمام واقعات اور تاثرات سے بھرا ہوا ہے جوان پر اس سفر میں ہوئے یورپ کی نئی فضا نے جو تبدیلیاں اُن کے خیالات میں پیدا کیں اُنھیں صاحبزادہ صاحب

نے تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُن کا روزنامچہ بذات خود ایک جداگانہ سبق آموز کتاب ہے اور اس قابل ہے کہ اُس کی جداگانہ اشاعت کی جائے اس تالیف میں اُسکی تفصیلات کی گنجائش نہیں ہے مختصر یہ کہ مسٹر بیک اور ان کی ہمشیرہ برنڈزی سے بذریعہ ریل روانہ ہو کر صاحبزادہ صاحب سے پہلے لندن پہنچ گئے اور صاحبزادہ صاحب براہ جبرالٹر ۳۱ مئی ۱۸۹۱ء کو لندن پہنچے۔ مسٹر بیک اُن کے بھائی اور بہن اور مسٹر محمد رؤف اعظم گڈھی (علیگڈھ اولڈ بوائے) انھیں اسٹیشن پر لینے آئے اور مسٹر بیک اُنھیں اپنے مکان پر لے گئے۔ جہاں ان کا قیام کچھ عرصہ تک رہا

انگلستان میں تعلیم کا آغاز

صاحبزادہ صاحب ۸ جون ۱۸۹۱ء کو (InnerTemple) میں بیرسٹری کی تعلیم کے لئے داخل ہوئے اور اسی روز پہلے ڈنر میں شامل ہوئے چھ ڈنروں کی ٹرم پوری کر کے مسٹر بیک کے مشورہ سے کیمبرج دیکھنے کے لئے چلے گئے کیمبرج یونیورسٹی دیکھ کر یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ اسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کریں گے جب صاحبزادہ صاحب علیگڈھ کالج میں تعلیم پاتے تھے تب ہی سے اُن کا ارادہ تھا کہ وہ انگلستان میں تجارتی تعلیم حاصل کریں گے مگر اب وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس کام کے لئے کم از کم پانچ سال کسی کارخانہ میں کام سیکھنا پڑے گا اور تین سو پونڈ کی رقم پیشگی داخل کرنی ہوگی اس لئے موصوف نے باقاعدہ تجارتی تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ البتہ تجارتی معلومات برابر حاصل کرتے رہے

لندن میں ایک ماہ قیام کر کے صاحبزادہ صاحب ۴ جولائی ۱۸۹۱ء کو کیمبرج پہنچے اور وہاں رہ کر قانون کا مطالعہ کرتے رہے اور اس دوران میں اپنے والد ماجد کی منظوری حاصل کر کے ۷ استمبر ۱۸۹۱ء کو کیمبرج یونیورسٹی کے کرائسٹ (Christ) کالج میں داخل ہو گئے اور امتحان کے لئے تاریخ کا مضمون لیا۔ داخل ہونے کے تیرہ روز بعد ۳۰ ستمبر کو پریوس (Previous) کے امتحان داخلہ میں شریک ہوئے اور دوسرا امتحان ۲ اکتوبر کو دیا دونوں امتحانات میں پاس ہوئے پھر لکچروں میں باقاعدہ شرکت کرنے لگے۔

کیمبرج میں انڈین مجلس کے نام سے جو جماعت تقریر و مباحثہ کے لئے قائم تھی اس میں

صاحبزادہ صاحب ۱۸ اکتوبر کو شریک ہوئے اور آگے چل کر کچھ بعد دگیوسٹ اس جماعت کے سکریٹری وائس پریسیڈنٹ اور پریسیڈنٹ ہوئے اور اپنے زمانہ میں اس میں بہت سی اصلاحات کیں جو ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

صاحبزادہ صاحب ۶ نومبر ۱۸۹۱ء کو کیمبرج وانسٹیر کورس میں داخل ہوئے اسی زمانہ میں ہمشیرہ کی شادی ہوئی تھی جس میں دونوں بھائیوں نے شرکت کی۔ جب کرائسٹ کالج کا فاؤنڈیشن ڈے (کالج کے قیام کی سالگرہ کا دن) منایا گیا تو صاحبزادہ صاحب نے وہاں یہ تجویز کیا کہ علیگڈھ کالج کے پرانے طلبا، جو کیمبرج میں ہوں وہ اپنی درسگاہ (علیگڈھ) کے قیام کی سالگرہ کا دن منایا کریں چنانچہ ۸ جنوری ۱۸۹۲ء کو کیمبرج میں علیگڈھ فاؤنڈیشن ڈے بڑے اہتمام سے منعقد کیا گیا اور اس کے ساتھ ایک شاندار ڈنر دیا گیا۔

۲۶ مارچ ۱۸۹۲ء کو جب کیمبرج یونیورسٹی کی تعطیل ہوئی تو وہ سمندر کے کنارے بمقام سینٹ لیونارڈس (ST.Leonards) مقیم ہوئے اور وہاں وہ لاطینی (Latin) زبان سیکھتے تھے اور تفریح کے وقت سمندر میں تیرا کرتے تھے جس سے اُن کی صحت کو فائدہ ہوا۔ نومبر ۱۸۹۳ء میں انھوں نے بیرسٹری کا امتحان رومن لا (Roman Law) میں پاس کرلیا اور ۱۹ جون ۱۸۹۴ء کو کیمبرج یونیورسٹی سے تاریخ میں ڈگری پائی۔

۲۳ جولائی ۱۸۹۴ء کو معہ اپنے بھائی کے انگلستان سے رخصت ہوکر ہندوستان واپس آئے۔ باقاعدہ یونیورسٹی اور بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے اور امتحانات پاس کرنے کے علاوہ انھوں نے ولایت میں رہ کر وہاں کی سیاسی، معاشرتی اور تجارتی زندگی کا بغور مطالعہ کیا اُن کے روزنامچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان سے وہ ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے گئے تھے لیکن انگلستان کی نئی دنیا میں اُنھیں ایک وسیع میدان نظر آنے لگا وہاں رہ کر اُن سے جہاں تک ممکن ہوا معلومات بہم پہنچائیں جن سے اُن کی نظر میں وسعت ہوئی ولایت میں ان کی سعی محض بیرسٹری یا کیمبرج کی ڈگری تک محدود نہ رہی بلکہ وہ پارلیمنٹ میں جاکر مباحثہ اور تقریریں بھی سنا کرتے تھے اور بعض

وقت نو۔نو گھنٹے اُس میں صرف کر دیتے تھے۔ وہ گرجا میں جاتے طرزِ عبادت دیکھتے اور مسیحی پادری کا وعظ سُنتے۔ مسیحیت اور اسلام کی اخلاقی خوبیوں کا موازنہ کرتے اور یہ نتیجہ نکالتے کہ دین اسلام فطرت کے مطابق ہے۔ انھوں نے والنٹیر کور میں رہ کر پوری فوجی قواعد سیکھی اور ایلڈر شاٹ کی فوجی تربیت گاہ میں ہفتہ ہفتہ بھر ٹھہر کر سپاہیانہ زندگی بسر کی۔ وہ مشاہیر انگلستان سے برابر ملتے رہے نیشنل لبرل کلب (National Liberal Club) جس کے پریسیڈنٹ مسٹر گلیڈ اسٹون (Glad Stone) وزیر اعظم تھے اس کے وہ ممبر تھے وہ بچوں کے پرورش خانوں میں جاتے اور طریقہ پرورش پر غور کرتے انھوں نے دار المعذورین بغور دیکھا وہ انگریزی شادیوں میں شریک ہو کر اُن کے رسوم دیکھتے اور ہندوستان کی شادیوں کی رسوم سے مقابلہ کر کے اپنے ملک میں اصلاح رسوم کے منصوبے قائم کرتے تھے وہ عدالتوں میں جاکر مقدمات کی کارروائیاں دیکھتے اور وکیلوں کی بحث غور سے سُنتے تھے۔ لنچوں اور ڈنروں میں دوسروں کے یہاں شریک ہوتے اور انھیں خود اپنے یہاں لنچ اور ڈنر پر مدعو کرتے اور تبادلۂ خیالات کرتے انگلستان کے قیام میں وہ کثرت سے مختلف مضامین پر کتابیں مطالعہ کرتے مشہور تاریخی عمارات و مقامات کی سیر کے لئے بھی وقت نکالتے۔ تھیٹر، سرکس اور عجائب خانے تحقیقات کی غرض سے دیکھتے سیاسیات کے متعلق معلومات حاصل کرنے سے بھی غافل نہیں رہے۔ ولایت کے قیام کے دوران میں سیاسیات اور تعلیمی معلومات حاصل کرنے کے لئے جو جو مواقع انھوں نے حاصل کئے ان کا تذکرہ اپنے اپنے موقع پر اس کتاب کے دوسرے ابواب میں کیا گیا ہے ہم اس باب کو اس اظہار خیال پر ختم کرتے ہیں کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں انگلستان سے معلومات کا خزانہ لے کر واپس ہوئے وہ صحیح معنوں میں طالب علم تھے۔ یورپ کی تعلیم حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے وہاں مفید اور کارآمد چیزوں کے ساتھ قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کے سامان اور زندگی برباد کرنے والی خندقیں بھی موجود ہیں اس لئے ہندوستانی نوجوانوں کو جو مغربی ممالک کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے جائیں۔ صاحبزادہ صاحب کا طریق عمل نمونہ کے طور پر اپنے سامنے رکھنا چاہئے۔

باب سوم

بیرسٹری

علیگڈھ کو وطن بنانا

انگلستان سے واپس ہونے پر صاحبزادہ صاحب ۲ نومبر ۱۸۹۴ء کو علیگڈھ آئے بیرسٹری کا کام شروع کیا اور علیگڈھ کو اپنا وطن بنالیا اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ انھوں نے اس فطری خواہش کے سبب جو وہ مسلمانوں کی قومی ترقی کی نسبت رکھتے تھے علیگڈھ کالج کو اپنا نصب العین قرار دے لیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ سرسید احمد خاں کی دوررس نگاہوں نے آفتاب احمد خاں کو اُن کے بچپن کے زمانہ سے تاک لیا تھا اور انھوں نے صاف الفاظ میں اپنی اس خواہش کا اظہار کردیا تھا کہ صاحبزادہ صاحب کو علیگڈھ میں مستقل قیام کرنا چاہئے جب انھوں نے بیرسٹری کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے سول لائنس کے ایک بنگلے میں رہے اُس کے بعد شہر میں منتقل ہوگئے شہر میں مکان لینے کے اسباب اُن کے روزنامچہ میں یہ لکھے ہیں۔

میرا موجودہ مکان ہر طریقہ سے بڑا ہے وہ شہر کے باہر ہے یہاں موکل نہیں آتے پس اشد ضرورت ہے کہ میں شہر کے اندر ایک اچھا مکان لوں اس سے چند فوائد مدِ نظر ہیں وہاں موکل آسانی سے پہنچیں گے شہر کے مسلمان اور ہندوؤں سے ملنے جُلنے کے مواقع ملیں گے اور لوگ مجھ سے واقف ہوں گے اس کے سوا سب سے بڑا یہ کام ہوسکے گا کہ شہری جو غافل ہیں گویا سو رہے ہیں اُن کو بیدار کرکے تازہ روح اور ہمت پھونک سکوں گا۔ برطانیہ کے راج میں امن ہے طرح طرح کی ترقیوں کی شاہراہیں کُھلی ہوئی ہیں صرف ہماری ذراسی کوشش اور ہاتھ ہلانے کی کمی ہے بالائے قلعہ کو جانے والی سڑک پر ایک عمدہ مکان ہے پہلے وہ ظفریاب خاں (وکیل) سے متعلق تھا یہی مکان مناسب ہے خفیف درستی اور قلعی وغیرہ ہوجائیگی۔

آفتاب منزل کی تعمیر

ظفر آباد والے مکان میں کچھ عرصہ تک رہنے کے بعد وہ اس کوٹھی میں آ گئے جو تھا اور یہاں سے مغرب میں نمائش والی سڑک پر واقع ہے اور اپنے اہل خاندان کو بھی بلوالیا۔ اسے یہاں اپنی کوٹھی میں ان کے والد ماجد نواب مرحوم احمد خاں صاحب کا انتقال ہوا جن کو شاہ جمال میں دفن کیا گیا اور ان کا خوبصورت مقبرہ بنوا کر اس سے ملحق ایک نہایت حسین مسجد تعمیر کرائی اور اس جگہ اپنے خاندانی قبرستان کو محدود کیا۔

چونکہ صاحبزادہ صاحب کو کالج کے کاموں میں زیادہ مشغولیت کی وجہ سے ضرورت لاحق ہوئی کہ کالج سے قریب تر رہیں اس لئے انھوں نے ایک وسیع قطعہ اراضی صاحب باغ سے جانب غرب خرید کر کے اس میں اپنی کوٹھی بنوانا شروع کی اور اس کا نام آفتاب منزل رکھا اس مکان میں وہ ۳ اپریل ۱۹۰۲ء کو آگئے یہ پہلا مکان علیگڈھ میں ہے جو کالج کے اولڈ بوائے نے تعمیر کرایا۔

اولُ بیتٍ وُضِعَ فی علی گڈھ من احد ابناء الجامعہ

صاحبزادہ صاحب کا یہ عقیدہ تھا کہ کالج کی خدمت کے سب سے زیادہ اہل اولڈ بوائز ہی ہیں اس مقصد کے پیش نظر وہ اپنے دوستوں کو ترغیب دیتے رہتے تھے کہ علی گڈھ میں مستقل قیام کریں اپنے روزنامچہ میں اس اسکیم کو انھوں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ اور وہ اس مجوزہ نوآبادی کو "کالج آباد" کے نام سے موسوم کرنا چاہتے تھے انکو اپنی کوشش میں بڑی کامیابی ہوئی چنانچہ ان ہی کی ترغیب وتحریص سے ۱۹۰۹ء میں محمد حبیب اللہ خاں و سرفراز خاں مرحوم نے کالج کے متصل اراضیات خرید کر کے اپنے مکانات ولایت منزل و سرفراز ہاؤس کی تعمیر کا انتظام کیا اور یہ سلسلہ روز افزوں ترقی کرتا گیا اور جب میرس روڈ کی نوآبادی قائم ہوئی تو خان بہادر شیخ عبداللہ صاحب اور خان بہادر سید زین الدین صاحب مرحوم و دیگر متعدد اولڈ بائز نے کوٹھیاں تعمیر کرائیں حتیٰ کہ یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب مرحوم نے بھی ایک وسیع احاطہ میں ضیاء منزل کے نام سے اپنی رہائش اور کرایہ کے لئے مکانات بنوائے اور اب تو خدا کے فضل سے باہر سے بہت سے معزز مسلمان اور اولڈ بوائز علیگڈھ میں آکر مستقلاً سکونت اختیار کر چکے ہیں اور میرس روڈ، دودھ پور، بیگ پور، جمال پور، بھمولا کے وسیع رقبہ جات مکانات اور کوٹھیوں سے ڈھک

آفتاب منزل (سنہ ۱۹۰۴ء)
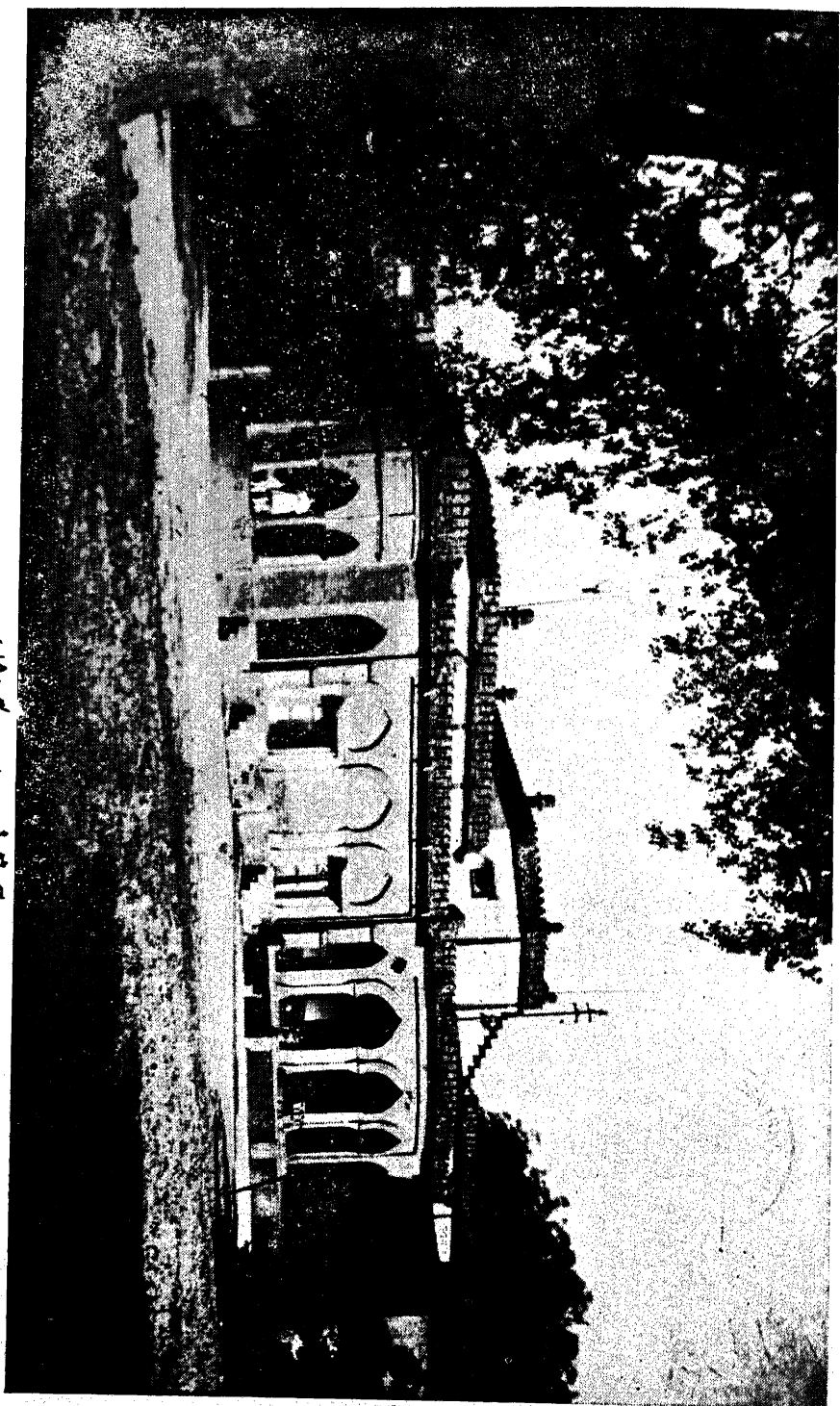
گئے ہیں اور یہ صاحبزادہ صاحب کے خواب کی سچی تعبیر ہے۔

انجمن محمدی علیگڑھ یکم جنوری ۱۸۹۵ء کو صاحبزادہ صاحب ظفریاب خاں والے مکان میں اُٹھ گئے شہر میں پہنچ کر انجمن محمدی کی بُنیاد ۲۸ اپریل ۱۸۹۵ء کو ڈالی اور اس کے تحت میں ایک مدرسہ قائم کیا صاحبزادہ صاحب اس کے مصارف کے پورا کرنے کے لئے مختلف تدبیریں کرتے رہتے تھے ایک تدبیر یہ کی تھی کہ چند' تزنہ ہمدردان اسکول کے ہمراہ علیگڈھ کے بازار کا گشت لگایا اور ہر ایک مسلمان دوکاندار سے ایک ایک پیسہ چندہ وصول کیا عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا اور ہر دوکاندار خوشی سے ایک ایک پیسہ دے دیتا تھا۔ یہ مدرسہ مختلف اوقات میں متضاد حالات اور تغیرات سے مقابلہ کرتا رہا بالآخر چند سال سے اب مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول کا باقاعدہ برانچ اسکول ہوگیا ہے شہر میں ایک سوشل کلب بھی تھا فوراً صاحبزادہ صاحب اُس کلب کے ممبر ہوگئے اس کلب میں ہندو مسلم دونوں شامل تھے صاحبزادہ صاحب کی شرکت سے اس کلب میں تازہ روح پیدا ہوگئی۔

بیرسٹری کی ابتدا وکالت کے پیشہ میں صاحبزادہ صاحب کا وہی حال تھا جو ابتدا میں کسی نئے وکیل اور بیرسٹر کا ہوتا ہے جابجا اپنے روزنامچہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ مجھے قانون ابھی نہیں آتا ہے یہ بڑی خامی ہے وکالت کے لئے دوسری ضروری صفات کے ساتھ قانون دانی کی اشد ضرورت ہے میں ہمت نہ ہاروں گا۔ قانون جاننے کی سخت کوشش کروں گا بحث میں کر سکتا ہوں لیکن قانون دانی کی خامی میں اچھی طرح محسوس کر رہا ہوں مجھے جلدی کرنی چاہئے اتنا تو ہو جائے کہ میں اپنے مصارف کے بقدر پیدا کرسکوں آخر والد ماجد میرا بار کب تک برداشت کریں گے وہ مجھ پر بے حد صرف کر چکے ہیں اب مجھے شرم آتی ہے۔

صاحبزادہ صاحب کی ہمت بڑی تھی استقلال کافی تھا بڑے سمجھدار تھے انھوں نے نہایت محنت سے کام شروع کیا یکوں اور بیل گاڑیوں تک میں مقدمات میں پیروی کیلئے

نہایت خوشی سے بیرونجات اور حکام کے دوروں کے مقامات پر جاتے تھے اور ابتدا ہی سے انھوں نے اپنے آپ کو فوجداری کے کام کے لئے مخصوص کرلیا تھا۔

بیرسٹری کا عروج کام کے بڑھنے کے ساتھ رفتہ رفتہ آمدنی میں ترقی ہونے لگی علیگڈھ کی ججی سے بلند شہر اور ایٹہ کا بھی تعلق ہوگیا اور ان اضلاع کا کام بھی صاحبزادہ صاحب کو ملنے لگا اور جتنا زمانہ بڑھتا گیا اُن کی شہرت زیادہ ہوتی گئی چند ہی سال بعد ان کا کام ججی علیگڈھ تک محدود نہ رہا بلکہ وہ صوبے کے دیگر اضلاع میں بھی بلائے جانے لگے اور صوبہ سے باہر بھی اُن کی شہرت پہنچ گئی۔ ۱۹۰۵ء میں ایک بڑے مشہور مقدمہ کی پیروی کے لئے حیدرآباد دکن بلائے گئے جس کا واقعہ یہ ہے:۔

۶ مئی ۱۹۰۵ء کو صاحبزادہ صاحب کے نام مہاراجہ صاحب گوالیار کے پرائیویٹ سکریٹری کا ضروری تار آیا کہ فوراً گوالیار آئیے صاحبزادہ صاحب فوراً گوالیار گئے اور پھول باغ کے اندر جے بلاس محل میں ٹھہرائے گئے دوسری صبح کو مہاراجہ صاحب سے ملاقات ہوئی صاحبزادہ صاحب کو یہ معلوم ہوکر سخت حیرت ہوئی کہ مہاراجہ صاحب نے انھیں حیدرآباد بھیجنے کو بلایا تھا تاکہ وہ قادر شاہ عرف سری صاحب کے مقدمہ میں جو حیدرآباد میں زیر تجویز تھا جاکر پیروی کریں۔ یہ قادر شاہ دربار گوالیار کے پیرو مرشد تھے حیدرآباد میں بھی شاہ صاحب کی جاگیر تھی اور اسی کے متعلق وہاں مقدمہ تھا۔ دو دن میں تمامی کاغذات متعلقہ مطالعہ کرکے انھوں نے خلاصہ تیار کرلیا اور مہاراجہ صاحب سے خواہش ظاہر کی کہ مقدمہ میں کوئی حیدرآباد ہی کا وکیل مقرر کردیا جائے جس کو مراسلت کے ذریعہ سے صاحبزادہ صاحب نے مدد دینے کی ذمہ داری لینی چاہی مگر مہاراجہ صاحب نے نہ مانا اور آپ ہی کو حیدرآباد بھیجا۔ حیدرآباد پہنچ کر اسی سلسلہ میں آپ نواب افسرالملک بہادر و دیگر اعلیٰ حکام ریاست سے ملے جنھوں نے آپ کی بہت آؤ بھگت کی۔ صاحبزادہ صاحب نے اس مقدمہ کی ایسی خوش اسلوبی سے پیروی کی کہ ایک ہفتہ کے اندر فوجداری کا مقدمہ حسب دلخواہ طے ہوگیا تب آپ نے مہاراجہ صاحب سے واپسی

علیگڈھ کی اجازت چاہی لیکن مہاراجہ صاحب نے بذریعہ تار آپ کو جواب دیا کہ جب تک قبضہ کا سوال دوسری عدالت میں طے نہ ہوجائے آپ وہیں موجود رہیں چنانچہ آپ اس کے لئے آخر جولائی تک وہاں قیام کرنا پڑا۔ اس طرح آپ کا قیام حیدرآباد میں تین ماہ کے قریب رہا اس کے دوران میں آپ کو وہاں بڑی بڑی فیسوں کے مقدمات ملتے رہے اور اس پیشہ میں آپ کی بڑی شہرت ہوگئی۔

اس زمانہ قیام میں مدارالمہام اور نواب ظفر جنگ بہادر معتمد افواج اور دیگر معززارکین ریاست نے آپ کے ساتھ نہایت عزت واحترام کا برتاؤ کیا۔ نواب خورشید جاہ کے نواب زادہ نے صاحبزادہ صاحب کو نہایت شاندار اور اعلیٰ پیمانہ پر ڈنر دیا جس میں شہر کے قریب معزز یورپین اور ہندوستانی مہمان تھے جلسوں میں صاجزادہ صاحب نے علیگڈھ کالج کے متعلق حیدرآباد، ورنگل اور سکندرآباد میں نہایت معرکتہ الآرا تقریریں کیں۔ اب حیدرآباد میں صاجزادہ صاحب کی دھوم مچ گئی اور اصرار کیا جانے لگا کہ وہ علیگڈھ کا قیام ترک کر کے حیدرآباد میں مستقل سکونت اختیار کریں اور وہیں بیرسٹری کریں حتیٰ کہ خود نواب محسن الملک بہادر نے بھی اُن کو علیگڈھ سے خطوط لکھے کہ حیدرآباد کا میدان ان کی ہر طرح کی ترقی کیلئے نہایت وسیع اور مناسب ہوگا اس میں شک نہیں کہ حیدرآباد کا میدان ان کی شہرت اور ترقی اور حصول دولت کے اعتبار سے نہایت وسیع تھا لیکن انھیں بچپن سے علیگڈھ رہ کر قومی خدمت کرنے کی لو لگی تھی اور وہ کسی قیمت یا لالچ پر علیگڈھ چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے۔

پیشہ وکالت میں ہمدردی

صاجزادہ صاحب نے اکثر موقعوں پر محض ہمدردی سے بھی غریبوں کے مقدمات میں پیروی کی۔ ایک دفعہ اپنے دفتر کے دفتری کو اڈیشنل جج علیگڈھ نے اس الزام میں فوجداری سپرد کر دیا کہ وہ ہولی کی تعطیل میں کچھ بادامی کاغذ دفتر سے اپنے گھر لے گیا تھا صاجزادہ صاحب نے بدوں کسی فیس کے غریب دفتری کی طرف سے ایسی پیروی کی کہ اس پر فرد جرم بھی نہ لگی اور وہ بری کر دیا گیا اور اس طرح ایک غریب شخص کا خاندان تباہی سے بچ گیا اسی طرح کے اور متعدد واقعات ہیں جن کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔

حکام کو اُن کے فرائض کی طرف متوجہ کرنے کی ایک مثال

ایک مرتبہ سوروں ضلع ایٹہ میں دسہرہ کے موقع پر ایک پولیس کے سب انسپکٹر نے نہایت زیادتی کی۔ برہمنوں نے لاٹ صاحب کو تار دیا ایٹہ کا ڈسٹرکٹ

مجسٹریٹ خود تحقیقات کو سُوروں پہنچا وہ غصّہ سے جامہ سے باہر تھا پولیس کا طرفدار بن کر وہ برہمنوں کو سزا دینا چاہتا تھا برہمن علیگڈھ سے صاحبزادہ صاحب کو پیروی کے لئے لے گئے تحقیقات شروع ہوئی مجسٹریٹ نے ان کی موجودگی پر اعتراض کیا لیکن انھوں نے قانون سے وہ اعتراض رُد کر دیا اور یہ دیکھ کر کہ مجسٹریٹ ضلع سب انسپکٹر کا ایسا طرفدار ہے کہ انصاف اور قانون کی پرواہ نہیں کرتا اور برہمنوں کو پھانسنا چاہتا ہے انھوں نے مجسٹریٹ ضلع کو سمجھایا اُسے اس کے فرائض اور انصاف کی طرف متوجہ کیا مجسٹریٹ ضلع کہتا تھا میرا تو یہ فرض ہے کہ اپنے ماتحتوں کی طرفداری کروں اور اُن کو زد سے بچاؤں وہ اُسے سمجھاتے تھے کہ ایک حد تک یہ خیال مانا جاسکتا ہے لیکن جب کہ رعایا پر ظلم ہوتا ہو تو یہ بات ہرگز پسندیدہ نہیں۔ مجسٹریٹ کہتا تھا کہ یہ سب انسپکٹر میرا بہترین آدمی ہے سُوروں کے برہمن نہایت سرکش اور گستاخ ہیں مجسٹریٹ نے دوران گفتگو میں سب انسپکٹر کو ایسا بہترین آدمی بتانے کے ساتھ یہ بھی اقرار کیا کہ ایسے سب انسپکٹر بدمعاش ہوتے ہیں اور انھیں بدمعاشوں سے پولیس کے بہترین افسر بنتے ہیں۔ روزنامچہ میں یہ واقعہ لکھ کر صاحبزادہ صاحب افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں "یہ ضلع کے اکثر حکام اِن اصولوں پر یقین رکھتے ہیں اور انھیں پر عمل کرتے ہیں"۔

علیگڈھ میونسپل بورڈ کی ممبری

کالج کی بہبودی کے خیال سے صاحبزادہ صاحب نے ۱۹۰۰ء میں علیگڈھ میونسپل بورڈ کی ممبری قبول کی اور اس کام میں حسب ذیل مقاصد اُن کے پیش نظر تھے۔ اُس زمانہ میں کالج کی طرف سے ایک ممبر میونسپل بورڈ میں نامزد ہوا کرتا چنانچہ مسٹر بیک پرنسپل کالج خود عرصہ دراز تک ممبر رہے تھے

۱۔ میونسپل بورڈ کے کام کا عملی تجربہ حاصل کرنا۔

۲۔ ایسی کوشش کرنا کہ میونسپل بورڈ کے دوسرے ممبر کالج کے معاملات میں دلچسپی لینے لگیں۔

۳۔ ایسے مساکین اور بے خانماؤں کا کچھ انتظام کرنا جو جاڑے کی راتیں بے پناہ سڑکوں پر گذارتے ہیں

۴۔ میونسپلٹی کو ایسے راستہ پر لانا کہ بورڈ واقعی مفید طریقوں پر کام کر سکے۔

باب چہارم

علیگڈھ کالج کی خدمات

کالج سے طبیعت کا لگاؤ

علیگڈھ کالج کی خدمات کا سلسلہ زمانہ طالب علمی ہی سے شروع ہوگیا تھا جس کا اندازہ ناظرین نے اس سے پہلے صفحات کے مطالعہ سے کیا ہوگا اب جب کہ بیرسٹری کے سلسلہ میں انھوں نے علیگڈھ میں قیام کیا تو وہ کالج کے کاموں میں منہمک ہوگئے۔ جنوری ۱۸۹۶ء میں وہ کالج کے ٹرسٹی مقرر ہوئے ۱۸۹۶ء کا وہ زمانہ تھا جبکہ علیگڈھ کالج کا ٹرسٹی ہونا باعث فخر سمجھا جاتا تھا اور لوگ ٹرسٹی ہونے کی خواہش کرتے تھے لیکن صاحبزادہ صاحب نے اپنے اس تقرر کو کسی منصب اور اعزاز کا مرادف نہیں سمجھا جیساکہ الفاظ ذیل سے جن کو ہم ان کے روزنامچہ سے نقل کرتے ہیں ظاہر ہوتا ہے "سر سید کی محض خواہش کی تعمیل ہے ورنہ ٹرسٹی بننے کی مجھے ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں کالج کی جو خدمت میں کرسکتا ہوں وہ ٹرسٹی ہوئے بغیر بھی یقیناً کرسکتا ہوں اور یہ امر واقعی ہے کہ میں بجائے ٹرسٹی کے کالج کا طالب علم کہلایا جانا زیادہ پسند کرتا ہوں مگر خیر۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اس ٹرسٹی ہونے کا مطلب و مفہوم کیا ہے۔"

قانون کی پروفیسری پر تقرر

۸ رجنوری ۱۸۹۷ء کو صاحبزادہ صاحب علیگڈھ کالج میں قانون کے پروفیسر مقرر ہوئے تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہوئی لیکن اس تین سو روپیہ ماہوار کو صاحبزادہ صاحب نے اپنے ذاتی صرف میں لانے کی جگہ حسب ذیل تین مدات میں تقسیم کردیا۔

ا۔ سو روپیہ ماہوار کالج کو دیا جائے تاکہ غبن سے جو نقصان کالج کو ہوا ہے اس کی کچھ تلافی ہو۔

۲۔ پچاس روپیہ ماہوار سے کالج کے طلباء کو وظیفہ دیا جائے اور وظیفہ کا نام نواب غلام احمد خان اسکالرشپ ہو۔

۳۔ بقیہ ایک سو پچاس روپیہ ماہوار سے قانون کی کتابیں کالج کے طلباء کو قانونی لکچر دینے کے لئے خریدنا تجویز کیں۔

صاحبزادہ صاحب اپنے شاگردوں کو صرف لکچر سُنا کر قانون کے امتحان کے لئے تیار ہی نہیں کرتے تھے بلکہ انھیں مقدمات تیار کرنے اور عملی طور پر عدالت میں جاکر پیش کرنے کے طریقے بھی بتاتے تھے جس کا اعتراف آج بھی وہ کامیاب وکیل جن کو ان کی شاگردی کا فخر حاصل ہے کرتے ہیں۔ سر سید رضا علی صاحب (علیگ) نے بھی اس بات کا ذکر اپنے دوستوں سے کیا ہے۔

صاحبزادہ صاحب نے اپنے عہد پروفیسری میں مجلس قانون مارچ ۱۸۹۰ء میں قائم کی تھی جس کا افتتاحی جلسہ اسٹریچی ہال میں منعقد ہوا تھا۔ مسٹر (سر) تھیوڈور ماریسن پرنسپل کالج اس جلسہ میں شریک تھے اس وقت صاحبزادہ صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ طلباء میں قانون کے مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کے لئے اس سوسائٹی کے قیام کی کس حد تک ضرورت تھی چنانچہ یہ سوسائٹی اب بھی یونیورسٹی میں قائم ہے اور ان کے عہد کی ایک قیمتی یادگار ہے۔

بورڈ آف مینجمنٹ

صاحبزادہ صاحب کو سر سید نے بورڈ آف مینجمنٹ کالج کا ممبر مقرر کیا تھا۔ چنانچہ ۲۲ جنوری ۱۸۹۷ء کو (Board of management) کا جو جلسہ ہوا اس میں صاحبزادہ صاحب شریک تھے مسٹر بیک نے کئی رزولیوشن اس جلسہ میں پیش کئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ بورڈنگ ہاؤس بینکرس (Board-ing hous Bankerse) کے ساتھ ایک فنڈ قائم کیا جائے اس کا نام "امانت" ہو اور فنڈ مذکور میں ذیل کی مدات کا روپیہ شامل کردیا جائے۔

۱۔ یونین کلب فنڈ۔

۲۔ ڈیوٹی اسکالرشپ۔

۳۔ تلہر اسکول فنڈ۔

۴۔ تعلیمی مردم شماری فنڈ۔

۵۔ محمڈن اینگلو اورنیٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن فنڈ۔

صاحبزادہ صاحب اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں "میں نے صاف دیکھ لیا کہ اس کا کیا مطلب تھا ایسے رزولیوشن پاس کر دینے کے یہ معنی ہیں کہ تمامی متذکرہ بالا فنڈوں کا روپیہ گویا کالج اسٹیبلشمنٹ کا ایک جزو ہو جائے چنانچہ میں نے اس رزولیوشن کی فوراً مخالفت کی جس پر شدت سے مباحثہ ہوا۔ بالآخر یہ نتیجہ نکلا کہ یہ سوال کسی آئندہ جلسہ کے لئے ملتوی ہو گیا۔ میں ہرگز کسی ایسی تجویز سے اتفاق نہ کروں گا جس کا یہ منشا ہو کہ محمڈن اینگلو اورنیٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن جیسی چیزیں کالج کا ایک جزو بن جائیں۔ ایسی سیاسی تحریکات میں سرسید اور مسٹر بیک اپنے تئیں شامل کیا کریں لیکن میں ایسی کسی تجویز کی موافقت میں اپنا ووٹ کبھی نہ دوں گا جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ کالج کو انڈین نیشنل کانگریس کے مقابلہ میں ایک قسم کی مخالفانہ تحریک بنا دیں۔

صاحبزادہ صاحب کی دوراندیشی اور مخالفت صحیح تھی کیونکہ اس رزولیوشن کے پاس ہو جانے پر تمامی فنڈوں کا روپیہ خلط ملط ہو کر رہ جاتا اور وہ کالج اسٹیبلشمینٹ کا جزو یقین کیا جاتا اور کالج کے مصارف میں بلا امتیاز لایا جاتا۔ اس طرح مختلف متذکرہ بالا فنڈ گویا بے معنی یا فنا ہو جاتے اس کے سوا سیاسی نقطہ نظر کی باریکی بھی قابل داد ہے یعنی محمڈن اینگلو اورنیٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن ایک سیاسی چیز تھی جب وہ کالج اسٹیبلشمینٹ کے ساتھ مدغم ہو جاتی تو اس کے یہی معنی تھے کہ کالج انڈین نیشنل کانگریس سے مقابلہ میں مخالفت کی ایک تحریک کا ایک کھلا ہوا مرکز ہے۔

صاحبزادہ صاحب کے زیر نظر دو پہلو تھے اوّل یہ کہ کالج ملکی سیاسیات سے علیحدہ رہے اور وہ کانگریس کا مخالف شمار نہ ہو اور دوسرے یہ کہ ان کے نزدیک کانگریس ملکی آزادی کے حاصل کرنے اور حقوق طلب کرنے کی ایک اہم جماعت تھی اور وہ اُس کی مخالفت کو پسند نہ کرتے تھے۔

کالج میں انگلش ہاؤس کا قیام ۱۸۹۷ء میں کالج میں انگلش ہاؤس قائم کرنے کی

ایک تجویز صاحب زادہ صاحب نے پیش کی جس کا مطلب یہ تھا کہ جو صاحب اپنے بچوں کو خاص طریقہ کی انگریزی تعلیم و تربیت دلانا چاہیں وہ پانچ سو روپیہ بطور قرضہ تعمیر مکان کیلئے دے دیں۔ صرف سرسید نواب محسن الملک اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے رقم مذکور دینے پر رضامندی ظاہر کی تھی اور زیادہ اصحاب اُس کے لئے آمادہ نہ ہوئے تھے اس لئے سرسید کی زندگی میں یہ تجویز معرض التوا میں پڑ گئی۔ سرسید کے بعد انگلش ہاؤس قائم ہوا اور آخرکار صاحبزادہ صاحب کی تجویز نے عملی جامہ پہنا۔

سرسید کی وفات کے بعد کالج کی خطرناک حالت

ابھی کالج کی وہ خطرناک حالت جو ایک کثیر رقم کے غبن کی وجہ سے ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوگئی تھی۔ درست نہ ہوئی تھی کہ ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید کالج کو اسی حالت میں چھوڑ کر دُنیا سے رحلت فرما گئے۔ جس روز سرسید کا انتقال ہوا صاحبزادہ صاحب ایٹہ میں تھے سوم کے روز وہ علیگڈھ واپس آئے انھیں معلوم ہوا کہ سید محمود صاحب اور مسٹر بیک پرنسپل تو ایک طرف رہیں اور نواب محسن الملک بہادر کا جو علیگڈھ میں موجود تھے رحجان مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کے ہم خیال لوگوں کی طرف ہے اسی وجہ سے صاحبزادہ صاحب نے مسٹر بیک کو نواب محسن الملک بہادر کا شاکی پایا۔ بس اُس وقت کی حالت کے لحاظ سے انھوں نے مسٹر بیک کو مشورہ دیا کہ وہ نواب محسن الملک کی مدد کے بغیر قوم کا اعتماد حاصل نہ کرسکیں گے۔ چونکہ اپنی صحت کی حالت کے اعتبار سے سید محمود کالج کے کام کا بار اُٹھانے کے قابل نہ تھے اس لئے کالج کے بعض خیر طلبوں کی یہ رائے ہوئی کہ کالج کی سکریٹری شپ کا مسئلہ فوراً طے کردیا جائے لیکن صاحبزادہ صاحب اور مسٹر بیک اس رائے کے خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ قوم کے سامنے اس مسئلہ کو چھیڑ کر انتشار نہ پیدا کیا جائے بلکہ سب کو کالج کی طرف متوجہ کرکے تازہ جوش پیدا کیا جائے۔ غبن اور سرسید کے انتقال کی وجہ سے جو عام مایوسی چھائی ہوئی تھی اس کو اُمید افزا نصب العین پیش کرکے جوش میں تبدیل کردیا جائے چنانچہ

صاحبزادہ صاحب نے مسٹر بیک سے کہا کہ سید محمود صاحب کی جو حالت ہے وہ سب پر عیاں ہے ایسی حالت میں نواب محسن الملک بہادر کے بغیر کالج کا کام ہرگز نہ چل سکے گا اور قوم کو بغیر ان کے کالج پر اعتماد نہ ہوگا۔ یہ بات مسٹر بیک کی سمجھ میں آگئی چنانچہ اسی وقت مسٹر بیک اور صاحبزادہ صاحب سرسید میموریل فنڈ قائم کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور مسٹر بیک اس پر رضامند ہوگئے کہ نواب محسن الملک بہادر پریسیڈنٹ ہوں۔

اب صاحبزادہ صاحب نواب محسن الملک کے پاس گئے اور کہا کہ یہ وقت بحث کا نہیں ہے بلکہ کالج کو تباہی سے بچانے کا ہے اور سب سے مقدم یہ کام ہے کہ سرسید میموریل فنڈ کی تجویز قوم کے سامنے پیش کرکے ضرر رساں خیالات ترقی کے خیال سے بدل دئے جائیں اور اس کی شکل صرف یہ ہے کہ آپ اور مسٹر بیک یہ کام اپنے ہاتھ میں لیں اور آپ پریسیڈنٹ ہوں۔ نواب محسن الملک نہ مانے تو صاحبزادہ صاحب مسٹر بیک کے پاس آئے اور انھیں نواب محسن الملک کے پاس لے گئے۔ دونوں میں گفتگو ہوئی اور یہ قرار پایا کہ نواب محسن الملک سرسید میموریل فنڈ کے پریسیڈنٹ ہوں۔

۱۳ مارچ ۱۸۹۸ء کو انسٹیٹیوٹ ہال (Institute Hall) میں ٹرسٹیوں کا جلسہ ہوا اور صاحب زادہ صاحب نے تحریک کی کہ سرسید میموریل فنڈ قائم کرکے دس لاکھ روپیہ جمع کیا جائے تاکہ اس سے مسلم یونیورسٹی قائم کی جائے۔ نواب محسن الملک پریسیڈنٹ اور صاحبزادہ صاحب سکریٹری منتخب ہوئے اور اسی دن سے کام شروع ہوگیا۔

صاحبزادہ صاحب کا یہ کارنامہ عظیم الشان ہے جس کا اعتراف نواب محسن الملک نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا جو انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس رامپور میں دسمبر ۱۹۰۰ء میں کی تھی۔ نواب صاحب نے فرمایا۔

"میں نے تو سرسید کے مرنے کے تین دن بعد کہدیا تھا کہ مجھ سے یہ حالت نہیں دیکھی جاتی میں علیگڑھ سے جاتا ہوں اس وقت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے دماغ سے نکلا کہ سرسید

کی یادگار میں محمڈن یونیورسٹی قائم کی جائے۔ مسٹر بیک اور آفتاب احمد خاں میرے پاس آئے اور اس خیال کو مجھ پر ظاہر کر کے کہا کہ تم اس کمیٹی کے صدر انجمن بنو۔ مجھے یہ تجویز سن کر تعجب ہوا کہ یہاں کالج رہنے کے لالے پڑے ہیں اور یہ محمڈن یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز کر رہے ہیں۔ میں نے اسکے جواب میں یہ کہا کہ کیسی شیخ چلی کی سی باتیں کرتے ہو کچھ جنون تو نہیں ہوگیا ہے سرسید کو زمانہ موافق آیا انھوں نے اور اُن کے دوستوں نے تیئس برس لگاتار کوشش کی اور سات لاکھ روپیہ سے زیادہ نہ وصول کر سکے تم کو دس لاکھ اس نازک وقت میں کیسے مل جائے گا ؎

ایں خیال است و محال است و جنوں

میرے نزدیک یہ تجویز کسی طرح چلنے والی نہیں اور مجھے ایک لاکھ روپیہ ملنے کی بھی اُمید نہیں ہے لہٰذا میں تو تمھارے ساتھ اس تجویز میں شریک نہیں ہوتا ہر چند میں نے انکار کیا لیکن انھوں نے ایک نہ مانی اور یہی کہا کہ اگر تم انکار کرو گے اور ہمارے ساتھ شریک ہو کر کام نہ کرو گے تو کالج کو جس قدر نقصان پہنچے گا خدا کے یہاں تم پر اس کا عذاب ہوگا اس کا وبال تم پر پڑے گا ایسے وقت میں کالج کی خدمت نہ سہی بلکہ قوم کی خدمت کرنا تم پر فرض ہے غرضکہ علیگڈھ میں رہنا صرف انھیں کے اصرار سے ہوا انھیں کے اصرار سے میں نے سرسید میموریل فنڈ کا پریسیڈنٹ ہونا قبول کیا سرسید کی یادگار میں اگر کوئی ہال کالج میں بن جاتا تو ہم لوگ خوش ہو جاتے لیکن اس تجویز کا یہ نتیجہ ہوا کہ سوا لاکھ روپیہ وصول ہوگیا جس سے بینک کا سودی قرضہ ادا ہوا تعمیر کے متعلق جو متفرق قرضہ تھا دیا گیا ڈبنیچر کا روپیہ واپس دیا گیا غرضکہ چون ہزار (۵۴۰۰۰) روپیہ ادا ہو کر اسّی ہزار (۸۰۰۰۰) موجود ہے جس کے پرامیسری نوٹ (Promisory note) خرید لئے گئے ہیں (ماخوذ از اسپیچ نواب محسن الملک) سطور بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے نازک وقت میں سرسید کی وفات کے بعد جبکہ نواب محسن الملک جیسے شخص کو نا امیدی ہو چکی تھی صاحبزادہ صاحب کے دماغ نے محمڈن یونیورسٹی کا منصوبہ قائم کر کے اُس کے لئے سرسید میموریل فنڈ کا کام شروع کرایا سچ تو یہ ہے کہ نا اُمیدی کو اُمید اور کامیابی سے بدل دینے کا سہرا صرف صاحبزادہ صاحب ہی

کے سر رہا کیونکہ تجویز کے موجد وہی تھے۔

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں صاحبزادہ صاحب کا حصہ

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے ۱۸۹۰ء میں ڈیوٹی سوسائٹی (انجمن الفرض) قائم کرکے اپنی مادر درسگاہ اور قوم کی خدمت کرنے کا جو جذبہ طلباء میں پیدا کر دیا تھا اس کا ظہور مختلف صورتوں میں ہوتا رہا۔ اسی جذبہ کے تحت میں طلباء نے بسرکردگی خان بہادر چودھری خوشی محمد خاں صاحب ناظر (مرحوم) اور مولوی علاء الحسن صاحب مرحوم ۱۸۹۲ء میں برادر ہڈ (BrotherHood) قائم کی۔ اس انجمن کے ارکان اپنی آمدنی میں سے ایک فیصدی کالج کو دینے کا وعدہ کرتے تھے اور سالانہ ڈنر منعقد کرتے تھے جس میں سابق طلباء بھی شریک ہوتے تھے اس کے سکریٹری مسٹر (بعدہٗ سر) تھیوڈور ماریسن پروفیسر کالج تھے۔ برادر ہڈ کے سالانہ جلسے ۱۸۹۶ء تک ہوکر بند ہوگئے پھر اپریل ۱۸۹۸ء میں سرسید کے چہلم کے موقع پر علیگڑھ میں بڑا اجتماع ہوا ہز آنر سر جیمس لاٹوش لفٹننٹ گورنر صوبہ متحدہ بھی سرسید میموریل فنڈ کی امداد کے لئے تشریف لائے اس اجتماع سے فائدہ اُٹھاکر صاحبزادہ صاحب نے مولوی بہادر علی مرحوم، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، شیخ عبداللہ۔ مولوی محمد حبیب اللہ خاں، سید طفیل احمد اور میر ولایت حسین کے مشورہ سے تجویز کیا کہ سابق طلباء کا ڈنر پھر جاری کیا جائے چنانچہ ۲۳ رجولائی ۱۸۹۸ء کو اولڈ بوائز کا پہلا جلسہ اور ڈنر ہوا اس جلسہ کے سکریٹری شیخ محمد عبداللہ صاحب اور خزانچی مسٹر تھیوڈور ماریسن پروفیسر کالج مقرر ہوئے۔ ۵ رمارچ ۱۸۹۹ء کے ڈنر میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن باقاعدہ وجود میں آئی اور مولوی بہادر علی صاحب اس کے اوّل سکریٹری بنائے گئے۔ مولوی صاحب موصوف کا انتقال ۳ رستمبر ۱۹۰۳ء کو ہوا اور اپریل ۱۹۰۴ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس وقت ایسوسی ایشن کی حالت یہ تھی کہ ممبروں کی تعداد صرف پندرہ اور اس کا سرمایہ ۲۶۶ ۳/۴ روپیہ تھا۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے تین سال کے عرصہ میں اس ایسوسی ایشن کو غیر معمولی

ترقی دی اور ۳۰ مارچ ۱۹۰۱ء کے اجلاس میں جو رپورٹ انھوں نے پیش کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ممبروں کی تعداد ۱۵ سے بڑھ کر ۲۶۵ اور سرمایہ ۲۶۶ روپیہ سے بڑھ کر ۸۵۱ روپیہ تک پہنچ گیا اس وقت کی ماہوار آمدنی کا اوسط چار سو روپیہ تھا اس دوران میں صاحبزادہ صاحب کے زمانہ میں ایسوسی ایشن کی طرف سے سائنس کے ایک پروفیسر کو تین سو روپئے ماہوار دئے جاتے تھے چنانچہ ۱۹۰۱ء میں اس پروفیسر کی تنخواہ کے ۳۶۰۰ روپیہ نکال کر ۴۶۸ روپیہ سرمایہ تھا۔

اس زمانہ کے اعتبار سے ایسوسی ایشن کی یہ انتہائی کامیابی تھی مگر بدقسمتی سے صاحبزادہ صاحب کی یہ کامیابی بعض اشخاص پر شاق گزری۔ ان ناگوار واقعات کی تفصیل کرنا مناسب نہیں ان اصحاب کی طرف سے غیرواجبی اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی اس وقت صاحبزادہ صاحب نے اختلاف رفع کرنے کے لئے یہی مناسب سمجھا کہ وہ عہدۂ سکریٹری سے دست کشی اختیار کریں چنانچہ انھوں نے استعفیٰ دیا لیکن جلسہ نے منظور نہیں کیا تاہم صاحبزادہ صاحب نے اسی سال نومبر کے آخر میں مولوی محمد حبیب اللہ خاں صاحب کو چارج دیا اور خود دستکش ہوگئے۔ صاحبزادہ صاحب کے انتظام کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ تمام کام صرف ایک دس روپیہ ماہوار کے کلرک سے لیتے تھے اور کالج کو تین سو روپیہ کی رقم بچا کر دیدیتے تھے۔

اُن کے عہد کی ایک یادگار یہ ہے کہ انھوں نے کوشش کرکے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو یہ حق دلایا کہ اُس کے تین نمائندے ٹرسٹیوں کی جماعت میں لئے جائیں اس طرح اولڈ بوائز کی حیثیت کالج کی انتظامی جماعت میں مسلّم ہوگئی۔ کچھ دن بعد نمائندوں کی تعداد میں دو کا اضافہ کردیا گیا۔

انھوں نے اپنے زمانہ میں ۱۶ فروری ۱۹۰۵ء کے جلسہ میں ایک تجویز یہ پیش کی تھی کہ اولڈ بوائز کا لباس حسب ذیل مقرر کیا جائے۔

ترکی ٹوپی۔ ترکی کوٹ، پتلون، انگریزی جوتہ۔ یہ وہی لباس ہے جو سرسید نے اختیار کیا تھا۔ اور آگے چل کر طلبار کی یونیفارم قرار دیا گیا۔

ڈائننگ ہال کے ایک قضیہ کا فیصلہ

نواب محسن الملک کے زمانہ میں صاحبزادہ صاحب ہر چھوٹے بڑے کالج کے انتظام اور ڈسپلن کو قائم رکھنے میں دلچسپی لیتے تھے جس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۹۰۴ء میں کالج کے مانیٹروں اور ڈائننگ ہال کے مہتمم سے جھگڑا ہوا اور بات بڑھ جانے کا خوف ہوا نواب محسن الملک اور مسٹر کارنا پروفیسر کی رائے سے اس جھگڑے کا تصفیہ صاحبزادہ صاحب کے سپرد ہوا انھوں نے اس معاملہ کی تحقیقات کی جس سے یہ ثابت ہوا کہ مہتمم مانیٹر کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آیا تھا مہتمم نے صاحبزادہ صاحب کے فیصلہ کے مطابق مانیٹروں سے معافی مانگ لی اور معاملہ ختم ہوا۔

طلبار کو انجیل کی تعلیم کی ممانعت پر مسٹر مارلین کی ناراضی

۱۹۰۴ء کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ کالج کے چند طلبار نے مشن کی ایک میم صاحبہ سے کالج سے باہر جاکر انجیل پڑھنی شروع کی جب نواب محسن الملک کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے طلبار کو ممانعت کردی اس پر مسٹر مارلین نے نواب نواب صاحب کو ایک چٹھی لکھ کر اظہار ناراضی کیا اور یہ لکھا کہ یہ طلبار انجیل پڑھنے میرے حکم سے جاتے ہیں اگر اس معاملہ میں کچھ شورش یا مداخلت ہوئی تو میں کالج کے طلبار کو اپنی بی بی سے ملنے نہیں دوں گا نہ اُن کو اپنے بنگلہ میں آنے دوں گا۔ یہ معاملہ ۱۳ جنوری ۱۹۰۵ء کو ٹرسٹیوں کے سالانہ جلسے میں پیش ہوا اِس میں صاحبزادہ صاحب بھی شریک تھے جلسے نے بالاتفاق مسٹر مارلین کے اس فعل پر افسوس کا رزولیوشن پاس کیا اور اس رزولیوشن کے متعلق مارلین صاحب کو ان کی چٹھی کے جواب میں خط لکھنے کا کام صاحبزادہ صاحب کے سپرد کیا گیا چنانچہ صاحبزادہ صاحب نے مارلین صاحب کو ایسا مدلل جواب لکھا کہ وہ معقول اور لاجواب ہوگئے۔

اپنے متعلق ایک غلطی کا ازالہ

صاحبزادہ صاحب نے ۱۹۰۴ء میں اٹھارہ سو (۱۸۰۰) روپیہ سالانہ وظائف کی مد میں اور تین ہزار پانچ سو روپیہ قانونی لائبریری فنڈ میں دئے تھے ٹرسٹیوں کے سالانہ جلسہ میں اس کا شکریہ ادا کیا گیا اور اس

۳۵۰۰
جلسہ کی رپورٹ پایونیر میں شائع ہوئی پایونیر میں قانونی لائبریری فنڈ کے عطیہ کی تعداد پینتیس سو کی بجائے پینتیس ہزار ۳۵۰۰۰ چھپ گئی صاحبزادہ صاحب نے اس غلطی کو دیکھ کر پانیر کو چٹھی لکھی اور غلطی کی تصحیح کرادی کیونکہ ان کو یہ امر گوارا نہ تھا کہ واقعہ کے خلاف ان کے تھوڑے عطیہ کو بڑا کرکے دکھایا جائے

کالج میں عربی تعلیم کے اجرار سے اختلاف

۱۹۰۴ء کالج کی تاریخ میں اس لئے یادگار رہے گا کہ علیگڈھ کالج ایک عربی مدرسہ میں تبدیل ہوجانے سے صاف بچ گیا یہ تجویز اُٹھی تو بڑی قوت سے تھی لیکن آخروہ ناکام رہی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

عربی تعلیم کی ترقی پر مسٹر گارڈنر براؤن پروفیسر کالج نے ایک اسکیم لکھی تھی۔ صاحبزادہ صاحب نے یہ اسکیم پڑھی پڑھتے ہی انھوں نے پہلا ریمارک تو یہ کیا کہ عربی اسکیم کے مصنف وہ مقاصد ہی نہیں سمجھتے جن کو پورا کرنے کے لئے سرسید علیہ الرحمۃ نے علیگڈھ کالج قائم کیا تھا اس کے سوا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانان ہند کی اصل ضروریات کا اُن کو علم نہیں ہے اس اسکیم کا عملدرآمد نہایت خطرناک ہے۔

۱۹ فروری کو صاحبزادہ صاحب کی نواب محسن الملک سے ملاقات ہوئی۔ نواب صاحب نہایت پریشان معلوم ہوتے تھے وہ صاحبزادہ صاحب کو علیحدہ لے گئے اور کہا کالج کے انگلش اسٹاف کی طرف سے جو خطرات تھے وہ صحیح ثابت ہوئے صاحبزادہ صاحب نے پوچھا کیا واقعہ ہے نواب صاحب نے فرمایا مسٹر براؤن سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ عربی اسکول کی مجوزہ اسکیم مسٹر ماریسن نے لارڈ کرزن وائسرائے ہند کے سامنے پیش کردی اور وائسرائے نے وہ اسکیم صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ میں بھیج دی ہے جب مجھے معلوم ہوا تو مسٹر براؤن سے میں نے کہا کہ مسٹر ماریسن کو ٹرسٹیوں وغیرہ کے مشورہ کے بغیر ایسا کام نہ کرنا چاہیئے تھا صاحبزادہ صاحب نے فوراً دیکھ لیا کہ ایسی عربی کی تحریک لارڈ کرزن کی سرپرستی میں صرف اس لئے کی گئی تھی کہ ملک میں اعلیٰ انگریزی تعلیم کی جڑ کٹ جائے

کیونکہ انڈین یونیورسٹی بل جو اس زمانہ میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے سامنے تھا اس کا یہی منشا تھا کہ تعلیمات کا کل سلسلہ گورنمنٹ کا ایک محکمہ بنا دیا جائے جس سے گورنمنٹ کو یہ اختیار حاصل ہو جائے کہ جو اس کا جی چاہے کرے چنانچہ اب یہ تجویز کی گئی کہ علیگڈھ میں عربی کا ایک مدرسہ قائم کیا جائے جس کا پرنسپل یورپین ہو ایک پروفیسر مصری ہو اور ایک پروفیسر ہندوستانی ہو مصارف کے سرمایہ کا اندازہ تیرہ لاکھ تھا جو گورنمنٹ عطا کرتی ظاہر تھا کہ ایسی تجویز سرسید کے اصول کے خلاف تھی جس سے یورپ کے سائنس اور اعلیٰ ادبی تعلیمات کی علیگڈھ میں بیخ کنی ہو جاتی اور لارڈ کرزن جیسے خیالات کے لوگوں کا اصل منشا یہی معلوم ہوتا تھا۔ سرسید کی یہ خواہش تھی کہ اپنی جماعت کو وہ یورپ کے سائنس اور انگریزی اور ادبیات کی اعلیٰ تعلیم دلائیں تاکہ مسلمان اول تو اس زندگی کی کشاکش کا مقابلہ کرنے کے لائق ہو جائیں اور دوسرے وہ وفادار مفید شہری بن جائیں مسٹر ماریسن اور مسٹر براؤن جیسے لوگ اس بات کے شدت سے حامی تھے کہ مسلمانوں کو عربی میں تعلیم دلانا اشد ضروری ہے گویا ان لوگوں کی رائے میں ہندوستانی مسلمانوں کو یوروپین سائنس اور انگریزی ادبیات کی حاجت ہی نہ تھی۔

لیکن ان اصحاب کی یہ غلطی تھی کیونکہ سرسید کے دئے ہوئے سبق ابھی تازہ تھے اور ان کے متبعین یہ سبق اتنی جلد بھول نہ سکتے تھے اس لئے یہ ناممکن تھا کہ عربی تعلیم کا سبز باغ دکھا کر مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم سے محروم کیا جائے۔ صاحبزادہ صاحب نے فوراً ہی اس خطرناک معاملہ پر توجہ کی نواب محسن الملک تو یہ کہتے تھے کہ مسٹر ماریسن نے دغا کی لیکن صاحبزادہ صاحب کی یہ رائے تھی کہ مسٹر ماریسن کا یہ فعل نہایت قابل اعتراض تھا اور آئندہ ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اسی اثنار میں مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی (نواب صدر یار جنگ بہادر) کی مسٹر ماریسن سے ملاقات ہوئی چونکہ شیروانی صاحب عربی کے علامہ ہیں مسٹر ماریسن نے نہایت دل خوش کن پیرایہ میں ان سے عربی کی تعلیمات اور جدید اسکیم کا ذکر کیا مسٹر ماریسن کو یہی یقین تھا کہ شیروانی صاحب اس اسکیم سے قطعی اتفاق ہی نہ کریں گے بلکہ اس کی حمایت کریں گے لیکن

شیروانی صاحب اگرچہ عالم باعمل اور عربی کے دلدادہ ہیں لیکن ان کی تیز نظر اصل مقصد کی تہ کو فوراً پہنچ گئی آپ نے مسٹر ماریسن کو معمولی سا جواب دیدیا اور فوراً صاحبزادہ صاحب سے ملاقات کی اور دونوں میں عربی اسکیم کے خطرات پر بحث ہوئی اور یہ قرار پایا کہ ایسی خطرناک اسکیم کے خلاف فوراً عملی کارروائی کی جائے۔

اسی طرح جب صاحبزادہ صاحب کی نواب سر محمد مزمل اللہ خاں بہادر سے ملاقات ہوئی تو نواب صاحب نے عربی اسکیم کو نہایت خطرناک اور مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کا میٹ دینے والا بتایا۔ اب دیر کرنے کا وقت نہ تھا اس لئے صاحبزادہ صاحب نے نواب محسن الملک آنریری سکریٹری کالج کے نام سے ۲۳ فروری ۱۹۰۴ء کو اخبار پانیر کو ایک مدلل چٹھی بھیجی جو ۹ مارچ ۱۹۰۴ء کی اشاعت میں شائع ہوئی اس چٹھی میں صاحبزادہ صاحب نے ٹرسٹیان کالج کی پالیسی اور ان کے اقتدار کی پوری صراحت کردی تھی۔

قبل اس کے کہ ۹ مارچ ۱۹۰۴ء کا پانیر علیگڈھ پہنچے مسٹر ماریسن کو کسی نہ کسی طرح یہ پتہ لگ گیا کہ عربی کی مجوزہ اسکیم کے خلاف پانیر وغیرہ اخبارات کو مضمون بھیجے جارہے ہیں چنانچہ ۲ مارچ ۱۹۰۴ء کو مسٹر ماریسن نے نواب محسن الملک بہادر کو چٹھی لکھی جس میں نواب صاحب سے یہ خواہش کی کہ وہ عربی اسکیم کے متعلق کسی اخبار میں کوئی مضمون شائع نہ کرائیں اور اس چٹھی میں نواب صاحب کو اپنی رائے سے متفق کرنے کے لئے یہ بھی لکھا کہ چونکہ علیگڈھ کالج کو الٰہ آباد یونیورسٹی میں اپنی پوزیشن قائم رکھنی ہے اس لئے کالج کو عربی اپنے امتیازی مضمون کے طور پر رکھنے کی ضرورت ہے نواب صاحب نے اس چٹھی کو صاحبزادہ صاحب کو دکھایا اور کہا کہ اخبارات میں تو اشاعت نہ کرنے کا مشورہ بعد از وقت ہے کیونکہ ۲۳ فروری ۱۹۰۴ء کو پانیر میں یہ مضمون بھیجا جاچکا ہے جو امروز فردا میں چھپ کر آجائے گا۔ اب رہی دوسری بات یعنی کالج کو اپنا خاص امتیازی مضمون اختیار کرنے کا مسئلہ اس کی نسبت نہایت زور دے کر فرمایا کہ جب کہ تاریخ ہمارا قدیمی خاص مضمون ہے تو کیا وجہ ہے کہ بجائے عربی کے ہم تاریخ ہی اپنا خاص مضمون

مقرر نہ کریں نواب صاحب نے صاحبزادہ صاحب کو یقین دلایا کہ وہ ان کی رائے سے متفق ہیں
اس واقعہ کے ۲ دو دن بعد ۹ مارچ ۱۹۰۴ء کے پانیر میں وہ مضمون چھپ کر آ گیا۔ اسی زمانہ میں
صاحبزادہ صاحب کو ایک جلسہ میں ایک تقریر کرنے کا موقع ملا جس میں انھوں نے بتایا کہ عربی
اسکیم کی مخالفت کی وجہ کیا ہے یہ جلسہ پروفیسر آرنلڈ کے رخصتی ڈنر کا تھا جو ۲۵ فروری ۱۹۰۴ء
کو نواب بہادر سر مزمل اللہ خاں کی طرف سے اسٹریچی ہال میں دیا گیا تھا صاحبزادہ صاحب کی
اس تقریر کے الفاظ یہ ہیں:۔

"علیگڈھ کی تحریک ایک ریلوے ٹرین کی مانند ہے۔ ایم۔اے۔او کالج اس کا دخانی انجن ہے
جو اس ٹرین کو چلاتا ہے انگلش اسٹاف کے ممبر اس انجن کے ڈرائیور ہیں۔

سرسید کے دو اصول تھے جو بمنزلہ ریل کی دو پٹریوں کے تھے اوّل یہ کہ ہندوستان کے
مسلمانوں کو یورپ کے سائنس اور ادبیات کی انگریزی زبان میں تعلیم دی جائے دوسرے یہ کہ
وہ سچّے مسلم بننے کے ساتھ سلطنت کے وفادار اور مفید شہری بنیں۔ پس ڈرایوروں یعنی انگلش
اسٹاف کا فرض ہے کہ وہ ٹرین کو ان ہی دو پٹریوں پر لے جائیں۔ اس وقت کچھ ایسے لوگ بھی
ہیں جو یہ تجویز پسند کرتے ہیں کہ ان ڈرائیوروں سے بیلوں کا چھکڑا چلوائیں اور اسی چھکڑے
میں مسلمان سیر و تفریح کیا کریں مگر ترقی کے میدان کی گھوڑ دوڑ میں ان بیلوں کی کیا حالت
ہوگی اگر مسلمان بیلوں کے چھکڑے کے حامیوں کی رائے پر کاربند ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ
مسلمان بہت پیچھے رہ جائیں گے یا اگر وہ ٹھہر جائیں تو ان کی قسمت کا کیا حال ہوگا چنانچہ
ہم کو اپنے ڈرائیوروں یعنی انگلش اسٹاف کی قابلیت اور سرگرمی پر پورا اعتماد ہے۔"

صاحبزادہ صاحب نے عربی تعلیم کی اسکیم کے معاملہ میں جس طرح سے ایک عام جلسہ میں
اپنی رائے کو آزادی سے ظاہر کر دیا تھا اسی طرح تعلیمات کے ایک بڑے افسر سے اپنی اس
رائے کے اظہار میں تامّل نہ فرمایا۔ اسی زمانہ میں یعنی ۹ مارچ ۱۹۰۴ء کو سررشتہ تعلیم گورنمنٹ
آف انڈیا کے ڈائرکٹر جنرل مسٹر آرنج علیگڈھ آئے تھے صاحبزادہ صاحب سے انکی ملاقات

ہوئی اور عربی کی مجوزہ اسکیم پر بحث چھڑ گئی۔ صاحبزادہ صاحب نے ڈائرکٹر جنرل صاحب سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ مجوزہ اسکیم کے موافق عربی کی تعلیم مسلمانوں کو مطلوب نہیں ہے۔ اسی زمانہ میں لارڈ کرزن کی گورنمنٹ نے تعلیمات پر ایک لمبا چوڑا رزولیوشن جاری کیا تھا جس کا صاحبزادہ صاحب بغور ملاحظہ کر چکے تھے اس رزولیوشن سے یہ پتہ چلتا تھا کہ گورنمنٹ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی ترقی نہیں چاہتی ڈائرکٹر جنرل سے صاحبزادہ صاحب کی جو باتیں ہوئیں اسوقت صاحبزادہ صاحب پر یہی اثر غالب تھا اور عربی کی مجوزہ اسکیم پر گورنمنٹ کی طرف سے زور دئے جانے کا وہ یہی مطلب سمجھتے تھے کہ یہ اسکیم اُن کوششوں کو جو ہندوستان کو جدید علوم سے مستفید کرنے کے لئے گذشتہ سالوں میں کی گئی تھیں برباد کردے گی۔

عربی کی چیر کا آخری فیصلہ

۱۲ اپریل ۱۹۰۴ء کو صاحبزادہ صاحب، نواب محسن الملک کے ساتھ لکھنؤ تشریف لے گئے۔ سرجیمس لاٹوش لفٹنٹ گورنر سے ۱۳ اپریل کو ملاقات ہوئی ہز آنر نے کہا کہ گورنمنٹ کی طرف سے تین، چیرز قائم کی جارہی ہیں سائنس کی الٰہ آباد کالج میں سنسکرت کی بنارس کالج میں اور اگر ٹرسٹی پسند کریں تو عربی کی چیر علیگڈھ کالج میں قائم کی جائے گی۔ نواب محسن الملک نے کہا کہ عربی کی چیر قائم ہونے پر یہ اشد ضروری ہوگا کہ کالج کی خودمختاری قائم رکھی جائے اور ایسی عربی کی چیر کے واسطے کالج اپنے فنڈ سے روپیہ بھی نہ دے سکے گا اور جدید عربی پروفیسر ٹرسٹیان کالج کا ماتحت ہوگا۔ یہی وہ رائے تھی جس کے متعلق صاحبزادہ صاحب نے نواب صاحب کو پورا زور دینے کے لئے متفق کرلیا تھا۔ ہز آنر نے جواب دیا کہ اصولاً ایسا ہی ہوگا اور یہ نیا پروفیسر ایسے طلبار کو پڑھائے گا جو بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرچکے ہوں گے چنانچہ ہز آنر کی گفتگو سے پورا اطمینان ہوگیا۔ ۱۹ مئی کو صاحبزادہ صاحب نے عربی چیر کے متعلق ٹرسٹیوں کی طرف سے ایک چھٹی لوکل گورنمنٹ کو لکھی جس میں مندرجہ بالا گفتگو کی جو نواب محسن الملک نے ہز آنر سے کی تھی اعادہ کردیا بالآخر اس کے متعلق عملدرآمد ہوا اور عربی کی چیر قائم ہوئی لیکن کالج کی انتظامی جماعت کو اُس پر مثل دیگر شعبہ جات کے

پورا اختیار حاصل ہوگیا۔

نواب وقارالملک سے مسٹر آرچبولڈ کا اختلاف

سرسید کے انتقال کے بعد سے انگریز استادوں کی یہ پالیسی ہوگئی تھی کہ کل اختیارات ان کے قبضہ میں آجائیں اور ٹرسٹیوں کی جماعت محض چندہ کرنے کے لئے رہے۔ یہ پالیسی رفتہ رفتہ ترقی کرتی رہی چنانچہ مسٹر ماریسن کے زمانہ میں ایران کا سیاسی وفد بلا استمزاج ٹرسٹیان بھیجا گیا اور تعلیم عربی کا مختلف فیہ مسئلہ چھڑا ان واقعات کے بعد ۱۹۰۷ء میں طلبار کا زبردست اسٹرائک ہوا جو مسٹر آرچبولڈ پرنسپل کے احکام کے خلاف تھا اس واقعہ سے غالباً مسٹر آرچبولڈ کی رائے یہ ہوگئی کہ تعداد طلبار کم رہے چنانچہ ۱۹۰۸ء میں نواب وقارالملک کی سکریٹری شپ کے ابتدا ہی میں اس مسئلہ پر اُن سے اور مسٹر آرچبولڈ سے اختلاف شروع ہوگیا۔

نواب محسن الملک کے زمانہ میں بھی پرنسپل کے اور اُن کے درمیان اختلاف ہوتے تھے مگر وہ نواب صاحب مرحوم کی نرمی کی وجہ سے ختم ہوجاتے تھے برخلاف اس کے نواب وقارالملک اسٹاف کو قاعدہ کے اندر رکھنا چاہتے تھے جس کا اسٹاف عادی نہ تھا اور قدم قدم پر سکریٹری کی رائے کی مخالفت کرتا تھا چنانچہ ایک فیل شدہ طالب علم کے داخلہ کی نسبت نواب وقارالملک نے داخلہ کی سفارش کی تو مسٹر آرچبولڈ پرنسپل نے اس سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر اس لڑکے کو داخل کیا جائے گا تو وہ اس کے بدلے میں کسی اور طالب علم کو خارج کر دیں گے۔ اس پر نواب صاحب نے فرمایا کہ اگر آپ ایسا کریں گے تو میں معاملہ ضابطہ میں لے آؤں گا۔

کالج کے اسٹاف اور ٹرسٹیوں کے اختیارات کی حد بندی کا مسئلہ

جنوری ۱۹۰۹ء میں مسٹر ڈی۔ لافوس ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم صوبہ متحدہ آگرہ واودھ کالج میں آئے اور نواب وقارالملک اور دوسرے بعض ٹرسٹیوں سے ملاقات کی کہ انھیں بعض باتوں پر جن کا تعلق کالج کی آئندہ توسیع کے خلاف تھا رضامند

کرلیا صاحبزادہ صاحب اُس ملاقات کے وقت موجود نہ تھے لیکن اُن کی یہ رائے تھی کہ نواب وقارالملک اور بعض دوسرے ٹرسٹی جن باتوں پر رضامند ہو گئے تھے ان کو رضامند نہ ہونا چاہیئے تھا اور صاحبزادہ صاحب نے اس یادداشت کے خلاف جو مسٹر ڈی لافوس نے اس ملاقات کے متعلق لکھی تھی کوشش شروع کر دی۔

اس مسئلہ نے اس قدر اہمیت حاصل کی کہ ۱۲ فروری ۱۹۰۹ء کو سرجان ہیوٹ لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ کالج میں تشریف لائے اور نہ صرف خود تشریف لائے بلکہ یہ انتظام کیا کہ ہز ہائنس نواب سر حامد علی خاں مرحوم والی رامپور بھی اُسی دن تشریف لائیں چنانچہ ہز ہائنس اور ہز آنر پروگرام کے مطابق اسٹریچی ہال میں تشریف لائے اور ایڈریس پڑھنے کے وقت ہز ہائنس نواب صاحب ڈائس سے اُتر کر ٹرسٹیوں کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ یہ نظارہ بہت پُر اثر تھا اسی سے فائدہ اُٹھا کر صاحبزادہ صاحب نے ایک برجستہ زبانی تقریر کی جس میں اُنھوں نے کہا کہ "جب ایسے قومی سردار جیسے ہمارے ہز ہائنس نواب صاحب بہادر رامپور ہیں ہندوستان کو نیا جنم دینے کے کام میں ہمارے انگلش فرماں رواؤں کے دوش بدوش ہیں تو وہ مبارک دن جس کا ہم کو انتظار ہے اب کچھ دور نہیں ہے اور وقت آرہا ہے کہ علیگڈھ کالج اپنے بانی کی آرزو پوری کرتے ہوئے ثابت کر دیگا کہ زیادہ عظیم الشان نتیجوں میں سے ایک بڑا نتیجہ یہ کالج ہے اور دُنیا میں وہ زندگی۔ روشنی اور آزادی پھیلانے کا ایک ذریعہ ہے"۔ صاحبزادہ صاحب کی اس تقریر کا حاضرین پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ ہز ہائی نس نے ایڈریس خود پڑھا۔ علاوہ دوسری باتوں کے ایڈریس میں کالج کے طلبا بھی مخاطب کئے گئے تھے۔

ایڈریس کے بعد ہز آنر نے ایک طویل تقریر کی جس میں بہت سی باتیں یادگار تھیں ہز آنر کے سوا کسی دوسرے لفٹنٹ گورنر نے اب تک کالج کے اندرونی انتظام میں دخل نہ دیا تھا پس تقریر میں ہز آنر کا سب سے زیادہ قابل غور وہ حصّہ تھا جس کا کالج کی آئندہ توسیع

سے تعلق تھا کیونکہ ہز آنر کی تقریر یقیناً توسیع کے خلاف تھی۔

ہز آنر نے اپنی تقریر میں اس خط و کتابت کا ذکر کیا جو صاحبزادہ صاحب اور مسٹر آرچبولڈ کے باہم ہوئی تھی اور اس گفتگو کا بھی حوالہ دیا جو صاحبزادہ صاحب اور مسٹر ڈی لا فوس کے درمیان الٰہ آباد میں ہوئی تھی اور جس کا تعلق کالج کے طلبار کے داخلہ اور تعداد سے تھا صاحبزادہ صاحب کے نزدیک یہ سب اس کارروائی کا نتیجہ تھا جو مسٹر ڈی لا فوس اور نواب وقارالملک اور بعض مقامی ٹرسٹیان کے درمیان ہوئی تھی اور جس میں ڈائرکٹر صاحب کی رائے جو توسیع کالج میں مانع تھی قبول کرلی گئی تھی۔

ایسے موقع پر صاحبزادہ صاحب بھلا کیسے خاموش رہ سکتے تھے وہ جانتے تھے کہ ہز آنر کی تقریر کا ٹرسٹیوں پر ضرور اثر ہوگا۔ ان ٹرسٹیوں میں بعض ایسے اصحاب موجود تھے جو ہز آنر کی تمام تجاویز پر بڑی مستعدی سے لبیک کہنے والے تھے۔ فی الحقیقت یہ موقع نہایت تردد خیز تھا لیکن صاحبزادہ صاحب نے آنے والے خطرہ کا اندازہ کرکے جس تدبیر اور جوانمردی سے اس کا مقابلہ کیا وہ انھیں کا حصہ تھا۔ سب سے پہلا کام حفظ ماتقدم کے طور پر صاحبزادہ صاحب نے یہ کیا کہ ہز آنر کی ۲۲ر فروری والی تقریر کے متعلق "انڈین ڈیلی ٹیلیگراف الٰہ آباد" اور پنجاب آبزرور (لاہور) اخبارات میں اپنا مضمون شائع کیا جس میں سرسید علیہ الرحمۃ کی کالج کے متعلق پالیسی کی پوری صراحت کی اور اسی موضوع پر سرسید کے ایک لکچر سے پورا اقتباس نقل کیا صاحبزادہ صاحب نے ہز آنر کی تقریر پر کوئی نکتہ چینی تو نہ کی لیکن یہ صاف لکھ دیا کہ ایسے اشخاص موجود ہیں جو ہز آنر کی تقریر کے خلاف ہیں اور ایسی رائے رکھنے کے متعلق ان کے پاس معقول وجوہ ہیں۔

اخبار "البشیر" میں بھی ایک لیڈنگ آرٹکل شائع ہوا جس میں ہز آنر کی تقریر کے اصل منشار کو عام مسلمانوں کے سامنے ظاہر کردیا گیا تھا۔

لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ خود نواب وقارالملک نے صاحبزادہ صاحب کے

مضمون کے جواب میں جو "ڈیلی ٹیلیگراف" میں شائع ہوا تھا اپنا ایک مضمون شائع کرایا پھر علیگڈھ انسٹیٹوٹ گزٹ میں ایک دوسرا مضمون شائع کرایا۔ صاحبزادہ صاحب نے نواب وقارالملک کے مضامین کے جواب میں مضمون بازی کا سلسلہ شروع کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن انھوں نے احتجاج کے طور پر کالج کی مختلف کمیٹیوں کی ممبری سے اپنا استعفیٰ پیش کردیا۔

اس استعفیٰ پر ۱۴ مارچ کو نواب وقارالملک صاحبزادہ کے پاس آئے دونوں میں باہمی تعلقات پر دیر تک گفتگو ہوئی اور صاحبزادہ صاحب نے صاف طریقہ پر ثابت کردیا کہ نواب صاحب نے اس سلسلہ میں جو کارروائی کی وہ مناسب نہ تھی۔ نواب صاحب نے اپنی حق پسندی سے صاحبزادہ صاحب کے اعتراض کو قبول کیا اور نواب صاحب کے اصرار پر انھوں نے اپنا استعفیٰ واپس لینا منظور کرلیا۔ اس کے بعد نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۱۵ مارچ ۱۹۰۹ء کو مسٹر آرچبولڈ پرنسپل صاحبزادہ صاحب کے پاس آئے اور نواب وقارالملک کی شکایت کی اور کہا کہ ۱۷ مارچ کو آپ حاضری میرے ساتھ کھائیں تو تفصیل کے ساتھ بات کرنے کا موقع ملے گا۔ صاحبزادہ صاحب نے منظور کرلیا لیکن دوسری صبح کو یعنی ۱۶ مارچ کو نواب وقارالملک بھی صاحبزادہ سے ملے اور کہا کہ اب انگلش اسٹاف سے ان کے تعلقات سخت کشیدہ ہوگئے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب کو معلوم تھا کہ بعض امور میں نواب صاحب کی زیادتی تھی لیکن بہت سی باتوں میں وہ قطعی حق پر تھے اس وقت تو صاحبزادہ صاحب نے اپنی سرسری رائے نواب صاحب سے بیان کردی اور نواب صاحب تشریف لے گئے۔ اصل بات یہ تھی کہ نواب صاحب کو خود یقین ہوگیا تھا کہ تعداد طلباء کے محدود کرنے کے مسئلہ میں اپنی رضامندی دے کر انھوں نے بڑی غلطی کی تھی پس اب نواب صاحب کی خواہش یہ تھی کہ چھوٹی چھوٹی اور جزوی باتوں میں اپنی قوت کی نمائش کرکے وہ اپنی اس بڑی غلطی کی تلافی کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسی پالیسی ہمیشہ ناکام اور بدمزگی کا باعث ہوتی ہے جیسی کہ موجودہ صورت میں تھی لیکن صاحبزادہ صاحب نے یہ ارادہ کرلیا کہ معاملہ کو راہ راست پر لانے کی حتی المقدور کوشش کریں گے۔

۷ار مارچ کو حسب قرار داد صاحبزادہ صاحب مسٹر آرچبولڈ سے ملے معاملات کالج پر بہت دیر تک گفتگو رہی صاحبزادہ صاحب کو اس سے حد درجہ افسوس ہوا کہ مسٹر آرچبولڈ کے خیالات منتظمان کالج کے احساسات کے قطعی خلاف تھے اور کالج کے پرنسپل سے جو توقعات تھیں ان کا نشان تک نہ تھا مسٹر آرچبولڈ کی کھلی ہوئی خواہش یہ تھی کہ کالج صرف انگلش اسٹاف کے اہتمام اور اختیار میں قطعی طور پر دے دیا جائے اور آنریری سکریٹری یا ٹرسٹیوں کو کالج سے کسی قسم کا عملی تعلق باقی نہ رہے لیکن مسٹر آرچبولڈ کی یہ غلطی تھی ان کو غالباً دو وجوہ سے یہ زعم باطل ہوا تھا ایک تو سرجان ہیوٹ کی تقریر سے اور دوسرے ان کشیدہ تعلقات سے جو نواب وقارالملک اور صاحبزادہ صاحب کے درمیان اس زمانے میں دیکھے گئے تھے۔

صاحبزادہ صاحب نے مسٹر آرچبولڈ سے کالج کی ضروریات کی صراحت کی اور بتایا کہ انگلش اسٹاف اور لوکل ٹرسٹیان کے باہم کیسے اور کس قسم کے تعلقات ہونے ضروری تھے لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مسٹر آرچبولڈ کو لوکل ٹرسٹیوں سے نفرت تھی۔ اب ظاہر تھا کہ اگر لوکل ٹرسٹیان اور انگلش اسٹاف میں اتحادِ عمل نہ ہوتا تو کالج کے لئے یقینی بدقسمتی کی بات تھی چنانچہ صاحبزادہ صاحب نے مسٹر آرچبولڈ سے کہا کہ لوکل ٹرسٹیوں اور انگلش اسٹاف کے باہم میل جول اور اتحادی عمل کی سخت ضرورت تھی اس پر مسٹر آرچبولڈ نے اس قدر بُرا مانا کہ صاحبزادہ صاحب کو افسوس ہوا کہ مسٹر آرچبولڈ سے انھوں نے ایسی بات ہی کیوں کی تھی مگر باوجود اس کے صاحبزادہ صاحب نے تمامی امور کے صاف صاف بیان کر دینے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی اس وقت صاحبزادہ صاحب کو معلوم نہ ہوا کہ یہ معاملہ کس قدر طول پکڑ جائیگا اور اس کا آخری نتیجہ کیا ہوگا کیونکہ تمامی یورپین اسٹاف غیر مطمئن حالت میں تھا اور کالج چھوڑ دینے کی کھلی دھمکیاں دے رہا تھا اور تو اور۔ اس وقت خود مسز آرچبولڈ نے کئی دفعہ کہا "میرا شوہر اس کالج میں نہ رہے گا اور اسے چھوڑ دے گا" صاحبزادہ صاحب نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور خاموش رہے کیونکہ ان کی رائے میں مسٹر آرچبولڈ کا چلا جانا ہی کالج کے

حق میں مفید تھا اس لئے کہ علیگڈھ کالج میں کام کرنے کے وہ اہل ہی نہ تھے۔ یہ ضرور ہے کہ مسٹر آرچبولڈ نے حتی المقدور کوشش کی تھی لیکن اس کوشش سے کالج میں کوئی ترقی نہ ہوئی تھی بہرحال اب معاملہ نہایت دشوار صورت پکڑ گیا تھا۔

اس ملاقات کا حال صاحبزادہ صاحب نے نواب وقارالملک سے کہنا اس لئے مناسب سمجھا کہ وہ کالج کے ٹرسٹیوں کے آنریری سکریٹری تھے اور ان کو ایسے حالات سے بے خبر رکھنا کالج کے ساتھ دشمنی کرنا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحبزادہ صاحب ہر موقع پر آنریری سکریٹری کو مدد دینے کے لئے کیسے تیار رہتے تھے۔

مارچ کے آخر میں نواب وقارالملک اور مسٹر آرچبولڈ میں کشیدگی اپنی آخری حد کو پہنچ گئی مسٹر آرچبولڈ کو یہ شکایت تھی کہ نواب صاحب انگلش اسٹاف کے اختیارات میں حد سے زیادہ مداخلت کرتے ہیں۔نواب وقارالملک نے اب تمامی خط وکتابت جو مسٹر آرچبولڈ سے ہوئی تھی صاحبزادہ صاحب کو دکھائی جس سے صاحبزادہ صاحب کو معلوم ہوا کہ سوائے چند باتوں کے زیادتی انگلش اسٹاف ہی کی تھی۔۲۴ مارچ کو صاحبزادہ صاحب کو معلوم ہوا کہ مسٹر آرچبولڈ نے استعفیٰ دے دیا ہے اور انگلش اسٹاف کے دوسرے پروفیسر بھی استعفیٰ دینے کو تیار بیٹھے ہیں صاحبزادہ صاحب نے نواب وقارالملک سے فوراً ملاقات کی اس وقت انھوں نے صاحبزادہ صاحب کو مسٹر آرچبولڈ کا استعفیٰ دکھایا اور وہ خط وکتابت بھی دکھائی جو اس ہفتہ میں انگلش اسٹاف سے ہوئی تھی انگلش اسٹاف نے پرنسپل آرچبولڈ کو ایک مشترکہ چٹھی لکھی تھی جس میں پرنسپل صاحب سے ہمدردی کا اظہار کرنے کے بعد لکھا تھا کہ معاملہ اگر خوش اسلوبی سے طے نہ ہوا اور آئندہ کے لئے مناسب انتظام کی ضمانت نہ دی گئی تو دفعہ ۱۳۹ و ۱۴۱ قواعد وضوابط قانون ٹرسٹیان کے موافق چارہ جوئی کی جائے گی۔اس دفعہ کا منشا وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس قسم کے مواقع پر گورنمنٹ سے تحقیقات کی درخواست کی جاسکتی ہے اور ٹرسٹیان حسب تصفیہ گورنمنٹ عمل کرنے پر مجبور کئے جاسکتے ہیں۔اس مشترکہ چٹھی سے اب انگلش اسٹاف کے تیور صاف ظاہر تھے اور

صاحبزادہ صاحب کو پورا یقین ہوگیا تھا کہ اب یہ معاملہ بغیر آخری حد تک پہنچے یکسو نہ ہوسکے گا
۴؍ نومبر ۱۹۰۸ء کو جب صاحبزادہ صاحب الٰہ آباد میں مسٹر ڈی لافوس سے ملے تھے تو ٹرسٹیاں
کالج اور پرنسپل کا اختلاف ڈائرکٹر سے بیان کر چکے تھے لیکن نواب وقارالملک نے ڈائرکٹر صاحب
سے جب وہ علیگڈھ آئے تھے کسی اختلاف کے موجود ہونے کا انکار کیا تھا اگر اُسی وقت اصل
واقعات زیر بحث ختم ہوجاتے تو غالباً یہ واقعات ایسی نازک صورت نہ اختیار کرتے مگر تیر
از کمان رفتہ واپس نہ آسکتا تھا اور واقعات جس حالت میں تھے اُن سے مقابلہ کرنا تھا۔

پانیر کا ایک مضمون

اس کے بعد ہی آنریری سکریٹری نواب وقارالملک اور پرنسپل آرچبولڈ کے باہمی نزاع کو ایک مضمون سے اور اہمیت ہوگئی۔ یہ
مضمون ۲۵ ؍ مارچ ۱۹۰۹ء کے پانیر میں شائع ہوا تھا اس مضمون سے کالج کی حالت کی طرف
سے پبلک پر وحشت ناک اثر پڑا تھا۔ خیال کیا گیا کہ یہ مضمون انگلش اسٹاف کے کسی ممبر نے
لکھا تھا اور اگر ایسا تھا تو انگلش اسٹاف کے طرزِ عمل کی پوری جانچ کا وقت آگیا تھا اب کالج
کے پیٹرن سر جان ہیویٹ لفٹننٹ گورنر صوبہ نے یہ کہا کہ نواب ممتازالدولہ سر محمد فیاض علی
خان بہادر کی معرفت نواب وقارالملک کو تار دلوایا کہ وہ فوراً لکھنؤ آئیں ایسا ہی تار مسٹر
آرچبولڈ پرنسپل کو دیا گیا دونوں لکھنؤ پہنچے ۲۹ ؍ مارچ ۱۹۰۹ء کو ہزآنر نے ایک جلسہ کیا
جس میں حسب ذیل اصحاب موجود تھے۔

۱۔ نواب ممتازالدولہ سر محمد فیاض علی خان بہادر ۔ پریسیڈنٹ ٹرسٹیان کالج
۲۔ نواب وقارالملک ۔ آنریری سکریٹری کالج۔
۳۔ مسٹر محمد رفیق جج ۔ ٹرسٹی کالج۔
۴۔ راجہ سر تصدق رسول خاں تعلقہ دار جہانگیر آباد۔ ٹرسٹی کالج۔
۵۔ راجہ نوشاد علی خاں 〃 〃 〃
۶۔ مسٹر آرچبولڈ ۔ پرنسپل کالج۔

۷۔ مسٹر ڈی۔ لا فوس ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم۔

۸۔ ہز آنر، سرجان ہیویٹ لفٹننٹ گورنر پیٹرن کالج۔

ابھی جلسہ کی کارروائی شروع نہ ہوئی تھی کہ نواب وقارالملک نے ہز آنر کی مداخلت پر یہ کہکر اعتراض کیا کہ معاملہ زیر بحث ابھی اس منزل پر نہیں پہنچا ہے کہ ہز آنر کالج کے پیٹرن مداخلت فرمائیں۔ اس اعتراض پر ہز آنر ناراض ہوئے اور فرمایا کہ کالج کے پیٹرن ہونے کی حیثیت سے وہ مجاز ہیں اور دھمکی دی کہ وہ کالج کی سرپرستی کے عہدہ سے مستعفی ہوجائیں گے۔ اس پر دوسرے صاحبان نے جن میں خود پریسیڈنٹ اور تین ٹرسٹی کالج تھے۔ ہز آنر سے کارروائی شروع کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مسٹر آرچبولڈ سے ہز آنر نے فرمایا کہ اپنی شکایات پیش کریں۔ مسٹر آرچبولڈ نے آنریری سکریٹری کی مداخلت کی پالیسی اور طریق عمل کی بابت نو شکائتیں پیش کیں۔ اس پر ہز آنر نے نواب وقارالملک سے جواب مانگا نواب صاحب نے ہر ایک شکایت کے متعلق جواب دیا۔ ان جوابوں کے بعد ہز آنر نے فوراً اپنا فیصلہ سُنا دیا۔

اس ۲۹ مارچ کے جلسہ میں نواب وقارالملک ہز آنر سے پوری مضبوطی کے ساتھ اختلاف کرتے رہے لیکن جائے قیام پر جب تشریف لائے تو لکھنؤ کے مقامی ٹرسٹیوں نے اُن سے یہ اصرار کیا کہ وہ ہز آنر کو ناراض نہ کریں تاکہ کالج کو نقصان نہ پہنچے اس لئے مجبور ہوکر نواب صاحب نے دوسرے دن ہز آنر کو ایک چٹھی لکھی جس میں اپنے ۲۹ مارچ کے جلسہ میں ہز آنر سے مخالفت اور مقابلہ کرنے کی بابت معذرت کی اور ہز آنر کا ۲۹ مارچ کا فیصلہ قطعی طور پر منظور کر لینے کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ وہ دوسرے ٹرسٹیوں کو یہ فیصلہ منظور کر لینے کی ترغیب دیں گے اور چٹھی کے ساتھ وہ نوٹ بھی بھیج دئے جو مسٹر محمد رفیق نے لکھے تھے جن میں مسٹر آرچبولڈ کی شکایات اور ہز آنر کا فیصلہ درج تھا۔ جب نواب وقارالملک علیگڈھ واپس آئے تو صاحبزادہ صاحب کو اس تمام کارروائی پر سخت حیرت ہوئی اور انھوں نے نواب صاحب سے کہا۔ آپ نے یہ کیا غضب کر دیا ۲۹ مارچ کے جلسہ میں جو کچھ ہوا اس کی بابت آپ پر جوابدہی عائد نہیں ہوتی

تھی لیکن ۳۰ مارچ کو جو چٹھی آپ نے ہز آنر کو لکھی اور ۲۹ مارچ کے فیصلہ کی ہر بات آپ نے مان لی درآں حالیکہ آپ کو مان لینے کا مطلق اختیار نہ تھا آپ ضرور جواب دہ ہیں۔ نواب صاحب کو اب اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انھوں نے تسلیم کرلیا کہ ضرور غلطی ہوئی۔ چنانچہ "وقارحیات" میں جو نواب صاحب کی سوانح عمری ہے صاف طور پر تحریر ہے کہ نواب صاحب نے یہ غلطی تسلیم کی مگر حقیقت یہ ہے کہ اس بارہ میں نواب صاحب قابل الزام نہیں کیونکہ انھوں نے جو کچھ کیا وہ کالج کی بہبودی کے لئے کیا یہ دوسری بات تھی کہ انھیں لکھنؤ میں ایسے ٹرسٹی مشورہ کے لئے ملے جو ہز آنر کی شخصیت سے مرغوب تھے اور ڈرتے تھے کہ ہز آنر ناراض ہوکر کالج کو نہ معلوم کیا نقصان پہنچادیں گے۔

ہز آنر کا فیصلہ

اا اپریل کو ۲۹ مارچ کے جلسہ کے مسٹر ڈی۔ لا فوس کے لکھے ہوئے نوٹوں کی نقل علیگڈھ پہنچی جس میں مسٹر آرچبولڈ کی شکایت اور ہز آنر کا فیصلہ تھا۔ ان نوٹوں کے مقابلہ میں مسٹر محمد رفیق کے لکھے ہوئے نوٹوں کی حقیقت نہ تھی کیونکہ تمامی کالج کا انتظام عملی طور پر پرنسپل کے ہاتھ میں دے دیا گیا تھا۔ ایک حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ نوٹ ہز آنر نے نواب فیاض علی خاں کو بھیج کر یہ ہدایت فرمائی کہ فیصلہ کسی ٹرسٹی کو نہ دکھایا جائے اور فیصلہ کی منظوری کا رزولیوشن ٹرسٹیوں سے پاس کرالیا جائے۔ حیرت ہے کہ ہز آنر کالج کے پریسیڈنٹ (نواب سر فیاض علی خان بہادر) کے اثر یا اقتدار کی طرف سے کس قدر غلطی میں پڑے ہوئے تھے۔ پریسیڈنٹ تو ضابطہ کا ایک عہدہ دار تھا وہ کالج کی پالیسی تنہا اپنے اختیار سے کیسے بدل سکتا تھا ایسا تو خود نواب وقارالملک آنریری سکریٹری بھی نہ کرسکتے تھے۔

دوسرے ہی دن ۱۲ اپریل کو پہاسو ہاؤس میں مقامی اور چند باہر سے آئے ہوئے ٹرسٹیوں کا ایک جلسہ ہوا جس میں صاحبزادہ صاحب نے نہایت مفصل اور مدلّل تقریر کے ذریعہ سے تمامی حالات ٹرسٹیوں کے سامنے بیان کرکے یہ ثابت کردیا کہ ۲۹ مارچ کو ہز آنر بیٹرن کی کارروائی کالج کے قواعد وضوابط کی دفعہ ۱۴ کی رو سے صرف ایک مشورہ کی حد تک تھی پس ہز آنر سے

درخواست کی جائے کہ ہزآنر کے فیصلہ کے نوٹ تمامی ٹرسٹیوں کے پاس اظہار رائے کی غرض سے بھیجے جائیں۔ اس سے سب نے اتفاق کیا تب صاحبزادہ صاحب نے ہزآنر کے نام چٹھی کا مسودہ مرتب کیا۔ جب یہ چٹھی ہزآنر کو پہنچی تو انھوں نے اصل نوٹوں میں سے کچھ ترمیم کر کے اجازت دے دی کہ نوٹ گشت کرائے جائیں جب یہ اجازت مل گئی تو صاحبزادہ صاحب نے یہ نوٹ نہایت غور سے پڑھے اور جواب کا ایک مسودہ لکھا جس میں ہزآنر کے فیصلہ کی بعض باتیں منظور کرلیں مگر چار باتیں منظور کرنے سے انکار کیا۔

۲۴، ۲۸ اور ۲۹ اپریل کو پہاسو ہاؤس میں پہلے یہ مسودہ ٹرسٹیوں کی مجلس شوریٰ میں پیش ہوا اور مجلس نے اس جوابی مسودہ کے حرف حرف سے اتفاق کیا۔

جن چار باتوں کے منظور کرنے سے انکار کیا گیا وہ ہزآنر کے فیصلہ میں حسب ذیل تھیں۔

۱۔ ایسے معاملات میں جو پرنسپل کے احاطۂ اختیار میں ہوں آنریری سکریٹری پرنسپل سے کچھ دریافت نہ کرے۔

۲۔ طلبار کے داخلہ کا قطعی اختیار پرنسپل کو رہے گا اس معاملہ سے کسی ٹرسٹی یا آنریری سکریٹری کو کوئی تعلق نہ ہوگا۔

۳۔ کسی ٹرسٹی یا آنریری سکریٹری کو اس سے کوئی واسطہ نہ ہوگا کہ یورپین اسٹاف کالج میں تعلیم کا کام کتنے گھنٹے کرتا ہے کام کی مقدار اور کام کا وقت مقرر کرنا صرف پرنسپل کے اختیار میں رہیگا۔

۴۔ آنریری سکریٹری کو طلبار سے ملاقات نہ کرنی چاہئے کیونکہ اس سے کالج کی ڈسپلن (Discipline) پر اثر پڑتا ہے۔

چونکہ ٹرسٹی کالج کی حکمراں جماعت تھی یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ متذکرہ صدر باتیں مان لیتے اور بے دست و پا ہو کر تمامی اختیارات پرنسپل کو دے دیتے اور اُسے کالج کا مالک یا خود سر فرمانروا بنا دیتے چنانچہ صاحبزادہ صاحب نے اس چٹھی میں پوری وضاحت سے وہ تمام وجوہ تحریر کر دی تھیں جن کی موجودگی میں اوپر کی چار باتیں منظور نہ کی جا سکتی تھیں۔

متذکرہ بالا جواب ہز آنر کو بھیج دیا گیا اسی کے ساتھ اس زمانہ میں تمام ہندوستان میں نہایت کثرت سے مسلمانوں کے جلسے ہوئے۔ اخباروں میں مضامین لکھے گئے اور کالج کی حفاظت کے خوب خوب مظاہرے ہوئے اور نواب وقارالملک پر پورے اعتماد کا اظہار کیا گیا انگلستان سے بھی مسلمان لیڈروں کے تار آئے ان سب باتوں کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ ہز آنر سرجان ہیوئیٹ لفٹنٹ گورنر صوبہ نے اس چٹھی کا جو ماہ مئی میں ان کو بھیجی گئی تھی جون میں جواب دیا۔ یہ چٹھی نہایت طولانی ٹائپ شدہ تھی جس میں ہز آنر نے بعض امور کے متعلق اپنی غلطی تسلیم کی ہز آنر نے لکھا تھا کہ حسب دفعہ ۱۴ انھوں نے صرف مشورہ دیا تھا اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا ٹرسٹیوں کو اختیار ہے اور آخر میں پورا اطمینان دلانے کو ہز آنر نے لکھا۔ اخباروں میں مجھے یہ دیکھنے سے افسوس ہوا ہے کہ ایسا خیال کیا جارہا ہے کہ گورنمنٹ کا منشار کالج کو سرکاری بنا لینے کا ہے میں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا خیال ہرگز نہیں ہے کالج کی ترقی تو صرف اسی بات پر منحصر ہے کہ وہ مثل سابق کے مسلمانوں کی اپنی ذاتی کوشش سے سرسبز ہو اور ترقی کرے کالج کو سرکاری بنانے کا ارادہ سراسر کالج کے نقصان کا باعث ہوگا۔ میں ہرگز ایسا خیال یا ارادہ نہیں رکھتا موجودہ دشواریوں میں میرا دخل دینا اس لئے نہ تھا کہ کالج کے اندرونی انتظام میں مداخلت کروں میں تو پیٹرن کی حیثیت سے ٹرسٹیوں کو صرف مدد دینا چاہتا تھا۔

اب یہ کشاکش ختم کے قریب آگئی تھی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور صرف چند مخلص قوم اور کالج کے خیر طلب ٹرسٹیوں کے بےخوف اور دلیرانہ مقابلہ اور کوشش نے کالج کو بچالیا اور جب نواب وقارالملک کو ایسے جری اور دوراندیش لوگوں کی مدد اور مشورہ ملا تو وہ بھی پھر اپنی جگہ سے نہ ہٹے اور نتیجہ حسب منشار حاصل ہوگیا۔

۳۱ر جولائی کو مسٹر آرچبولڈ کا استعفیٰ ٹرسٹیوں کے سامنے پیش ہونے والا تھا بہت سے ٹرسٹیوں نے توپراکسی (Proxy) کے ذریعہ اپنی رائے نواب صاحب اور صاحبزادہ صاحب

کی موافقت میں بھیج دی تھی لیکن باوجود اس کے پوری توقع نہ تھی کہ رائے کا بڑا غلبہ حاصل ہو سکیگا

وفد کی تجویز

اسی ماہ جولائی میں (نواب بہادر سر) محمد مزمل اللہ خاں آگرہ گئے اور ہز آنر لفٹننٹ گورنر اور مسٹر بٹلر فارن سکریٹری (بعدہ سر ہارکورٹ بٹلر) سے ملے اور آخر کار یہ طے ہوا کہ اس معاملہ کے متعلق ٹرسٹیوں کا ایک وفد ہز آنر کی خدمت میں حاضر ہو۔ نواب سر محمد مزمل اللہ خاں آگرہ سے علیگڈھ واپس آئے اور نواب وقار الملک نے وفد کی تجویز سے اتفاق کیا لیکن اس تاریخ کو صاحبزادہ صاحب فتح گڈھ میں تھے لہٰذا مولوی ابوالحسن صاحب اسسٹنٹ سکریٹری صاحبزادہ کے پاس فتح گڈھ بھیجے گئے تاکہ وفد کے بارے میں مشورہ کریں۔ صاحبزادہ صاحب نے وفد کی تجویز سے اس شرط پر اتفاق کیا کہ پہلے ۳۱ جولائی کے جلسے میں وہ طریق عمل طے کرلیا جائے جس کے موافق وفد ہز آنر کی خدمت میں لے جایا جائے کیونکہ صاحبزادہ صاحب کو اندیشہ تھا کہ کہیں وفد جانے کی حالت میں عین وقت پر ہز آنر کے سامنے وہی بات پیش نہ آجائے جو ۲۹ مارچ کو لکھنؤ میں پیش آچکی تھی۔

ٹرسٹیوں کا جلسہ

۳۱ جولائی کو ٹرسٹیوں کا جلسہ ہوا ۲۵ ٹرسٹی تو جلسہ میں موجود تھے ۲۱ ٹرسٹیوں نے پراکسیاں اور ۱۲ نے اپنی تحریری رائیں بھیجی تھیں۔ پس منجملہ ستر کے اٹھاون ووٹ میٹنگ کے سامنے تھے پہلا معاملہ وفد کا پیش ہوا اور بہت ردوقدح کے بعد وفد کا جانا منظور ہوا۔

صاحبزادہ صاحب نے اس ایڈریس کا مسودہ لکھا تھا جو ہز آنر کے سامنے پیش ہونے کو تھا یہ مسودہ جلسہ میں صاحبزادہ صاحب نے پڑھا جو پسند کیا گیا اس کے بعد صاحبزادہ صاحب نے دوسرا مسودہ پڑھ کر سنایا جو کالج کی پالیسی کے اعلان کے متعلق انھوں نے لکھا تھا اور جو ٹرسٹیوں کی طرف سے شائع ہونے والا تھا۔ اس مسودہ کے مشتہر کردینے کی اس لئے ضرورت تھی کہ ہندوستان کے اینگلو انڈین اخبارات اُن اختلافات کی بابت جو ٹرسٹیان کالج اور یورپین اسٹاف کے باہم تھا اس شبہ میں پڑگئے تھے کہ کالج نے اپنی پُرانی

پالیسی چھوڑ دی ہے اس مسودہ میں اُن الزامات کی صاحبزادہ صاحب نے پوری تردید کی تھی جو پالیسی کی تبدیلی کے متعلق لگائے جارہے تھے اس کارروائی کے بعد جلسہ ختم ہوگیا اور آئندہ جلسہ کی تاریخ ۲۲ر اگست مقرر کی گئی تاکہ اس وقت تک وفد کا عملی نتیجہ معلوم ہوجائے اور جملہ معاملات قطعی طور سے فیصل کئے جاسکیں ہزآنز کی خدمت میں وفد کے لیجانے کی تاریخ ۹ر اگست مقرر ہوئی وفد پیش ہونے سے پہلے نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب نے فرمایا کہ رائے عامہ نے ہزآنز پر پورا اثر کیا ہے اور وہ وفد کے مطالبات کو منظور فرمائیں گے۔

وفد کے اراکین حسب ذیل تھے :۔

۱۔ نواب وقار الملک۔

۲۔ نواب (سر) مزمل اللہ خان۔

۳۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں۔

۴۔ شیخ عبداللہ صاحب

۵۔ راجہ نوشاد علی خاں صاحب۔

۶۔ حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب۔

۷۔ مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹر۔

۸۔ خان بہادر شیخ وحید الدین صاحب۔

وفد کے باریاب ہونے پر صاحبزادہ صاحب نے ایڈریس پڑھا۔ ہزآنز نے اس کا جواب دیا اور اپنے جواب میں ٹرسٹیوں کی جملہ خواہشات پوری کردیں صاحبزادہ صاحب نے اسی وقت ہزآنز کی تقریر کا ترجمہ ٹرسٹیوں کو سُنادیا اس کے بعد ہزآنز کا شکریہ ٹرسٹیوں کی طرف سے ادا کیا اس طرح یہ اہم اور مختلف فیہ مسئلہ بخیر و خوبی طے ہوگیا جس سے ٹرسٹیوں کے اختیارات کی پوری وضاحت ہوگئی اور ان کا اقتدار پوری طرح قائم ہوگیا اس تمام جد وجہد کا جس کی اصل

روح صاحبزادہ صاحب تھے ہز آنر سر جان ہیویٹ لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ پیٹرن کالج پر ایسا اثر ہوا کہ انھوں نے صاف الفاظ میں کہدیا۔ "آپ لوگوں نے ہر معاملہ میں مجھے شکست دی"۔

۲۲ اگست ۱۹۰۹ء کو ٹرسٹیوں کا جلسہ ہوا جس میں اول وہ رزولیوشن پاس کئے گئے جن کا تعلق اس اہم مسئلہ سے تھا اُس کے بعد وہ رزولیوشن پاس کیا گیا جس کا تعلق مسٹر آرچبولڈ کے استعفے اور انگلش اسٹاف کے مشترکہ نوٹ سے تھا صاحبزادہ صاحب نے ٹرسٹیوں کے فیصلہ کا مسودہ انگریزی میں لکھا جو منظور کیا گیا صاحبزادہ صاحب نے ان چٹھیوں کا مسودہ انگریزی میں لکھا تھا جو آنریری سکریٹری کی طرف سے مسٹر آرچبولڈ کے استعفے کے متعلق اور انگلش اسٹاف کو اس کے مشترکہ نوٹ کی بابت بھیجی جانے کو تھیں یہ مسودات بھی منظور کئے گئے۔

اس کے بعد خان بہادر سید جعفر حسین صاحب نے صاحبزادہ صاحب کے لئے اس مضمون کا ایک ووٹ پیش کیا کہ اس اہم مسئلہ میں جو اہم خدمات انھوں نے انجام دیں اُس کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا جائے جو بالاتفاق پاس ہوا۔

اسی وقت سنڈیکیٹ (Syndicate) کا جلسہ منعقد ہوا تقسیم کار کے سلسلہ میں یہ تجویز کیا گیا کہ تعلیم بورڈنگ ہاؤس اور عمارت کے صیغۂ جات کی نگرانی صاحبزادہ صاحب کے سپرد کی جائے یہ بالاتفاق منظور رہا تجویز پیش کرتے ہوئے مولوی عبداللہ جان صاحب وکیل سہارنپور نے ایک تقریر کی جو صاحبزادہ صاحب کے لئے اعتماد کے ووٹ کے مرادف تھی۔

صاحبزادہ صاحب کو عمارت کی نگرانی سپرد کئے جانے پر خان بہادر سید جعفر حسین (مرحوم) پنشنر انجینیر سے جنھیں فن تعمیر کا ماہر سمجھنا چاہئے خاموش نہ رہا گیا موصوف نے سال بھر پہلے اس صیغہ کو صاحبزادہ صاحب کے سپرد کئے جانے کی مخالفت کی تھی مگر اس جلسہ میں انھوں نے اپنی حق پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے علی الاعلان فرمایا کہ صاحبزادہ صاحب کے خلاف سال گذشتہ جو کچھ انھوں نے کہا تھا وہ ان کی غلط فہمی تھی اور اصل یہ ہے کہ عمارت کے کام کو سوائے صاحبزادہ صاحب کے کوئی دوسرا انجام ہی نہیں دے سکتا۔ اس تقریر کا صاحبزادہ صاحب

پر اس قدر زیادہ اثر ہوا کہ اول اُن کے مُنھ سے ایک لفظ نہ نکل سکا بڑی دشواری سے آخر انھوں نے بس اس قدر کہا کہ میں کوئی ذمہ داری اس وقت تک قبول نہ کروں گا جب تک کہ نواب وقارالملک صاف الفاظ میں اپنی خوشی اور رضامندی کا اظہار نہ کرینگے اور یہ نہ فرماویں گے کہ میری مدد کی انھیں ضرورت ہے۔ نواب صاحب نے بھی اس پر اپنی خوشی اور رضامندی کا اظہار کیا جس پر صاحبزادہ صاحب نے تمام کاموں کی ذمہ داری جو ان کے سپرد کئے گئے تھے قبول کی۔ ٹرسٹیوں کے فیصلہ کے مطابق ذمہ داری تو صاحبزادہ صاحب نے خُدا کے بھروسہ پر یہ کہکر لے لی ؎

بھروسہ پر تری امداد کے بیڑا اُٹھایا ہے
فلک کا بوجھ اُٹھانے پر تُلا ہوں ناتواں ہوکر

لیکن انھیں وہ دشواریاں بھی اچھی طرح معلوم تھیں جن سے ان کا سامنا ہونے والا تھا یعنی ایک طرف تو یورپین اسٹاف ان کے خلاف ہونے والا تھا دوسری طرف خاص مقامی حالات ان کے سامنے تھے۔

صاحبزادہ صاحب نے اس ذمہ داری کے قبول کرنے پر فرمایا تھا۔ میں یہ سب خُدا پر چھوڑتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان اور قسمت ہے۔ میں کیا اور میری ذمہ داری کیا۔ بس مجھے حتی المقدور سعی کرنی چاہئے ہر چیز خدا کے اختیار میں ہے اور سب کا مالک وہی ہے۔

نواب وقارالملک سے اختلاف

مندرجہ بالا عنوان کے آخر میں ناظرین نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ گو صاحبزادہ صاحب نے ٹرسٹینر اور نواب وقارالملک کے متفقہ اصرار پر وہ سب ذمہ داریاں قبول کرلی تھیں جو ان کے سپرد کی گئیں لیکن ان کو مقامی حالات اور یورپین اسٹاف کی کشاکش سے اندیشہ تھا کہ شدید دشواریاں پیش آئیں گی چنانچہ ان کا وہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ بہ حیثیت ممبر انچارج بورڈنگ ہاؤس انھوں نے جو پہلی سالانہ رپورٹ پیش کی اس میں جو واقعات ان کے سامنے تھے تفصیل سے لکھے اور ڈسپلن

کی خرابیوں کو جو روز افزوں ترقی پر تھیں ظاہر کر دیا۔ بدقسمتی سے نواب وقارالملک بہادر نے اس رپورٹ کو اپنے عہد کی کارگزاری پر ایک حملہ خیال کر لیا۔ حالانکہ اس رپورٹ کا منشا رکسی طرح بھی نواب صاحب موصوف کی تنقیص نہ تھی لیکن نواب محسن الملک مرحوم کے آخری زمانہ سے کالج کے دفتری و تعلیمی اسٹاف کے بعض ممبروں نے چند مقامی و بیرونی ٹرسٹیوں کو اپنا آلۂ کار بنا لیا تھا اور اس ذریعہ سے وہ آنریری سکریٹری کالج سے اپنے ناجائز مفاد کبھی کبھی حاصل کر لیتے تھے۔ انھوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر کوشش کی کہ نواب صاحب اور صاحبزادہ صاحب کے درمیان جو غلط فہمی ہو گئی تھی اس کو ایک معرکہ خیز ہنگامہ بنا دیں۔ اخبارات میں مضامین شائع ہونے لگے اور اسلامی پبلک میں کالج کی طرف سے انتشار کے آثار نظر آنے لگے۔ آخرکار ٹرسٹیوں کا ایک جلسہ ۱۸ ستمبر سنہ ۱۹۱۰ء کو منعقد ہوا جس میں سربرآوردہ ٹرسٹیز کثرت سے جمع ہوئے اور بہت کچھ گفت و شنید کے بعد مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں آف محمود آباد اور نواب محمد اسحاق خاں مرحومین کی سرگرم کوشش اور توجہ سے جو غلط فہمی کہ نواب صاحب اور صاحبزادہ صاحب میں پیدا ہو گئی تھی خیر و خوبی کے ساتھ دفع ہو گئی شاید ایسے ہی کسی موقع کے واسطے لسان الغیب شیراز نے یہ کہا تھا ؎

شکر ایزد کہ میانِ من و او صلح فتاد
حوریاں رقص کناں ساغرِ پیمانہ زدند

(نوٹ) راقم الحروف اس جلسہ میں شریک اور عینی شاہد اس کیفیت کا تھا جو اکثر ٹرسٹیوں پر صلح ہو جانے سے فرحت پیدا کر رہی تھی اور معدودے چند اصحاب جو دفتری سازشوں کا آلۂ کار بن گئے تھے اس وجہ سے پشیمان نظر آتے تھے کہ اُن کی شر انگیزیاں ناکام رہیں نواب وقارالملک نے اپنی حق پسندی سے آخرکار یہ طے فرمایا کہ اب جب کہ یہ قضیہ نامرضیہ بخیر و خوبی ختم ہو گیا ہے تو میں اب ان تمام کاغذات کو اس طرح دفن کر دوں گا کہ وہ پھر منظر عام پر نہ لائے جا سکیں۔ میں نواب صاحب کے اس جذبۂ حق پرستی کا احترام کر کے تفصیلات سے اجتناب کرتا ہوں ورنہ "در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست" حبیب اللہ

مسلم یونیورسٹی کا ابتدائی خیال

یوں تو علیگڈھ میں اسکول قائم کرنے سے پہلے ہی سرسید علیہ الرحمۃ نے مسٹر سید محمود کی مدد سے مسلم یونیورسٹی

کی مکمل اسکیم تیار کر لی تھی مگر ابتدا اسکول ہی سے کی گئی اسکول سے کالج بنا مگر سرسید مرحوم ومغفور کی حیات میں ایسا موقع نہ ملا کہ یونیورسٹی کی طرف علیگڈھ کا قدم بڑھتا۔ آخر کار مارچ ۱۸۹۸ء میں سرسید اعظم کی وفات کا الناک سانحہ پیش آیا اس کے بعد ہی "سرسید میموریل فنڈ" کی تحریک شروع کر دی گئی جس میں یہ تجویز کیا گیا کہ دس لاکھ روپیہ جمع کر کے علیگڈھ میں مسلم یونیورسٹی قائم کی جائے چنانچہ ڈھائی لاکھ کے قریب چندہ ہوا لیکن اسی دوران میں لارڈ کرزن وائسرائے ہند نے ایک تعلیمی کمیشن مقرر کیا تھا جس کی رپورٹ کا یہ منشا تھا کہ یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے کثیر رقم کی شرط رکھی جائے اس کے سوا حکومت نے قومی یونیورسٹی دینے سے قطعی انکار کیا تھا چنانچہ بڑی وجہ یہ تھی کہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کا خیال اس وقت سرد ہو کر قریب قریب فراموش سا ہو گیا تھا لیکن چونکہ ہر بات کا وقت مقرر ہوتا ہے ۱۹۱۱ء میں اس خیال نے یکایک ایک غیر معمولی قوت کے ساتھ عملی شکل اس طرح اختیار کی کہ "ہز ہائی نس سر آغا خاں" نے ناگپور میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں اعلان کیا کہ علیگڈھ کالج کو مسلم یونیورسٹی بنا دینے کے لئے تیس لاکھ روپیہ قوم سے بذریعہ چندہ کے جمع کیا جائے اسی کے ساتھ یہ تجویز کی کہ آئندہ دربار تاجپوشی کے وقت شاہنشاہ معظم کے حضور میں حاضر ہو کر مسلم یونیورسٹی کا فرمان شاہی (Charter) عطا کئے جانے کی استدعا کی جائے درحقیقت یہ ایسی عظیم الشان تجویز تھی کہ اُس نے مدتوں کی آرزو میں ایک تازہ جان ڈال دی اور تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں روح پھونک دی۔ اس کے بعد ہی ہز ہائی نس سر آغا خاں نے یہ تجویز بھی کی کہ مطلوبہ رقم فراہم کرنے کی غرض سے تمام صوبجات کو وفد روانہ کئے جائیں اسی سلسلہ میں ہمیں اختصار کے ساتھ یہ دکھانا ہے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے مسلم یونیورسٹی کی اسکیم کے کامیاب بنانے میں کیا عملی حصہ لیا اس اسکیم کے اصل دو بڑے کام یہ تھے کہ اول سرمایہ جمع کیا جائے اور پھر گورنمنٹ سے یونیورسٹی کی باضابطہ اجازت حاصل کی جائے۔

ویسے تو یونیورسٹی کے لئے سرمایہ جمع کرتے رہنے میں صاحبزادہ صاحب کی گویا عمر ہی صرف

ہوگئی بڑے بڑے عطیات اور چندے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے لیکن یہاں پر ہم صرف صاحبزادہ صاحب کی وہ جد وجہد دکھانا چاہتے ہیں جو انھوں نے یونیورسٹی کے قائم ہونے سے قبل سرمایہ فراہم کرنے میں کی۔

لاہور کا وفد چونکہ سرسید احمد علیہ الرحمۃ اہل پنجاب کو "زندہ دلان پنجاب" کہا کرتے تھے اس لئے سب سے اول لاہور جانے کا ارادہ کیا گیا لیکن خط وکتابت سے وہاں کے مسلمان راضی نہ ہوئے تب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب ۲۴ر جنوری ۱۹۱۱ء کو خود لاہور گئے اور وہاں کے مقتدر اصحاب کو آمادہ کرلیا چنانچہ ان کی دعوت پر یہ وفد آخر فروری میں لاہور گیا جس میں ہز ہائی نس آغا خاں۔ نواب وقارالملک۔ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں اور دوسرے ارکین شامل تھے لاہور میں وفد کا ایسے جوش اور دھوم سے استقبال کیا گیا کہ دیکھنے والوں کو وہ منظر کبھی نہ بھولے گا ۲۴ر فروری ۱۹۱۱ء کو ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں دو لاکھ پچاس ہزار کا چندہ ہوا اور لاہور والوں نے ثابت کردیا کہ وہ فی الواقع زندہ دلان پنجاب ہیں۔ لاہور سے واپس آکر صاحبزادہ صاحب نے اغراض و مقاصد یونیورسٹی پر ایک رسالہ لکھا اور اس کو طبع کراکر ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے نہایت کثیر تعداد میں تمام ملک میں شائع کیا اس رسالہ سے مسلمانوں پر نہایت گہرا اثر ہوا اور وہ یونیورسٹی کی امداد کی طرف متوجہ ہوئے۔

اب یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ملک کے بڑے بڑے مقامات میں مجوزہ یونیورسٹی کیلئے وہ خود جائیں چنانچہ لاہور کے بعد ان کا سلسلہ شروع ہوگیا ذیل میں ان چند مقامات کی فہرست دی جاتی ہے جن کے چندہ کی رقوم معلوم ہیں۔

نام مقام	تاریخ جلسہ	نام اراکین وفد	رقوم چندہ
سہارنپور	۸ر مارچ ۱۹۱۱ء	صاحبزادہ آفتاب احمد خاں	۷۰ ہزار روپیہ
کراچی	۱۱ر "	مہاراجہ سر محمد علی خاں۔ راجہ محمود آباد۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں	ایک لاکھ "

نام مقام	تاریخ جلسہ	نام اراکین وفد	رقوم چندہ
کوئٹہ (بلوچستان)	اپریل ۱۹۱۱ء	صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مولوی بشیر الدین مولوی سید سلیمان اشرف	۴۰ ہزار روپیہ
بمبئی	۳۰ اپریل ۱۹۱۱ء	نواب وقار الملک صاحبزادہ آفتاب احمد خاں حاجی محمد موسیٰ خاں	۱۲ ہزار ״
بدایوں	۷ مئی ״	صاحبزادہ آفتاب احمد خاں	۱۹ ہزار ״
مرادآباد	۲۷ مئی ״	مہاراجہ سر محمد علی خاں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں	۳۲ ہزار ״
کانپور	۳ جون ״	״ ״	۳۳ ہزار ״
شاہجہانپور	۱۶ ستمبر ״	״ ״ ״	۱۲ ہزار ״

ان مقامات کے علاوہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب امرتسر، جالندھر اور آگرہ گئے اور وہاں سے چندہ لائے۔ ان وفود کا اثر یہ ہوا کہ مسلم یونیورسٹی کی تحریک تمام ملک میں پھیل گئی اور اپنے اپنے مقامات پر لوگوں نے جلسے کرکے چندے کرنے شروع کردئے جلسوں کے لئے عمدہ تقریروں کے نمونہ کی ضرورت تھی صاحبزادہ صاحب کی تقریروں کی تمام ملک میں دھوم تھی ہر طرف سے ان کی تقریروں کی مانگ ہوئی وہ چونکہ لکھی ہوئی نہ تھی اس لئے آپ نے یونیورسٹی کے مقاصد اور اس کی ضروریات پر ایک مفصل تقریر لکھی اور اس میں اس قدر زیادہ مسالہ جمع کردیا کہ اسے دیکھ کر جو اصحاب چاہیں اپنی تقریریں جلسوں کے لئے مرتب کرلیں صاحبزادہ صاحب کی یہ نمونہ کی تقریر چھپتر صفحات پر ایک رسالہ میں چھاپ کر کالج کی طرف سے ملک میں تقسیم کی گئی جس کی وجہ سے اس مسئلہ میں بڑی رہنمائی کے ساتھ کامیابی ہوئی۔

گورنمنٹ میں مسلم یونیورسٹی کے واسطے جدوجہد

مسلمان اگر مطلوبہ سرمایہ جمع بھی کرلیتے تو اس سے کیا ہوسکتا تھا جب تک کہ گورنمنٹ یونیورسٹی کے قواعد وضوابط (Constitution) منظور نہ کرلیتی اور

یہی وہ کڑی منزل تھی جس کے طے کرنے میں دور اندیشی قابلیت اور ہمت کی ضرورت تھی اس کوشش میں بڑے بڑے باثر اشخاص کا ہاتھ تھا۔ ہمیں اس ضمن میں یہ دکھانا ہے کہ صاحبزادہ صاحب کی تدبیر اور حُسن سعی کا اس کی کامیابی میں کیا حصہ رہا۔

مسلم یونیورسٹی کا کانسٹی ٹیوشن

۱۵-۱۶ اپریل ۱۹۱۱ء کو صاحبزادہ صاحب مسلم یونیورسٹی کی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی میں شریک ہوئے جس کے صدر مہاراجہ صاحب محمود آباد تھے چونکہ کمیٹی کے جلسہ میں نہایت اہم معاملات طے ہونے والے تھے اس لئے نواب وقارالملک نے خصوصیت کے ساتھ صاحبزادہ صاحب سے خواہش کی تھی کہ وہ ضرور شریک ہوں۔ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے ممبران، ہزہائی نس سر آغا خاں نے نامزد کئے تھے اس کمیٹی کے سکریٹری شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی (مرحوم) تھے ڈاکٹر بلگرامی صاحب نے مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن کا مسودہ تیار کیا تھا اور اسی مسودہ پر اس جلسہ میں غور و بحث ہونے والی تھی۔

اس جلسہ میں ممبران کمیٹی کو ہزہائی نس سر آغا خاں کی ایک چٹھی پر غور کرنا تھا جو ڈاکٹر بلگرامی کے نام موصول ہوئی تھی اس میں ہزہائی نس آغا خاں نے چند مشورہ دئے تھے جن کے مطابق مسلم یونیورسٹی کا کانسٹی ٹیوشن تیار کیا جاتا پہلا مشورہ یہ تھا کہ یونیورسٹی کے چانسلر وائسرائے ہند بنائے جائیں اور ان کو ویٹو (veto) کا اختیار دیا جائے یعنی یونیورسٹی کے جس فیصلہ کو وائسرائے چاہیں مسترد کردیں جہاں تک اس مشورہ کا تعلق تھا کمیٹی کے سب اراکین نے اس شرط کو منظور کرلیا تھا لیکن صاحبزادہ صاحب نے اپنا فرض سمجھا کہ اس مشورہ کے مان لینے میں جو خطرات تھے وہ بھی اراکین کے سامنے بیان کردیں انھوں نے کہا کہ اگر وائسرائے یونیورسٹی کے چانسلر کردئے گئے تو پھر اُن سے وہ اختیارات جو ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں کو عموماً یونیورسٹی ایکٹ کے موافق حاصل ہیں بچانا دشوار ہوگا یعنی دوسرے الفاظ میں وائسرائے کو جملہ اختیارات حاصل ہوجائیں گے اس مضمون پر صاحبزادہ صاحب

پہلے ہی ایک چھٹی لکھ چکے تھے جس کی ایک نقل وہ ہز ہائی نس سر آغا خاں کو بھیج چکے تھے لیکن باوجود اس کے کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے اس جلسہ میں ہز ہائی نس سر آغا خاں کا یہ مشورہ منظور کر لیا گیا یعنی یہ کہ وائسرائے مسلم یونیورسٹی کے چانسلر ہوں اور اُن کو "ویٹو" کا اختیار دیا جائے ہز ہائی نس سر آغا خاں نے یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ چانسلر کو یہ اختیار بھی دیا جائے کہ یونیورسٹی کی حکمراں جماعت کے بعض ارکین کو وائسرائے نامزد کیا کریں۔ وائس چانسلر بھی وہی مقرر کیا کریں اور پروفیسروں کا تقرر بھی وہی کیا کریں لیکن ہز ہائی نس سر آغا خاں کے ان مشوروں کو کمیٹی نے منظور نہیں کیا اس کے بعد ڈاکٹر سید علی بلگرامی کے مسودہ کانسٹی ٹیوشن پر بحث شروع ہوئی اور بہت سی ضروری باتوں سے اتفاق کیا گیا لیکن آخری اور قطعی فیصلہ کے لئے آئندہ مئی کا مہینہ مقرر ہوا اور یہ تجویز ہوئی کہ ایک خاص کمیٹی مقرر کی جائے جس کے ارکین مہاراجہ صاحب محمود آباد، نواب وقار الملک، ڈاکٹر سید علی بلگرامی، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ہوں اور یہ انتظام کیا جائے کہ ماہ مئی کے پہلے ہفتے میں بمقام شملہ یہ ارکین سر ہارکورٹ بٹلر ممبر تعلیمات گورنمنٹ ہند سے ملاقات کریں اور یہ معلوم کریں کہ وائسرائے کا مسلم یونیورسٹی کی طرف سے کیا خیال ہے۔ جب یہ معلوم ہو جائے تو کانسٹی ٹیوشن کا مسودہ جملہ ارکین کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کو بھیجا جائے اس کے بعد آخری اور قطعی فیصلہ کی غرض سے ماہ مئی میں کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا اجلاس کیا جائے واقعہ یہ تھا کہ یہ کام سب سے زیادہ مشکل تھا کہ گورنمنٹ اور قوم کے نقطہ خیال کو ملحوظ رکھ کر یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط اور قانون کو بنایا جائے یونیورسٹی ایکٹ کا ایک مسودہ ڈاکٹر سید علی بلگرامی نے کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کو بھیجا تھا اس ایکٹ کے متعلق ۱۵-۱۶ اپریل ۱۹۱۱ء کو جلسہ کیا گیا اور غور و بحث کے بعد اس مسودہ میں بہت سی تبدیلیاں کی گئیں لیکن صاحبزادہ صاحب کو یہ تبدیل شدہ مسودہ بھی پسند نہ تھا کیونکہ اس میں نہایت ضروری فروگذاشتیں تھیں اس لئے خود صاحبزادہ صاحب کو ایک مسودہ تیار کرنا پڑا۔

شملہ کی پہلی کانفرنس

۱۰ مئی ۱۹۱۱ء کو صاحبزادہ صاحب، نواب وقار الملک اور

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب علیگڈھ سے شملہ کو روانہ ہوئے تاکہ سر ہارکورٹ بٹلر ممبر تعلیمات سے تبادلہ خیالات کریں۔ یہ معاملہ اہم تھا کیونکہ ابھی تک یہ معلوم نہ تھا کہ مجوزہ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے گورنمنٹ کا خیال کیا تھا اسی لحاظ سے صاحبزادہ صاحب نے اچھی طرح سے تیاری کرلی تھی وہ ۱۱ مئی ۱۹۱۱ء کو شملہ پہنچے مہاراجہ صاحب محمود آباد شملہ میں پہلے سے موجود تھے شملہ پہنچتے ہی کانسٹی ٹیوشن کے متعلق پہلے آپس میں مشورہ ہوا اور ۲۲ مئی کو علی الصباح صاحبزادہ صاحب نے کانسٹی ٹیوشن کے متعلق کچھ نوٹ لکھے اور ایک بجے سر ہارکورٹ بٹلر سے سب اراکین ملے مسٹر شارپ بھی موجود تھے جو پہلے مشرقی بنگال میں سررشتہ تعلیمات کے ڈائرکٹر رہ چکے تھے اور اب صیغہ تعلیم گورنمنٹ آف انڈیا کے انڈر سکریٹری تھے سب سے پہلے صاحبزادہ صاحب نے ایک تقریر کی جس میں یونیورسٹی کی تحریک کی وضاحت کی اور مسلمانوں کے موجودہ تنزل کے وجوہ اور ان کے واسطے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت اور قومی یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان کی علیگڈھ کالج نے جو کچھ ترقی اس وقت تک کی تھی اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور اس کی بناء پر یونیورسٹی قائم کرنے کا استحقاق ثابت کیا۔ منجملہ دیگر امور کے صاحبزادہ صاحب نے یہ بھی کہا کہ مسلمان اپنی جداگانہ یونیورسٹی اس وجہ سے چاہتے ہیں کہ وہ مذہبی تعلیم کی ضرورت کو بہت زیادہ محسوس کرتے ہیں جس کا انتظام ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں میں نہیں ہے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مسلمان مذہبی تعلیم بالخصوص اس وجہ سے چاہتے ہیں کہ بغیر اس تعلیم کے آزاد اور مکمل تعلیم نہیں ہوسکتی ہے دوسری یونیورسٹیوں کو مسلمانوں کے مرض کے علاج کے لئے ناکافی بتاتے ہوئے صاحبزادہ صاحب نے لارڈ کرزن کے اس مشہور مقولہ کا حوالہ دیا کہ "مسلمانوں کو ابھارنے اور ترقی دینے کے لئے مصنوعی کلیں تیار نہیں کی جاسکتی ہیں۔"

صاحبزادہ صاحب کی یہ تقریر اس قدر مفصل اور بسیط تھی کہ کانفرنس کی یہ اول نشست اس کے واسطے کافی نہ ہوئی اور لنچ کے بعد جو سر ہارکورٹ بٹلر نے اراکین کو دیا تھا پھر سلسلہ

تقریر شروع ہوا جب یہ تقریر ختم ہوئی تو سرہارکورٹ بٹلر نے کہا کہ صاحبزادہ صاحب نے اپنی تقریر میں جو جو باتیں بیان کی ہیں ان کی مکمل یادداشت پیش کی جائے تاکہ رائے کا اظہار کیا جاسکے صاحبزادہ صاحب نے کہا" ہم نے ایک مسودہ تیار کیا ہے جو کل پیش کیا جائے گا"۔

جب اراکین سرہارکورٹ بٹلر کے دفتر کے کمرے سے باہر آئے تو نواب وقارالملک نے صاحبزادہ صاحب سے کہا۔ "آفتاب احمد خاں ذرا جھک جاؤ"۔ صاحبزادہ صاحب جھک گئے نواب وقارالملک نے صاحبزادہ صاحب کی پیشانی چوم لی یہ ثبوت تھا اس اضطراری اثر کا جو نواب صاحب کے قلب پر صاحبزادہ صاحب کی قابلیت اور تقریر سے پڑا تھا۔

صاحبزادہ صاحب اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں" نواب وقارالملک کے اس اظہار محبت اور قدردانی پر میں حیران رہ گیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری ناچیز تقریر کا نواب صاحب پر ایسا اثر پڑا کہ اُن سے ضبط نہ ہوسکا اور اُسی اضطرار کی حالت میں انھوں نے میری پیشانی کو بوسہ دیا" رات کے بڑے حصہ میں صاحبزادہ صاحب نے کانسٹی ٹیوشن کے مسودہ پر پھر غور کیا ۱۳ر مئی کو گیارہ بجے اراکین سرہارکورٹ بٹلر سے ملے اور کانسٹی ٹیوشن اور ایکٹ کے مسودے پیش کئے یہ مسودے جو ابتدا ہی میں لکھے گئے تھے اور کانسٹی ٹیوشن کمیٹی میں پہلی دفعہ پیش ہوئے تھے دراصل نامکمل اور ناقص تھے اور اب صاحبزادہ صاحب کو از سرنو لکھنے پڑے تھے چنانچہ اس وقت جو مسودے سرہارکورٹ بٹلر کے سامنے پیش کئے گئے وہ صاحبزادہ صاحب ہی کے لکھے ہوئے تھے۔

سرہارکورٹ بٹلر نے مسودوں پر ایک نظر ڈالی اور کہا "اس بات سے تو میں حیرت زدہ ہوگیا ہوں کہ تمام بڑے بڑے اختیارات تو آپ لوگوں نے خود لے لئے ہیں اور گورنمنٹ کے واسطے بہت کم چھوڑا ہے" اور پھر سرہارکورٹ بٹلر نے بہ تکرار کہا "ہندوستانی یونیورسٹیوں میں تو چانسلر کو بڑے بڑے اختیارات حاصل ہیں اسّی فیصدی یونیورسٹی کے فیلو اور نیز وائس چانسلر وہی مقرر کرتا ہے۔ یہی اختیارات چانسلر کو مسلم یونیورسٹی سے بھی ملنے چاہئیں" اسکے

جواب میں صاحبزادہ صاحب نے کہا ہندوستان کی یونیورسٹیاں قومی یونیورسٹیاں نہیں ہیں لیکن مسلم یونیورسٹی تو قومی یونیورسٹی ہوگی بالآخر سرہارکورٹ ٹبلر نے کہا " اچھا میں آپ کے مسودات پہلے بغور پڑھ لوں تو پھر اُن پر بحث اور لحاظ کروں گا چنانچہ اس کے واسطے ۱۶ ار مئی مقرر کی گئی۔

سرہارکورٹ ٹبلر سے گفتگو کے لئے صاحبزادہ صاحب کی تیاری

۱۴ اور ۱۵ ار مئی ۱۹۱۱ء کو صاحبزادہ صاحب نے ۱۶ ار مئی کے معرکہ کے لئے تیاری کی اور مسٹر (سر) علی امام سے ملاقات کر کے یونیورسٹی کے متعلق جملہ امور ان کو سمجھادئے اور مسٹر سید علی امام اُس زمانہ میں گورنمنٹ آف انڈیا کے ممبر قانون تھے اور انھوں نے ضروری باتیں نوٹ کرلیں تاکہ وائسرائے کی کونسل میں جب معاملہ پیش ہو تو وہ مفصل رپورٹ پیش کر سکیں۔

۱۵ ار مئی کی رات کو سرہارکورٹ ٹبلر نے ڈنر دیا جس میں صاحبزادہ صاحب شریک ہوئے اور ڈنر میں مسٹر (سر) علی امام۔ مسٹر جنکنس ہوم ممبر اور سرہارکورٹ بٹلر کے انڈر سکریٹری مسٹر شارپ مہاراجہ صاحب محمود آباد۔ نواب وقار الملک۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب بھی شریک تھے سرہارکورٹ ٹبلر نے مسلم یونیورسٹی کا نسٹی ٹیوشن پر بحث چھیڑی جس میں مسٹر جنکنس اور مسٹر علی امام نے بھی حصہ لیا۔ سرہارکورٹ ٹبلر تو یہ کہتے تھے کہ گورنمنٹ کو زیادہ اختیارات دئے جائیں لیکن صاحبزادہ صاحب اس کے خلاف تھے اور اختلاف کے دلائل دیتے جاتے تھے۔ مسٹر علی امام نے صاحب زادہ صاحب کی رائے سے موافقت کی اور مسٹر جنکنس کی رائے بین بین تھی آخر نتیجہ یہ ہوا کہ صاحبزادہ صاحب نے جو وہ چاہتے تھے قریب قریب حاصل کرلیا سرہارکورٹ ٹبلر نے اس بات پر بہت زور دیا کہ پروفیسروں کے تقرر کا اختیار چانسلر کو دیا جائے وہ اس پر بھی زور دیتے رہے کہ تمام اعلیٰ اختیارات سینٹ (Senate) کو دئے جائیں اور کورٹ (Court) کی مجلس صرف نمائشی ہو۔ ۱۲ بجے شب تک یہی بحث ہوتی رہی جب رخصت ہونے لگے تو مہاراجہ صاحب محمود آباد نے سرہارکورٹ ٹبلر سے کہا کہ کل کے جلسہ میں مسٹر

جنکنس اور مسٹر علی امام بھی شریک کئے جائیں سر ہار کورٹ ٹبلر نے یہ بات مان لی ان دونوں سے بڑی مدد ملنے کی توقع تھی کیونکہ مسلم یونیورسٹی کے یہ دونوں حامی تھے۔

۱۶ مئی کو حسب قرار داد سر ہار کورٹ ٹبلر کے دفتر میں ٹھیک گیارہ بجے کانفرنس شروع ہوئی صاحبزادہ صاحب نے تمام دشواریاں تفصیل کے ساتھ بیان کیں جو سر ہار کورٹ ٹبلر کی سمجھ میں اچھی طرح آ گئیں اور دو گھنٹہ کے مباحثہ کے بعد جملہ امور طے ہو گئے۔

چانسلر کے اختیارات

اصل معرکہ کی بات اختیارات تھے جو چانسلر کی حیثیت سے وائسرائے کو دیئے جانے کو تھے اس مباحثہ میں یہ طے ہوا کہ علیگڈھ کے موجودہ قواعد و ضوابط کی رو سے سر سید علیہ الرحمۃ نے جو اختیارات لوکل گورنمنٹ کو دینے منظور کئے تھے وہ سب اختیارات مسلم یونیورسٹی کے چانسلر کو دئے جائیں صاحبزادہ صاحب نے اس بات پر بھی رضامندی ظاہر کی کہ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے سامنے یہ بات پیش کی جائے گی کہ جملہ تقررات میں جن کا پروفیسروں سے تعلق ہوگا چانسلر سے منظوری حاصل کی جائے لیکن اس موقع پر نواب وقار الملک بہادر مضطرب تھے اور آمادہ تھے کہ پروفیسروں کے علاوہ بھی جملہ تقررات چانسلر کی منظوری کے تابع کر دئے جائیں اس سے صاحبزادہ صاحب نے فوراً اختلاف کیا اور صرف پروفیسروں کی منظوری تک چانسلر کے اختیارات محدود رکھنے کو ترجیح دی سر ہار کورٹ ٹبلر اس پر مُصر تھے کہ وائس چانسلر کے تقرر کی منظوری کا اختیار چانسلر ہی کو دیا جائے یہ وہ اختیار تھا جو کانسٹی ٹیوشن کمیٹی پہلے سے چانسلر کے لئے منظور کر چکی تھی لیکن صاحبزادہ صاحب نے کہا کہ یہ معاملہ بھی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے سامنے پیش کیا جائے۔

صاحبزادہ صاحب کی دور اندیشی

کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ اس مرحلہ تک۔ صاحبزادہ صاحب کی قابلیت، دور اندیشی، محنت اور کوشش سے اس اہم معاملہ میں بڑی کامیابی ہوئی یعنی اصل اختیار یونیورسٹی کی حکمراں اور منتظم جماعت یعنی کورٹ کے ہاتھ میں رہا اور چانسلر کو جو اختیارات دئے گئے اُن میں گورنمنٹ اور مسلم یونیورسٹی کے اغراض مشترک اور مساوی تھے۔

کانسٹی ٹیوشن کی ترتیب

۱۰؍جولائی ۱۹۱۱ء کو صاحبزادہ صاحب لکھنؤ ہوتے ہوئے محمود آباد پہنچے اور مسلم یونیورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن کی ترتیب میں برابر مصروف رہے۔ محمود آباد میں نواب وقارالملک۔ مولوی عزیز مرزا صاحب اور ڈاکٹر ضیاءالدین احمد صاحب بھی موجود تھے نواب وقارالملک کی رائے تھی کہ ہر ایک بات جماعت منتظمہ کے اختیار میں دی جائے اور جہاں تک ممکن ہو اسٹاف کو کم اختیارات دئے جائیں لیکن صاحبزادہ صاحب کو اس سے اختلاف تھا کیونکہ ان کو یقین تھا کہ یہ پالیسی آخر میں خطرناک ثابت ہوگی۔ ۲۰؍جولائی ۱۹۱۱ء کو آخر کار یہ مسودہ مکمل ہوگیا اور طے ہوا کہ اب یہ طبع کیا جائے اور کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے ارکین کے پاس بھیجا جائے اور ۷؍اگست کو کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کی جائے جس میں آخری فیصلہ کیا جائے۔

کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا انعقاد

۷؍اگست ۱۹۱۱ء کو کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے اراکین لکھنؤ پہنچ گئے۔ قیصر باغ میں قیام ہوا مہاراجہ صاحب محمود آباد نے نہایت فراخدلی سے میزبانی کی۔ ۱۰؍اگست سے ۲۰ اگست تک کمیٹی کی برابر کارروائی ہوتی رہی۔ دن رات کانسٹی ٹیوشن کے مسودہ پر غور اور بحث ہوتی رہی ہندوستان کے مختلف صوبجات سے تیئس۲۳ ممبر آئے تھے اور سب ہی اس قومی کام میں اتحاد، انہماک اور نیک نیتی سے کام کر رہے تھے بالآخر جملہ امور اس طرح طے ہوئے کہ سب اراکین نے اپنا اطمینان ظاہر کیا اور ۲۰؍اگست کو سب کام ختم ہوگیا۔

اس جلسہ کے صدر مہاراجہ صاحب محمود آباد تھے اُن کے سلیقہ، استقلال اور اخلاق کا سب پر اثر ہوا اور مہاراجہ صاحب کی قدر و منزلت دلوں میں بہت بڑھ گئی مسلم یونیورسٹی کی تجویز میں ہر پہلو سے مہاراجہ صاحب نے جس طرح عملی حصہ لیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔

شملہ کی پہلی کانفرنس میں سر ہارکورٹ ٹیلر کے سامنے یہ طے ہوا تھا کہ پروفیسروں کا تقرر پورے طور پر ٹرسٹیوں کے ہاتھ میں نہ رہے بلکہ جب وہ کسی نئے پروفیسر کا تقرر کریں تو چانسلر

کو اطلاع دیں اور اگر چانسلر ایسے تقررات مناسب خیال نہ کرے تو اُسے نامنظور کردینے کا اختیار ہوگا لیکن ۲۰ کو سر ہارکورٹ بٹلر نے مہاراجہ محمود آباد کو لکھا کہ چانسلر کے لئے صرف اس اختیار کہ اگر وہ مناسب خیال کرے تو تقرر نامنظور کردے پسندیدہ نہیں ہے بلکہ چانسلر کو یہ اختیار ہونا چاہئے کہ وہ پروفیسر کا تقرر ابتداہی سے خود کرے چنانچہ جب یہ معاملہ لکھنؤ کی متذکرہ میٹنگ میں پیش ہوا تو چانسلر کو ایسا اختیار دینا مناسب معلوم نہ ہوا۔ پس لکھنؤ کے جلسہ میں یہ طے کیا گیا کہ چونکہ دفعہ ۱۰ کی رو سے چانسلر کو خاص شرائط کے ساتھ پروفیسر کا تقرر نامنظور کردینے کا اختیار کانسٹی ٹیوشن میں دیا گیا ہے اس لئے اب ضرورت نہیں ہے کہ چانسلر کو "ویٹو" یعنی کل کارروائی کالعدم کردینے کا اختیار دیا جائے کانسٹی ٹیوشن کا وہ مسودہ جو لکھنؤ کے جلسہ میں پاس ہوا تھا اب سر ہارکورٹ بٹلر کو بھیجا گیا اور مہاراجہ صاحب محمود آباد نے جملہ ممبران کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کو شملہ آنے کے لئے مدعو کیا تاکہ قطعی طور پر سر ہارکورٹ بٹلر سے معاملہ طے کیا جائے۔

۲۲ ستمبر ۱۹۱۱ء کو صاحبزادہ صاحب شملہ پہنچے اور وہاں یہ معلوم ہوا کہ جو ممبر شملہ میں موجود تھے اُن کی یہ رائے تھی کہ تقرر کے معاملہ میں سر ہارکورٹ بٹلر کی رائے کا اتباع کیا جائے صاحبزادہ صاحب کو یہ بھی معلوم ہوا کہ مہاراجہ صاحب محمود آباد کی بھی یہی رائے تھی۔

۲۳ ستمبر کو جلسہ شوریٰ کیا گیا جس میں صاحبزادہ صاحب نے دیکھا کہ اراکین کی اکثریت اس پر آمادہ تھی کہ گورنمنٹ کی خواہش مان لی جائے اور ان اراکین کو اب اس بات کا مطلق لحاظ نہ تھا کہ لکھنؤ کے جلسہ میں وہ کیا طے کرچکے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر صاحبزادہ صاحب نے اپنی تقریر میں مدلل طریقہ سے اراکین کو بتایا کہ اسٹاف کو قطعی طور پر اختیار میں رکھنے کی اشد ضرورت اور مصلحت ہے ورنہ تقرر کا اختیار گورنمنٹ کے ہاتھ میں چلے جانے سے اسٹاف پر دوسرا اثر پڑے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ تنہا صاحبزادہ صاحب کیا کرسکتے تھے جبکہ اراکین کی اکثریت پہلے ہی اپنی رائے قائم کرچکی تھی تاہم صاحبزادہ صاحب کی کوشش اور تقریر سے اتنا تو ہوا کہ اراکین نے اس بات سے اتفاق کیا کہ چونکہ اُسی دن سہ پہر کو سر ہارکورٹ بٹلر سے ملاقات ہونے کو تھی اس لئے

اس وقت اُنھیں کوئی صاف جواب نہ دیا جائے بلکہ پہلے یہ دیکھا جائے کہ وہ چاہتے کیا ہیں اس کے بعد دوسرے دن کے جلسہ میں صاف جواب دیا جائے۔

ساڑھے تین بجے سہ پہر کو سرہارکورٹ ٹبلر سے اراکین ملے۔ دو گھنٹہ کانفرنس رہی اور سرہارکورٹ ٹبلر نے گورنمنٹ کے تعلق اور اختیارات کی وضاحت کی۔ اراکین نے سب باتیں نوٹ کرلیں اور یہ پہلا جلسہ ختم ہوا۔

۲۴ ستمبر کو اراکین نے پھر ایک جلسہ شوریٰ کیا جو پانچ گھنٹہ تک ہوتا رہا اس میٹنگ میں اکثریت کی یہ رائے تھی کہ تقرر پروفیسروں کے بارے میں گورنمنٹ کے اختیار کو مان لیا جائے لیکن صاحبزادہ صاحب یہی اصرار کرتے رہے کہ جو کچھ گورنمنٹ مانگتی ہے وہ سب ایک دم دیدینے پر ہرگز رضامندی نہ دی جائے اور پہلے اُن اراکین کانسٹی ٹیوشن کمیٹی سے رائے لی جائے جو اُس وقت شملہ میں موجود نہ تھے مگر صاحبزادہ صاحب کی اس رائے کو اکثریت نے نہیں مانا بالآخر ووٹ لئے گئے تو نواب وقارالملک بہادر خاموشی کے ساتھ علیحدہ ہوگئے اور کسی طرف ووٹ نہ دیا صاحبزادہ صاحب کو صرف تین ووٹ مولانا محمد علی، مولوی عزیز مرزا اور مسٹر نبی اللہ کے ملے ایسی شکست پر بھی صاحبزادہ صاحب نے اراکین کو یہ مان لینے پر مجبور کیا کہ سرہارکورٹ ٹبلر کے سامنے بحث شروع ہونے سے پہلے جلسہ میں صاحبزادہ صاحب کو تقریر کا موقع دیا جائے تاکہ سرہارکورٹ ٹبلر اس بات پر آمادہ کئے جاسکیں کہ گورنمنٹ پروفیسروں کے تقرر کے سوال پر نظرثانی کرے۔

دوسرے دن کے جلسہ میں سرہارکورٹ ٹبلر کے سامنے صاحبزادہ صاحب نے پون گھنٹہ تقریر کی اور کہا کہ تقرر کے مسئلہ پر وہ گورنمنٹ سے نظرثانی کرنے کو کہیں۔ صاحبزادہ صاحب کی تقریر کا اثر اراکین پر بھی ہوا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہاراجہ صاحب محمودآباد نے سرہارکورٹ ٹبلر سے وہی درخواست کی جو صاحبزادہ صاحب نے کی تھی اور نتیجہ یہ ہوا کہ باوجودیکہ ممبروں کی اکثریت اس بات پر آمادہ تھی کہ پروفیسروں کے تقرر کے اختیارات گورنمنٹ کو دیدیئے جائیں

یہ مسئلہ نظر ثانی کے لئے ملتوی کر دیا گیا اور پچھلے دن کی ناکامی کے بعد اس روز صاحبزادہ صاحب کو کامیابی ہوئی۔

اس کے بعد گورنمنٹ میں مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ پر غور ہوتا رہا۔ مسٹر علی امام نے جو وائسرائے کی انتظامی کونسل کے ممبر تھے یونیورسٹی کے متعلق برابر کوشش جاری رکھی حتیٰ کہ دہلی میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا وقت آگیا اور ۴ دسمبر ۱۹۱۱ء کے اجلاس میں سر ہار کورٹ ٹبلر، مسٹر علی امام اور مہاراجہ دربھنگہ شریک ہوئے۔ سر ہار کورٹ ٹبلر اور مسٹر علی امام نے مسلم یونیورسٹی کی تائید میں جو عنایت اور کوشش کی تھی اس کے لئے شکریہ کا ایک رزولیوشن پاس کیا گیا جب صاحبزادہ صاحب شکریہ کے متعلق اپنی تقریر ختم کر چکے تو سر ہار کورٹ ٹبلر نے ایک تقریر کی جس میں صاف الفاظ میں کہا "آپ کو مسلم یونیورسٹی ضرور ملے گی بشرطیکہ آپ مطلوبہ رقم جمع کرلیں نواب وقارالملک اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں میرے دوست ہیں اور مہاراجہ صاحب محمود آباد میرے بھائی ہیں" اسی اجلاس میں مہاراجہ صاحب دربھنگہ کی طرف سے مسلم یونیورسٹی فنڈ کے لئے تیس ہزار روپیہ چندہ کا اعلان ہوا۔

سکریٹری شپ سے انکار

ابھی مسلم یونیورسٹی کے معاملات طے نہ ہوئے تھے کہ نواب وقارالملک نے آخر ۱۹۱۱ء میں یہ اعلان کیا کہ وہ ۳۱ جنوری ۱۹۱۲ء کو بوجہ پیرانہ سالی اور علالت آنریری سکریٹری کے عہدہ سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ صاحبزادہ صاحب نے جس وقت یہ اعلان دیکھا ان کے دل پر بڑا اثر ہوا اور ان کو اس مسئلہ میں نہایت تردد پیدا ہو گیا ایک طرف تو وہ یہ دیکھتے تھے کہ فی الواقع نواب صاحب اپنے عہدے کے فرائض انجام دینے کے قابل نہیں رہے دوسری طرف جب وہ یہ دیکھتے تھے کہ مسلمانوں میں قحط الرجال ہے اور کوئی دوسرا شخص ایسا نظر نہیں آتا تھا جو اس عہدہ کا کام بہ احسن وجوہ انجام دے سکے۔ بہرحال ٹرسٹیوں کے سالانہ جلسہ کی تاریخ قریب آگئی اس سے دو دن پہلے بعض ٹرسٹیوں نے صاحبزادہ صاحب سے اصرار کیا کہ وہ اس عہدہ کو قبول کرلیں اس بارے میں سر سید

عبدالرؤف صاحب کو بہت اصرار تھا لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا آخر [illegible]
کو مہدی منزل میں جلسہ ہوا۔ اصل سوال نواب وقارالملک کے استعفیٰ کا پیش تھا۔ [illegible] اصرار
کر رہے تھے کہ کچھ دنوں اور نواب صاحب علیحدہ نہ ہوں کیونکہ مجوزہ مسلم یونیورسٹی کا اہم مرحلہ
سامنے تھا۔ حاضرین کے اصرار پر نواب وقارالملک نے اس شرط پر اپنی رضامندی ظاہر کی کہ کام
کرنے کو ٹرسٹی صاحبان کسی دوسرے شخص کو نامزد کر دیں جو آنریری سکریٹری کا محنت طلب کام
انجام دیا کرے اس پر مولانا محمد علی نے تجویز پیش کی کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سے یہ فرائض
انجام دینے کی درخواست کی جائے سر سید عبدالرؤف نے اس تجویز کی پُرزور تائید کی اور اسی طرح
دوسرے ٹرسٹیوں نے بھی تائید کی لیکن صاحبزادہ صاحب نے انکار کر دیا۔ جب صاحبزادہ صاحب
کی طرف سے مایوسی ہو گئی تو یہ تجویز پیش کی گئی کہ (نواب بہادر سر) محمد مزمل اللہ خاں اس کام
کے لئے منتخب کئے جائیں اور ان کے ساتھ عملی کام کو ایک ٹرسٹی اور نامزد کیا جائے اور وہ
صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ہوں لیکن صاحبزادہ صاحب نے اس کو بھی منظور نہ کیا۔ صاحبزادہ
صاحب کا یہ انکار اس وجہ سے نہ تھا کہ وہ کالج کی خدمت سے گریز کرتے تھے بلکہ وہ بغیر
کسی عہدہ کے بھی کالج کا کام کرنے کو تیار رہتے تھے اُن کا انکار صرف اس وجہ سے تھا کہ
کہ وہ اس بات کو سمجھتے تھے کہ نواب وقارالملک اپنی جگہ پر کام کرنے کے واسطے جن اصحاب
کو نامزد کریں گے وہ وہی ہوں گے جن کی بابت پہلے سے شہرت ہو چکی تھی اور ان حالات
میں وہ نواب صاحب کی مرضی کے خلاف کام کرنا نہیں چاہتے تھے چنانچہ اسی جلسہ میں
اس واقعہ کا اظہار ہو گیا۔ جس وقت یہ بحث پیش تھی نواب وقارالملک اپنی جگہ پر کھڑے
ہوئے اور کہا "میں نے ہز ہائی نس سر آغا خاں کو ایک چٹھی لکھی تھی کہ اب میں اپنے عہدہ سے
مستعفی ہونے والا ہوں کیونکہ بوجہ ضعف پیری اور اپنی صحت کی خرابی کے آنریری سکریٹری
کے فرائض ادا نہیں کر سکتا اپنی جگہ پر نامزدگی کے متعلق میں نے ہز ہائی نس سر آغا خاں کو دو
نام بھی لکھ بھیجے تھے کہ ان میں سے ایک کا انتخاب کر لیا جائے ایک نام تو نواب حاجی

محمد اسحاق خاں صاحب کا تھا اور دوسرا نام مولوی محمد عزیز مرزا صاحب کا تھا لیکن ہز ہائی نس سر آغا خاں نے براہ راست مجھے کوئی جواب نہ دیا البتہ انھوں نے مولوی عزیز مرزا صاحب کے نام ایک چٹھی بھیجی ہے جس میں انھوں نے مولوی عزیز مرزا صاحب کو ترجیح دی ہے کہ وہ آنریری سکریٹری کئے جائیں۔ یہ کہہ کر نواب وقار الملک نے وہ اصل چٹھی ٹرسٹیوں کے سامنے پیش کر دی نواب محمد مزمل اللہ خاں نے جو نواب محسن الملک کے زمانہ سے جوائنٹ سکریٹری کا کام انجام دیتے تھے نواب وقار الملک کے اس طرز عمل کو کہ انھوں نے اس موقع پر اُن کا نام فراموش کر دیا بہت محسوس کیا اور اپنی خدمات کی شرح کرتے ہوئے نہایت شکایت آمیز لہجہ میں کہا۔ "میری خدمات کی کچھ بھی قدر دانی نہ کی گئی اور اب میں جوائنٹ سکریٹری کا عہدہ ہرگز ہرگز منظور نہ کروں گا آخر کار یہی قرار پایا کہ نواب مزمل اللہ خاں ہی سے کام کرنے کی درخواست کی جائے چنانچہ نواب صاحب نے یہ درخواست ٹرسٹیوں کے اصرار سے منظور کر لی اور نواب وقار الملک کا نام محض اعزازی طور پر قائم رہا اور اس کے بعد واقعی طور پر سب کام نواب محمد مزمل اللہ خاں کرتے رہے یہاں تک کہ اسی سال میں نواب محمد اسحاق خاں صاحب سکریٹری منتخب ہوئے۔

مسلم یونیورسٹی کی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی میں شرکت

۲؍جون ۱۹۱۲ء کو صاحبزادہ صاحب لکھنؤ میں مسلم یونیورسٹی کی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی میں شریک ہوئے۔ یہ کمیٹی قیصر باغ میں مہاراجہ صاحب محمود آباد کے مکان پر ہوئی بہت سے ارکین کمیٹی میں شریک تھے اصل بحث یونیورسٹی کے قواعد (ریگولیشن) کے متعلق تھی جن کی بابت اخباروں میں بہت کچھ لکھا جارہا تھا قواعد کا مسودہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب نے تیار کیا تھا اور اس پر چاروں طرف سے نکتہ چینی ہو رہی تھی ۳؍جون کو بھی کمیٹی ہوتی رہی اور قواعد کے مسودہ میں بہت کچھ تبدیلیاں کی گئیں صاحبزادہ صاحب نے اس پر زور دیا کہ پہلے مسودہ رائے عامہ حاصل کرنے کی غرض سے صرف شائع کر دیا

جائے اور ابھی پاس نہ کیا جائے چنانچہ یہی رائے منظور ہوگئی نواب وقارالملک اس جلسہ میں شریک نہ ہوسکے تھے انھوں نے اپنی رائے لکھ کر بھیج دی تھی کہ مسودہ پر جہاں تک مجھ کو غور کا موقع ملا ہے وہ بہت زیادہ اصلاح کا محتاج ہے اور جو کچھ اس میں اس وقت درج ہے۔ اگر بدقسمتی سے وہی آخر تک قائم رہ جائے تو میں صاف یہ رائے دوں گا کہ ایسی یونیورسٹی کو ہمیں دور ہی سے سلام کرنا چاہیئے جس کے ریگولیشن کے ذریعہ سے ہم اپنی اس آزادی کو بھی کھو بیٹھیں جو آج ہم کو علیگڈھ کالج کی موجودہ حالت اور موجودہ قانون کے بموجب حاصل ہے (وقار حیات صفحہ ۵۷۹، ۵۸۰)

مسلم یونیورسٹی کے متعلق گورنمنٹ کی پالیسی

نواب محمد اسحاق خاں صاحب کو عہدۂ سکریٹری کا جائزہ لئے ہوئے ابھی ایک ہفتہ سے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ مسلم یونیورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن کے متعلق گورنمنٹ ہند کی ایک چٹھی موصول ہوئی اس پر غور کرنے کے لئے لکھنؤ میں ۱۲ اگست ۱۹۱۲ء کو ایک جلسہ منعقد ہونے والا تھا صاحبزادہ صاحب اس زمانہ میں اپنے منجھلے بیٹے شہزاد احمد خاں کو جو ولایت جا رہے تھے خدا حافظ کہنے کے لئے بمبئی گئے ہوئے تھے لیکن اس جلسہ کی اہمیت کا خیال کرتے ہوئے عین وقت پر لکھنؤ پہنچ گئے اور ۱۲ اگست کے جلسہ میں شریک ہوئے۔ ممبر تعلیمات کی جو چٹھی زیر بحث تھی اس کا لُبِ لباب یہ تھا۔

۱۔ سکریٹری آف اسٹیٹ نے یہ طے کر دیا ہے کہ یونیورسٹی کو دوسرے کالجوں کے الحاق کا اختیار نہ دیا جائے گا۔

۲۔ مجوزہ یونیورسٹی کا نام "علیگڈھ یونیورسٹی ہوگا" مسلم یونیورسٹی نام نہ ہوگا۔

۳۔ وائسرائے یونیورسٹی کے چانسلر نہ ہوں گے مگر جو اختیارات وائسرائے کو بہ حیثیت چانسلر دئے جانے تجویز ہوئے ہیں وہ اختیارات گورنمنٹ آف انڈیا (وائسرائے بہ اجلاس کونسل) کو دئے جائیں گے۔

۴۔ ٹرسٹیان یونیورسٹی کی کونسل میں گورنمنٹ کی بھی نمائندگی ہوگی۔

۵۔ سکریٹری آف اسٹیٹ کو یہ اختیار ہوگا کہ یونیورسٹی کی اسکیم میں تبدیل و ترمیم کریں۔

صاحبزادہ صاحب کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ممبر تعلیمات کی اس چٹھی سے اراکین کانسٹی ٹیوشن کمیٹی میں نہایت جوش و اشتعال پیدا ہوگیا تھا جس میں مسٹر (مولانا) محمد علی مرحوم اور مسٹر مظہر الحق مرحوم پیش پیش تھے۔ صاحبزادہ صاحب کو گورنمنٹ کی یہ پالیسی خود بھی ناپسند تھی لیکن اس کے ساتھ ان کو کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا وہ طریقۂ مخالفت جو وہ اختیار کرنا چاہتی تھی پسند نہ تھا۔ اُنھوں نے ۱۲ اگست کے پہلے جلسہ میں اپنے خیالات پوری وضاحت سے پیش کیے مگر اکثریت کی یہ رائے تھی کہ مخالفت میں پورا مظاہرہ کیا جائے چنانچہ مسٹر محمد علی نے چٹھی کا ایک مسودہ لکھا جس میں گورنمنٹ کی تجاویز سے صاف اختلاف کیا اور لکھا کہ معاملہ کا آخری فیصلہ یونیورسٹی کی مجلس تاسیس (یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی) کے سپرد کردیا گیا ہے۔

لکھنؤ میں کانسٹی ٹیوشن کمیٹی ختم کرکے ۱۳ اگست کو صاحبزادہ صاحب علیگڈھ واپس آئے اور مجوزہ یونیورسٹی کے متعلق علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک مضمون شائع کیا جس میں اس پالیسی کی حمایت کی کہ بدون الحاق کے اختیار کے یونیورسٹی کا چارٹر (فرمان شاہی) لے لیا جائے۔ مسلم اخباروں میں اس زمانہ میں یونیورسٹی کے متعلق نہایت پُرجوش مضامین شائع ہورہے تھے اور چاروں طرف ایک ہنگامہ برپا تھا۔

ابتدائے ستمبر میں صاحبزادہ صاحب نے ایک مضمون لکھا جس میں اُن غیر ذمہ دارانہ مضامین کی تردید کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ جو کچھ یونیورسٹی کی مبحث پر لکھا جائے وہ اعتدال اور متانت کے ساتھ ہو۔

یونیورسٹی فنڈ اور جنگ بلقان

سنہ ۱۹۱۲ء کے آخر مہینے وہ مہینے تھے جبکہ ریاستہائے بلقان نے متحد ہوکر ٹرکی پر یورش کی تھی اور ترک نہایت خطرناک جنگ میں مصروف تھے۔ نومبر میں حالات اور زیادہ تردد خیز ہوگئے کیونکہ

اتحادیوں کے مقابلہ میں ترکوں کو پیہم ہزیمت ہو رہی تھی صاحبزادہ صاحب اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں۔

"ایسی ہولناک خبروں کے لئے ہم تیار نہ تھے۔ ہر شخص کو ترکی افواج پر پورا اعتماد تھا خصوصاً جبکہ چار سال سے ٹرکی میں آئینی حکومت ہے اصلاحیں کی گئی ہیں اور نوجوان پارٹی (ینگ پارٹی) کوششوں میں مصروف ہے۔ ان سب کے ہوتے ہوئے ٹرکی میں ایسے نتیجے نہ ہونے چاہئیں تھے جیسے ہو رہے ہیں۔ بلغاریہ کی فوج قسطنطنیہ سے ۲۰ میل قریب آگئی ہے اور اب ترک اپنی جانوں کی حفاظت کی خاطر جنگ کر رہے ہیں۔ درحقیقت یہ جنگ صلیب اور ہلال کے درمیان ہے۔ یورپ کی تمام حکومتیں ان غیر متوقعہ نتائج پر خوشی کے شادیانے بجا رہی ہیں برخلاف اس کے تمام دنیائے اسلام پر آسمان سے بجلی گری ہے۔ ہندوستان میں مسلمان خوف و اضطراب سے بھر گئے ہیں مستقبل نہایت خوفناک اور تاریک نظر آتا ہے جہاں تک ممکن ہے ہندوستانی روپیہ سے مدد کر رہے ہیں ڈاکٹر انصاری نے ایک طبی مشن قائم کیا ہے جس کے واسطے مسٹر محمد علی چندہ جمع کر رہے ہیں۔"

"ہمارے علیگڈھ کے طلبار نہایت جوش میں بھر گئے ہیں۔ گوشت اور چاول کھانا انھوں نے ترک کر دیا ہے اور اس سے جو کچھ بھی بچت ہوتی ہے وہ ٹرکی کے واسطے دیدی جاتی ہے ہم نے اسٹریچی ہال میں جلسہ کیا اس جلسہ میں میں نے تقریر کی اور پانچ سو دس (۵۱۰) روپیہ نقد چندہ دیا نوجوانوں کے دماغوں پر ایسا شدید اثر پڑا ہے کہ اب وہ یہ تجویز پیش کر رہے ہیں کہ یونیورسٹی فنڈ کا کل سرمایہ ٹرکی کو بھیج دیا جائے اور مسٹر محمد علی نے مجھے اور دوسرے صاحبوں کو تار دئے ہیں کہ ہم منظوری دے دیں اور یونیورسٹی کا سرمایہ ٹرکی کو بھیج دیا جائے۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ یہ سرمایہ بطور قرض ہی کے ترکی کو دیدیا جائے۔ لیکن یہ طفلانہ خیالات ہیں دوسرے طریقوں سے چندہ کیوں نہیں کر لیا جاتا مسلمان تو چندہ دینے کو آمادہ ہیں مسلم یونیورسٹی کا سرمایہ ٹرکی کو بھیج دینے سے کیا پورا ہوگا لیکن اس کے خلاف مسلمانان ہند کی تعلیمی اسکیم کا

شاید ہمیشہ کے لئے ضرور خاتمہ ہوجائے گا۔ میں ایسی تجویز کے خلاف ہوں یہ باتیں صرف اس لئے پیش آرہی ہیں کہ ہماری جماعت میں پریشانی اور ابتری ہے اور صحیح معنی میں لیڈر ایک بھی نہیں ہے جو آفت آتی ہے وہ عوام جھیلتے اور طوفان کا مقابلہ کرتے ہیں نام نہاد لیڈر اس وقت پھر نمودار ہوجاتے ہیں جب طوفان گزر چکتا ہے اور مطلع صاف ہوجاتا ہے۔" صاحبزادہ صاحب کا یہ مشورہ مقبول ہوا اور یونیورسٹی کا سرمایہ محفوظ رہا۔

مکالمہ کی صورت میں مسلم یونیورسٹی پر ایک رسالہ

دسمبر ۱۹۱۲ء میں صاحبزادہ صاحب نے مکالمہ کی شکل میں مجوزہ یونیورسٹی کے موجودہ حالات و معاملات کے متعلق ایک رسالہ لکھ کر شائع کیا۔ مکالمہ دو فرضی شخصوں کے درمیان تھا ایک کا نام جوش محمد خاں اور دوسرے کا نام متین اللہ خاں تھا۔ جوش محمد خاں تو معاملات میں حد سے زیادہ جلدی کرنے والے تھے اور موجودہ زمانہ کے جوش و خروش کی موجوں میں بہ جانے والی طبیعت رکھتے تھے لیکن متین اللہ خاں سنجیدہ مزاج دوراندیش اور سمجھ کر کام کرنے والے تھے اور ان کے وہی خیالات تھے جو سر سید اور ان کی تحریک کے موافق تھے۔ یہ رسالہ پورے ایک سو صفحات پر تھا۔ معاملہ کے تمام پہلو کھول کر سامنے رکھ دیئے گئے تھے کیونکہ فاؤنڈیشن کمیٹی کے جس کا اشارہ لکھنؤ کی کانسٹی ٹیوشن کے سلسلہ میں اوپر کیا جاچکا ہے، جلسہ کا وقت قریب آگیا تھا اور جو ۲۷ دسمبر کو لکھنؤ میں منعقد ہونے والا تھا اس لئے صاحبزادہ صاحب نے واقفیت عامہ کے لئے مسئلہ کے ہر پہلو پر بحث کر کے لوگوں کے شکوک رفع کرنے کی کوشش کی تھی۔

یونیورسٹی کی فونڈیشن کمیٹی کے جلسہ میں صاحبزادہ صاحب کی شرکت

۲۵ دسمبر ۱۹۱۲ء کو اس کمیٹی کی شرکت کی غرض سے صاحبزادہ صاحب لکھنؤ کو روانہ ہوئے ۲۶ دسمبر کو ملک کے ہر حصہ سے لوگ لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔ ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر رام پور بھی تشریف لائے تھے اور اسی دن

مہاراجہ صاحب محمود آباد کے مکان پر ایک جلسہ کیا گیا تاکہ دوسرے دن منعقد ہونے والی فاؤنڈیشن کمیٹی کا دستور العمل بنایا جائے۔ اس جلسہ کے صدر ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر رام پور تھے۔ صاحبزادہ صاحب نے دستور العمل کا جو مسودہ تیار کیا تھا وہ پیش ہوا اور منظور کیا گیا۔ اسی میٹنگ میں میجر سید حسن صاحب بلگرامی نے ایک رزولیوشن پیش کیا جس میں ان اختیارات پر اعتراض کیا گیا تھا جو وائسرائے کو چانسلر کی حیثیت سے دیدئے گئے تھے اور جن سے وہ جملہ اختیارات کے مالک ہوئے جاتے تھے ۲۷ر دسمبر کو قیصر باغ کی بارہ دری میں فاؤنڈیشن کمیٹی کا جلسہ ہوا ٹھیک دس بجے شب گذشتہ کے دستور العمل کے مطابق کارروائی شروع ہوئی کمیٹی کے صدر ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور تھے اس میں تین رزولیوشن پاس ہوئے میجر سید حسن بلگرامی نے چانسلر کے اختیارات کے متعلق اپنا رزولیوشن پیش کیا نواب وقار الملک نے تائید کی۔ شیخ عبداللہ صاحب نے مخالفت کی اور اب بحث شروع ہوئی میٹنگ ایسی عام تھی کہ بارہ دری میں عوام، کالج کے طلبار اور اسکولوں کے لڑکے کثرت سے داخل ہو گئے تھے کوئی امتیاز نہ تھا اور اس انبوہ کے شور وغل سے سیٹیوں اور تالیوں سے جلسہ میں بے ترتیبی اور برہمی پیدا ہو گئی۔ اسی طوفان میں صاحبزادہ صاحب نے رزولیوشن کی مخالفت کی۔ مسٹر محمد علی نے بھی رزولیوشن کی تائید میں گرم تقریر کی۔ ان حالات سے نواب صاحب رام پور نہایت برداشتہ خاطر ہوئے دوپہر تک یہی طوفان برپا رہا اس کے بعد دو گھنٹہ کو جلسہ ملتوی ہوا سہ پہر کے جلسہ میں نواب صاحب رام پور تشریف نہیں لائے اور مہاراجہ صاحب محمود آباد نے صدارت کی۔

وائسرائے کی خدمت میں ایک وفد بھیجے جانے کے مسئلہ پر بحث چھڑی۔ تجویز یہ تھی کہ تیس ممبروں کا ایک وفد وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہو کر زیر بحث مسائل کے متعلق گفتگو کرے۔ نواب وقار الملک مہاراجہ صاحب محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور ایک کثیر تعداد ممبران فونڈیشن کمیٹی اس تجویز کی حامی تھی۔ مسٹر محمد علی نے اس کی مخالفت کی اور باوجودیکہ ان کو بار بار سمجھایا گیا کہ مجوزہ وفد کے ممبر سب قوم کے معتمد علیہ اور مسلّم قومی لیڈر ہیں اور

اُن سے ہرگز ایسے تصفیہ پر رضامند ہونے کی توقع نہیں جو مسلمانوں کے حقیقی اغراض کے منافی ہو مگر مسٹر محمد علی کی مخالفت کی شدت بڑھ گئی اور وہ یہی کہتے رہے کہ فونڈیشن کمیٹی اپنی قسمت کا فیصلہ ۳۰ آدمیوں کی رائے پر منحصر کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہوسکتی مخالف و موافق تقریروں کا ایسا طویل سلسلہ رہا کہ آخری فیصلہ نہ ہوسکا اور شام ہوگئی۔ ۲۸ر دسمبر کی رات کو گورنمنٹ ہاؤس میں مہاراجہ صاحب محمود آباد، مسٹر جناح، نواب وقارالملک، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، مسٹر محمد علی، (سر) سید وزیر حسن، میجر سید حسن بلگرامی (سر) سید راس مسعود، نواب محمد اسحاق خاں اور دیگر خاص خاص اصحاب مدعو تھے۔ ڈنر سے فارغ ہونے کے بعد یہ سب اراکین مہاراجہ صاحب محمود آباد کے مکان پر جمع ہوئے دو بجے شب کے قریب بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے کیا کہ وائسرائے کی خدمت میں ایک وفد بھیجا جائے جس میں مختلف خیال کے لیڈر برابر برابر تعداد میں شامل کئے جائیں۔ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے ممبر یا ٹرسٹی شامل نہ کئے جائیں۔ اس مضمون کے رزولیوشن کا ایک مسودہ فونڈیشن کمیٹی کے عام اجلاس میں جو صبح کو ہونے والا تھا مرتب کیا گیا۔

چنانچہ ۲۹ر دسمبر ۱۹۱۲ء کے جلسہ میں یہ رزولیوشن پیش ہوا۔ آج جلسہ کا رنگ دوسرا ہی تھا یعنی نہ ہنگامہ آرائیاں تھیں نہ شور و غل تھا نہایت سکون و خاموشی کے ساتھ کارروائی ہوئی اس جلسہ کی ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ وائسرائے کی خدمت میں وفد بھیجے جانے کی جس تجویز کی ۲۸ر دسمبر کے جلسہ میں سخت مخالفت ہوئی تھی اور جس پر مسٹر (مولانا) محمد علی نے گرم تقریریں کی تھیں آج انھوں نے یہ رزولیوشن یہ کہہ کر پیش کیا کہ نوجوان پارٹی کی قوت اتحاد کا کل کافی مظاہرہ ہوچکا ہے اور علیگڈھ کی صاحب اقتدار جماعت بے بس ثابت ہوچکی ہے۔ آج وہی رزولیوشن پیش کرنے کی استدعا مجھ سے کی گئی ہے کیونکہ فی نفسہ اس تجویز میں کوئی بُرائی نہیں ہے لہٰذا منظوری کے قابل ہے چنانچہ سکون کے ساتھ یہ رزولیوشن پاس ہوا۔ وفد کے اراکین کی فہرست منظور کی گئی نواب وقارالملک خاموش رہے اخباروں میں اس جلسہ کی

کارروائی کے خلاف جب مضامین نکلے اور خود نواب وقار الملک پر بھی بدگمانی کا اظہار کیا گیا تب موصوف نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے ایک مضمون اخبارات میں شائع کیا اور بالآخر یہ نتیجہ ہوا کہ وفد بھیجے جانے کی تجویز بلا عمل رہی۔

فاؤنڈیشن کمیٹی کے اس اجلاس میں سکون پیدا کرنا فی الواقع صاحبزادہ صاحب ہی کا حصہ تھا جیسا کہ مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے جو انھوں نے صاحبزادہ صاحب کے انتقال کے بعد لکھا تھا وہ لکھتے ہیں کہ "فاؤنڈیشن کمیٹی کا اجلاس ایسا معرکۃ الآرا تھا جو دیکھنے والوں کو غالبًا تمام عمر نہ بھولے گا۔ علیگڈھ کی صاحبِ اقتدار جماعت پر یہ شدید ترین حملہ تھا۔ مسٹر محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی سحر بیانیوں نے سارے جلسہ کو علیگڈھ کا مخالف بنا دیا تھا۔ حالت یہ تھی کہ اِدھر حضرات علیگڈھ کی تقریر شروع ہوئی اور اُدھر پورا ہال تحقیر کے نعروں سے گونجنے لگا زبان کھولنا دشوار تھی اس حالت میں ایک صاحبزادہ صاحب مرحوم ہی کی تقریر ایسی تھی جو ساری جماعت علیگڈھ میں سے توجہ اور ادب کے ساتھ سُنی جاتی تھی اور خود مرحوم کی متانت کا یہ عالم تھا کہ اتنا ہنگامہ برپا رہا لیکن اُن کے مزاج الفاظ اور انداز تقریر میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوا۔

مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی نے جو حال اس جلسہ کا سطورہ بالا میں مختصرًا بیان کیا ہے۔ وہ بالکل صحیح و درست ہے لیکن جلسے کی نوعیت اور اس کے بعد جو مراسلت نواب وقار الملک بہادر مرحوم کی طرف سے اخبارات میں شائع ہوئی ہے وہ اس بات کی متقاضی ہے۔ کہ واقعات کی قدرے اور تفصیل کر دی جائے۔

راقم الحروف (محمد حبیب اللہ) اس جلسۂ فاؤنڈیشن کمیٹی میں بہ حیثیت ایک ممبر کے موجود تھا نیز اس مختصر اجتماع میں جو مہاراجہ صاحب محمود آباد کے مکان قیصر باغ میں شب میں ہوا تھا اور جس میں ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر رام پور بھی تشریف فرما تھے شریک رہا تھا۔ میرے علم میں اس شب کے اجتماع میں جو کچھ کارروائی ہوئی وہ تقریبًا بالاتفاق تھی

مگر صبح کو جو جلسہ فاؤنڈیشن کمیٹی کا ہوا۔ اس میں وہ یک رنگی اور اتحاد خیال، مخالفت اور غیر اعتدالی تقریروں سے مبدل ہو گیا۔

گورنمنٹ ہاؤس کے ڈنر کے بعد جو اجتماع محمود آباد ہاؤس میں ہوا۔ اس میں میں شریک نہ تھا۔ بہر حال دوسرے دن صبح کو جو کارروائی فاؤنڈیشن کمیٹی کے اجلاس میں ہوئی اس سے ظاہر ہوا کہ مسٹر محمد علی بھی اب علیگڈھ پارٹی کے ہم خیال تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو اس پچھلی نیم شبہ کارروائی سے ملال ہوا اور انھوں نے مسٹر محمد علی کی کارروائی پر سخت اعتراض کیا اور یہ مشہور شعر برمحل پڑھا جس سے کہ حاضرین بہت لطف اندوز ہوئے۔

معشوق ما بہ شیوۂ ہر کس موافق است

با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

میر محفوظ علی بدایونی جو مسٹر محمد علی کے دلی دوست اور ہمدرد میں رفیق کار تھے اس واقعہ کی بابت اس طرح رقم طراز ہیں۔

"مسلم یونیورسٹی کے سلسلے میں قیصر باغ میں جلسہ ہوا۔ اس وقت یونیورسٹی کے متعلق پنجابی ارباب صحافت کے محاورے میں نرم اور گرم جماعت میں تصادم آرا تھا۔ راجہ محمود آباد نرم جماعت کے قائد تھے اور محمد علی گرم جماعت کے روح رواں مگر شب درمیان صبح کو ان کی رائے میں "نرمی" آگئی اس پہ الہلال مرحوم نے "حدیث الغاشیہ" کے عنوان سے ایک دھواں دھار مضمون لکھا جس میں (الہلال کی غیر موجودگی میں حافظہ پر بھروسہ کر کے لکھتا ہوں) شب تار اور تاراج متاع کا سمان باندھ کر آخر میں یہ چبھتا ہوا شعر لکھ دیا۔

معشوق ما .... (صفحہ ۱۸۲ علی گڈھ میگزین جنوری ۱۹۳۹ء موجود لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

نواب وقار الملک بہادر کے جس مضمون کا حوالہ پچھلے صفحہ پر ہے وہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۵ر فروری ۱۹۱۳ء میں (صفحہ ۵ سے ۱۳ تک) شائع ہوا ہے۔

وہ مضمون نہایت مفصل اور جزوی سے جزوی کارروائی جلسہ پر روشنی ڈالتا ہے لیکن یہ مضمون اس قدر طویل ہے کہ اس کو یہاں نقل نہیں کیا جا سکتا چونکہ نواب صاحب کی پوزیشن قوم میں مسلمہ لیڈر کی تھی اور اُن کی راست بازی بھی ضرب المثل تھی اس لئے ان کے اس مضمون سے ملک میں مسئلہ مجوزہ یونیورسٹی کی بابت ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس کے دفع کرنے کے واسطے بزرگان قوم بالخصوص مہاراجہ محمود آباد مرحوم نے دانشمندی سے کام لیا اور نواب صاحب کی خدمت میں ایک خط ارسال کیا جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲ راپریل ۱۳ء (صفحہ ۱۳، ۱۴) پر درج ہے۔ نواب صاحب نے بھی اپنی حق پسندی کا اظہار فرمایا اور مہاراجہ صاحب کے خط کے بعد ہی ایک مختصر جواب ارقام فرمایا جو مہاراجہ صاحب کے خط کے ساتھ ساتھ اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں مندرج ہے۔ مضمون کے خاتمے پر نواب صاحب نے یہ شعر لکھا ہے جو ایک پر لطف اور بلیغ اشارہ اس کارروائی کی بابت ہے جو ۲۸، ۲۹ دسمبر ۱۲ء کی شب میں محمود آباد ہاؤس میں ہوئی تھی۔

در ظلمت شب ہر انچہ کردی کردی　　　در روشنیٔ روز ہماں نتواں کرد

اس تمام خلفشار کا نتیجہ اس وقت یہی ہوا کہ مجوزہ وفد وائسرائے کی خدمت میں نہیں بھیجا گیا۔

۱۹۱۵ء میں صاحبزادہ صاحب کا عہدہ سکریٹری سے پھر انکار

نواب وقار الملک کے عہدۂ سکریٹری کے زمانے میں جسطرح سکریٹری کو اس کے فرائض ادا کرنے میں صاحبزادہ صاحب مدد دیتے رہے نواب محمد اسحاق خاں صاحب کے عہد میں بھی کالج کا کام کرنے میں ان کی وہی دلچسپی اور سرگرمی برابر قائم رہی اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ خواہش نہ تھی کہ وہ سکریٹری ہو کر ہی کالج کا کام کریں۔ نواب وقار الملک مرحوم کے زمانہ میں بھی یہ عہدہ ان کے سامنے پیش کیا گیا تھا لیکن انھوں نے قبول نہ کیا تھا۔ جس کی تفصیل اس سے قبل کے صفحات میں آچکی ہے۔ اب ۱۹۱۵ء میں نواب محمد اسحاق خاں کے مستعفی ہونے کے ارادہ کی خبر مشہور ہوئی اس پر سب سے

پہلے نواب (سر) محمد مزمل اللہ خاں نے صاحبزادہ صاحب سے کہا میری یہ خواہش ہے کہ آپ اس آنریری سکریٹری کے عہدہ کے لئے آمادہ ہوں اور میں آپ کے ساتھ جوائنٹ سکریٹری کے فرائض انجام دوں گا۔ صاحبزادہ صاحب نے انکار کیا اس پر نواب صاحب نے فرمایا کہ اگر آپ سکریٹری ... کے لئے بوجہ عدیم الفرصتی آمادہ نہیں ہوتے تو آپ جوائنٹ سکریٹری ہوجائیے اس میں کام کچھ زیادہ نہیں ہے صاحب زادہ صاحب نے جوائنٹ سکریٹری ہونے سے بھی انکار کیا۔

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب نے بھی صاحبزادہ صاحب سے اصرار کیا کہ وہ کم سے کم جوائنٹ سکریٹری تو ہوجائیں مگر ڈاکٹر صاحب سے بھی صاحبزادہ صاحب نے انکار کیا۔ آخر میں مولوی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی (نواب صدر یار جنگ بہادر) صاحبزادہ صاحب سے ملے اور کالج کی سکریٹری شپ کا ذکر کیا اُن کی رائے نواب سر محمد مزمل اللہ خاں بہادر کی موافقت میں تھی شیروانی صاحب نے فرمایا۔ میں مسٹر میرس کا ایک پیغام لایا ہوں۔ اُنھوں نے مجھسے یہ کہا ہے کہ آفتاب احمد خاں کالج کی جوائنٹ سکریٹری شپ قبول کرلیں اور نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر آنریری سکریٹری ہوں۔ شیروانی صاحب جب چلے گئے تو نواب محمد مزمل اللہ خاں بہادر صاحبزادہ صاحب سے ملے اور وہی کہا جو شیروانی صاحب نے کہا تھا چنانچہ صاحبزادہ صاحب نے ان الفاظ میں آخری جواب دیا "مجھے اس کا تو مطلق خیال نہیں ہے کہ سکریٹری کوئی ہو میں ہر ایک آنریری سکریٹری کے ساتھ کام کرنے کو تیار ہوں اب چونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کالج کو میری خدمات کی ضرورت ہے اس لئے میں غور کروں گا اور بعد کو جواب دوں گا کہ آیا میں جوائنٹ سکریٹری کے عہدہ کے فرائض اپنے حسب منشاء ادا کرنے کے لئے پورا اور کافی وقت نکال سکوں گا یا نہیں" لیکن نہ نواب محمد اسحٰق خاں صاحب نے استعفیٰ دیا اور نہ صاحبزادہ صاحب کو سکریٹری یا جوائنٹ سکریٹری کا عہدہ قبول کرنے کے متعلق اپنا آخری فیصلہ دینے کی اس وقت ضرورت پیش آئی۔

تمہید - آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے مسائل پر غور و عمل کرنے کی غرض سے اواخر ۱۸۸۶ء میں سرسید احمد خاں علیہ الرحمتہ نے ایک انجمن قائم کی اور اس کا نام محمڈن ایجوکیشنل کانگریس رکھا چند سال بعد اس نام میں بجائے لفظ کانگریس کے کانفرنس قائم کیا گیا اور اب اس مشہور معروف انجمن کا نام آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہے۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا تعلق کانفرنس سے اکتالیس برس تک قائم رہا اُن کے تعلق اور کارکردگی کی نوعیت کے لحاظ سے اس مُدت کے مندرجہ ذیل تین دَور ہیں۔

۱۔ دَور اوّل سرسید کی زندگی میں۔

۲۔ دَور دوم سرسید کی وفات سے صاحبزادہ صاحب کی ممبری انڈیا کونسل کے شروع ہونے تک۔

۳۔ دَور سوم انڈیا کونسل کا ممبر ہونے سے مرض الموت کے شروع ہونے تک اگست ۱۹۱۷ء تا جنوری ۱۹۲۸ء۔ اِن کو تین فصلوں میں بیان کیا جاتا ہے۔

فصل اوّل

کانفرنس کی خدمات سرسید کی زندگی میں دسمبر ۱۸۸۶ء تا مارچ ۱۸۹۸ء۔

طالب علمی کے زمانہ سے کانفرنس سے دلچسپی

پہلا اجلاس کانفرنس کا دسمبر ۱۸۸۶ء میں زیر صدارت الحاج مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر سی۔ ایم۔ جی (مرحوم و مغفور) علیگڈھ میں منعقد ہوا تھا صاحبزادہ

آفتاب احمد خاں اُس زمانہ میں ایم۔اے۔او کالج کے ایک طالبعلم تھے لیکن فطرت نے بچپن ہی سے اُن کے دل میں مذہب کی عظمت اور قومی ترقی کی ایک لگن لگادی تھی اور مدرستہ العلوم علیگڈھ کی محبت اُن کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی اب اس اجلاس کانفرنس میں اُن کو اپنے فطری مذہبی جوش کے اظہار کا ایک موقع مل گیا۔وہ محض طالب علمانہ حیثیت سے اجلاس میں شریک نہ ہوئے بلکہ ممبر بن کر کانفرنس کے مباحث میں حصہ لیا علیگڈھ کے مشہور وکیل خواجہ محمد یوسف صاحب (مرحوم) نے اجلاس مذکور میں ایک تحریک بذریعہ رزولیوشن ۱۲ اس مضمون کی پیش کی کہ "چونکہ مسلمانوں میں قرآن مجید کے حافظوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے اس لئے تنزل کے دور کرنے کے واسطے مناسب تدابیر اختیار کی جاویں" آفتاب احمد خاں نے اس تحریک کی تائید نہایت جوش کے ساتھ کی غیر مناسب نہ ہوگا اگر ہم ان کی اس تقریر کے (جو انھوں نے پہلی بار اس تعلیمی کانفرنس میں کی تھی) چند جملے یہاں پر نقل کر دیں تاکہ ناظرین کو اندازہ ہو جائے کہ اس ہونہار مسلم کو طالب علمی ہی کے زمانہ میں مذہب اور قوم کے ساتھ کس قدر شغف پیدا ہو چکا تھا۔

"صاحبان یہ جلسہ حقیقتاً وہ جلسہ ہے کہ اگر خدا کے فضل و کرم سے اس کے مقاصد کے پورے ہونے کے عمدہ ذریعے اور وسیلے مہیا ہو گئے تو ہندوستان کے مسلمانوں کو اس بات کا پورا یقین ہو جانا چاہئے کہ وہ وقت اب قریب ہے کہ خدا کے فضل سے ان کی گردش کا زمانہ پلٹا کھائے اور اب پھر اُس زمانہ کے آثار نمودار ہوں جس زمانہ میں تمام روئے زمین پر اسلام کی صدائے اللہ اکبر گونجتی تھی اور جس کی وجہ سے تمام دُنیا کی قوموں کے دلوں میں اسلام کی بہت بڑی عزت اور عظمت بیٹھ گئی تھی اور جس کے سُنتے ہی مسلمانوں کے سینے جوش سے بھر جاتے تھے۔

صاحبان! میں اس وقت اس تحریک کی تائید کرنے کھڑا ہوا ہوں جو ہماری قوت۔ہماری دینی و دنیوی ترقی اور ہماری قوم کی عزت و عظمت کی جڑ ہے۔

قرآن مجید ہی اس شخص کا جس نے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ زبان و دل سے کہا

دین وایمان ہے یہ وہ مقدس اور بے مثل کتاب ہے کہ جس کو غیر قوموں کے لوگ بھی جاننے کی کوشش کرتے ہیں ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ قرآن مجید کو ذہن نشین کرے اور اپنے پاک اور سچے خداوند کے کلام کو دل پر نقش کالحجر کرے کوئی قاعدہ اور کوئی قانون ہمارے واسطے اس سے بڑھ کر عمدہ عمل کرنے کو نہیں ہوسکتا یہ اس ذات پاک کا قانون بنایا ہوا ہے جس کو ہم خدائے ذوالجلال کہتے ہیں اور یہ اس مقدس شخص سے ہم کو پہنچا ہے جس کو رسول اللہ اور خاتم النبیین کہتے ہیں ؎

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　مرادیں غریبوں کی برلانے والا

میں اس بات کو دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر قرآن مجید پر پورے طور سے عمل کیا جاوے تو ممکن نہیں کہ مسلمان اس ذلت کے دریا سے فوراً تیر کر نہ نکل جائیں پہلے زمانہ کے مسلمانوں میں کیا تھا جیسے ہاتھ پاؤں خدا نے ہم کو دئے ہیں ویسے ہی ان کے بھی تھے ان میں کوئی چیز زیادہ تھی تو یہ تھی کہ وہ اپنے اللہ جل جلالہٗ کی مرضی پر مٹے ہوئے تھے۔

ہم کو چاہئے کہ ہم اس مقدس کتاب کے مطالب کو اپنے ذہنوں میں ایسا محفوظ رکھیں کہ ہم کسی وقت اس سے بھٹک نہ جائیں اور یہ عمدہ طور پر اسی وقت ہوسکتا ہے کہ بجائے کاغذ کے ہم اس کو دل پر لکھیں جو خدا کے فضل سے کبھی مٹ نہیں سکتا اور ہم سے جدا نہیں ہوسکتا اور اس واسطے ہم کو چاہئے کہ جہاں تک ہوسکے اس بات کی کوشش کریں کہ قرآن مجید کے حافظوں کی تعداد جو آج کل دن بدن کم ہوتی جاتی ہے بڑھے ۔" (ماخوذ از رپورٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس دسمبر ۱۸۹۶ء)

مندرجہ بالا اقتباس میں ہم کو طرز ادا کی دلکشی اور بندش الفاظ کی چستی کو نہ تلاش کرنا چاہئے کیونکہ یہ تقریر محض ایک ناتجربہ کار طالب علم کی نقش اوّلین ہے البتہ جو چیز کہ غیر معمولی درجہ تک اسمیں نمایاں ہے وہ مذہبی جذبہ ہے جو ایک صحیح الخیال پختہ کار مسلمان کی شایان شان ہے۔

انگلستان کی تعلیم کے بعد صاحبزادہ صاحب کے تعلقات کانفرنس کے ساتھ

کانفرنس کے ساتھ صاحبزادہ صاحب کی وابستگی کا آغاز تو اس کی ابتدائے قیام سے ظاہر ہوتا ہے لیکن ان کی عملی

سرگرمی اس وقت شروع ہوتی ہے جبکہ انگلستان کی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ حسب خواہش سرسید احمد خاں اواسط ۱۸۹۴ء میں بحیثیت ایک بیرسٹر کے علیگڈھ میں اقامت گزیں ہوئے اسی سال کی کانفرنس میں جو علیگڈھ میں منعقد ہوئی تھی انھوں نے انگریزی زبان میں ایک لکچر دیا تھا جسکی بابت سرسید نے سالانہ رپورٹ میں یہ ریمارک کیا کہ " ہمارے عزیز اور ہمارے کالج کے پرانے طالب علم آفتاب احمد خاں اسکوئر بی۔اے بار ایٹ لا کا انگریزی لکچر جس میں انھوں نے یونیورسٹی کیمبرج کی تعلیم کا اور مدرسۃ العلوم کی تعلیم اور کیمبرج اور مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کے کالج لائف کا موازنہ کیا تھا۔ طالب علموں کے لئے حد سے زیادہ مفید تھا۔"

نیز پریسیڈنٹ اجلاس (مسٹر جسٹس شاہ دین) نے لکچرار کی نسبت یہ فرمایا کہ " آفتاب احمد خاں ایک بے نظیر نمونہ ہیں ہمارے اس کالج کی تعلیم اور کیمبرج یونیورسٹی کی تعلیم کے مجھکو بڑی خوشی ہے کہ ایسے لائق طالب علم مدرسۃ العلوم سے پیدا ہوئے ہیں۔" (صفحہ ۳۰ و ۱۳۳ رپورٹ کانفرنس ۱۸۹۴ء)

سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کا قیام اور صاحبزادہ صاحب کا وایس پریسڈنٹ منتخب ہونا۔

امتداد ایام کے ساتھ ساتھ صاحبزادہ صاحب کا تعلق کانفرنس سے روز بروز قوی ہوتا گیا ابھی کانفرنس کی عمر دس سال کی بھی نہ ہوئی تھی کہ سرسید کو انتظامی امور و مقاصد کانفرنس کی تکمیل کے واسطے سینٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

چنانچہ ۱۷ر نومبر ۱۸۹۶ء کو ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں اس کمیٹی کے عہدہ دار منتخب ہوئے خود سرسید پریسیڈنٹ مقرر ہوئے اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وائس پریسیڈنٹ۔ نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاولی سکریٹری اور نواب محسن الملک بہادر جوائنٹ سکریٹری ہوئے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے انتخاب سے پتہ چلتا ہے کہ اسی زمانہ میں قومی کاموں میں اُن کا انہماک اس درجہ پر پہنچ چکا تھا کہ کانفرنس کی جماعت انتظامیہ میں ان کو بحیثیت ایک عہدہ دار کے شامل کیا گیا۔

اسی سال کے آخر میں صاحبزادہ صاحب کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں بمقام میرٹھ شریک

ہوئے اس اجلاس میں سرسید اور نواب محسن الملک کے درمیان جو نہایت دلچسپ مباحثہ اس مسئلہ پر ہوا کہ "آیا مسلمانوں کی قوم مردہ ہے یا کانفرنس" صاحبزادہ صاحب نے بھی ایک طویل اور معرکۃ الآرا تقریر کی جس کی بابت پریسیڈنٹ اجلاس (نواب عماد الملک بہادر بلگرامی) نے اپنی اسپیچ میں یہ فرمایا کہ اگر "ہمارے آفتاب احمد خاں کے سے دس بارہ نوجوان سرسید کی کوشش سے مدرسۃ العلوم میں پیدا ہوجائیں تو ہمارے سرسید کی کل شکایتیں رفع ہوجائیں گی اور مدرسہ کو کسی مدد اور اعانت کی ضرورت نہ رہے گی" (صفحہ ۸۳ رپورٹ کانفرنس ۱۸۹۶ء)

دہلی کا ایک عام جلسہ کانفرنس کی تائید میں

سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے وائس پریسیڈنٹ ہوجانے سے آفتاب احمد خاں کی سرگرمی میں اور اضافہ ہوا اور انھوں نے اپنے انتخاب کے دو ہفتہ کے اندر دہلی میں زیر سرپرستی "انجمن حامی مدرسۃ العلوم" (جو وہاں اُن کی کوشش سے قبل ازیں قائم ہوچکی تھی) ۲۸ نومبر ۱۸۹۸ء کو ایک عام جلسہ ٹاؤن ہال میں منعقد کرایا اور اس میں نواب محسن الملک بہادر کو مدعو کیا نواب صاحب اس جلسہ میں شریک ہوئے اور اپنی رپورٹ میں (جو رُوئداد اجلاس کانفرنس ۱۸۹۶ء میں شامل ہے) صاحبزادہ صاحب کی اُس تقریر کی جو انھوں نے فوایدِ تعلیم پر اس شاندار جلسہ میں کی تھی بہت تعریف کی اور یہ تحریر کیا کہ "سامعین پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا ہے"۔

لوکل کمیٹیوں کا قیام

ضلع وار لوکل کمیٹیاں قائم کرانے کی تجویز تو ۱۸۸۸ء ہی میں کانفرنس کے دوسرے سالانہ اجلاس میں (بمقام لکھنؤ) منظور ہوچکی تھی لیکن کوئی عملی کارروائی اس سلسلہ میں اب تک نہیں ہوئی تھی اب سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے مقاصد میں اس تجویز پر زور دیا گیا اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے اپنی ذمہ داری کا احساس کرکے مختلف اضلاع میں دورہ کیا اور ۱۸۹۷ء میں بجنور اور فرخ آباد میں لوکل کمیٹیاں قائم کرائیں۔

فصل دوم

کانفرنس کی خدمات معتمدی کی وزارت سے صاحبزادہ صاحب کی ممبری انڈیا کونسل کے شروع ہونے تک (۱ اپریل ۱۸۹۸ء تا ۱۱ جولائی ۱۹۱۷ء)۔

صاحبزادہ صاحب بحیثیت جوائنٹ سکریٹری کانفرنس

۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید احمد خاں رح کا انتقال ہوا اور کانفرنس کا انصرام واہتمام نواب محسن الملک کے ہاتھ میں آیا نواب صاحب مرحوم ومغفور نے اپنی غیر معمولی قابلیت اور اُولوالعزمی سے اس ادارہ کو جو اس وقت تک عملاً صوبہ متحدہ وپنجاب تک محدود تھا واقعی طور پر آل انڈیا انسٹی ٹیوشن بنا دیا کانفرنس کے نہایت پُرشان وشوکت اجلاس ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں منعقد کرائے اور ان کے ذریعہ سے علیگڈھ کالج کو جو سرسید کے بعد شدید خطرہ میں پڑگیا تھا نئی زندگی بخشی ان اجلاسوں میں سرسید میموریل فنڈ (یعنی مسلم یونیورسٹی کی مجوزہ اسکیم) کے واسطے بالخصوص مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کی جاتی تھی اور بعض بڑے بڑے عطیات بھی اس زمانہ میں نواب صاحب ممدوح کی غیر معمولی کوشش وسحر طرازی سے کالج کو مل سکے ان تمام کاموں میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نواب صاحب مرحوم کے دست راست تھے اور ہر اجلاس کانفرنس میں صاحبزادہ صاحب کی غیر معمولی سرگرمی سرسید میموریل فنڈ کی کامیابی میں نمایاں تھی آخر کار وہ وقت آیا کہ نواب محسن الملک بہادر کی خواہش پر کانفرنس کا کل کام صاحبزادہ صاحب کے سپرد کیا گیا کالج کے کام کی کثرت اور اپنی روز افزوں خرابی صحت کی وجہ سے نواب محسن الملک بہادر نے نہایت دوراندیشی اور موقعہ شناسی سے کام لے کر صاحبزادہ صاحب کو آخر ۱۹۰۵ء میں کانفرنس کا آنریری جوائنٹ سکریٹری مقرر کرایا اور اپنے جملہ اختیارات اُن کو تفویض کردئے اس کے بعد گو کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا عہدہ جوائنٹ سکریٹری کا ہی رہا لیکن عملاً وہ آنریری سکریٹری کانفرنس کے جملہ خدمات وفرائض انجام

دیتے تھے اور جہاں تک ہم کو علم ہے نواب صاحب مرحوم یا اُن کے جانشینوں نے صاحبزادہ صاحب کے کام یا اُن کے اختیارات میں مداخلت نہیں کی آئندہ واقعات سے اندازہ ہو سکے گا کہ صاحبزادہ صاحب نے اپنے فرائض کو کس طرح ادا کیا اور کانفرنس نے ان کی سرکردگی میں مسلمانان ہند کی بالعموم اور علی گڈھ کالج کی بالخصوص کیا کیا نمایاں و قابل قدر خدمات انجام دیں۔

کانفرنس کی حالت صاحبزادہ صاحب کے چارج لینے کے وقت

جب صاحبزادہ صاحب نے اس کام کا جائزہ لیا تو اس وقت بموجب رپورٹ پروفیسر گارڈنر براؤن (آنریری جوائنٹ سکریٹری) کانفرنس کی یہ حالت تھی کہ۔

(۱) "کوئی باقاعدہ سسٹم نہیں (۲) کوئی محدود پروگرام نہیں (۳) کوئی مستقل سرمایہ نہیں۔ (۴) مستقل کام کرنے والے نہیں" نیز خود نواب محسن الملک مرحوم نے کانفرنس کی حالت زار کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا کہ سکریٹری کے دفتر میں ایک پچیس روپیہ کے محرر سے زیادہ نہیں ریفرنس کیلئے کوئی مواد نہیں" کوئی لائق مددگاران کے (سکریٹری کے) پاس نہیں"

(صفحات ۶۹ و ۶۹۵ روئداد اجلاس کانفرنس ۱۹۰۵ء)

متذکرہ صدر حوصلہ شکن حالت کی اصلاح کی غرض سے پہلا کام صاحبزادہ صاحب نے یہ کیا کہ "کانفرنس کی عملی کارروائی کے لئے ایک مختصر اسکیم" مرتب کی، اس اسکیم کو انھوں نے اپنی اولوالعزمی اور بلند قومی نصب العین کے لحاظ سے "مختصر" کہا ہے لیکن دراصل وہ اس قدر جامع اور مبسوط اسکیم ہے کہ قومی تعلیم و ترقی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کے متعلق اس میں مفید تجاویز درج نہ ہوں۔ یہ اسکیم بائیس صفحات پر مشتمل ہے اور روئداد اجلاس کانفرنس ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی ہے اس کتاب کے صفحات اس کی نقل کے متحمل نہیں ہو سکتے لیکن موجودہ حالت میں بھی اس کا مطالعہ اُن اصحاب کے واسطے جن کو مسلمانوں کی تعلیم سے دلچسپی ہے خالی از منفعت نہ ہوگا۔

اس سلسلہ میں واجبی طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اعلیٰ درجہ کی اسکیم کا مرتب کر دینا

چنداں عجیب اور اہم بات نہیں اس اعتراض کا احساس خود مصنّف اسکیم کو ہونا اُن الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے جو انھوں نے خاتمہ اسکیم پر درج کئے ہیں اور جو حسب ذیل ہیں :-

"یہ اسکیم بہ پیرایہ بیان کی گئی ہے تاوقتیکہ وہ کُل یا اس کا معقول جزو کامیاب ثابت نہ ہو اس وقت تک وہ محض خیالی پلاؤ ہے اور بس"۔

بہرحال صاحبزادہ صاحب نے اپنا کام شروع کر دیا اس کے نتائج ناظرین آئندہ صفحات پر ملاحظہ فرمائیں گے اس مقام پر ہم اُن کے طریقہ کارکردگی کا مختصراً تذکرہ کر دینا مناسب خیال کرتے ہیں۔

صاحبزادہ صاحب کا طریقہ کار

کانفرنس کے کام کے واسطے صاحبزادہ صاحب کا کوئی خاص وقت مقرر و محدود نہ تھا ان کی اُفتادِ طبیعت ایسی واقع ہوئی تھی کہ جب وہ کسی کام کو اپنے ذمہ لے لیتے تھے تو پھر اُس میں اُن کا انہماک اس درجہ ہوتا تھا کہ خلوت و جلوت میں سفر و حضر میں پرائیویٹ صحبتوں میں اور پبلک موقعوں پر وہ اُسی دُھن میں رہا کرتے تھے چنانچہ کانفرنس کے کام کے سلسلہ میں چھ بجے صبح سے دس گیارہ بجے شب تک جب ان کو ضرورت پڑتی تو اہلکاران دفتر کو اپنے یہاں بُلواتے تھے۔ مولوی انوار احمد صاحب زبیری (مرحوم) جن کا تعلق کانفرنس سے تقریباً چالیس سال تک رہا اور جنھوں نے براہ راست صاحبزادہ صاحب کی ماتحتی میں بارہ سال تک کام کیا راوی ہیں کہ یہ وقت بے وقت کی طلبی شروع شروع میں اہلکاران پر بڑی گراں گزرتی تھی لیکن صاحبزادہ صاحب کے اخلاق حُسن سلوک اور دل دہی سے اور خود اُن کے انہماک و محنت کو دیکھ کر اہلکار بھی تعمیل احکام میں سرگرمی کے ساتھ مصروف رہتے تھے صاحبزادہ صاحب اپنے ماتحتوں سے کام لینے میں ایک حد تک سخت گیر تھے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ان کا برتاؤ اہلکاران کے ساتھ اس ضابطہ اور خشکی کا نہ تھا جس کا نظارہ سرکاری دفتروں میں علی العموم ہوا کرتا ہے انھوں نے اہلکاران کانفرنس کے یہ بات ذہن نشین کر دی تھی کہ گو کہ اُن کی تنخواہیں زیادہ نہیں ہیں مگر وہ اس قومی کام کی تکمیل میں ایک طرح سے

شریک کار ہیں اس طریقہ کار کا یہ اثر ہوا کہ دفتری کُل کے سب پُرزے آسانی اور صفائی کے ساتھ اپنا اپنا کام کرنے لگے۔

سفیروں کا تقرر

سفیروں کے تقرر میں صاحبزادہ صاحب حتی الامکان بہت احتیاط کرتے تھے اور جن لوگوں کو اس کام کے واسطے منتخب کرتے تھے اُن کو اوّل کچھ دن دفتر میں تعینات رکھتے تھے اور اس زمانہ میں ان کو کانفرنس کے اغراض و مقاصد و لٹریچر سے آگاہی حاصل کرنے کا موقع دیتے تھے اور پھر اُن کو مناسب ہدایات و کاغذات وخطوط کے ساتھ (جو ملک کے سربرآوردہ اشخاص کے نام وہ خود لکھا کرتے تھے) ان کے حلقوں میں روانہ کرتے تھے سفیروں کی کارکردگی کی رپورٹوں کو غور سے پڑھا کرتے تھے اور ضروری ہدایات جاری کرتے رہتے تھے آخر سال پر جس جس سفیر کا کام عمدہ پایا جاتا تھا اسی لحاظ سے اسناد تمغوں اور (خاص حالات میں) نقد انعامات سے اس کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

سالانہ اجلاسوں کا انعقاد

کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں کے انعقاد کی بابت صاحبزادہ صاحب اکثر تو اجلاس ہی میں مقامی اصحاب کے مشورہ سے اعلان کرا دیتے تھے کہ آئندہ اجلاس فلاں شہر میں ہوگا لیکن اگر کبھی قطعی فیصلہ اس وقت تک نہ ہوسکتا تو پھر جس قدر جلد بھی ممکن ہوتا ذاتی خطوط کے ذریعہ سے ضروری امور طے کرکے ضابطہ کی دعوت منگا لیتے تھے اور اخبارات میں مشتہر کرا کے تقریبًا سال بھر اُس اجلاس کی کامیابی کے واسطے صدر دفتر سے سفیروں اور اپنے احباب کے ذریعہ سے مسلسل کوشش جاری رکھتے تھے چنانچہ اُنکے عہد میں کوئی اجلاس ناغہ نہ ہوا بلکہ ہر اجلاس کامیاب رہا اور کسی نہ کسی خصوصیت کے لحاظ سے قابل یادگار ہوا اس بارہ میں صاحبزادہ صاحب کا یہ معمول تھا کہ سفیر اور خاص خاص اہلکار مقام اجلاس پر پہلے سے بھیج دیتے تھے اور وہ خود بھی کئی کئی دن پیشتر سے وہاں پہنچ جاتے تھے اور معززین شہر اور مجلس استقبالیہ کے ممبروں کے ساتھ مل کر اس انہماک کے ساتھ ہر قسم کے انتظام میں شریک ہوجاتے تھے گویا وہ اُسی مجلس اور شہر کے ایک معمولی آدمی ہیں صاحبزادہ صاحب

کی محنت اور توجہ کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ آخر ۱۹۱۱ء میں کانفرنس کا جو اجلاس بمقام دہلی بزمانہ دربار تاجپوشی ملک معظم ہوا تھا اس کی صدارت ہز ہائی نس آغا خاں نے اس شرط سے قبول کی تھی کہ انعقاد جلسہ کے واسطے مقامی اصحاب کو تکلیف نہ دی جائے اور کل انتظام علیگڈھ سے کیا جاوے اور صدر دفتر ہی اس کا ذمہ دار ہو دربار تاجپوشی کی وجہ سے دہلی میں جاکر باہر والوں کے لئے اس قسم کا انتظام کرنا ایک سخت دشوار کام تھا مگر صاحبزادہ صاحب کی غیر معمولی محنت نے اُس کو بھی آسان کر دیا تین مہینہ پہلے سے انھوں نے اپنے دو معتمد اہلکاران یعنی مولوی محمود احمد صاحب عباسی اور مولوی انوار احمد صاحب زبیری مرحوم کو وہاں تعینات کر دیا اور ہفتہ میں ایک بار (اور کبھی دو بار بھی) خود دہلی جانا اپنے اوپر لازم کر لیا اس کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو دقت اور پریشانی اکثر ممبران کو ۱۹۰۳ء کے اجلاس میں لاحق ہوئی تھی وہ اس مرتبہ مبدل بہ راحت اور آسائش ہوگئی۔ اس اجلاس کو یہ شرف اور افتخار بھی اوّل مرتبہ حاصل ہوا کہ اس کے ایک جلسہ کی صدارت ایک والی ملک یعنی ہر ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم آف بھوپال (خلد آشیاں) نے فرمائی نیز چند دیگر روشن خیال والیان ملک مثلاً ہز ہائنس گیکواڑ آف بڑودہ نے اپنی تشریف آوری اور تقریر سے کارکنان کانفرنس کی حوصلہ افزائی فرمائی اسی اجلاس میں سر ہارکورٹ بٹلر ممبر تعلیم گورنمنٹ آف انڈیا نے مسلم یونیورسٹی کی اسکیم کے متعلق جو اس زمانہ میں مسلمانوں کا محبوب ترین مسئلہ تھا اُردو میں ایک مختصر مگر

لے لارڈ کرزن کے دربار ۱۹۰۳ء کے موقع پر نواب محسن الملک نے دہلی میں کانفرنس کا اجلاس اعلیٰ پیمانہ پر منعقد کرایا تھا اس اجلاس کا اہتمام دہلی کے مقتدر اصحاب کے ذمہ تھا جنھوں نے خان بہادر مولوی عبدالاحد صاحب (مرحوم) کی سرکردگی میں بڑا ذخیرہ ہر قسم کے ضروری سامان کا فراہم کر لیا تھا اور خان بہادر موصوف نے نہایت محنت شاقہ سے ہر چیز درست کر دی تھی دربار کی وجہ سے دہلی میں بڑا ہجوم تھا اور کانفرنس میں شرکا کی تعداد بھی غیر معمولی طور پر زیادہ تھی عین اجلاس کے زمانہ میں ایک اتفاقیہ غلطی سے ممبران کانفرنس کو انتظام طعام وغیرہ کے متعلق شکایات پیدا ہوگئی تھیں جس کے اعادہ کا خوف ہز ہائنس آغا خاں کی اس شرط کا باعث ہوا کہ انتظام صدر دفتر علیگڈھ کے ذمہ ہو اور مقامی اصحاب کو اس بارہ میں تکلیف نہ دی جائے ہز ہائنس ۱۹۰۳ء کے اجلاس کانفرنس کے پریسیڈنٹ تھے اور ان کو اس وقت کی دقتوں کا اندازہ تھا۔

ولولہ انگیز تقریر کی جس سے مجوزہ یونیورسٹی کے لئے وصولی چندہ میں بڑی امداد حاصل ہوئی اور تعلیمی نقطہ نظر سے ایک نہایت اہم کام یہ ہوا کہ مسٹر گوکھلے (آنجہانی) کی اُس مشہور اسکیم کو جو جبریہ اور مفت ابتدائی تعلیم کے اجرار کے متعلق تھی مسلمانوں کی خاص ضروریات کے تحفظ کے ساتھ پہلی مرتبہ کانفرنس نے تسلیم کرلیا اور اُس پر پسندیدگی کی مہر ثبت کردی غرضکہ دہلی کا یہ وسیع و شاندار اجلاس اپنے نتائج کے لحاظ سے نہایت کامیاب رہا۔

اجلاس کانفرنس میں ممبران کی شرکت

صاحبزادہ صاحب کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ ہر اجلاس کانفرنس میں ممبران و ممتاز مشاہیر ملک و قوم کثرت سے شریک ہوا کریں تاکہ ان کو کانفرنس کے ساتھ اصلی دلچسپی پیدا ہو چنانچہ سفیروں پر برابر یہ تاکید ہوتی تھی کہ جب وہ چندہ ممبری وصول کیا کریں تو حتی الامکان زیادہ سے زیادہ اصحاب سے وعدہ شرکت اجلاس بھی لیا کریں اس قسم کے وعدوں کی فہرستیں جب صاحبزادہ کے سامنے پیش ہوتی تھیں تو وہ ان اصحاب کو ذاتی خطوط لکھا کرتے تھے اور اجلاس میں شریک ہونے والے اصحاب کی سہولت اور آسائش کے واسطے ہر قسم کی اطلاعات بہم پہنچانا صدر دفتر کے ذمہ لازمی کردیا تھا دور دراز مقامات مثلاً کراچی۔ ڈھاکہ۔ رنگون کے سفروں کے واسطے ریل کے مختلف راستے۔ جنکشنوں پر گاڑیوں کی تبدیلی۔ ریل و جہاز کے کرایہ اور روانگی کے اوقات شرح و بسط کے ساتھ لکھ دیئے جاتے تھے اور یہ سب اطلاعات اخبارات کے ذریعہ بھی مشتہر کردی جاتی تھیں ان کارروائیوں کا یہ نتیجہ ہوا کرتا تھا کہ ہر اجلاس میں ممبران بیرونی و مقامی کی تعداد بہت کافی ہوتی تھی اور مسلمانوں کے ہر طبقہ کی دلچسپی علیگڈھ تحریک کے ساتھ روز افزوں ترقی پر تھی اور جو آخر کار مسلم یونیورسٹی اسکیم کی کامیابی میں بہت زیادہ ممد و معاون ثابت ہوئی۔

کانفرنس کے اخراجات میں احتیاط

کانفرنس کے ذرائع آمدنی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اخراجات میں اضافہ ہونا بھی لازمی تھا لیکن صاحبزادہ صاحب کی نگرانی میں ہر قسم کے اخراجات ہمیشہ اسی طرح قائم رہے جیسے کہ اس وقت

ناگزیر تھے جب کہ انھوں نے کانفرنس کے جوائنٹ سکریٹری کے عہدہ کا جائزہ لیا تھا اور جب کانفرنس فنڈ میں ایک پیسہ بھی نہ تھا بلکہ اس کے ذمہ ایک ہزار سے زائد کا قرضہ تھا کفایت شعاری جواُن کا ایک ذاتی وصف تھا وہ کانفرنس کے ہر چھوٹے بڑے کام میں اپنا جلوہ دکھاتا رہا مالکان مطابع سے ٹھیکیداران عمارت سے دفتر کے اخراجات روزمرہ کے متعلق اہلکاران سے اُن کی کدو کاوش مشہور تھی مگراس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جائز مطالبات کی ادائگی میں حیل وحجت کیا کرتے تھے۔ برخلاف اس کے عمدہ کام پر صلہ دینا بھی وہ ضروری سمجھتے تھے اور بعض سفیر اس سلسلہ میں خوب مستفیض ہوتے تھے البتہ کسی پبلک فنڈ سے ایک پیسہ بھی ناجائز صرف ہوجانا اُن پر بڑا شاق تھا اور جب ان کو یقین ہوجاتا تھا کہ کسی اہلکار نے کانفرنس کے مال میں خیانت کی ہے تو وہ اسکے خلاف ہر طرح کی کوشش کرکے اسے سزا دلواتے تھے اور اس سلسلہ میں اُن پر کسی قسم کی سعی و سفارش اثر نہیں ڈال سکتی تھی چنانچہ ایک سفیر کے خلاف اُن کو فوجداری کا مقدمہ دائر کرنا پڑا اور اس میں ان کو بہت کچھ تکلیف اُٹھانا پڑی نیز جن اصحاب نے اس سفیر کے تقرر کی سفارش کی تھی وہ بھی اُن سے آزردہ ہوگئے لیکن انھوں نے کسی بات کی پروا نہ کی اور ملزم کو عدالت سے سزا دلوائی حسابات کانفرنس کی سالانہ آڈٹ انھوں نے چارج لینے کے بعد شروع کرادی تھی جو ہر پبلک انسٹی ٹیوشن کے لئے نہایت ضروری ہے۔

کانفرنس فنڈ پر اپنے سفر خرچ کا بار نہ ڈالنا

اسی سلسلہ میں یہ امر بھی قابل اظہار ہے کہ کانفرنس اور کالج کے واسطے جب کبھی صاحبزادہ صاحب کو سفر کرنا پڑا تو وہ اپنے خرچ کا بار کسی قومی فنڈ پر نہ ڈالتے یہ سفر صوبہ متحدہ میں تو بہت زیادہ ہوتے تھے اور بعض اوقات طویل ہوتے تھے مثلاً ملتان۔ڈیرہ غازی خاں۔پشاور۔کوئٹہ۔کراچی۔پونا۔بمبئی۔کلکتہ۔رنگون وغیرہ اور سب ذاتی روپیہ سے کئے جاتے تھے اس پر اضافہ یہ کہ ایسے مواقع پر اور بالخصوص کانفرنس کے اجلاسوں کے دو تین ہفتہ قبل جبکہ وہ ہمہ تن اس کام میں منہمک ہوجاتے تھے وہ اپنی بیرسٹری کا کام

بھی بند کر دیتے تھے اور آئی ہوئی فیسوں کے سینکڑوں روپئے واپس کر دیتے تھے چشم دید اور تحریری شہادتیں موجود ہیں کہ بعض موکل یہ خیال کر کے کہ مقررہ فیس کے علاوہ اور زیادہ دینے سے وہ اُن کے مقدمات کی پیروی کے واسطے رضامند ہو جائیں گے بڑی بڑی رقوم پیش کر دیتے تھے لیکن یہ منتر کارگر نہ ہوتا تھا کیونکہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جن قومی کاموں کی ذمہ داری ایک مرتبہ اپنے اوپر عاید کر لیتے تو ان کی انجام دہی میں تکلیف اُٹھانا اور ذاتی نقصان گوارا کرنا ان کی طبیعت ثانی ہو گئی تھی اور مزید براں یہ کہ وہ اس کا اظہار بھی نہ کرتے اور نہ احسان جتاتے بلکہ بہ تلمیح شیخ قول شیرازی رح یہ کہتے تھے۔

"منت منہ کہ خدمتِ قومی ہمی کُنی"
"منت شمار زو کہ بخدمت بداشت تت"

دور دوم میں لوکل کمیٹیوں کا قیام

کانفرنس کی عملی کارروائی کی اسکیم میں جس کا تذکرہ پچھلے صفحات میں آچکا ہے صاحبزادہ صاحب نے مختلف اضلاع و مقامات میں لوکل کمیٹیوں کے اجراء اور ان کے ذریعہ سے تعلیمی کاموں کی انجام دہی پر بہت زیادہ زور دیا ہے چنانچہ جوائنٹ سکریٹری ہونے کے بعد ہی انھوں نے اس سلسلہ میں کارروائی شروع کر دی سفیروں کو خاص طور پر تاکید کی کہ وہ مقامی سر برآوردہ اصحاب کو آمادہ کر کے کمیٹیاں قائم کرائیں لیکن یہ کوشش صرف سفیروں تک محدود نہیں رکھی گئی بلکہ اسکیم کو کامیاب کرنے کی غرض سے انھوں نے وقتاً فوقتاً خود سفر کئے اور اپریل ۱۹۰۶ء میں بریلی، مرادآباد، اور میرٹھ گئے جلسے کرائے لکچر دئے اور لوکل کمیٹیاں قائم کرائیں اس کے بعد بجنور اور فتح آباد گئے اور سابقہ لوکل کمیٹیوں کو جن کا وجود صرف کاغذ پر رہ گیا تھا از سر نو زندہ کیا آگرہ اور بدایوں میں جا کر موجودہ کمیٹیوں کو اُن کے فرائض کی طرف متوجہ کیا اس تمام دوا دوش کا یہ نتیجہ ہوا کہ ۱۹۱۰ء تک مختلف مقامات میں اُنتالیس ۳۹ کمیٹیاں قائم ہو گئیں جن کا باضابطہ تعلق علیگڈھ سے ہو گیا اور یہ کمیٹیاں اپنے اپنے حلقہ اثر میں تعلیمی کام انجام دینے لگیں اُن میں سے آگے چل کر بریلی، مرادآباد، میرٹھ

آگرہ اور بدایوں کی کمیٹیاں اس حد تک کامیاب ہوئیں کہ ان مقامات پر اسلامیہ ہائی اسکول قائم ہوگئے جو اب خدا کے فضل سے تعلیمی خدمات بہ احسن وجوہ انجام دے رہے ہیں اور جن میں سے بعض انٹرمیڈیٹ اور ڈگری کالج کے درجہ پر پہنچ گئے۔

پراونشیل کانفرنسوں کا قیام اور ان میں شرکت

صاحبزادہ صاحب کے تعلیمی پروگرام میں صوبہ وار کانفرنسوں کے قیام کا مسئلہ ایک خاص اہمیت رکھتا تھا ان کی رائے تھی اور بالکل صحیح تھی کہ آل انڈیا کانفرنس کا وجود باوجود مسلسل اور منظم کوششوں کے ہر صوبہ کی تعلیمی ضروریات کے واسطے کافی نہیں ہے کیونکہ نہ تو اس کو مقامی حالات سے پوری واقفیت ہو سکتی ہے اور نہ وہ لوکل کمیٹیوں کے کام کی نگرانی کما حقہٗ کر سکتی ہے اس لئے حسب موقع مناسب وہ اس سلسلہ میں کام کرتے رہے اور بنگال، مدراس اور بمبئی میں پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس عالم وجود میں آئیں پنجاب میں اول کئی سال تک انجمن حمایت اسلام لاہور نے عملاً اس خدمت کو ایک حد تک انجام دیا تھا لیکن انجمن مذکور کے خود اپنے کام اس قدر زیادہ تھے کہ وہ صوبہ کے جملہ ضلعوں کی تعلیمی ضروریات پر کما حقہٗ توجہ نہیں کر سکتی تھی چنانچہ اپریل ۱۹۱۳ء میں ملتان سے واپسی کے وقت پہلی کوشش صاحبزادہ صاحب نے اس بارہ میں شروع کی اور پرائیویٹ ملاقات خطوط اور اخبارات میں مضامین کے ذریعہ سے اہل پنجاب کو پراونشیل کانفرنس قائم کرنے کی طرف متوجہ کیا دوسری مرتبہ اکتوبر ۱۹۱۳ء میں اہل پنجاب کے نام ایک دردانگیز اپیل شائع کی اور دسمبر ۱۹۱۳ء میں آگرہ کے اجلاس آل انڈیا کانفرنس میں مسلمانان پنجاب کو اس خاص کام کے واسطے مدعو کیا اور آخر کار اسی اجلاس میں صوبہ پنجاب کے واسطے پراونشیل کانفرنس قائم ہوئی۔

صوبہ جات متحدہ میں اودھ کے واسطے بمقام لکھنؤ اور آگرہ کے واسطے بمقام اٹاوہ علیٰحدہ علیٰحدہ کانفرنس قائم ہوئیں لیکن لکھنؤ کی اس وقت کی فضا ناسازگار ثابت ہوئی اور اودھ کی کانفرنس جلد تر مردہ ہوگئی جنگ عظیم اور بعض دیگر وقتی ہنگاموں کی وجہ سے اٹاوہ کی کانفرنس بھی کئی سال تک سکتہ کے عالم میں رہی آخر کار ۱۹۲۴ء میں صاحبزادہ صاحب کی کوششوں سے اس کو بدایوں

میں بیدار کیا گیا اور اس نئے جنم میں وہ اپنے آنریری سکریٹری (مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی) کے انہماک اور توجہ کی بدولت دونوں صوبوں (یعنی آگرہ واودھ) کی تعلیمی خدمات میں مصروف ہے۔

پراونشیل کانفرنسوں کے بعض اجلاسوں میں جن کا ذکر آگے آتا ہے صاحبزادہ صاحب نے صدارت بھی کی لیکن اُن کی دلی خواہش اور کوشش یہ رہتی تھی کہ وہ ہر صوبہ کی کانفرنس کے کسی نہ کسی اجلاس میں ضرور شرکت کریں چنانچہ حیدرآباد (سندھ)۔ منٹگمری (پنجاب) بدایوں (صوبہ متحدہ) اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے (جبکہ آخرالذکر صوبہ کے کانفرنس کی خدمات بھی انجام دیتی تھی) اجلاسوں میں شرکت کی اور بسیط تقریریں بہ مناسب موقع کیں اور عہدہ داران کانفرنس ہائے متعلقہ کو مفید مشورے دئے اور مرکز (علیگڈھ) اور صوبوں کے درمیان تعلیمی امور میں اتحاد عمل کی بنیاد ڈالی۔ بدایوں کے اجلاس میں انھوں نے آل انڈیا کانفرنس کی طرف سے تعلیم بالغان کے لئے قومی لٹریچر کی مخصوص کتابوں کا ایک صندوق بھی اس غرض سے پیش کیا تھا کہ ایک مقامی مسجد میں رکھا جاوے تاکہ نمازی مسلمان اس سے مستفیض ہوا کریں اُن کی یہ کارروائی بسلسلہ اس بسیط پروگرام کے تھی جس کی تفصیل ان کے خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۲۳ء میں موجود ہے۔

پراونشیل کانفرنسوں میں صدارت

جن پراونشیل کانفرنسوں کے اجلاس میں صاحبزادہ صاحب نے صدارت کی اُن میں سے ایک اجلاس بنگال کانفرنس کا ۱۹۱۱ء میں کلکتہ میں منعقد ہوا تھا دوسرا ۱۹۱۴ء میں صوبہ بمبئی کانفرنس کا پونا میں تھا اور تیسرا صوبہ جات متحدہ کی کانفرنس ۱۹۲۵ء کا الٰہ آباد میں اجلاس تھا اول الذکر کا خطبہ صدارت مقامی حالات کے لحاظ سے اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تھا اور نہایت بصیرت افروز اور کل صوبہ بنگال کے مسلمانوں کی ضروریات پر مشتمل تھا اس زمانہ کے اُردو اور انگریزی اخبارات نے اس پر نہایت مفید تبصرے کئے تھے یہ خطبہ جداگانہ رسالہ کی شکل میں چھپ گیا ہے ماہرین تعلیم و دیگر اصحاب جن کو اس مضمون سے دلچسپی ہے صوبہ بنگال کی کانفرنس کے دفتر سے حاصل کر کے

مستفیض ہوسکتے ہیں اس اجلاس میں خاص طور پر کلکتہ مدرسہ کو کالج کے درجہ پر پہنچانے کے واسطے ریزولیوشن پاس ہوا اور علیگڈھ کی واپسی پر صاحبزادہ صاحب نے بنگال گورنمنٹ کی خدمت میں ایک مدلل میموریل روانہ کیا نیز ڈائرکٹر سرشتہ تعلیم بنگال سے مراسلت جاری رکھی آخرکار یہ کوشش بھی بارآور ہوئی اور کلکتہ مدرسہ مستقبل کالج بن گیا جس سے بنگال کے مسلمانوں کی تعلیم میں بڑی امداد مل رہی ہے۔

پُونا کا خطبۂ صدارت ہم کو دستیاب نہ ہوسکا لیکن اس اجلاس کا خاص نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ ہی سال یعنی ۱۹۱۵ء میں آل انڈیا کانفرنس کا اجلاس پونا میں منعقد ہوا نیز اسی موقع سے صاحبزادہ صاحب نے یہ فائدہ اُٹھایا کہ گورنر بمبئی اور ڈائرکٹر سرشتہ تعلیم سے (سندھ تعلیمی پیسہ سیس بل (Cessbill) پر جس کی تحریک آل انڈیا کانفرنس کے اجلاس کراچی میں ہوئی تھی مفصل گفتگو کی اور اُن کی ہمدردی تجویز مذکور سے حاصل کی مگر افسوس ہے کہ خود مسلمانان سندھ کی نااتفاقی کی وجہ سے یہ بِل ملتوی ہوگیا۔

آخرالذکر کانفرنس کی رُوئداد سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بسلسلہ صدارت پراونشیل کانفرنس صاحبزادہ صاحب نے جب کل صوبہ کے مسلمانوں کے تعلیمی اعداد ونقشہ جات تیار کئے اور سربرآوردہ مقامی حضرات و سرکار کانفرنس سے تبادلہ خیال کیا تو دیگر اقوام کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعلیمی رفتار کو بہت ہی سست پایا اور چونکہ صوبہ بمبئی میں آل انڈیا کانفرنس کے پچھلے اجلاس کو گیارہ سال سے زائد کا زمانہ گذر چکا تھا اور حالات بہت کچھ بدل چکے تھے اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ پھر اس صوبہ میں مرکزی کانفرنس کو مدعو کرایا جاوے تاکہ یہاں کی تعلیمی تحریک کو تقویت پہنچے اور قومی کام کرنے کا ولولہ تازہ ہوجاوے چنانچہ ۱۹۱۵ء کا اجلاس آل انڈیا کانفرنس پُونا میں منعقد ہوا اور اس میں علاوہ دیگر ضروری اور عام ریزولیوشن کے خاص صوبہ بمبئی کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے واسطے نہایت مفید تجاویز منظور ہوئیں اور یہ کہنا بالکل حق بجانب ہوگا کہ یہ صرف صوبہ اور مرکزی کانفرنسوں کا نتیجہ ہے کہ صوبہ بمبئی میں اُردو کی تعلیم کے متعلق ایک

حدتک کامیاب نتائج پیدا ہوئے ہیں پونا کے اجلاس آل انڈیا کانفرنس کو یہ امتیاز بھی حاصل ہوا تھا کہ اس اجلاس میں قوم نے مفت اور جبری تعلیم کا اصول دوسری مرتبہ تسلیم کیا تھا۔

(نوٹ: پہلی بار دہلی کی کانفرنس ۱۹۱۱ء میں اس اصول کو منظور کیا گیا تھا)

الٰہ آباد کے خطبۂ صدارت میں صاحبزادہ صاحب نے ایک اہم اور ضروری مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار کیا تھا اس لئے ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ پراونشیل کانفرنس کی رپورٹ متعلقہ سے اس کا مختصر اقتباس یہاں درج کردیں۔ صوبہ کی کانفرنس کو شکایت تھی اور بجا شکایت تھی (اور جواب بھی ایک بڑی حد تک صحیح ہے) کہ سررشتہ تعلیم مسلمانوں کے جائز مطالبات پر توجہ نہیں کرتا جس کی وجہ سے ان کی تعلیم میں شدید مشکلات ہیں اور اُن کے واجبی حقوق کی پامالی ہورہی ہے نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ جو ریزولیوشن کانفرنس کی طرف سے بھیجے جاتے تھے بسا اوقات ان کی رسید تک نہ آتی تھی کانفرنس کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہ تھا کہ سررشتہ تعلیم پر اثر ڈالا جاسکے ان حالات میں صاحبزادہ صاحب نے جو علاج تجویز کیا وہ حسب ذیل ہے:۔

"وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے فرائض کو اُس خلوص و سرگرمی کے ساتھ انجام دیں جس کی ہماری نازک حالت متقاضی ہے ہم کو اپنے مفاد و مقاصد قومی کے تحفظ کے لئے مناسب اور معقول مطالبہ کا حق حاصل ہے لیکن یہ اس وقت کارآمد ہوسکتا ہے جب ہمارے نمائندے اپنے فرائض خوبی کیساتھ انجام دیں اس کا انحصار نہ صرف ہمارے نمائندوں کی قابلیت اور قوت پر ہے بلکہ اس کا مدار زیادہ تر مسلمان پبلک کی اُس فکر اور آمادگی پر ہے جس کے ساتھ وہ اس کانفرنس کے توسل سے اُن نمائندوں کی کارکردگی کو نظر میں رکھ سکتے ہیں اس سلسلہ میں۔ میں اپنے نمائندگان مجلس قانون (U.P. Legis Lative Council) سے اپیل کروں گا کہ وہ عامۃ النّاس اور اس کانفرنس کے لئے وہ تمام اطلاعات حاصل کریں جن کا نہ صرف حکام بلکہ خود اُن کی اپنی جد و جہد و کارکردگی سے تعلق ہے اور جو ہمارے ہر قسم کے تعلیمی مفاد اور مقاصد سے وابستہ ہیں۔ میں نہایت ادب کے ساتھ یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ سکریٹری صاحب کانفرنس کی سالانہ رپورٹ میں ایک نوٹ کا اضافہ

فرمائیں جس میں سال رواں کے کل سوالات یا تجاویز کا خلاصہ ہو جو صوبہ کی کونسل میں ہماری تعلیمی ضروریات کے متعلق مسلمان ممبران نے پیش کئے آپ کو معلوم ہے کہ صوبہ کے مختلف اضلاع سے بھیجے ہوئے تقریباً تیئس[۲۳] نمائندے ہمارے اس وقت کونسل میں ہیں ان کو اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ ہماری تعلیمی ضروریات اور مطالبات کو برابر گورنمنٹ اور پبلک کے پیش نظر رکھیں اگر اس کانفرنس یا اس قسم کی دیگر جماعتوں سے متحد ہو کر ہمارے ممبران کونسل اپنی قوم کی تعلیمی ضروریات پر پوری توجہ اور طاقت صرف کریں تو مجھے یقین ہے کہ وہ ثمرات حاصل ہو جائیں گے جو معمولی اجتماع یا احتجاج سے حاصل نہیں ہو سکتے۔"

خدا کا شکر ہے کہ پچھلے چند سال میں صاحبزادہ صاحب کے مجوزہ طریقہ کار پر عمل شروع ہوا ہے اور بعض مسلم ممبران کونسل کی توجہ اور سرگرمی سے صوبہ جات متحدہ کے سررشتہ تعلیم کو مسلمانوں کے اکثر مطالبات کی واجبیت کا بادل ناخواستہ اقرار کرنا پڑا ہے۔

سالانہ رپورٹ میں مفید اصلاحات

صاحبزادہ صاحب کے جوائنٹ سکریٹری مقرر ہونے سے قبل کانفرنس کی سالانہ رپورٹوں میں خطبۂ صدارت ریزولیوشن اور اُن پر مباحثہ کا خلاصہ آمدنی و خرچ کے گوشوارے۔ فہرست ممبران و وزیٹران اور مسلمانوں کی عام بے حسی و بے اتفاقی کی شکایت ہوا کرتی تھی یا ان کو اُبھارنے اور جوش دلانے کے واسطے ایک دو لکچر اور نظم و نثر کے کچھ مرثیے ہوتے تھے ان سب چیزوں کو اپنے اپنے حدود میں قائم رکھتے ہوئے صاحبزادہ صاحب نے اور بہت سی مفید اصلاحات سالانہ رپورٹ میں داخل کر دیں اپنے کارکردگی کے پہلے ہی سال کی رپورٹ میں (جو ۲۲ مطبوعہ صفحات پر مشتمل ہے اور جو بمقام ڈھاکہ دسمبر ۱۹۰۶ء میں پیش ہوئی تھی) اول حصہ میں انھوں نے ہندوستان کے کل مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو صوبہ دار اعداد و شمار کے تناسب سے دکھلایا تھا کہ وہ کس قدر پستی کی منزل میں پڑے ہیں اور اس ہمت شکن پستی و تنزل سے ان کو کس طرح ترقی کی شاہراہ پر لانے کے لئے تدابیر اختیار کرنی چاہئیں نیز صوبہ بنگال کی ضروریات تعلیمی کی خاص طور

پر وضاحت کی گئی تھی رپورٹ کے دوسرے حصّہ میں آل انڈیا کانفرنس اور اس کے شعبہ جات (تعلیم نسواں۔ ترقی اُردو وغیرہ وغیرہ) کا سال بھر کا کام جو علیگڈھ میں اور علیگڈھ سے باہر ہوا تھا مناسب تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا تھا یہ سچ ہے کہ کل ہندوستان کے اعداد تعلیمی کا جمع کرنا اور اُن سے مسلمانوں کے متعلق نتائج اخذ کرکے مفید عملی تجاویز پیش کرنا بجائے خود بڑی کاوش اور سخت محنت کا کام تھا لیکن اس مواد کے فراہم ہونے کے بعد صدر دفتر علیگڈھ سے جو مسلسل کوشش ہوتی رہی اور جو تحریکات گورنمنٹ آف انڈیا و پراونشیل گورنمنٹ میں کی گئیں اور جن میں اعداد و شمار سے مسلمانوں کے مطالبات تعلیمی کے جائز ہونے پر استدلال کیا گیا ان سب کا نتیجہ آخرکار قومی تعلیم کے حق میں ایک حد تک مفید ثابت ہوا اور یہی اصلی مدعا صاحبزادہ صاحب کی غیر معمولی جد و جہد کا تھا۔

دوسرے سال کی رپورٹ جو دسمبر ۱۹۰۸ء میں آل انڈیا کانفرنس کے اجلاس امرتسر میں پیش ہوئی وہ پہلے سال کی رپورٹ سے بھی زیادہ جامع۔ مدلّل اور مفید معلومات سے پُر تھی اس میں علاوہ صوبہ وار تعلیمی اعداد کے ایک مفصل پروگرام قومی تعلیم کے ترقی کے واسطے آئندہ بارہ سال کیلئے پیش کیا گیا تھا اور مجوزہ مسلم یونیورسٹی کو عالم وجود میں لانے کا مقصد اعظم جو سرسید علیہ الرحمۃ کے انتقال کے بعد ہر سال کانفرنس کے اجلاس میں پیش کیا جاتا تھا اس رپورٹ میں خاص طور سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا تھا یہ بہتّر صفحہ کی مطبوعہ رپورٹ (جس پر اجلاس میں بہت کچھ تحسین و آفرین کی گئی اور اخبارات میں نہایت عمدہ اور حوصلہ افزا رائیں شائع ہوئیں) یہاں پر نقل نہیں کی جاسکتی اور اس کا مختصر اقتباس اس کی خوبی اور اہمیت کو ظاہر نہیں کرسکتا اس لئے ہم نواب وقارالملک مرحوم و مغفور کی رائے جو موصوف نے اس رپورٹ کے متعلق ظاہر فرمائی تھی لکھ دینا کافی اور مناسب خیال کرتے ہیں اور اس پر اضافہ کرتے ہیں کہ یہ عجیب حُسن اتفاق ہے کہ صاحبزادہ صاحب کے مجوزہ پروگرام کے بموجب ٹھیک بارھویں سال یعنی ۱۹۲۰ء کے آخر میں مسلم یونیورسٹی قائم ہوگئی۔

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید

جوائنٹ سکریٹری کی رپورٹ پر نواب وقارالملک مرحوم کی رائے:۔

"جو باتیں جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے اپنی رپورٹ میں مسلمانوں کی اصلاح اور فلاح کے متعلق بیان کی ہیں اور محمڈن یونیورسٹی کی تکمیل کے بارہ میں جو پروگرام اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے قوم کے سامنے پیش کیا ہے مخصوص رپورٹ کا وہ حصہ جس میں ہر صوبہ کی تعلیم اور ترقی سے مقابلہ کیا گیا ہے اس قابل ہے کہ اس رپورٹ کے پڑھنے والے اسے غور سے پڑھیں"۔

"رپورٹ دفتر کانفرنس کی سال بھر کی کارروائی کی محض اطلاع نہیں ہے بلکہ وہ قوم کے علمی تنزل اور موجودہ افسوسناک حالت کا ایک مرقع ہے جس میں قوم کی تباہی اس کی غفلت اور جہل کی اصلی تصویریں نظر آتی ہیں اس قسم کے مضامین یا رپورٹیں کوئی معمولی تحریریں نہیں ہوتیں جن پر سرسری نظر ڈالنی کافی معلوم ہوتی ہے بلکہ یہ وہ نازک باتیں ہیں جن پر پوری توجہ کے ساتھ عمل و کوشش کی ضرورت ہوتی ہے اور جن کی طرف سے کسی قسم کی بے پروائی اور عدم توجہی قومی موت کا باعث ہے جس محنت اور دل سوزی کے ساتھ رپورٹ لکھی گئی ہے اور جو تجویزیں قوم کی خدمت میں پیش کی گئی ہیں اُمید ہے کہ قوم اپنی بہبودی کے لئے ان خیالات کو دستورالعمل بنائے گی کیونکہ اس محنت کا اگر کوئی صلہ ہے تو فقط یہی ہے کہ قوم بحیثیت مجموعی قوت اپنی بہبودی کے واسطے اب وہ تدابیر اختیار کرے جو اس کی عزت اور ترقی کا باعث ہوں اور جو اس رپورٹ کے لکھنے کا اصلی مقصد ہے۔

خاکسار
مشتاق حسین
آنریری سکریٹری آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس"

نوٹ (ماخوذ از رپورٹ سالانہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۲۲ء صفحہ ۵۷-۵۸)۔

۱۹۰۸ء کے بعد ہم کو ۱۹۱۴ء میں صاحبزادہ صاحب کی ایک تیسری رپورٹ ملتی ہے جو راولپنڈی کے اجلاس کانفرنس میں پیش ہوئی تھی اور جو ان کی سابقہ رپورٹوں سے زیادہ مبسوط مدلل اور عمدہ ہے یہ رپورٹ ایک تمہید اور ایک مضمون یعنی "کانفرنس کا ماضی و مستقبل" اور سالانہ کارگذاری کے حالات میں ۴۰ اصفحات مطبوعہ پر مشتمل ہے ظاہر ہے کہ ایسی جامع رپورٹ جس میں جملہ "قومی تعلیمی نظام" کے قیام ترقی کے مختلف و پیچیدہ مسائل پر بحث ہو یہاں نقل نہیں کی جاسکتی اس لئے ہم نہایت مختصر طور پر اُن دو تین امور کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو اس رپورٹ کی جان سخن ہیں سب سے پہلی مرتبہ کانفرنس کی رپورٹ میں اُس مذہبی جذبہ کا جلوہ نظر آتا ہے جو بتدریج صاحبزادہ صاحب کے خیالات و افکار میں رو بہ ترقی تھا اور جس کی ایک جھلک اُن کے خطبۂ صدارت جلسہ سالانہ مدرسہ الٰہیات کانپور میں (۱۹۱۰ء) میں نظر آئی تھی اور جو آخر کار ایک تنظیمی اسکیم کی شکل میں موصوف کے خطبۂ صدارت آل انڈیا کانفرنس کے اجلاس ۱۹۲۳ء میں نمودار ہوا اس رپورٹ میں اس امر کی پوری تفصیل کی گئی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بحیثیت مسلمان کس طرح کامیاب ہوسکتے ہیں اور بحیثیت اس ملک کے باشندے ہونے کے ان کی ترقی کے کیا ذرائع ہوسکتے ہیں نیز گورنمنٹ آف انڈیا کی پنجسالہ تعلیمی رپورٹ اور صوبجات کے سررشتہ تعلیم کی سالانہ رپورٹوں کا تعلق جہاں تک کہ مسلمانوں کی تعلیم سے ہے اس پر نہایت متانت اور وضاحت سے بحث کی گئی اور بتلایا گیا کہ مرکزی اور صوبجاتی گورنمنٹوں نے کس حد تک اپنے اپنے فرائض اس سلسلہ میں ادا کئے علاوہ بریں اس رپورٹ میں صوبجات پنجاب و سرحد کی پست تعلیمی حالات کو خاص طور پر نقشہ جات و ڈائگرم (Diagram) کے ذریعہ سے نمایاں کیا گیا تھا نیز مسلمانان کشمیر کی حالت زار کا دردانگیز و عبرتناک مرقع پیش کیا گیا تھا آخرالذکر مسئلہ کی تفصیل جداگانہ عنوان کے تحت میں بیان کی جائے گی اول الذکر صوبہ جات کے متعلق جو ڈائگرام دکھلائے گئے تھے ان کا گہرا اثر حاضرین اجلاس پر ہوا چنانچہ خان بہادر

شیخ غلام صادق صاحب (مرحوم) رئیس امرتسر نے صاحبزادہ صاحب کے واسطے شکریہ کا ووٹ پیش کرتے ہوئے (جس کو اجلاس نے بالاتفاق منظور کیا) اپنی طرف سے مبلغ صہ پچاس روپیہ کا اعلان کیا کہ اس روپیہ سے ڈائگرام مذکورہ بالا طبع کرا کر ہر دو صوبہ جات کے جملہ اسلامیہ مدارس و انجمنوں میں بھیجے جائیں اس رپورٹ کی بابتہ آخری بات جو ہم کو کہنی ہے وہ یہ ہے کہ صاحبزادہ صاحب نے ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت نہ صرف سیاسی اغراض و ملکی مفاد کے لحاظ سے رپورٹ میں ظاہر کی تھی بلکہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے واسطے باہمی اتحاد و رواداری کو مؤثر دلائل سے ضروری بتلایا تھا اور ثابت کیا تھا کہ بغیر امداد و تعاون فریقین کے اس پیچیدہ مسئلہ کا حل دشوار بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔

ناظرین کے علم میں ہے کہ ۱۹۱۴ء سے قبل بھی ایک دو مرتبہ اور اس کے بعد تو مختلف اوقات میں سیاسی رہنمایان ملک و ملت نے ہندو مسلم اتحاد کے واسطے بارہا سرگرمیاں دکھلائیں لیکن افسوس کہ نتیجہ کبھی دیرپا نہ نکلا ان کوششوں میں گو چند ایسے اصحاب بھی شامل تھے جن کا تعلق بعض قومی درسگاہوں سے تھا لیکن ہمارے خیال میں من حیث الجماعت منتظمین مدارس نے کوئی عملی قدم اس سلسلہ میں نہیں اٹھایا ہے پس جبکہ اس مسئلہ کی اہمیت مسلم ہے کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ قومی درسگاہوں کے منتظمین اور مخصوص اساتذہ صاحبزادہ صاحب کے نظریہ متذکرہ صدر پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور طلبہ کی انجمنوں میں شریک ہو کر ہمدردی کے ساتھ صحیح اصولوں پر ان کی رہنمائی کریں اور حقیقی و پائدار ملکی و ملی اتحاد و اتفاق کی بنیادوں کو استوار کریں کہ یہی ایک واحد و اصلی ذریعہ اس ملک کی نجات کا ہے۔

"لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا"

Teachers Conference
کانفرنس اساتذہ

مرکزی کانفرنس کی تنظیم کے ساتھ ساتھ لوکل کمیٹیوں اور صوبہ وار کانفرنسوں کے قیام کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اس کل کارروائی کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف اضلاع و قصبات میں اسلامیہ اسکول و مکاتب عالم وجود میں آنے

تھے لیکن ان درسگاہوں کو شروع ہی سے ایک طرف تو سررشتہ تعلیم کی غیر ہمدردانہ کارروائیوں سے اور دوسری طرف خود قوم کی سرد مہری اور منتظمین کی باہمی کشمکش سے دوچار ہونا پڑا چنانچہ ان خرابیوں کی اصلاح وانسداد کے واسطے ۱۹۰۸ء میں آل انڈیا کانفرنس کے اجلاس امرتسر میں یہ قرار پایا کہ اسلامیہ اسکولوں کے اساتذہ، خاص خاص منتظمین اور بعض ماہران تعلیم کی ایک کانفرنس علیگڈھ میں طلب کی جاوے اور غور و مشورے کے بعد ان مشکلات کے حل کرنے کے لئے عملی تدابیر اختیار کی جاویں۔

مندرجہ بالا حالات میں ۲۹ و ۳۰ مئی ۱۹۰۹ء کو ٹیچرس کانفرنس (Teachers Conference) اول مرتبہ زیر صدارت شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاءاللہ صاحب دہلوی (مرحوم) علیگڈھ میں منعقد ہوئی جس میں صوبہ جات متحدہ، پنجاب، سرحد، بمبئی، بنگال وغیرہ کے اصحاب متعلقہ شریک ہوئے اور کامل غور و خوض کے بعد نہایت مفید اور ضروری تجاویز منظور ہوئیں اور ان کے مطابق مرکز علیگڈھ و دیگر مقامات سے کارروائی شروع ہوگئی اس کانفرنس کی تجاویز نہایت واضح و جامع ہیں اور روئداد اجلاس آل انڈیا کانفرنس ۱۹۰۹ء میں بالتفصیل درج ہیں جب دسمبر ۱۹۰۹ء میں اس کانفرنس کی رپورٹ مرکزی کانفرنس کے اجلاس رنگون (برہما) میں پیش ہوئی تو قرار پایا کہ سال آئندہ پھر ٹیچرس کانفرنس بمقام علیگڈھ طلب کی جاوے چنانچہ اس ریزولیوشن کی تعمیل ہوئی اور ۳۰ اپریل و یکم مئی ۱۹۱۰ء کو اس کانفرنس کا دوسرا اجلاس علیگڈھ میں منعقد ہوا اور اس کی صدارت (سر) شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا۔ لاہور نے کی حاضرین کی تعداد مثل سال گذشتہ کے تھی اور کچھ تعداد جدید اساتذہ کی بھی موجود تھی علاوہ خاص امور انتظامی و تعلیمی کے جن کا تعلق براہ راست اسلامیہ اسکولوں سے تھا اس سال کے اجلاس میں ایک لکچر مسٹر ریس (Rees) ہیڈ ماسٹر محمڈن کالجیٹ اسکول علیگڈھ اور دوسرا ڈاکٹر ضیاءالدین احمد صاحب پروفیسر ریاضی محمڈن کالج علیگڈھ کا بھی تھا۔

اول الذکر انگلش پبلک اسکول کے متعلق مفید معلومات کا مرقع تھا اور آخرالذکر لکچر کا

انشا اور ریاضی کی تعلیم (جس کے نام سے اس زمانہ میں مسلم طلبہ کانپتے تھے) اتنی غیر دلچسپ اور دشوار نہیں ہے بشرطیکہ ٹھیک طریقہ تعلیم اختیار کیا جاوے نیز اساتذہ کے استفادہ کی غرض سے کنڈر گارٹن سسٹم کے آلات وغیرہ بھی مشاہدہ کرائے گئے اس اجلاس میں بعض اسلامیہ اسکولوں کے استاد اپنے چند طلبہ کو بھی لائے تھے ان میں سے بریلی کے طلبہ نے جن کو مولوی قمر علی صاحب (خلیک) لائے تھے بذریعہ پینی ریڈنگ (Penny Reading) شب کے ایک جلسہ کو نہایت دلچسپ اور سبق آموز بنادیا اور علیگڈھ کے تین طالب علموں نے مسلم یونیورسٹی کے عنوان پر نہایت عمدہ تقریریں کیں اور اس طرح سنہ ۱۹۱۰ء کا اجلاس بخیر و خوبی ختم ہوا۔

مرکزی دفتر علیگڈھ سے اب پتہ نہیں چلتا کہ اس کانفرنس اساتذہ کا کوئی جلسہ سنہ ۱۲-۱۹۱۱ء میں ہوا یا نہیں گمان غالب یہ ہے کہ نہیں ہوا کیونکہ اس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کی اسکیم کو کامیاب کرنے کے واسطے مرکزی کانفرنس کا تقریباً کل عملہ کالج کو منتقل کر دیا گیا تھا اور خود صاحبزادہ صاحب بھی ہمہ تن اسی کام میں منہمک ہو گئے تھے البتہ سنہ ۱۹۱۳ء میں ایک خاص ضرورت پیش آجانے کی وجہ سے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے اساتذہ کی کانفرنس علیگڈھ میں ہوئی۔

صوبہ متحدہ کی کمیٹی ابتدائی تعلیم اور کانفرنس کی کوشش

گورنمنٹ صوبہ متحدہ نے مئی سنہ ۱۹۱۳ء میں ایک کمیٹی تعلیم کے متعلق زیر صدارت آنریبل جسٹس پیگٹ مقرر کی تھی جس نے اپنی تجاویز کے متعلق کانفرنس اور کالج سے بھی رائے طلب کی تھی اس کمیٹی کی اکثر تجاویز کا مضر اثر مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم پر پڑنے والا تھا اس لئے کانفرنس کی طرف سے علاوہ اساتذہ کے اکثر مسلمان ماہرین تعلیم بھی مدعو کئے گئے تھے اور صوبہ کی گورنمنٹ نے پانچ افسران سررشتہ تعلیم کو بھی شرکت کی اجازت دی تھی یہ وقیع جلسہ زیر صدارت خان صاحب خواجہ سجاد حسین صاحب مرحوم (پانی پتی) انسپکٹر آف اسکولس پنجاب ہوا ایک ہفتہ تک علیگڈھ میں سرگرم بحث و مباحثہ رہا جس میں ۱۹ر جولائی سنہ ۱۹۱۳ء کو ایک نہایت ہی مبسوط و مکمل اسکیم تیار ہوئی اور گورنمنٹ کی کمیٹی کے سوالات کا مشرح و مدلل

جواب دیا گیا یہ سینتیس صفحہ کی روئداد مرکزی کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں بمقام آگرہ پیش ہوئی کتاب ہذا کے صفحات اس کی نقل کے متحمل نہیں ہو سکتے ہیں لیکن اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اگر ایسا مسکت اور مدلل جواب علیگڈھ سے نہ پیش ہوتا تو پیگٹ کمیٹی کی تجاویز کے بموجب اس صوبہ کے مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کو بہت زیادہ نقصان پہنچتا یہ امر بھی نظر انداز نہ ہونا چاہئے کہ یہ تعلیمی جد وجہد صوبہ کی عام ابتدائی تعلیم کے واسطے بھی مفید ثابت ہوئی۔ اس لئے وہ کانفرنس کا ایک مہتم بالشان کارنامہ ہے اور بقول اخبار البشیر اٹاوہ[1] یہ صاحبزادہ صاحب کے ذاتی اثر کا نتیجہ تھا۔

چوتھی مرتبہ ٹیچرس کانفرنس کا اجلاس ۲۱ و ۲۲ جون ۱۹۱۴ء کو علیگڈھ میں زیر صدارت خان بہادر مولوی محمد بشیر الدین صاحب مشہور و معروف ماہر تعلیم و بانی و منیجر اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ منعقد ہوا اس اجلاس میں علاوہ دیگر مفید تحریکات کے یہ اہم تجویز بھی منظور ہوئی کہ جملہ اسلامیہ مدارس جو سررشتہ تعلیمات کے مقرر کردہ نصاب کی تعلیم دیتے ہیں ایک خاص نظام میں منسلک کر دئے جائیں اور اس قسم کے جو اسکول کے اب تک سررشتہ تعلیم سے باضابطہ تسلیم نہ ہو گئے ہوں ان کو رگنائزڈ (Recognised) کرایا جائے چنانچہ ایک مفصل اسکیم جو اس معاملہ کے کل پہلوؤں پر حاوی تھی مرتب کی گئی اور عملی کارروائی کی غرض سے خاص خاص مدارس کا معائنہ بھی کرایا گیا۔

مندرجہ بالا امور کے علاوہ ایک بڑا اہم و دور رس نتیجہ اساتذہ کی کانفرنسوں کا یہ ہوا کہ گورنمنٹ صوبہ جات متحدہ نے مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کی بابت ان کے خاص خاص مطالبہ جات کو تسلیم

[1] مسلم ابتدائی تعلیم کی یہ افسوسناک حالت دیکھ کر صاحبزادہ صاحب (آفتاب احمد خاں مرحوم) نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ماتحتی میں ایک جلسہ طلب کیا جس میں علاوہ ان مسلمانوں کے کہ جن کو تعلیمی تجربہ حاصل تھا اپنے اثر کو کام میں لا کر سررشتہ تعلیم کے مسلمان افسروں کو علیگڈھ بلایا اور بعد بحث و مباحثہ کے ایک میموریل تیار کر کے گورنمنٹ میں بھیجا یہ صاحبزادہ صاحب کے ذاتی اثر کا نتیجہ تھا۔ (صفحہ ۲ البشیر اٹاوہ ۲۰ اپریل ۱۹۳۰ء)

کرکے ۲۵ راگست ۱۹۱۴ء کا مشہور ریزولیوشن جاری کیا جس کی تفصیل عنوان متعلقہ کی تحت میں کی جائے گی۔

گورنمنٹ ہند کا ۱۹۱۳ء کا مشہور ریزولیوشن

اس کانفرنس کا کام جس وقت سے صاحبزادہ صاحب کے سپرد ہوا تھا وہ مسلسل کوشش کرتے رہے کہ مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق جو خاص امور گورنمنٹ آف انڈیا اور صوبہ جات کی گورنمنٹوں اور والیان ملک کی توجہ و احکام کے محتاج ہیں وہ صرف کانفرنس کے سالانہ ریزولیوشنوں تک محدود نہ رہیں بلکہ اُن پر عمل بھی ہو چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے واسطے وہ حکام متعلقہ سے ضابطہ کی مراسلت پر قناعت نہ کرتے تھے بلکہ حسب موقع ان کے پاس جاتے تھے اور تفصیلی گفتگو میں اپنے مطالبات اکثر تسلیم کرا لیتے تھے اور بعض مقامات پر مختصر وفد بھی لے جاتے تھے اور مسلم اخبارات میں اُن امور کو زیر بحث لاکر ایک متفقہ آواز بلند کراتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخرکار گورنمنٹ کو متوجہ ہونا پڑا اور اپریل ۱۹۱۳ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے مسلمانوں کے خاص خاص تعلیمی مطالبات کو اپنے ریزولیوشن (نمبری ۵۹۵-۵۸۵ مورخہ ۳ راپریل ۱۹۱۳ء) میں تسلیم کرکے صوبہ جات کی گورنمنٹوں کو ان کی تعمیل کی ہدایت کی۔

گورنمنٹ صوبہ متحدہ کا اگست ۱۹۱۴ء کا اہم ریزولیوشن

ادھر گورنمنٹ صوبہ متحدہ نے مئی ۱۹۱۳ء میں ابتدائی تعلیم پر ایک کمیٹی (جو پگٹ کمیٹی کے نام سے مشہور ہے اور جس کا تفصیلی تذکرہ قبل ازیں ہو چکا ہے) مقرر کی۔ اس کمیٹی کی تجاویز پر مدلل اور مفصل رائے گورنمنٹ میں بھیجی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سر جیمس مسٹن لفٹننٹ گورنر صوبہ متحدہ نے ستر۱۷ہ مسلمان ماہران تعلیم کی ایک کمیٹی (جسکے سکریٹری مرزا حبیب حسن مرحوم ایک ملازم سرکاری تھے) بمقام نینی تال طلب کی اس کمیٹی میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں خان بہادر شیخ عبداللہ اور ڈاکٹر (سر) ضیاءالدین احمد علیگڈھ سے براہ راست تعلق رکھنے والے تھے دیگر ممبران میں سے اکثریت ایسے اصحاب کی تھی جو کسی نہ کسی حیثیت سے

علیگڈھ سے وابستہ تھے اور اس لیاظ سے اس کمیٹی کو علی گڈھ کی نیابت کا اچھا موقع حاصل ہوا تھا کمیٹی نے اپنے ممبران میں سے مولوی سید کرامت حسین (مرحوم) سابق جج ہائیکورٹ الہ آباد کو اپنا صدر منتخب کر کے نہایت غور و محنت سے کارروائی شروع کی اور ایک نہایت مبسوط و مدلل رپورٹ کے ذریعہ سے جو ۷۶ مطبوعہ صفحات پر مشتمل ہے مسلمانوں کے مطالبات کو پیش کیا نیز متعدد نقشہ جات و گوشواروں میں صحیح اعداد و شمار سے مسلمانوں کے حقوق کو واضح کیا گیا اور یہ سب بقول مولوی بشیرالدین صاحب جو اس کمیٹی کے سرگرم ممبر تھے) صاحبزادہ صاحب ہی کی دماغ سوزی اور شبانہ روز محنت کا نتیجہ تھا۔[1]

اس ضخیم رپورٹ کی تفصیل ان صفحات میں ممکن نہیں ہے گورنمنٹ نے کمیٹی کی اکثر و بیشتر سفارشات کو منظور کر کے ان پر عملدرآمد کے واسطے ۲۵ / اگست ۱۹۱۴ء کو اپنا ریزولیوشن (جو مسٹن اسکیم کے نام سے مشہور ہو گیا ہے) صادر کیا اس ذریعہ سے صوبہ متحدہ میں پرائمری اسلامیہ اسکول و مکاتب قائم ہوئے جن میں مذہبی تعلیم کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا اور ہر ضلع کے واسطے ایک کمیٹی اور صوبہ کے واسطے مسلم ممبران کی ایک سنٹرل کمیٹی زیر صدارت مسلم انسپکٹر آف اسکولز مقرر کی گئی نگرانی کے واسطے ایک خاص عملہ (معہ اس کے متعلقات کے) جس میں صوبہ کے واسطے ایک مسلمان انسپکٹر اور ہر کمشنری کے لئے ایک ڈپٹی انسپکٹر کا تقرر ہوا اور اس طرح گو مسلمانوں کی دیرینہ آرزو و کوشش ایک حد تک پوری ہوئی لیکن نتائج کے لحاظ سے (جس کی ذمہ داری بہت کچھ خود مسلمانوں پر ہے) افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ اسکیم کچھ زیادہ کامیاب

نوٹ [1] ان نقشہ جات اور اعداد کی اہمیت اس واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے کہ جب ہندو پریس نے صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ پر مسلمانوں کے ساتھ غیر واجب تعلیمی مراعات کا الزام لگایا تو سر جیمس مسٹن لفٹنٹ گورنر صوبہ کو اس غلط الزام کی تردید اور اپنی گورنمنٹ کی غیر جانبداری ثابت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ہز آنر نے بمقام غازیپور بجواب ایڈریس ڈسٹرکٹ بورڈ نہایت صاف الفاظ میں اعتراف کیا کہ مسلمانوں کی کمیٹی نے جو اعداد و شمار پیش کئے تھے وہ اس درجہ صحیح اہم اور لاجواب تھے کہ گورنمنٹ ان کو قبول کرنے کے واسطے مجبور تھی اور اس کے جو احکام گورنمنٹ نے ۲۵ / اگست ۱۹۱۴ء کے ریزولیوشن کے ذریعہ سے جاری کئے وہ بالکل حق بجانب اور مبنی بر انصاف ہیں۔

غرض اسی زمانہ میں خود صاحبزادہ صاحب نے ایک طویل مضمون میں (جو علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مطبوعہ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۴ء کے ساڑھے نو صفحات پر شائع ہوا تھا) گورنمنٹ کے اس ریزولیشن اور کانفرنس کی ستائیس سال کی مسلسل مساعی کی تفصیل کرکے قوم سے اس سلسلہ میں عملی کارروائی کے واسطے پُرزور اپیل کی تھی کاش کہ مسلمانوں میں وہ بیداری اور دُھن ہوتی جو ہمارے ابنائے وطن میں ہے تو اس وقت ان کی ابتدائی تعلیم صوبہ متحدہ میں ایسی زبون و پست حالت میں نہ ہوتی کہ جس کا رونا اب اُن کی ہر تعلیمی مجلس میں رویا جاتا ہے۔

صاحبزادہ صاحب بحیثیت ممبر کمیٹی صوبہ و چیرمین کمیٹی علیگڈھ

متذکرہ صدر مسٹن اسکیم کے نفاذ کے وقت سے صاحبزادہ صاحب صوبہ کی کمیٹی کے ممبر اور ضلع علیگڈھ کی کمیٹی کے چیرمین مقرر ہوئے تھے انھوں نے اپنے فطری انہماک کے ساتھ یہ کام شروع کیا اور مسلمان پبلک کو متوجہ کرنے کے علاوہ ان اسباب پر بھی غور کیا جن کا تعلق ملازمان سرکاری سے تھا اور جن کی سرد مہری اسکیم کی کامیابی میں حائل تھی چنانچہ انھوں نے ۱۹۱۷ء میں جملہ ضروری امور کو تفصیل کے ساتھ ایک رسالہ کی شکل میں مرتب کرکے جو انگریزی کے باریک ٹائپ کے ۲۶ صفحات میں چھپا ہوا ہے) گورنمنٹ میں ارسال کیا اور پبلک میں بھی اس کی اشاعت کی اس کارروائی کا نتیجہ ایک حد تک مفید ثابت ہوا۔

مسلمانان کشمیر کی تعلیمی ترقی کے واسطے جدوجہد

یہ تو ہم نہیں بتا سکتے کہ مسلمانان کشمیر کی تعلیمی ترقی کی لگن صاحبزادہ صاحب کے دل میں کب سے تھی لیکن ۱۹۰۷ء میں کانفرنس کے اجلاس (مقام کراچی) میں ان کی کوشش سے ہز ہائی نس مہاراجہ صاحب کشمیر کی توجہ کو اس خطہ کے مسلمانوں کی حالت زار کی جانب بذریعہ ایک ریزولیشن کے منعطف کرایا جانا ظاہر کرتا ہے کہ ۱۹۰۷ء سے ان کی کوشش نے عملی صورت

نوٹ لہ صاحبزادہ صاحب نے ۲۵ اگست ۱۹۱۴ء کے ریزولیشن کے ضروری اقتباسات اُردو میں (آٹھ صفحہ مطبوعہ پر) اس غرض سے شائع کئے کہ مسلمان واقعی طور پر اس ریزولیشن کے احکام سے فائدہ اُٹھاسکیں اور طریقہ کارروائی اُنھیں معلوم ہوجائے

اختیار کر لی تھی۔ اسی اجلاس میں کشمیر کے مسلمان طلبہ کی امداد تعلیم کے واسطے انھوں نے چند علم دوست و مقتدر اصحاب سے وظائف حاصل کئے اور کالج و کانفرنس سے بھی اسی قسم کا انتظام ہوا تاکہ غریب ہونہار کشمیری طلبہ علیگڑھ اور لاہور میں تعلیم پا سکیں اس کے بعد وہ مسلسل کوشش کشمیر کے مسلمانوں کی بابت کرتے رہے اور ہر سال کانفرنس میں وہاں کی ضروریات کے لحاظ سے ریزولیوشن پاس کراتے رہے اور ایک خاص سفیر کانفرنس کی جانب سے کشمیر بھیجا تاکہ وہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کے متعلق تحقیقات کر کے اعداد اور صحیح حالات جمع کرے اور لوکل کمیٹیاں قائم کرا کر وہاں سے مسلمان طلبہ کو علیگڑھ و لاہور بھجوانے کا انتظام کرے اسی دوران میں صاحبزادہ صاحب کشمیر کے بعض معززین سے بھی مراسلت کرتے رہے آخر کار سری نگر کی انجمن "نصرت الاسلام" نے ان کو کشمیر آنے کی دعوت بھیجی لیکن ان کے داخلہ کشمیر میں ریاست کی طرف سے رکاوٹ پیدا کی گئی جس کو خان بہادر چودھری خوشی محمد خاں صاحب نے (جو کالج کے ایک ممتاز و مشہور اولڈ بوائے تھے اور جو اُس زمانہ میں گورنر کشمیر تھے) اپنی حسن تدبیر سے رفع کیا اور صاحبزادہ صاحب ستمبر ۱۳-۱۹ء میں اپنے مشن پر روانہ ہو گئے محمد حبیب اللہ خاں اس سفر میں صاحبزادہ صاحب کے ساتھ تھے اور وہ چشم دید حالات اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"اثنائے سفر میں موضوع گفتگو اکثر و بیشتر مسلمانان کشمیر کی حالت زار تھا اور سری نگر پہنچ کر تو صاحبزادہ صاحب اس میموریل کی تیاری میں جو ہز ہائینس مہاراجہ صاحب کی خدمت میں پیش کرنا تھا ایسے منہمک ہو گئے کہ گویا ایک معمولی اہلکار کو ایک بڑے افسر کے احکام کی تعمیل ایک مدت معینہ میں کرنا ہے علیگڑھ سے جو کاغذات مشعر حالات و اعداد تعلیمی ساتھ لائے تھے موقع پر ان کی جانچ پڑتال شروع کر دی مقامی رؤسا معززین و منتظمین مدارس سے حالات دریافت کئے حسن اتفاق سے اس زمانہ میں بعض ماہرین تعلیم (مثلاً جسٹس شاہدین مرحوم وغیرہم) پنجاب سے کشمیر کی سیر و سیاحت کے واسطے آئے ہوئے تھے علیگڑھ کے بعض اولڈ بوائے بھی وہاں موجود تھے ان سب سے تبادلہ خیال کے بعد ایک موقر وفد مرتب کیا گیا اور اس طرح وہ میموریل جس میں

صحیح حالات اور اعداد و شمار ایسے مؤثر اور دل نشین پیرائے میں درج کئے گئے تھے کہ جن سے اعراض یا انکار ممکن نہ تھا ہز ہائینس کی خدمت میں پیش کیا گیا لیکن جو جواب ہز ہائینس کی طرف سے مسٹر مترا وزیر تعلیم نے دیا وہ نہایت دل شکن اور مایوس کن تھا بجز معمولی مراعات امثل چند وظائف وغیرہ کے) بقیہ سب اہم اور ضروری مطالبہ جات سے یا تو اعراض کیا گیا یا انکار کر دیا گیا (اس جواب کو ہم انشاء اللہ خود صاحبزادہ صاحب کے الفاظ میں اس عنوان کے خاتمہ پر بیان کریں گے)۔

مندرجہ بالا کار خاص کے علاوہ جس میں صاحبزادہ صاحب تقریباً دو ہفتہ تک شبانہ روز مصروف رہے وہ سری نگر اور ملحقہ مقامات میں ان سب مساجد اور مزارات پر جہاں مسلمانوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ جاتے تھے اور پُر جوش تقریریں کرتے تھے۔ انجمن نصرت الاسلام کے جلسہ خاص میں (جس کا انتظام انجمن مذکور نے نہایت عالیشان پیمانہ پر کیا تھا اور جس میں حاضرین کی تعداد ہزار ہا تھی) صاحبزادہ صاحب کی تقریر اس قدر دل آویز اور موثر تھی کہ سننے والے موحیرت تھے صاحبزادہ صاحب اسلام آباد (عرف آننت ناگ) بھی گئے اور وہاں کے مسلمانوں کے ایک بڑے جلسہ میں اُن کے حقوق تعلیم کے ذرائع پر ایک بسیط تقریر کی ریزیڈنٹ کشمیر سے بھی ملے اور مسلمانوں کی ضروریات اور حالات کی جانب توجہ دلائی غرضکہ یہ سفر کشمیر جس کو اہل ثروت علی العموم سیر و تفریح و بحالی صحت کے واسطے کیا کرتے ہیں (اور صاحبزادہ صاحب کو بھی ان چیزوں کی ضرورت بدرجہ اولیٰ تھی) اُن کے واسطے غیر معمولی جد و جہد و محنت شاقہ کا زمانہ تھا اور اس کو انھوں نے نہایت خوش دلی سے برداشت کیا۔"

کشمیر سے واپسی پر وہاں کے مفصل حالات ایک رسالہ کی شکل میں مرتب کر کے شائع کئے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "مسئلہ کشمیر" کی طرف خود وہاں کے عام مسلمانوں اور ہندوستان کے مسلمانوں کی توجہ منعطف ہو گئی۔

ہز ہائینس مہاراجہ صاحب کشمیر کے جواب اور مسلمانان کشمیر کے مسئلہ کو راولپنڈی کے اجلاس

کانفرنس میں (جہاں کہ کشمیر کے مسلمان بکثرت موجود تھے) پیش کر کے صاحبزادہ صاحب نے ایک معرکۃ الآرا تقریر کی جس میں انھوں نے اس ریاست کی ۹۵ فیصدی آبادی کا جو مسلمانوں پر مشتمل ہے نہایت دردناک مگر واقعی اور صحیح نقشہ اس طرح کھینچا۔

"خطۂ کشمیر کو قدرت نے جو بے مثل مادی مناظر اور نظارے عطا کئے ہیں ان کے بیان کی ضرورت نہیں دُنیا اُن سے واقف ہے لیکن کشمیر میں مرغزار ہوں تو کیا' شیریں چشموں اور وسیع تالابوں سے وہ علاقے سیراب ہوں تو کیا' زعفران کی خوشبو سے وہ زمین معطر ہو تو کیا انواع واقسام کے میوہ جات سے وہ ملک مالا مال ہو تو کیا جبکہ اسلام کا باغ وہاں پژمردہ اور اُجاڑ ہے ملت محمدی کی زمین وہاں بنجر اور ویران ہے اخلاق محمدی کے چشمے وہاں خشک اور برباد ہیں' اُمت محمدی کا شجر وہاں بے آب و بے ثمر ہے اور اسلامی شوکت واقبال کا وہاں زوال ہے یہ حالت ہے ان بھائیوں کی جو تعداد میں پچانوے فیصدی ہیں اور ہر طرح سے اپنے ملک کے خیر خواہ اور ہر طرح اپنے مہاراج کے مطیع و فرماں بردار ہیں۔"

آگے چل کر صاحبزادہ صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"جو ایڈریس ہم نے مہاراجہ صاحب بہادر کی خدمت میں پیش کیا تھا اس کا جواب جو دیا گیا وہ مسٹر مترا صاحب جو صیغۂ تعلیمات کے افسر تھے ان کا لکھا ہوا تھا ایڈریس کے ہر لفظ سے مہاراجہ صاحب پر بھروسہ ظاہر ہوتا ہے امید افزا جواب کی نہ صرف اُمید تھی بلکہ ہم کو حق حاصل تھا لیکن جو جواب ہم کو ملا اس سے زیادہ خشک و دل شکن ہونا دشوار ہے مگر چونکہ وہ مسٹر مترا کے دماغ و پالیسی کا نتیجہ تھا اس لئے ہم کو ہز ہائینس سے شکایت نہیں بلکہ اس جواب سے اس سبب کا پتہ لگتا ہے جو کشمیر کے مسلمانوں کی ترقی کے سد راہ ہے اس لئے میری قطعی رائے ہے کہ جب تک کشمیر کے مسلمانوں کی تعلیم کی نگرانی کسی ایسے عہدہ دار کے تحت میں نہ ہوگی جس کو فطرتاً دلی ہمدردی ان کے ساتھ ہو اس وقت تک یہ مسئلہ ہرگز حل نہ ہوگا اور اس کے معنی یہ ہیں کہ وہاں کا اعلیٰ افسر تعلیمات مسلمان ہو۔"

آئندہ کارروائی جو مسلمانان کشمیر کی تعلیمی ترقی کے لئے صاحبزادہ صاحب کی رائے میں ضروری تھی وہ یہ تھی کہ اس سلسلہ کو جو ریاست میں مطالبہ جات پیش کرنے کے لئے شروع کیا گیا تھا قائم رکھنا چاہئے لیکن خود مسلمانوں کو فوری تدبیر یہ کرنی چاہئے کہ کم ازکم پچاس ہونہار کشمیری طلباء کو لاہور اور علیگڈھ کے قومی کالجوں میں تعلیم دلائی جائے تاکہ جب وہ گریجوئٹ ہوکر اپنے وطن کو واپس جائیں تو اپنی قوم اور ریاست کی خدمت کے قابل ہوکر اپنے حقوق کی بہت کچھ نگرانی کر سکیں نیز یہ کہ چونکہ کشمیر میں لائق مسلمان اُستاد نہیں ملتے اس لئے متذکرہ صدر طلبہ سے یہ شرط کر لی جائے کہ بعد کامیابی امتحان وہ اپنی خدمات کو سب سے پہلے سررشتہ تعلیم ریاست میں پیش کریں گے علاوہ بریں ہندوستان کے قومی کالجوں میں اُن طلبہ کو خاص وظائف دئے جائیں جو اس بات پر آمادہ ہوں کہ بعد ختم تعلیم وہ ایک مدت مقررہ تک کشمیر کے صیغۂ تعلیمات میں ملازمت کریں گے اس سلسلہ میں صاحبزادہ صاحب نے اراکین مسلم کشمیری کانفرنس سے اور نیز ان کشمیری مسلمانوں سے جو ہندوستان میں مستقلاً آباد ہوگئے اور جن میں سے اکثر خوشحال اور قومی ضروریات سے واقف ہیں خاص طور پر اپیل کی کہ اس قومی کام میں فیاضی کے ساتھ شریک ہوں۔

خدا کا شکر ہے کہ جس کام کی ابتدا صاحبزادہ صاحب نے کی تھی اس کا نتیجہ اچھا نکلا کشمیری مسلمانوں میں اب بیداری پیدا ہوگئی ہے کشمیر کے طالب علم جو علیگڈھ سے تعلیم پاکر اپنے وطن کو واپس گئے وہ اپنی ریاست اور قوم کی خدمت میں مصروف ہیں اور وہاں موجودہ تحریکات میں مختلف حیثیتوں سے کام کر رہے ہیں۔

کانفرنس کا مستقل سرمایہ

صاحبزادہ صاحب کانفرنس کی سالانہ آمدنی سے جس کا بیشتر حصّہ فیس ممبری و وزیٹری سے حاصل ہوتا تھا مطمئن نہ تھے وہ اس ادارہ کے لئے استقلال اور اس کے مفید کاموں کے مسلسل جاری رہنے کے واسطے مستقل سرمایہ کی ضرورت شروع سے محسوس کرتے تھے چنانچہ اس سلسلہ میں جیسے جیسے ذرائع و مواقع ان کو ملتے رہے اُن کو وہ کام میں لاتے رہے بعض والیان

آئندہ کارروائی جو مسلمانان کشمیر کی تعلیمی ترقی کے لئے صاحبزادہ صاحب کی رائے میں ضروری تھی وہ یہ تھی کہ اس سلسلہ کو جو ریاست میں مطالبہ جات پیش کرنے کے لئے شروع کیا گیا تھا قائم رکھنا چاہئے لیکن خود مسلمانوں کو فوری تدبیر یہ کرنی چاہئے کہ کم از کم پچاس ہونہار کشمیری طلباء کو لاہور اور علیگڈھ کے قومی کالجوں میں تعلیم دلائی جائے تاکہ جب وہ گریجوئٹ ہوکر اپنے وطن کو واپس جائیں تو اپنی قوم اور ریاست کی خدمت کے قابل ہوکر اپنے حقوق کی بہت کچھ نگرانی کرسکیں نیز یہ کہ چونکہ کشمیر میں لائق مسلمان اُستاد نہیں ملتے اس لئے تذکرہ صدر طلبہ سے یہ شرط کرلی جائے کہ بعد کامیابی امتحان وہ اپنی خدمات کو سب سے پہلے سررشتہ تعلیم ریاست میں پیش کریں گے علاوہ بریں ہندوستان کے قومی کالجوں میں اُن طلبہ کو خاص وظائف دئے جائیں جو اس بات پر آمادہ ہوں کہ بعد ختم تعلیم وہ ایک مدت مقررہ تک کشمیر کے صیغۂ تعلیمات میں ملازمت کریں گے اس سلسلہ میں صاحبزادہ صاحب نے اراکین مسلم کشمیری کانفرنس سے اور نیز ان کشمیری مسلمانوں سے جو ہندوستان میں مستقلاً آباد ہوگئے اور جن میں سے اکثر خوشحال اور قومی ضروریات سے واقف ہیں خاص طور پر اپیل کی کہ اس قومی کام میں فیاضی کے ساتھ شریک ہوں۔

خدا کا شکر ہے کہ جس کام کی ابتدا صاحبزادہ صاحب نے کی تھی اس کا نتیجہ اچھا نکلا کشمیری مسلمانوں میں اب بیداری پیدا ہوگئی ہے کشمیر کے طالب علم جو علیگڈھ سے تعلیم پاکر اپنے وطن کو واپس گئے وہ اپنی ریاست اور قوم کی خدمت میں مصروف ہیں اور وہاں موجودہ تحریکات میں مختلف حیثیتوں سے کام کررہے ہیں۔

کانفرنس کا مستقل سرمایہ

صاحبزادہ صاحب کانفرنس کی سالانہ آمدنی سے جس کا بیشتر حصہ فیس ممبری و وزیٹری سے حاصل ہوتا تھا مطمئن نہ تھے وہ اس ادارہ کے لئے استقلال اور اس کے مفید کاموں کے مسلسل جاری رہنے کے واسطے مستقل سرمایہ کی ضرورت شروع سے محسوس کرتے تھے چنانچہ اس سلسلہ میں جیسے جیسے ذرائع و مواقع ان کو ملتے رہے اُن کو وہ کام میں لاتے رہے بعض والیان

ریاست کی خدمت میں انھوں نے عرضداشتیں روانہ کیں اپنے نائب معتمد (خان بہادر) مولوی ادریس احمد (مرحوم) کو بھوپال بھیجا اور وہ خود حیدرآباد دکن گئے نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی سابق صدر الصدور امور مذہبی (جو بوجہ طویل قیام حیدرآباد وہاں کے حالات سے بخوبی واقف ہیں) شاہد ہیں کہ جب صاحبزادہ صاحب حیدرآباد پہنچے تو مسٹر گلینسی صدر المہام فائنس (مالیات) دورہ میں تھے صاحبزادہ صاحب بعجلت تمام دورہ ہی میں اُن سے جاکر ملے اور ضروریات و حالات کانفرنس کی اس طرح تقریب کی کہ بلامزید تحقیقات وتفتیش و کارروائی دفتری جو ان امور میں علی العموم ناگزیر ہوتی ہے مبلغ ایک لاکھ اکہتر ہزار پانچ سو کے پرامیسری نوٹ صاحبزادہ صاحب کے پاس واپسی بلدہ پر پہنچ گئے اس گرانقدر عطیہ کی آمدنی چھ ہزار روپیہ سالانہ تھی اور یہ نوٹ بطور مستقل سرمایہ اب داخل بنک ہیں

گورنمنٹ حیدرآباد سے تعلیمی اداروں کو جو امداد ملا کرتی تھی اس کا طریقہ اس زمانہ میں یہ تھا کہ خزانہ عامرہ سے رقم معینہ سالانہ یا ششماہی دی جایا کرتی تھی لیکن کانفرنس کو یہ امتیاز حاصل ہوا کہ کل عطیہ یکمشت کانفرنس کو مرحمت فرمادیا گیا اور سالانہ درخواست و تصدیق وغیرہ کی ضرورت باقی نہ رہی دربار بھوپال سے دو ہزار دو سو روپیہ سالانہ مستقل امداد کی منظوری صادر ہوئی ریاست بھاولپور اُس زمانہ میں زیر اہتمام کونسل آف ریجنسی تھی جس کے پریزیڈنٹ خان بہادر مولوی (سر) رحیم بخش صاحب (مرحوم) جیسے خیر مجسم بزرگ تھے موصوف کی توجہ خاص سے بارہ سو روپیہ سالانہ مقرر ہوئی نیز دیگر امرا و اعیان ملت سے سالانہ امدادیں حاصل ہوئیں جن کی مجموعی مقدار قریب دس ہزار روپیہ سالانہ کی ہوتی ہے اور جن کی بدولت کانفرنس کا صدر دفتر قائم ہے

اعداد متذکرہ صدر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ادارہ جو صاحبزادہ صاحب کے چارج لینے کے وقت (مستقل سرمایہ کا تو ذکر کیا) ایک ہزار سے زائد کا مقروض تھا اُن کی مسلسل کوشش سے اس کی مستقل سالانہ آمدنی بارہ ہزار کے قریب تک پہنچ گئی اور یہ علاوہ ان نہایت معقول رقوم فیس ممبری وغیرہ وغیرہ کے تھا جو ہر سال حاصل ہوا کرتی تھی اور جن کا اوپر ذکر ہوچکا ہے قطع نظر

ان کی دیگر خدمات کے صاحبزادہ صاحب کا یہ ایک کارنامہ ہے جو کانفرنس کی تاریخ میں عدیم المثال ہے اور اسی کی بدولت اس تعلیمی کساد بازاری کے زمانہ میں بھی اس کی زندگی قائم ہے۔

تبلیغ واشاعت لٹریچر کے ذریعہ سے جدوجہد ۱۹۰۸ء سے قبل تبلیغ تو کانفرنس کی طرف سے ایک مختصر حد تک ہوا کرتی تھی لیکن تعلیمی لٹریچر کی اشاعت قطعی نہ تھی سب سے پہلی بار صاحبزادہ صاحب کی وہ معرکتہ الآرا رپورٹ جو اجلاس کانفرنس میں بمقام امرتسر دسمبر ۱۹۰۸ء میں پیش ہوئی تھی اور جس کا ذکر قبل ازیں ہو چکا ہے سندھی، بنگالی، گجراتی اور ہندی میں ترجمہ ہو کر کثرت سے صوبہ جات متعلقہ میں تقسیم کی گئی اس کے بعد تعلیم، معاشرت اصلاح رسوم وغیرہ پر پانچ ہزار رسالے تقسیم کئے گئے کانفرنس کی مختصر تاریخ شائع کی گئی نیز ایک رسالہ انگریزی زبان میں شائع کیا گیا جسمیں کانفرنس کے اغراض و مقاصد عملی کاموں اور اُن کے نتائج سے بحث کی گئی تھی اس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کی بابت انعامی جواب مضامین لکھوائے گئے تھے ان میں سے تین مضامین جو انعام کے مستحق قرار دئے گئے تھے ایک رسالہ کی شکل میں طبع کرا کے کثرت کے ساتھ تقسیم کئے گئے ایک اور رسالہ چونسٹھ صفحہ کا تعلیم کے موضوع پر پانچ ہزار کی تعداد میں تقسیم کیا گیا۔ مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے مقاصد و نظام پر ایک مبسوط رسالہ مرتب ہو کر شائع ہوا۔

ان رسالہ جات کی تالیف و تصنیف میں صاحبزادہ صاحب نے اپنے بعض دوستوں کو بھی شریک کیا لیکن اکثر ان میں سے خود ان کی دماغی کوشش اور کاوش کا نتیجہ ہے اور مسوّدے ان کی قلم کے اب تک موجود ہیں مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے برروئے کار آنے میں اس تبلیغ و اشاعت کا بڑا نمایاں اثر ہوا اور یہ کانفرنس کی بڑی خدمت ہے جو بحیثیت آنریری جوائنٹ سکریٹری صاحبزادہ صاحب نے اپنے طبعی انہماک و اخلاص کے ساتھ انجام دی۔

تعداد ممبران و آمدنی میں اضافہ پچھلے صفحات میں کانفرنس کی ترقی کی تیز رفتاری ناظرین کے سامنے پیش ہو چکی ہے صاحبزادہ صاحب

کے شدید انہماک کا قدرتی اثر کانفرنس کے ہر شعبہ میں ظاہر ہوچکا ہے جس کی ایک بیّن مثال تعداد ممبران میں معتدبہ اضافہ ہے ان کے جوائنٹ سکریٹری مقرر ہونے سے پہلے تعداد ممبران ۱۵۶ تھی اس میں اُن کے چارج لینے کے بعد ہر سال اضافہ ہوتا رہا حتیٰ کہ ۱۹۰۹ء میں ۳۴۴۳ ممبر تھے اور فیس ممبری و وزیٹری سے ۲۳۳۳ روپیہ حاصل ہوئے دیگر مدات سے بقدر ۲۲۳۲ روپیہ کے آمدنی ہوئی اور مجموعی اخراجات ہر قسم کے ادا کرنے کے بعد بیس ۲۰۰۰۰ ہزار روپیہ بطور سرمایہ مستقل بنک میں جمع کیا گیا۔ ۱۹۱۰ء کے آخر سے مسلم یونیورسٹی کی تحریک شروع ہوگئی اور اس اسکیم کو کامیاب کرنے کے واسطے نہ صرف صاحبزادہ صاحب خود ہمہ تن اس میں منہمک اور مصروف ہو گئے بلکہ کانفرنس کا کُل عملہ (بجز دو کلرکوں کے) بھی مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کو منتقل کردیا گیا ظاہر ہے کہ اس کارروائی سے کانفرنس کی آمدنی میں کمی ہوگئی۔ لیکن جو خسارہ کانفرنس کا ہوا وہ یونیورسٹی کا نفع تھا اور چونکہ کانفرنس کا وجود ہی کالج کو ترقی دے کر یونیورسٹی بنانے کا ایک بڑا ذریعہ ثابت ہوا اس لئے سرسید رح کا جو مقصد کانفرنس کے قائم کرنے سے تھا وہ بدرجۂ اولیٰ حاصل ہوا۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

مدارس اسلامیہ کی امداد

اسلامیہ مدارس علی العموم مالی مشکلات میں پھنسے رہتے ہیں لیکن ان میں بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کی امداد بروقت نہ کی جائے تو انکی فیض رسانی کم ہوکر صدہا غریب طلبار کی تعلیم سے محرومی کا باعث ہوتی ہے صاحبزادہ صاحب ایسے مدارس کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے اور حسب موقع و ضرورت ان کی ہر قسم کی امداد کرتے تھے چنانچہ جب اٹاوہ کا مشہور معروف اسلامیہ انٹر کالج (جو اپنی بنا و بقا کے لئے صرف ایک پُر از ایثار و خلوص ہستی یعنی محترم بزرگ مولوی بشیر الدین صاحب کا رہین منت ہے) مالی پریشانیوں میں تھا تو صاحبزادہ صاحب نے کانفرنس فنڈ سے ۵۰۰ روپیہ سالانہ کی امداد اس مدرسہ کے واسطے جاری کی علیٰ ہذا علیگڈھ کے مدرسہ نسواں کو (جو خان بہادر شیخ عبداللہ صاحب کے استقلال و کوشش سے اب ڈگری کالج کے درجہ پر پہنچ گیا ہے) ۱۳۰ روپیہ سالانہ کی گرانٹ دی اور مدراس کے باڈم میموریل

فنڈ میں جو وہاں کے مسلمانوں کے نفع رسانی کے لئے قائم کیا گیا تھا ایک ہزار کا عطیہ کانفرنس کی طرف سے بھیجا اُن کی اخلاقی امداد اور ہمدردی مسلمانوں کے ہر چھوٹے بڑے ادارہ کے ساتھ ہمیشہ شامل رہی اور اس کی مثال آگرہ کا "شعیبیہ محمدیہ اسکول" ہے جس کی امداد کے واسطے ۱۹۱۳ء میں صاحبزادہ صاحب نے اجلاس کانفرنس میں پُر درد اور پُر زور اپیل کی اور تقریباً پانچ ہزار روپیہ کا چندہ جلسہ میں ہوگیا اور اب یہ اسکول اپنے غیر معروف مگر انتھک بانی مولوی سعید احمد صاحب زبیری مرحوم کی کوشش سے انٹر کالج کے درجہ کو پہنچ کر مقامی مسلمانوں کو نفع پہنچا رہا ہے۔

تعلیمی وظائف

غریب ہونہار طلبہ کی مالی امداد کا مسئلہ ہمیشہ صاحبزادہ صاحب کے پیش نظر رہا ہے۔ زمانہ طالب علمی ہی میں انھوں نے علیگڑھ کالج کی مشہور "انجمن الفرض" (ڈیوٹی سوسائٹی) قائم کی تھی جس سے اب تک ہزارہا نادار مسلمان طلبا رستفیض ہو چکے ہیں جب سے انھوں نے عملی زندگی شروع کی وہ اس سلسلہ میں ہر امکانی کوشش کرتے رہے علیگڑھ کے متعلق اُن کا یہ خیال تھا جس کو انھوں نے میرٹھ کی کانفرنس ۱۸۹۶ء میں اول بار بیان کیا کہ کالج کی مالی حالت ایسی عمدہ اور مضبوط ہو جانی چاہئے کہ وہ ایک ہزار طلبہ کے پورے اخراجات کا ہر سال کفیل ہو سکے اور ان کو مفت تعلیم دے سکے اسی جذبہ کے تحت میں ۱۹۰۲ء میں دہلی کی کانفرنس میں جبکہ لارڈ کرزن کی مقرر کردہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ زیر بحث تھی اور جس رپورٹ میں اعلیٰ تعلیم کو روکنے کی عجیب وغریب طریقوں سے کوشش کی گئی تھی اور جس میں ایک سفارش یہ بھی تھی کہ کالجوں میں طلبار کی فیس تین فیصدی سے زائد معاف نہ کی جائے صاحبزادہ صاحب نے اس آخر الذکر تجویز کی نہایت سختی کے ساتھ مخالفت کی اور ایک نہایت مفصل و مدلل تقریر میں ثابت کیا کہ مسلمان طلبہ کو اس سفارش کے منظور ہونے کی حالت میں سخت نقصان پہنچے گا۔

اب جبکہ ۱۹۰۶ء میں کانفرنس کا چارج انھوں نے لیا تو ان کو اپنے اس پُرانے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا موقع ملا کانفرنس کے ذمہ کا قرضہ ادا کرنے اور دفتر کی نہایت اہم ضروریات پورا کرنے کے بعد انھوں نے جو پہلا بجٹ بنایا تو اس میں بارہ سو (۱۲۰۰) کی رقم امداد طلبہ کے واسطے رکھی اور اس کے علاوہ

آٹھ وظائف کا مختلف صوبہ جات کے ٹریننگ کالجوں میں مسلم طلبہ کے واسطے انتظام کیا دوسرے سال رقم مذکور دوگنی کردی اور ۱۳-۱۹۱۲ء میں بارہ سو سالانہ سے بارہ سو روپیہ ماہوار تک پہنچا دی حتیٰ کہ ۱۹۱۷ء کے وسط میں جب انھوں نے کانفرنس کا چارج دیا تو اس وقت تک کانفرنس کی طرف سے کم وبیش ستر ہزار روپیہ اس مد میں خرچ ہو چکے تھے۔

یہ وظائف ہر شعبۂ تعلیم یعنی آرٹس، میڈیکل۔ انجینئرنگ۔ ویٹرینری اور ٹریننگ کالج کے طلبہ کے واسطے تھے اور ظاہر ہے کہ اس ذریعہ سے بہت سے ہونہار غریب طلبہ اعلیٰ مدارج پر فائز ہوئے اور بہت سے شریف گھرانے تباہی اور جہالت کی تاریکی سے نکل کر علم اور عزت و ثروت کی روشنی میں پہنچ گئے۔

صدر دفتر کانفرنس کی تعمیر

آخر ۱۸۸۶ء سے جبکہ کانفرنس کی ابتدا ہوئی تھی سرسید مرحوم کے انتقال (مارچ ۱۸۹۸ء) تک کانفرنس کا کام کالج کے کاموں کے ساتھ ساتھ جناب مرحوم کی کوٹھی پر ہوا کرتا تھا اور ایک محرر کو قلیل تنخواہ پر (جو سرسید اپنے پاس سے دیا کرتے تھے) اس کام پر مامور کر لیا گیا تھا۔ جنوری ۱۸۹۳ء سے محرر مذکور کی تنخواہ ۱۲ روپیہ ماہوار "کانفرنس فنڈ" سے مقرر ہوئی نواب محسن الملک جب سرسید کے جانشین ہوئے تو انھوں نے بھی سابقہ طریقۂ کار جاری رکھا اور گو نواب صاحب موصوف نے اپنے غیر معمولی انہماک، ایثار، فصاحت و بلاغت سے کالج اور کانفرنس کو آل انڈیا حیثیت پر لانے میں نمایاں کامیابی حاصل کی لیکن ان کے زمانہ میں بھی دفتر کانفرنس کے واسطے کوئی جداگانہ انتظام و مقام نہ تھا۔

اوائل ۱۹۰۶ء میں جب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کانفرنس کے آنریری جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے تو اس وقت اس ادارہ میں صرف دو محرر تھے انھوں نے سب سے پہلے کالج کے ایک کمرہ میں باضابطہ دفتر قائم کیا اور جب کالج کی ضروریات کی وجہ سے یہ کمرہ چھوڑنا پڑا تو کالج ہی کے ایک چھوٹے خس پوش بنگلہ کے دو کمروں میں دفتر کو منتقل کیا گیا لیکن

کانفرنس کی روز افزوں ترقی کی وجہ سے یہ مقام بہت جلد غیر کافی و غیر موزوں ثابت ہوا۔ مگر سرمایہ کی کمی اور دیگر ضروری امور کی وجہ سے ایک مدت تک اس بارہ میں کوئی کارروائی نہ ہو سکی بالآخر ۱۹۱۳ء میں جب سرمایہ کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا اور کانفرنس کی حیثیت بطور ایک مستقل شاندار اور فیض رساں ادارہ کے قائم ہوگئی تو شروع ۱۹۱۴ء اور پھر ۱۹۱۵ء میں صاحبزادہ صاحب نے بھوپال کے دو سفر کئے اور ہر ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم (خلد آشیاں) کے حضور میں تفصیلی حالات عرض کر کے علیا حضرت کی نہ صرف ہمدردی و توجہ مبذول کرانے میں کامیاب ہوئے بلکہ صدر دفتر کانفرنس کی عمارت کے واسطے ریاست سے گراں قدر عطیات (مبلغ تیس ہزار) اور شاہزادگان والاتبار سے مبلغ ۱۸۰۰۰ اٹھارہ ہزار روپیہ حاصل کر کے علیگڈھ واپس ہوئے۔ فرط نوازش و رافت سے علیا حضرت نے مجوزہ عمارت "سلطان جہاں منزل" کو اپنے نام نامی سے منسوب ہونے کی اجازت عطا فرمائی۔ ضروری مراحل جلد تر طے کرنے کے بعد ہر ہائینس کے حضور میں عرضداشت پیش کی گئی کہ علیا حضرت عمارت کا سنگ بنیاد اپنے دست حق پرست سے نصب فرمائیں چنانچہ اس علم دوست و روشن خیال فرمانروا نے اس گذارش کو بھی شرف قبولیت بخشا اور علیگڈھ تشریف لانے کی زحمت گوارا فرما کر ۲۷ فروری ۱۹۱۴ء کو ایک عظیم الشان جلسہ میں جس میں اعیان ملت اطراف ہند سے جمع ہوئے تھے رسم "تاسیس بنیاد" ادا فرمائی اس نادر المثال موقع پر کچھ تعجب نہیں کہ کانفرنس نے بزبان حال سعدی رح کا مشہور قطعہ (بہ تلمیح ضروری) عرض کیا ہو۔

"ز قدر و شوکت "سلطان" نہ گشت چیزے کم
ز التفات برایں ملت پریشانے
کلاہ گوشۂ ملت بہ "آفتاب" رسید
کہ سایہ بر سرش انداخت چوں تو سلطانے"

جو ایڈریس کہ علیا حضرت کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اس میں دفتر کی ضرورت، عمارت مجوزہ کی تفصیل اور تکمیل تعلیم کے بعد فراہمی کتب و ہر قسم کے تعلیمی ساز و سامان اور طریقہ کار کی

تفصیل تھی اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کانفرنس اور اس کے کاموں کی بابت صاحبزادہ صاحب کا نصب العین کس قدر بلند تھا اور کس قدر مفید و ہمہ گیر پروگرام قومی تعلیم و ترقی کا ان کے پیش نظر تھا یہ ایڈریس آٹھ گنجان مطبوعہ صفحات پر مشتمل ہے اور یہاں پر نقل نہیں کیا جا سکتا لیکن وہ آج بھی اس قابل ہے کہ تعلیمی کشتی کے ناخدا اس پر توجہ کریں۔

الغرض تعمیر کا کام اسی انہماک کفایت شعاری و احتیاط کے ساتھ شروع کیا گیا جو صاحبزادہ صاحب کی طبیعت ثانی تھی اور جس میں جزئیات کے ساتھ عمارت کی شان اور خوبصورتی ہمیشہ پیش نظر رہتی تھی یہ زمانہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کا تھا اور سامان عمارت بالخصوص لوہا اور بڑے بڑے گرڈر نہایت گراں و بمشکل دستیاب ہوتے تھے بایں ہمہ موانع یہ عمارت (سلطان جہاں منزل) اور اسٹاف کے مکانات جس قدر عجلت اور کفایت کے ساتھ تیار کرائے گئے وہ صاحبزادہ صاحب کے فن تعمیر سے خاص لگاؤ اور محنت شاقہ و ذاتی نگرانی کا کرشمہ ہے آج تیئس برس بعد بھی جبکہ یونیورسٹی میں بہت سی وسیع و شاندار عمارتیں تیار ہو چکی ہیں "سلطان جہاں منزل" اپنی استواری خوبصورتی اور دلآویزی میں خود اپنی نظیر ہے اور یہ سب کام مع ایک قیمتی کتب خانہ و تعلیمی ساز و سامان کے ایک محدود و غیر معمولی زمانہ میں بصرف مبلغ اڑتالیس ہزار انجام پذیر ہوا " ان ہذا لشیئ عجاب"

اس دوران میں صاحبزادہ صاحب اپنے مقرر کردہ پروگرام پر کام شروع کرنے کے واسطے تکمیل عمارت کے منتظر نہ رہے بلکہ ان کو جس وقت بھی کوئی مناسب موقع مل جاتا اس سے فائدہ اٹھاتے تھے چنانچہ اپریل ۱۹۱۵ء میں جو کارروائی اس سلسلہ میں انھوں نے کی تھی اسکی کیفیت ، اپریل ۱۹۱۵ء کے علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں تفصیل کے ساتھ شائع ہوئی تھی ہم اس کا مختصر انتخاب ذیل میں درج کرتے ہیں :-

اول ہفتہ اپریل ۱۹۱۵ء میں مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے جلسوں کی تقریب میں ایک اچھا خاصا اجتماع علیگڈھ میں ہوگیا تھا صاحبزادہ صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ان اصحاب کو سلطان جہاں منزل (صدر دفتر) کی زیر تعمیر عمارت میں چاء پر مدعو

کیا اور تعمیر کے متعلق حالات سُنا کر کانفرنس کے کاموں کا جو وسیع پروگرام تیار کیا تھا پیش کیا اور جس طریقہ سے دفتر میں اور دفتر سے باہر کام کئے جائیں گے ان کی تفصیل کر کے یورپ کے تعلیم یافتہ اصحاب بالخصوص مسٹر (مولانا) محمد علی، تصدق احمد خاں شیروانی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، مسٹر اے ایم خواجہ اور دیگر صاحبان سے التجا کی کہ وہ ان کاموں میں ان کا ہاتھ بٹائیں کیونکہ تنہا ایک شخص یہ سب کام نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر نثار احمد صاحب (بریلوی) اور مسٹر ہارون خاں صاحب شیروانی نے فوراً وعدہ امداد کیا۔ نواب (سر) محمد مزمّل اللہ خاں صاحب نے دفتر کے فرنیچر کے واسطے مبلغ ۵۰۰/ روپیہ کا اعلان فرمایا۔

صدر دفتر کی تعمیر سے صاحبزادہ صاحب کا مقصد صرف ضروریات دفتر کے واسطے ایک عالیشان مکان کا مہیا کرنا نہ تھا بلکہ ان کے پیش نظر وہ اہم تعلیمی مسائل تھے جن کو وہ اس دفتر کے ذریعہ انجام دینا چاہتے تھے ہم ان کے مقاصد کو انھیں کے الفاظ میں رپورٹ کانفرنس ۱۹۱۶ء سے مختصراً یہاں نقل کرتے ہیں۔

"جس کسی نے بھی مسئلہ تعلیم پر غور کیا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس زمانہ میں یہ مسئلہ اُم المسائل اور اس کا حل قوموں اور ملکوں کی قسمت کو عملاً فیصل کرنے والا ہے اب وقت اس کا نہیں کہ وراثتاً یا رواجاً جو علوم اور کتابیں رائج ہیں انھیں پر قناعت کی جائے بلکہ اب اس تعلیم کی ضرورت ہے جو قانون فطرت کی صحیح ترجمان ہو۔ نفس بشری اور جسم انسان کو مدارج ارتقا کے اعلیٰ نقطہ پر پہنچانے کے لئے مجرب اسباب اور وسائل کا نام تعلیم ہے اور اس کے دائرے اور احاطہ میں تمام موجودات عالم کا علم شامل ہے۔"

"اب سوال یہ ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کو اس مقصد اعظم کے حصول کے لئے کیا کرنا چاہئے ظاہر ہے کہ سب سے اول کام یہ ہونا چاہئے کہ ہم کو مسئلہ تعلیم کا صحیح مفہوم معلوم ہو فلاطون اور سقراط سے لے کر اس وقت تک روشن اور تعلیم یافتہ دماغوں نے اس مسئلہ کو سمجھنے اور سلجھانے میں سعی کی ہے اور آج زندہ اور بیدار ملکوں میں مسئلہ تعلیم بذات خود ایک علم کا درجہ رکھتا ہے

انگلستان۔ فرانس۔ جرمنی۔ امریکہ وغیرہ میں محض اس مضمون پر ہزاروں کتابیں موجود ہیں خاص کر امریکہ میں اس طرف بہت زیادہ توجہ ہو رہی ہے یہاں تک کہ فن تعلیم کی ایک قاموس پانچ موٹی موٹی جلدوں میں مرتب ہو چکی ہے بغیر ان کتابوں کے مطالعہ کے کوئی شخص مسئلہ تعلیم کی نوعیت اور اہمیت کو نہیں سمجھ سکتا علاوہ فلسفہ یا علم تعلیم کے یورپ اور امریکہ میں جو نظام تعلیم چند صدیوں سے قائم ہے جس کے ذریعہ سے وہاں کے باشندوں کے دلوں اور دماغوں کی کاشت و تربیت ہو رہی ہے ان کا مطالعہ نہایت ضروری ہے جس سے معلوم ہو کہ جو اصول اور مطالب فلسفہ تعلیم نے بتائے ہیں عملاً ان کا کیا نتیجہ اور ثمرہ ہوا یہ دونوں قسم کی معلومات حاصل کرنے کے بعد پھر ہم کو اس ملک میں اپنی قوم کے خاص حالات اور ضرورتوں کا اندازہ کرنا ہے اور یہ سب کچھ معلوم کرنے کے بعد اپنی قوم کے لئے تعلیمی پروگرام قرار دینا ہے۔"

"تعلیمی پروگرام قرار دینے کے بعد پھر اس ملک کے نظام تعلیم کو سمجھنا اور دوسرے ممالک کے نظام تعلیم سے مقابلہ کر کے یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے تعلیمی پروگرام کی تکمیل کے لئے وہ کہاں تک مناسب و موزوں ہے۔"

"مثلاً اس ملک میں ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم، اعلیٰ تعلیم اور پیشوں کی تعلیم کے لئے جس قسم کے اصولوں اور طریقوں پر عمل ہو رہا ہے ان کو پورے طور پر سمجھنا اور گذشتہ تجربہ اور آئندہ کے نصب العین کے لحاظ سے ان کی نسبت رائے قائم کرنا ہے ظاہر ہے کہ ان مقاصد کے عمدہ ہونے میں تو کسی کو شک ہو ہی نہیں سکتا سوال صرف یہ ہے کہ ان کے حصول کا عملی طریقہ کیا ہے۔ اس کا جواب صدر دفتر کانفرنس کے پروگرام میں موجود ہے صدر دفتر کی عمارت کی ظاہری شان و شوکت سے بڑھ کر وہ سامان ہے جو اس میں اب موجود ہے اور انشاء اللہ آئندہ اور زیادہ ہوگا۔ سب سے اول تعلیمی کتب خانہ قابل ذکر ہے حقیقت یہ ہے کہ جب سے یہ کتب خانہ وجود میں آیا ہے اس وقت سے خود میری آنکھیں کھل گئی ہیں اور اب خود مجھ کو معلوم ہوتا جاتا ہے کہ مسئلہ تعلیم کو سمجھنے اور سمجھ کر اس سے مستفیض ہونے کا کیا طریقہ ہے اس وقت اس کتبخانہ میں تقریباً ایک ہزار

جلدیں صرف مسئلہ تعلیم اور اس کی مختلف شاخوں کے متعلق موجود ہیں۔ ضرورت اب یہ ہے کہ قوم کے وہ تعلیم یافتہ اصحاب جو اپنی زندگی کے کچھ حصّہ کو اس مقصد اعظم کی خدمت میں صرف کرنے کو تیار ہوں وہ ان کتابوں کا مطالعہ کریں ہمارے کالج میں اس وقت خدا کے فضل سے ایک سو سے زیادہ مسلمان گریجوائٹ اسٹاف اور ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کے کلاسوں میں ہیں اور اُمید ہے کہ اس تعداد میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہے گا ضرورت یہ ہے کہ ان میں سے ایسے اصحاب کو اس طرف راغب کیا جائے جن کی طبیعت میں اس میدان میں کارنمایاں کرنے کی صلاحیت ہو انعامات اور تمغہ جات کے ذریعہ سے شوق اور رغبت پیدا کرائی جائے اس کے متعلق انشاء اللہ پوری اسکیم پیش کی جائے گی۔"

"دوسرا کام یہ ہے کہ مختلف صوبجات میں جو مسلمان آباد ہیں ان کی خاص حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق تعلیمی پروگرام قرار دیا جائے اعداد اور صحیح حالات کی بناء پر صوبجات کی گورنمنٹوں سے انکی مسلمان رعایا کے تعلیمی حقوق طلب کئے جائیں اس کام کے لئے مردم شماری کی رپورٹیں اور کل ملک کے اضلاع کے گزیٹیر اور اسی قسم کی معلومات کے ذرائع ضروری ہیں ایک حد تک یہ سامان اب صدر دفتر میں موجود ہے رفتہ رفتہ اس کی تکمیل ہوجانا چاہئے اور لائق عہدہ داروں کے ذریعہ ان ذرائع سے کام لیا جائے اور مسالہ جمع کیا جائے۔"

"تیسرا کام یہ ہے کہ مسئلہ تعلیم کے متعلق مسائل کو قوم میں عام فہم کرنے کے لئے اُردو تصانیف اور ترجموں اور رسائل کے ذریعہ سے تعلیمی مسائل کی اشاعت کی جائے اس کے لئے ایک حد تک کانفرنس کے دفتر میں سامان موجود ہے اور انشاء اللہ عنقریب اس اسکیم کو عمل میں لایا جائے گا" [۱]

الغرض جب عمارت بہمہ جہت مکمل ہوگئی تو علیا حضرت کی خدمت میں یہ استدعا پیش کی گئی کہ سرکار عالیہ بنفس نفیس "سلطان جہاں منزل" کے افتتاح کی زحمت گوارا فرمائیں چنانچہ جناب ممدوحہ نے اپنی روشن خیالی اور حب قومی سے اس درخواست کو بھی منظور فرماکر بہ معیت ولی عہد بہادر بھوپال

---

[۱] رپورٹ کانفرنس ۱۹۱۶ء بمقام علیگڈھ۔ صفحات ۵۳ و ۵۴۔ ۶۵ و ۶۶ و ۶۷۔

و پرنس حمید اللہ خاں بی۔اے علیگ (حال فرمانروائے بھوپال) ۱۹ فروری ۱۹۱۶ء کو علیگڈھ میں قدم رنجہ فرمایا۔

جلسہ افتتاح مثل جلسہ تاسیس (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) نہایت شاندار و بارونق تھا ایڈریس میں جو علیا حضرت کی خدمت میں پیش کیا گیا عمارت کے متعلق ذکر تھا اور جو کام اس عمارت میں سرانجام پائیں گے ان کی تفصیل کی گئی تھی سرکار عالیہ نے جواب میں جو تقریر ارشاد فرمائی وہ نہایت مفید نصائح اور مشوروں سے لبریز تھی موصوفہ نے خاص طور پر اس بات پر توجہ دلائی تھی کہ تعلیم یافتہ طبقہ جس پر قومی تعلیم و ترقی کا انحصار ہے اب تک اپنے فرض کو ادا کرنے سے قاصر رہا ہے آئندہ اس کو کانفرنس کے کاموں میں عملی حصہ لینا چاہئے تاکہ جو اُمیدیں سرسید احمد خاں اور ان کے رفقار کو اس گروہ سے تھیں پوری ہوں اسی ضمن میں حضور ممدوحہ نے کالج کی مالی حالت اور مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے قبول اور عدم قبول کے مسئلہ پر جو اس وقت مسلمانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کئے ہوئے تھا بیش بہا خیالات کا اختصار کے ساتھ اظہار فرمایا اور آخر میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی کوششوں اور ہمدردیوں کا جو کانفرنس اور اس کے مقاصد کے لئے وہ کرتے ہیں خاص طور پر اعتراف فرمایا اور ان کے مذاق تعمیر اور کفایت شعاری کی جو انھوں نے سلطان جہاں منزل کی تعمیر میں دکھلائی داد دی" عمارت کو علیا حضرت نے اندر اور باہر سے بالاستیعاب ملاحظہ فرمایا اور جو کتب خانہ تعلیمی ساز و سامان کا مہیا کیا گیا تھا اس کی بابتہ اظہار پسندیدگی فرمایا اور اس طرح یہ جلسہ نہایت کامیابی اور خیر و خوبی کے ساتھ ختم ہوا۔

بے محل نہ ہوگا اگر ہم اس عنوان کو (مائی لارڈ)[ل] سید نثار حسین صاحب نثار ڈپٹی مجسٹریٹ

[ل] "مائی لارڈ" موصوف کانفرنس کے نہایت پرانے اور سرگرم ممبر تھے اور قومی ترقی و تعلیم پر ان کے لکچر ہمہ وقت تیار رہتے تھے اور ہر مجمع اور موقع پر بیان فرماتے تھے جل مرکب کے جس کا ذکر اس کتاب میں کسی اور مقام پر آیا ہے ممبر تھے اور اس مجلس کے ممبر مائی لارڈ کہکر تقریر شروع کرتے تھے اسی وجہ سے آپ کا نام بہت کم لوگوں کو معلوم تھا اور ہر شخص مائی لارڈ کے لقب سے ان کو پکارا کرتا تھا۔

انہار صوبہ متحدہ (مرحوم) کے قطعہ تاریخ اور علیا حضرت کی بذلہ سنجی پر ختم کریں قطعہ تاریخ یہ ہے:۔

این مرکز تعلیمی وین دائرہ علمی
از فضل خداوندی چوں گشت بنائے دل
برجستہ رقم کردہ کلکم سن تعمیرش
این خوب شدہ زیبا "سلطان جہاں منزل"

۱۳۳۴ھ

بذلہ سنجی کی تفصیل علیگڈھ انسٹیٹوٹ گزٹ میں اس طرح درج ہے۔

"علیا حضرت بیگم صاحبہ کی بذلہ سنجی"

"رسم افتتاح دفتر کانفرنس (سلطان جہاں منزل) کے موقع پر علیا حضرت دام اقبالہا نے زبان فیض ترجمان سے بطور مطائبت ایک فقرہ ارشاد فرمایا تھا جو غایت لطف سے خالی نہیں اور چونکہ وہ معدودے چند لوگوں کے سوا کسی نے نہیں سُنا اور جلسہ کی شائع شدہ کیفیت میں بھی اس کا ذکر نہیں آیا اس لئے اس کا اعادہ یقیناً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"جس وقت سرکار عالیہ ملاحظہ عمارت سے فارغ ہونے کے بعد فوٹو گروپ کے لئے باہر تشریف لارہی تھیں تو ایک جگہ دفعتاً ٹھٹک گئیں۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب (جو اس وقت سرکار عالیہ کے ہمراہ تھے) رہنمائی کی غرض سے آگے ہولئے تھے اور اتفاق سے آفتاب کا رُخ بھی بالکل سیدھا سامنے ہی تھا۔ آفتاب احمد خاں صاحب نے (یہ سمجھ کر کہ شاید سرکار عالیہ راستہ کی تلاش میں ٹھہر گئی ہوں) اشارہ کرکے عرض کیا، حضور اس طرف تشریف لے چلئے جواباً سرکار عالیہ نے بے تکلف ارشاد فرمایا جب "آفتاب" سامنے آجاتا ہے تو راستہ دکھائی نہیں دیتا۔

اس پر صاحبزادہ صاحب نے مسکرا کر فرمایا بجا ہے اور آگے بڑھ دئے اور جو لوگ قریب تھے وہ بھی سرکار عالیہ کی اس برمحل بذلہ سنجی سے بیحد محظوظ ہوئے۔"

(ماخوذ از علیگڈھ انسٹیٹوٹ گزٹ ۸ مارچ ۱۹۱۶ء صفحہ ۱۴)

علیگڈھ میں اجلاس کانفرنس

دسمبر ۱۹۱۶ء میں جو اجلاس کانفرنس علیگڈھ میں زیر صدارت میاں (سر) محمد شفیع صاحب (مرحوم) منعقد ہوا تھا وہ صاحبزادہ صاحب کے "دور دوم" کا آخری اجلاس تھا اس کے بعد وہ انڈیا کونسل کے ممبر مقرر ہوکر (وسط ۱۹۱۷ء میں انگلستان چلے گئے اس زمانہ کے مخصوص حالات کے لحاظ سے اس امر کی ضرورت ہے کہ اس اجلاس کی کچھ تفصیل پیش کی جائے۔

بعض ناگزیر اسباب سے مسلم یونیورسٹی کے چارٹر ملنے میں بہت دیر لگ گئی تھی "جنگ بلقان" و مسجد مچھلی بازار کانپور کے واقعات نے مسلمانوں کے قومی و مذہبی جذبات میں غیر معمولی ہیجان پیدا کر دیا تھا جنگ عظیم بھی شروع ہوگئی تھی اور بنارس ہندو یونیورسٹی جس کے واسطے برادران وطن نے مسلمانوں سے بہت بعد کام شروع کیا تھا قائم ہوگئی تھی تعلیم یافتہ مسلمانوں کا سواد اعظم گورنمنٹ کی مقرر کردہ شرائط پر یونیورسٹی قبول کرنے کے واسطے آمادہ تھا لیکن ایک دوسرا فریق اسے قومی وقار کے خلاف سمجھتا تھا اور قوم کے ساتھ غداری کا مرادف۔ اخبارات اور پبلک جلسوں میں نہایت تیزی اور غیر معتدل طریقہ سے بحث شروع ہوگئی تھی اور پمفلٹ بازی و دیگر ناروا طریقہ سے گرم فریق اعتدال پسندوں کو زک دینے کی کوشش کر رہا تھا چونکہ کانفرنس کے دفتر اور پلیٹ فارم ہی سے یونیورسٹی اسکیم کو کامیاب کرنے کے واسطے سب سے زیادہ کوشش ہوئی تھی اس لئے اس کشمکش کا اثر لامحالہ کانفرنس کے کاموں پر بھی پڑ رہا تھا قوی وجوہ کی بنا پر یہ خیال درجہ یقین کو پہنچ گیا تھا کہ علیگڈھ کے اجلاس میں کوئی نہ کوئی شدید بے لطفی اور جھگڑا پیدا کیا جائے گا ان اسباب سے کارکنان کالج و کانفرنس بہت زیادہ فکرمند تھے لیکن خدا کا شکر ہے کہ کوئی جھگڑا نہ ہوا اور اجلاس خیر و خوبی کے ساتھ ختم ہوا اور یہ سب کچھ نتیجہ صاحبزادہ صاحب کی غیر معمولی محنت تحمل اور راستبازی کا تھا۔

صاحبزادہ صاحب اکتوبر ۱۹۱۶ء میں علیل ہوگئے تھے حتیٰ کہ طبی مشورہ کے بموجب ان کو کچھ عرصہ تک علیگڈھ سے باہر رہنا پڑا ان کے ذاتی کام سب بند ہوگئے تھے لیکن کانفرنس کا کام

اُسی شوق و شغف سے جو اُن کا خاص حصہ تھا برابر جاری رہا اس طریقہ کار سے کانفرنس کا اجلاس تو بیشک کامیاب رہا لیکن ان کی صحت کو سخت صدمہ پہنچا جس کا اثر تا دم مرگ قائم رہا۔ یہ اجلاس مندرجہ ذیل خصوصیات کے واسطے یادگار ہے۔

ماہرین فن تعلیم کے لکچر

سب سے پہلی بات اس اجلاس کانفرنس میں یہ ہوئی کہ ماہرین فن تعلیم کے لکچر ہوئے دور دراز مقامات مثلاً لاہور سے مسٹر وِلٹن پرنسپل ٹریننگ کالج و مسٹر مارٹن پرنسپل اسلامیہ کالج اور الٰہ آباد سے مسٹر (سر) میکنزی پرنسپل و مسٹر طالب الدین پروفیسر ٹریننگ کالج۔ مدراس سے مسٹر سہرامنی آیار پروفیسر پریسیڈنسی کالج اور کلکتہ سے مسٹر ٹیلر اسسٹنٹ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم و نگراں تعلیم مسلمانان بنگال شریک اجلاس ہوئے۔ ان کے لکچر نہایت دلچسپ تھے اور فن تعلیم سے تعلق رکھنے والے اصحاب کے واسطے بیش بہا معلومات کا ذخیرہ تھا لکچروں کے خلاصے اُردو میں تیار کرلئے گئے تھے اور چھاپ کر اجلاس میں تقسیم کردئے گئے تھے اور اس طرح سے غیر انگریزی داں اصحاب کو بھی ان لکچروں سے مستفیض ہونے کا موقع ملا تھا لکچروں کے علاوہ مسٹر کریم بخش صاحب پرسنل اسسٹنٹ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم صوبہ سرحد نے وہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر مفصل اور مفید رپورٹ پڑھی جس سے حاضرین کو صوبہ مذکور کے خاص حالات کا اندازہ ہوا۔

اسکول میوزیم اور تعلیمی نمائش

عرصہ ہوا کہ اسکول میوزیم قائم کرنے کے لئے ریزولیوشن پاس ہوا تھا لیکن چونکہ کانفرنس کا اب تک کوئی اپنا مکان نہیں تھا اور کالج کے خس پوش چھوٹے بنگلہ کے دو کمرے اس کام کے واسطے موزوں اور کافی نہ تھے اس لئے اس ریزولیوشن کی تعمیل نہ ہوسکی تھی صدر دفتر (سلطان جہاں منزل) کی تعمیر کے بعد صاحبزادہ صاحب نے مجوزہ میوزیم قائم کردیا اور اس سلسلہ میں تعلیمی نمائش بھی اول بار امسال علیگڈھ میں کی گئی اور اس میں دیگر مقامات سے (علاوہ علیگڈھ کے) اسلامیہ اسکولوں کے طلبہ کی بنائی ہوئی چیزیں بھی رکھی گئی تھیں اُس زمانہ کے معیار سے یہ نمائش بہت کامیاب ہوئی اس

نمائش میں اوّل بار کنڈر گارٹن طریقہ تعلیم کے متعلق جو سامان صاحبزادہ صاحب نے پہلے سے منگوایا تھا رکھا گیا تھا وہ اس طریقہ تعلیم کے واسطے عرصہ سے کوشاں تھے۔

مفت و جبریہ تعلیم

اس ریزولیوشن کو پیش کرتے وقت صاحبزادہ صاحب نے تعلیم کی ضرورت اور اہمیت پر یہاں تک کہا کہ اگر اُن کا اختیار ہو تو وہ اس کام کے واسطے اس قسم کا خاص قانون پاس کرادیں جو جنگ کے موقع پر منظور کئے جاتے ہیں اور جس کے بموجب کل سامان عیش و عشرت بند کردئے جاتے ہیں اور کل روپیہ جنگ کے کاموں میں خرچ کیا جاتا ہے اسی طرح ضرورت ہے کہ ملک کا سب سرمایہ اول تعلیم پر صرف کیا جائے بعض ممبران نے کچھ ترمیمات پیش کیں جو آخرکار واپس لے لیں ڈاکٹر (سر) ضیاءالدین احمد صاحب نے طریقہ کار کے متعلق کہا کہ اوّل یہ دیکھا جائے کہ ہم اس کے واسطے تیار بھی ہیں یا نہیں اور یہ کہ کارروائی اس طرح ہو کہ آئندہ چل کر مفت اور جبریہ تعلیم کا نفاذ ہوسکے نواب محمد اسحٰق خاں صاحب آنریری سکریٹری کالج و کانفرنس نے ڈاکٹر صاحب کی ترمیم کی سخت مخالفت کی اور چند ممبران نے بھی اس قسم کی تقریریں کیں اور آخرکار ریزولیوشن مجوزہ (بلفظہ) بالاتفاق پاس ہوا۔

اُردو کی بقا اور ترقی

اُردو کے متعلق جو ریزولیوشن اس اجلاس میں پاس ہوا اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں ایک متعصب گروہ برادران وطن کا ملک کی اس مشترکہ زبان پر بیجا حملے کررہا تھا اس لئے اس مسئلہ کو صاحبزادہ صاحب نے بجائے اُردو سیکشن میں پیش کرنے کے اصل اجلاس کانفرنس میں ایک مختصر تقریر کے ساتھ پیش کیا اور اس سلسلہ میں (سر) سید رضا علی صاحب نے ایک برمحل اور بسیط تقریر کی اور مسلمانوں کو اُردو کی حمایت اور ترویج کے ذرائع اختیار کرنے کی ترغیب دی۔

پریس کانفرنس

صاحبزادہ صاحب مُدّت سے پریس کانفرنس قائم ہونے کے آرزومند تھے ان کا خیال تھا (اور یہ صحیح خیال ہے) کہ قومی ترقی کے ہر شعبہ میں خواہ

تعلیم یا سیاست یا معاشرت اخبارات کی آواز بہت زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ اگر ایڈیٹران اپنے اخبارات کی پالیسی اعتدال اصلاح اور تدبیر کے ساتھ تعین کر کے اس پر استقلال کے ساتھ قائم رہیں تو وہ بہت جلد بمقابلہ معمولی لیڈروں کے قوم کی رہنمائی کرسکتے ہیں چنانچہ اسی خیال سے انھوں نے علیگڈھ کے اس اجلاس کانفرنس میں ایڈیٹر صاحبان اخبارات کو خصوصیت کے ساتھ مدعو کیا تھا تاکہ علیگڈھ میں جو کام ہو رہے ہیں وہ ان کو بچشم خود دیکھ کر رائے قائم کریں اور نیز یہ کہ ایک پریس کانفرنس کی ضرورت ان پر واضح کی جائے اس دعوت پر چند قومی اخبارات کے ایڈیٹر صاحبان تشریف لائے اور ایک مخصوص جلسہ میں "جو سلطان جہاں منزل" میں ترتیب دیا گیا تھا صاحبزادہ صاحب نے تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار فرمایا جن کو حاضرین نے بہت پسند کیا اور پریس کانفرنس قائم کرنے کا وعدہ کیا لیکن افسوس یہ وعدہ آجکل کے مسلمانوں کے اکثر وعدوں کی طرح شرمندۂ ایفا نہ ہوا ادھر صاحبزادہ صاحب چند ماہ بعد انگلستان انڈیا کونسل میں چلے گئے۔ وہاں سے واپسی پر پھر انھوں نے ایک کوشش اس بارہ میں کی جس کا ذکر دور سوم میں آئے گا۔

سائنس کے کرشموں کا مشاہدہ اسٹریچی ہال میں پہلی بار ڈاکٹر ولی محمد صاحب پروفیسر کالج کی کوشش سے بجلی کی روشنی کا انتظام کیا گیا تھا اور سائنس کے بعض تجربات اور کرشموں کا مشاہدہ کرایا گیا تھا جو حاضرین اجلاس کی بڑی دلچسپی کے باعث ہوئے۔

کانفرنس کے حسابات کانفرنس کے تفصیلی حسابات سب سے پہلی بار اسی اجلاس میں پیش ہوئے اور خود صاحبزادہ صاحب نے خواہش کی کہ ممبران ان کی بابت آزادی کے ساتھ اظہار خیال کریں چنانچہ بعض ممبران نے کچھ ریمارکس کئے اور اس کے بعد کل حسابات بالاتفاق منظور ہوئے۔

کانفرنس کی سالانہ رپورٹ یہ رپورٹ اُردو کے باریک ٹائپ کے ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے صاحبزادہ صاحب نے اس رپورٹ کو اپنی علالت

اور اجلاس کانفرنس کے انتظامات کی غیر معمولی مصروفیت کے زمانہ میں جس کی تفصیل اوپر عرض کی گئی قلمبند کیا تھا انھوں نے اپنے مقرر کردہ معیار کا لحاظ کرکے اس رپورٹ کو غیر مکمل لکھا ہے لیکن درحقیقت وہ ایک جامع اور مبسوط تبصرہ کانفرنس کے دہ سالہ کام کا ہے جو انھوں نے بحیثیت آنریری جوائنٹ سکرٹیری انجام دئے تھے اس رپورٹ میں خصوصیت کے ساتھ اس فرسودہ ناروا اعتراض کا مُسکِت و مدلّل جواب ہے جو سرسید رح اور نواب محسن الملک کے زمانہ سے چلا آتا تھا اور جس کو بعض اصحاب نے "بمقتضائے طبیعت" پچھلی دو سال میں نہایت بلند آہنگی کے ساتھ اُٹھایا تھا اور متعدد پمفلٹ اس مضمون کے شائع کئے تھے کہ کانفرنس ایک بے عمل جماعت ہے اور اس کا وجود قومی اغراض کے واسطے نہ صرف بیکار بلکہ غیر مفید ہے صاحبزادہ صاحب نے اعداد و شمار۔ سرکاری و غیر سرکاری رپورٹوں و کاغذات اور جملہ دیگر متعلقہ واقعات سے ثابت کیا کہ سرسید رح کے زمانہ (۱۸۸۶ء) سے ۱۹۱۶ء تک تیس سال کی مدت میں کانفرنس نے ملک و ملّت کی کس قدر مہتم بالشان خدمات انجام دیں اور مسلمانوں میں تعلیمی بیداری اور قومی معاملات سے دلچسپی محض کانفرنس کی بدولت پیدا ہوئی علیگڈھ کی روایات کے بقا اور خود مسلم یونیورسٹی کے قیام میں کانفرنس کا کس قدر حصّہ ہے اس کا اندازہ رپورٹ مذکور کے ملاحظہ ہی سے ہوسکتا ہے یہاں پر اس کی تفصیل ممکن نہیں ہے۔

اب چونکہ دور دوم ختم پر ہے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ الحاج نواب محمد اسحٰق خاں صاحب (مرحوم) آنریری سکریٹری کالج و کانفرنس کا تبصرہ جو موصوف نے صاحبزادہ صاحب کے کاموں کے متعلق ان کی روانگی انگلستان کے وقت علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۱۷ء میں شائع کیا تھا اس کا وہ حصّہ جو کانفرنس کے متعلق ہے یہاں پر نقل کردیا جائے وھو ہذا۔

"مذکورہ بالا جملہ قومی خدمات سے بڑھ چڑھ کر آپ کی ممتاز ترین یادگار آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی موجودہ حیثیت ہے آپ نے ۱۹۰۶ء میں بحیثیت آنریری جوائنٹ سکرٹیری کانفرنس کا چارج لیا تھا جب کہ صرف ایک کلارک اس عظیم الشان قومی انسٹیٹیوشن

کی کل کائنات تھی نہ کوئی سرمایہ مجتمع تھا نہ کوئی آمدنی تھی اور یہ کہنا بالکل مبالغہ میں داخل نہیں کہ کانفرنس کی طرف سے گزشتہ بارہ سال میں ہمارے قوم کی جس قدر تعلیمی خدمت ہوئی ہے اور آج کانفرنس بلحاظ دائرہ عمل و وسعت وسائل جن مستحکم بنیادوں پر قائم ہے یہ بہت زیادہ صاحبزادہ صاحب ہی کے ذاتی توجہ، انہماک، خاموش اور بے ریا خدمات اور شخصی کوششوں کا نتیجہ ہے اس کانفرنس کی خاطر صاحبزادہ صاحب ممدوح علاوہ اپنے وقت و توجہ کا بہت بڑا حصہ روزانہ صرف کرنے کے اپنی آمدنی کا بھی بہت کچھ نقصان برداشت کرتے رہے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ کانفرنس کے اجلاسوں کے زمانہ میں نیز اس قسم کے دیگر مواقع پر موصوف اپنی توجہ کو اپنے پیشہ کے کاروبار کی طرف سے بالکل ہٹالیا کرتے تھے اور یہ آپ ہی کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج کانفرنس اپنے مقاصد کے اعتبار سے اتنی کامیاب نظر آتی ہے کہ آپ کے زمانۂ جوائنٹ سکریٹری شپ میں ڈھاکہ، کراچی، امرتسر، رنگون، ناگپور، دہلی، لکھنؤ، آگرہ، راولپنڈی، پونا اور علیگڈھ میں ہمگیں ۱۱ اجلاس سالانہ ہوئے آپ کے کانفرنس کی رپورٹیں آپ کی قابل قدر کوششوں کی (جو آپ نے ہمیشہ قومی تعلیم کی ترقی کے متعلق برابر جاری رکھیں) روشن تصویریں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو اب تک تمام ہندوستان کے صوبوں میں خاطر خواہ ترقی نہیں ہوئی ہے تاہم ہر مقام پر علی قدر حیثیت بیداری کے آثار پیدا ہو چلے ہیں جو انشاء اللہ العزیز بارآور ہوکر رہیں گے آپ کی کوششیں مسلمانان کشمیر کی تعلیم کے متعلق خاص طور پر سب سے زیادہ قابل قدر ہیں جہاں باوجود ناگفتہ بہ دشواریوں کے ایسے سامان مہیا ہو گئے کہ مسلمانان کشمیر کی ہمت بندھ گئی۔"

"۱۹۱۲ء میں آپ بنگال پراونشیل ایجوکیشنل کانفرنس کے اور ۱۹۱۳ء میں بمبئی پراونشیل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے ان مواقع پر آپ نے جو خطبات دئے وہ ان صوبوں کی تعلیمی تاریخ کا قابل قدر ذخیرہ اور آئندہ اصلاحات کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہیں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی تحریک کو صاحبزادہ صاحب کانفرنس کے ہر اجلاس میں تازہ فرماتے

رہے اور ۱۹۱۰ء کے اجلاس ناگپور میں جبکہ یہ تحریک پہلی بار سرسبز ہوتی معلوم ہوئی آپ نے جس سرگرمی سے اس تجویز کو آگے بڑھانے اور کامیاب بنانے میں بیش از بیش حصہ لیا اس سے پبلک بخوبی واقف ہے کہ ملک کے دور دراز حصص میں دورہ کیا مسلم یونیورسٹی کی اشاعت کی غرض سے متواتر کوششیں جاری رکھیں متعدد مضامین اور رسالے شائع کرائے اور مسودات قانون مسلم یونیورسٹی کی ترتیب میں آپ بہت مدد دیتے رہے گورنمنٹ سے اس مسئلہ پر جس قدر اور جہاں گفتگو ہوئی ہے آپ اس میں شریک غالب رہے۔ ایثار۔ تحمل، خصوصاً ضبط نفس آپ کی ذاتی خصوصیات ہیں اس میں ذرہ بھر بھی شک کی گنجائش نہیں کہ آپ کا عمر بھر کا شغل راجح مسلمانوں کی ترقی تعلیم کی دُھن رہی ہے خدا کے فضل و کرم سے امید ہے کہ آپ کے جدید منصب پر فائز رہنے کے زمانہ میں قومی بہبود کے متعلق آپ کی مساعی جمیلہ بہت زیادہ بارآور ہوں گی اور مسلمانوں کے حقوق مذہبی و ملکی و سیاسی کے تحفظ میں حتی الوسع ہمیشہ کوشاں رہیں گے"۔

"صاحبزادہ صاحب کی رخصت ایک ایسا موقع ہے کہ نہ خوش ہوتے بنتی ہے نہ رنج کرتے خوشی اس بات کی ہے کہ صاحبزادہ صاحب کا انتخاب ایک ایسے عہدہ کے لئے ہوا ہے جہاں وہ اپنی قوم اور ملک اور گورنمنٹ کے لئے مفید تر خدمات بجا لاسکیں گے اور غم اس کا ہے کہ کالج اور کانفرنس اس وقت آپ کی براہ راست خدمات سے محروم ہوتے ہیں کیونکہ مخلص کارگذار بزرگوں کا اپنے پرانے مرکز کو چھوڑ کر کسی اعلیٰ سے اعلیٰ مرکز کی طرف بھی رجوع کرنا ان کے ساتھ کام کرنے والوں کے لئے فی الحقیقت کسی دلی خوشی کا باعث نہیں ہوسکتا اور اس لحاظ سے صاحبزادہ صاحب کی جدائی علیگڈھ کے حق میں اور ان کے احباب و مداحین کے لئے سردست ایک ناقابل تلافی نقصان ہے بہرحال اس مضمون کو اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

"اے تماشاگاہ کالج ذات تو"
"تو کجا بہر تماشا میروی"

"دعا ہے کہ جامع المتفرقین پھر اُن کو بخیر و خوبی اپنے اصلی مرکز کی طرف واپس لاکر اُن کو اپنی چھیتی کانفرنس کی مزید خدمت کرنے کا اور قوم کو ان کی بیش بہا خدمات سے مستفیض ہونے کا موقع عطا فرمائے۔"

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

خاکسار

(دستخط) محمد اسحٰق خاں عفی عنہ

آنریری سکریٹری

فصل سوم (تیسرا دور)

اواخر ۱۹۱۷ء سے مرض الموت کے شروع ہونے تک کانفرنس کی خدمات

انڈیا کونسل کی ممبری کے زمانہ میں صاحبزادہ صاحب کا تعلق کانفرنس کے ساتھ گو کہ اس نوعیت کا نہ رہا تھا۔ جیسا کہ علیگڈھ کے قیام کی حالت میں تھا۔ لیکن انگلستان میں بھی علیگڈھ اور کانفرنس کے "خیال" سے وہ "غافل نہیں رہے"۔ وہاں بھی وہ حتی الامکان تعلیمی جلسوں اور کانفرنسوں میں شرکت کرتے تھے۔ اور ان سب چیزوں کو جن کو وہ مسلمانوں اور علیگڈھ کے واسطے مفید خیال کرتے نوٹ کر لیتے اور پھر اُن کو تفصیل کے ساتھ اپنے دوست مولوی طفیل احمد صاحب کو جو اس زمانہ میں کانفرنس کے آنریری جوائنٹ سکریٹری تھے لکھا کرتے تھے۔ اسی دوران میں انھوں نے بمشورہ و اجازت نواب صدر یار جنگ بہادر (آنریری سکریٹری کانفرنس) فن تعلیم کی بہت سی نادر کتابیں خرید کر علیگڈھ بھجوائیں۔ انگلستان، فرانس، جرمنی وغیرہ کی نامور و مشہور یونیورسٹیوں کو بالاستیعاب دیکھنے کے لئے تقریباً کُل یورپ کا سفر کیا۔ غرضکہ انگلستان کے ہفت سالہ قیام میں بھی تعلیمی مسائل سے اس قدر گہری اور غیر معمولی واقفیت حاصل کر لی کہ ان کا شمار "ماہرین فن تعلیم" میں ہونے لگا۔ چنانچہ اس کا ایک دل کش مظاہرہ دسمبر ۱۹۲۳ء کے اجلاس کانفرنس میں بمقام علیگڈھ ہوا۔ اس سال کی کانفرنس کے صدارت کے واسطے صاحبزادہ صاحب کا انتخاب عمل میں آیا تھا۔ اور استقبالیہ کمیٹی کے صدر آنریبل نواب سر مزمل اللہ خاں صاحب مرحوم و مغفور تھے۔ نواب صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس اجلاس کانفرنس کی جدت آمیز نوعیت کی بابت حسب ذیل ارشاد فرمایا:۔

"اس سال کی کانفرنس میں پہلے سے بہت زیادہ امتیاز ہے۔ قبل ازیں فلسفیات،

تخیلات اور ادبیات کی اسپیچیں ہوتی تھیں۔ یا محض ریزولیوشن پاس ہوتے تھے مگر اس مرتبہ میرے معزز دوست اور قابل جانشیں آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے یہ جدّت کی ہے۔ کہ کانفرنس کو عملیات کا مرقع بناکر پیش کیا ہے۔ گویا کانفرنس نے اس صورت میں دوبارہ جنم لیا ہے۔ یعنی پینتیس ۳۵ برس کے بعد اس سال کانفرنس کو اپنی اصلی شکل میں رونما ہونے کا موقع ملا۔ مجھے امید واثق ہے کہ آپ حضرات اس سے مستفید ہوں گے۔ اور پھر اپنے اپنے مقامات پر جاکر اپنے احباب و اعزّہ کو ان جدید خیالات سے بمصداق وَلْيُبَلِّغِ الْحَاضِرُ الْغَائِبَ مستفیض کریں گے۔ حضرات تقریروں کا وقت اب گیا۔ اب عمل کا وقت ہے"۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اجلاس سے تقریبًا تین ماہ قبل صاحبزادہ صاحب رخصت پر ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ اور اس وقفہ کو انھوں نے کانفرنس ہی کے کاموں میں صرف کیا۔ صوبۂ متحدہ اور پنجاب کے مختلف اضلاع میں دورہ کیا۔ اور حیدرآباد کا سفر بھی اسی سلسلہ میں ہوا۔ ہر دو صوبہ جات کے گورنر صاحبان سے مل کر ڈائریکٹر صاحبان و دیگر افسران و اساتذہ سررشتۂ تعلیم کو کانفرنس کی شرکت کے لئے اجازت دلوائی۔ اجلاس سے پندرہ دن قبل اور دوران اجلاس میں وہ جزوی و کلّی کاموں میں اس طرح منہمک ہوگئے کہ لوگوں کو اُن کے جوائنٹ سکریٹری شپ کانفرنس کا زمانہ یاد آگیا۔ حالانکہ وہ اس اجلاس کے صدر منتخب ہوچکے تھے۔ اور عام انتظامات کی ذمہ داری ان پر نہ تھی۔ لیکن کانفرنس سے ان کا شغف ان کی طبیعت ثانی کے درجہ پر تھا۔ اس لئے صدارت کے محدود رسمی امور تک وہ اپنے آپ کو پابند نہ کرسکے۔

اس اجلاس کانفرنس کی مندرجہ ذیل خصوصیات قابل تذکرہ ہیں:۔

(۱) خلاف معمول سابقہ یہ اجلاس بجائے تین کے چھ دن تک رہا۔ اور سلسلہ کام آٹھ بجے صبح سے گیارہ بجے شب تک (بہ استثنائے مختصر وقفہ کھانا اور نماز کے) جاری رہا۔

(۲) علاوہ جنرل پریسیڈنٹ ہونے کے کہ جو صاحبزادہ صاحب خود تھے۔ انھوں نے نامور

ماہرین تعلیم مثلاً علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب، مسٹر میکنزی ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم صوبہ متحدہ سرجاسج اینڈرسن ڈائریکٹر پنجاب ودیگر حضرات کو مختلف اجلاسوں کا صدر مقرر کیا۔ اور ان اصحاب نے نہایت مفید اور پُرمغز خطبات ارشاد فرمائے۔

(۳) غیر ضروری اور رسمی ریزولیوشنوں کی تعداد کم کر کے بڑا حصہ اجلاس کا علمی اور تعلیمی لکچروں میں صرف کیا گیا۔ اکثر لکچر نہایت مفید موضوع پر تھے۔ جو علی العموم اس فن کے ماہرین نے دئے تھے۔ بلامبالغہ اس سے قبل اتنا بڑا مجمع ماہرین فن تعلیم اور اشخاص متعلقہ سررشتہ تعلیمات برٹش انڈیا و ریاستہائے ہند کا کسی ایک مقام پر نہ ہوا تھا۔ صرف ایک ریاست حیدرآباد ہی سے دس اصحاب شریک اجلاس ہوئے تھے۔ ۴۵ لکچر پڑھے گئے یا پیش ہوئے اور اکثر لکچروں پر مفید مباحثے ہوئے۔ یہ لکچر انگریزی و اُردو کی علٰحدہ علٰحدہ دو جلدوں میں کانفرنس نے شائع کر دئے ہیں۔ اور بعض ان میں سے اس قدر عرصہ گذرنے کے بعد بھی اس قابل ہیں کہ ان کو غور سے پڑھا جاوے اور ان پر عمل کیا جاوے۔

(۴) اقلاً دو سو اہل ہنود نے (جن میں سے بعض تعلیمی حیثیت سے بہت ممتاز تھے) شرکت کی۔ اس سے قبل ہندو اصحاب خال خال ہی شریک ہوا کرتے تھے۔

(۵) اُردو کی بہترین اور تازہ ترین تالیفات وتصنیفات اور انگریزی کتابوں کی دوکانات اس سال آئیں کہ جن کے واسطے معقول انتظام مقام اجلاس (اسٹریچی ہال) کے سامنے کیا گیا تھا۔

(۶) تربیت جسمانی پر علامہ یوسف علی کا مفید و پُرمغز لکچر تھا جس میں کہ جسمانی تربیت کے اثر وتعلق کو جو عام تعلیم و اخلاق کے ساتھ ہے۔ دلنشیں طریقہ سے بیان کیا گیا تھا۔ نیز فن بنوٹ کی تاریخ، ترقی و تنزلی پر مولوی عبدالحمید صاحب مہتمم مدرسہ عربی (اندرون پھاٹک حبشی خاں دہلی) کی تقریر ہوئی۔ اور اس کے بعد اسٹریچی ہال کے سامنے ہندوستانی ورزشوں (یعنی پٹا، پھری گتکا، بنوٹ وغیرہ) کا مظاہرہ ہوا۔ جس میں دہلی اور لکھنؤ کے مشہور استادوں

نے اپنے جوہر دکھلائے۔ نیز اسی سلسلہ میں دوسرے دن بوائے اسکاؤٹس کا مظاہرہ ہوا۔ جس سے حاضرین بہت متاثر ہوئے۔ اس مظاہرہ اور دلچسپی کا یہ نتیجہ ہوا کہ اپنے وائس چانسلری کے زمانہ میں صاحبزادہ صاحب نے یونیورسٹی میں ایک استاد فن بنوٹ کا تقرر کیا اور اس طرح بنوٹ کلب قائم ہوا۔ جو اب تک چل رہا ہے۔

(۷) ایک خصوصیت اس اجلاس کی یہ بھی تھی کہ اس میں وہ ظاہری سامان زیبائش و آرائش بالکل نہ تھا۔ جو اب تک کانفرنس کا لوازمہ سمجھ لیا گیا تھا۔ بلکہ سادگی اور صفائی کے ساتھ ہر چیز قرینہ سے تھی۔ اور چونکہ ماہرین تعلیم اس اجلاس میں کثرت سے تھے۔ انھوں نے اس جدید انتظام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور عموماً اور لوگ بھی بجائے ظاہری شان و شوکت کے اور ضمنی دلچسپیوں کے علمی اور سنجیدہ مشاغل کی طرف زیادہ متوجہ معلوم ہوتے تھے۔ اور اجلاس کے انداز اور طرز کارروائی سے یہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ "یہ کوئی تفریحی جلسہ نہیں ہے۔ بلکہ سب لوگ کسی مفید اور سنجیدہ کام کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ اور یہ چاہتے ہیں۔ کہ یہاں سے کچھ سیکھ کر اپنے گھروں کو واپس جائیں "

(۸) کھانے کا انتظام اس مرتبہ معمول سے جداگانہ حیثیت کا تھا۔ اب تک یہ دستور تھا کہ یا تو کوئی مقامی فیاض رئیس ممبران و شرکائے کانفرنس کا میزبان ہو جاتا تھا۔ یا استقبالیہ کمیٹی ہوٹل وغیرہ قائم کر کے مختلف مدارج و اقسام کے کھانے مہیا کراتی تھی۔ یہ دونوں صورتیں دقت سے خالی نہ تھیں۔ ہر جگہ ایسے فیاض بزرگ موجود نہ تھے۔ کہ شرکائے کانفرنس کو عام دعوت دیں۔ اور استقبالیہ کمیٹی کو اس انتظام میں بڑی مشکلات کا سامنا رہتا تھا۔ اور اس کے خاص خاص کارکنوں کو جو وقت کہ کانفرنس کے دیگر مفید اور ضروری کاموں میں صرف ہونا چاہیئے۔ کھانے کے انتظام کی نذر ہو جاتا تھا۔ اور پھر بھی یہ شکایت رہتی تھی۔ اس مرتبہ صاحبزادہ صاحب نے یہ کل انتظام علیگڈھ کے منددین چیف ریڈر حافظ شرافت اللہ صاحب (مرحوم) کے سپرد کیا تھا۔ اور انھوں نے سلیقہ کے ساتھ سادہ مگر نہایت عمدہ کھانا

نہایت واجبی نرخ پر مہیا کیا۔ کہ جس کو عموماً بہت پسند کیا گیا۔

(۹) تعلیمی نمائش جو اس کانفرنس کی جان تھی۔ اس کی غرض و غایت مختصراً خود صاحبزادہ صاحب کے الفاظ میں یہ تھی کہ "تعلیمی ثمرات کو مجسم شکل میں ظاہر کیا جاوے" موصوف اس کے واسطے بہت سا سامان انگلستان سے لائے تھے۔ اور ہندوستان میں بھی جہاں جہاں سے ممکن ہوا فراہم کیا۔ اور یہ کُل ملاکر ایسی نمائش ترتیب دی گئی کہ جس کی بابت بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ آج تک وہ خود اپنی نظیر ہے۔ صرف اس نمائش کے افتتاح کے واسطے ہز ایکسیلنسی سر ولیم میرس گورنر صوبہ متحدہ جو انگریزی علم و ادب کے مشہور و مسلمہ فاضل ہیں۔ اپنا کرسمس کیمپ چھوڑ کر علیگڈھ آئے تھے۔ نمائش کو بغور دیکھنے کے بعد ہز ایکسیلنسی نے جو تقریر کی۔ اس میں مسئلہ تعلیم کے بعض پہلوؤں پر چند نادر اور دلچسپ خیالات کا اظہار کیا۔ اور نمائش کو ہندوستان میں ایک جدید تعلیمی تحریک قرار دیکر صاحبزادہ صاحب کی مسلسل تعلیمی سرگرمیوں اور مساعی کا نہایت عمدہ الفاظ میں اعتراف کر کے ان تکالیف کے واسطے جو نمائش کے سلسلے میں انھوں نے برداشت کیں گورنمنٹ اور ماہرین تعلیم کا مرہون منت ہونا ظاہر کیا۔

نمائش کے حالات خاں بہادر مولوی ادریس احمد صاحب (مرحوم) ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول بریلی نے اختصار و قابلیت کے ساتھ مرتب کئے تھے۔ ناظرین سوانح ہذا کی واقفیت اور دلچسپی کے واسطے ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں:۔

"اپنی ناواقفیت اور اپنے محدود مشاہدے کے ہاتھوں ہمارے دماغوں میں تعلیم کا مفہوم اس قدر مختصر، اس قدر تنگ اور اس قدر غیر دلچسپ رہتا چلا آیا ہے۔ کہ علیگڈھ کی تعلیمی نمائش کے اعلانات اخباروں میں پڑھ کر کم سے کم میرے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات کبھی نہ آئی تھی۔ کہ بانیٔ نمائش نے علیگڈھ میں تعلیم کا ساز و سامان اس قدر وافر جمع کیا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے نہایت وسیع اور بلند و بالا ہال اور کمرے اس قدر تنگ ہو جائیں گے۔ کہ

کثیر التعداد مشتاق زائرین کی ٹولیوں کو اس نادر اور نظر فریب ذخیرہ کو جی بھر کر دیکھ لینے
کی غرض سے ان ہالوں اور کمروں میں چلنے پھرنے کی بھی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ اب تک
تعلیمی نمائش کا سب سے بڑا نقشہ جو ذہن میں محفوظ تھا۔ وہ سنہ ۱۹۱۰ء والی الہ آباد کے مشہور
و معروف نمائش کی یاد سے وابستہ تھا جس میں ایک کمرہ اس ضروری شعبہ کے لئے مخصوص
تھا۔ مگر جس وقت علیگڈھ پہنچ کر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی تعلیمی نمائش تک رسائی نصیب
ہوئی تو آنکھیں خیرہ ہوگئیں اور سب سے پہلے مجھے اس بات کا حیرت انگیز احساس ہوا۔ کہ
میرا وجود کسی طرح ایک کنوئیں میں رہنے والے مینڈک سے بہتر نہیں ہے جس کو دنیا و مافیہا
کی خبر نہیں ہوتی۔ اور جو کولہو کے بھنگوں کی طرح اپنے مختصر ماحول ہی کو دنیا سمجھے ہوئے
ہوتا ہے۔ مجھ کو اس بات کا یقین ہے۔ اور میں نے بہت سے کہنہ سال بزرگوں کو جو کانفرنس
کے اس سالانہ اجلاس میں شریک تھے۔ بار بار یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اب سے پہلے ہندوستان
میں کہیں کسی مقام پر بھی ایسی عظیم الشان تعلیمی نمائش کبھی نہیں ہوئی۔ کاش اس نمائش
کا کوئی پیمانہ یا معیار ذہن میں پیشتر سے موجود ہوتا۔ تو اس کے حوالہ سے پبلک کو اس کی
اطلاع دی جاتی۔ تاکہ سب لوگ خصوصاً مسلمان اس نادر موقعہ سے استفادہ کرنے کی غرض سے
اپنے سو کام ہرج کر کے زیادہ سے زیادہ تعداد میں علیگڈھ پہونچتے۔ اور دنیائے تعلیم کی اس
دماغ افروز تصویر کا بچشم خود مشاہدہ کرتے۔ مگر میرے خیال میں حسرت کے لحاظ سے وہ لوگ
جنھوں نے نمائش کو دیکھا اور وہ لوگ جو اس موقع پر علیگڈھ نہ پہنچ سکے۔ قریب قریب
برابر رہیں گے۔

علیگڈھ یونیورسٹی کے دس گیارہ بڑے بڑے وسیع ہال اور کمرے فرش سے چھتوں تک
سامان سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ جدھر آنکھ اُٹھتی تھی۔ وہیں نگاہ قید ہو کر رہ جاتی تھی۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

بھلا تین چار دن کے عرصہ میں (اور وہ بھی ماہ دسمبر جب کہ دن بہت ہی چھوٹے ہوتے ہیں) کیونکر اس ذخیرہ کثیر کے دیکھنے کا حق ادا ہو سکتا تھا۔ مہینے نہیں تو چند ہفتے تو دیکھنے کو ملتے۔ الغرض جو لوگ علیگڈھ پہنچ سکے وہ تو یہ حسرت دل میں ساتھ لئے جاتے ہیں کہ آئے بھی اور کچھ نہ دیکھ پائے۔ اور جو لوگ بد قسمتی سے بالکل ہی نہ پہونچ سکے۔ وہ حضرات جس وقت اس نمائش کی تفصیل دیکھنے والوں کی زبانی سنیں گے۔ ان کی حسرت کا تو میں کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ جب نمائش کے کمرے بند ہو جانے کے بعد اسٹریچی ہال کے سامنے مجمع ہوا کرتا تھا۔ تو عموماً نمائش کے فوائد پر بحث ہوا کرتی تھی۔ میں نے ہر دفعہ اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ سب سے بڑا فائدہ جو اس ذخیرہ کثیر کو ایک جگہ فراہم دیکھنے سے ہم سب کو خصوصاً تعلیم یافتہ طبقہ کو پہنچا ہے وہ اپنی ناواقفیت اور جہل کا احساس ہے۔ ہم کو یہ خبر ہی نہ تھی۔ کہ تعلیمی جدوجہد کے میدان میں دنیا کی دوسری معاصر قومیں کہاں سے کہاں تک پہونچ چکی ہیں۔ نمائش کے دیکھ چکنے کے بعد اور تعلیم کے جدید دلاویز طریقوں کے مشاہدے کے بعد صاف معلوم ہوتا تھا۔ کہ ان لوگوں کے مقابلہ میں جو ان جدید طریقوں کے موجد اور ان طریقوں سے بہرہ یاب ہیں۔ ہم کو وہی نسبت ہے جو تاریخ کے سنگی زمانہ میں یعنی (اسٹون ایج (Stone age) والوں کو ہمارے زمانہ سے کیا فرق ہے۔ اس شخص میں جو پتھر کے آلات و اسلحہ سے اپنی حفاظت اور اپنی شکم پُری کیا کرتا تھا۔ اور اس شخص میں جو ۱۹۲۳ء میں بھی بچوں کو قمچیوں سے مار مار کر حروف تہجی اور ان کے مرکبات رٹواتے ہیں۔ ترجمہ کی غلطیوں پر ان کی گوشمالی کرتے ہیں۔ غیر زبان کا ایک فقرہ بتلانے سے پہلے صرف و نحو کے قواعد بچوں کو ایک میعاد مقررہ کے اندر یاد کراتے ہیں۔ اور طمانچوں اور بید کی مدد سے پہاڑے اور حساب کے قاعدے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ازبر کراتے ہیں۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم کو اپنی مختص الوقت ضرورتوں کا احساس بھی نہیں ہے۔ اور ہم یہ نہیں جانتے کہ دوسری معاصر قومیں تعلیمی دوڑ میں ہم سے کس قدر

آگے نکل چکی ہیں۔ اگر علیگڈھ کی نمائش کے مطالعہ کے بعد اپنی اس پس ماندگی کا ہمارے دلوں میں احساس پیدا ہو گیا۔ تو سمجھنا چاہئے کہ نمائش نے اس دفعہ ایک ہی موقع پر وہ کام کر دکھایا۔ جس کے انجام دینے میں ہماری ایجوکیشنل کانفرنس ۳۶ سال سے مصروف رہتی چلی آئی ہے۔

دوسرا بڑا فائدہ جو اس نمائش سے غالبًا مقصود تھا یہ ہے کہ جو لوگ مسئلہ تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کی رہنمائی ہو۔ مثلاً جب تک بھاپ کی قوت اور اس کے گوناگوں استعمال سے لوگ ناواقف تھے۔ اس طرف توجہ کا رخ ہی نہیں ہوتا تھا۔ مگر جب ایک دن ایک مرد واحد نے چولھے پر دیگچی کا سرپوش پھڑپھڑاتے ہوئے نگاہ غور سے دیکھ لیا۔ اور اسکا خیال بھاپ کی قوت کی طرف رجوع ہوا۔ تو اس کی فہم کو تگ و دو کا راستہ مل گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ اس ایک مرد نے اس قوت سے جو کام لیا۔ اس کے مظاہرے کے بعد سیکڑوں قسم کے انجن اور کارخانے اور جہاز بن گئے۔ اب بجلی کی قوت سے طرح طرح کام لینے کی غرض سے لوگ اپنا دماغ لڑا رہے ہیں۔ ہم سمجھتے تھے۔ کہ تعلیم جیسے فرسودہ روکھے سوکھے دل آزار کام میں آخر کہاں تک دلچسپی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور "طفل بہ مکتب نمی رود و لے برندش" کے اصول کی کہاں تک اصلاح ہوسکتی ہے۔ مگر علیگڈھ کی نمائش میں بعض خوانین یورپ کی ایجاد کردہ تازہ طریقہ ہائے تعلیم کی تفصیلات مانٹی سوری (Montessori) طریقہ تعلیم کے مشاہدہ نے گویا آنکھیں کھول دیں۔ کہ کسی طرح حقیقی تعلیم کو بچوں کی تفریح کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔ اس طریقہ تعلیم کے ماتحت تین چار برس کی عمر ہی سے بچوں کی تعلیم شروع ہوجاتی ہے۔ اُستاد کی نگرانی میں اس کی کسی مداخلت کے بغیر بچے کھیل کود میں غیر محسوس طور پر تعلیم پاتے رہتے ہیں۔ اور ان کو یہ خبر بھی نہیں ہوتی۔ کہ ہم مکتب یا مدرسہ میں تعلیم پا رہے ہیں اور اسی طرح وہ صرف معمولی تعلیم ہی نہیں پاتے۔ بلکہ روز بروز ان کی قوت مشاہدہ تیز ہوتی جاتی ہے۔ وہ اپنی غلطیوں کی خود ہی اصلاح کر لیتے ہیں۔ ان کے دماغوں میں قوت

تخلیق اور ایجاد اول ہی دن سے کام کرنا شروع کر دیتی ہے۔ مگر کسی طرح واقعی مشاہدہ کے بغیر اس طریقۂ تعلیم کی خوبیوں کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگوں کو یہ خیال گزرا کہ اس طریقہ تعلیم کے لئے جو سازوسامان درکار ہے۔ اس کے واسطے رقم کثیر کی ضرورت ہے۔ مگر عزم مصمم شرط ہے۔ جب آدمی کام شروع کر دیتا ہے۔ تو وہ کام کا راستہ بھی خود تلاش کر لیتا ہے۔ مثلاً نمونہ کے طور پر بچوں کو اس جدید طریقہ سے استفادہ کرتے ہوئے جب دکھایا تو ان کو لکڑی کے تختہ پر بنی ہوئی بیش قیمت تصویروں کے ٹکڑے اس غرض سے دیئے گئے کہ ان ٹکڑوں کو جوڑ کر ان سے وہ سالم تصویریں بنالیں۔ ان کے بجائے کپڑے کے تھانوں پر جو تصویریں بزازوں کی دکان پر مفت مل سکتی ہیں قینچی سے کتر کر ٹکڑے کر دیئے جانے سے بالکل وہی کام لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح قیمتی کھلونوں کے بجائے لکڑی اور مٹی اور ٹین کے کھلونے آسانی سے والدین اور استاد خود بنا سکتے ہیں۔ طریقہ تعلیم کا یہ جدید نمونہ دیکھ کر دماغ نے فوراً اپنا کام شروع کر دیا۔ اور کم از کم میں تو یہ پختہ ارادہ ساتھ لے کر علیگڈھ سے واپس جا رہا ہوں۔ کہ گھر پہونچتے ہی اپنے چھوٹے بچوں کو قرآن شریف اور اردو سکھانے کے لئے یہ طریقہ کام میں لانا شروع کروں گا۔

خلاصہ کلام یہ ہے۔ کہ جیسے اندھیری رات میں غیر معلوم راستہ سے بے دیکھے منزل مقصود تک پہونچنے کے لئے کسی مسافر کو کوئی خدا کا بندہ لالٹین حوالہ کر کے صحیح سڑک پر ڈال دے۔ وہی کام صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے تعلیمی نمائش کے ذریعہ انجام دیا ہے راستہ بتلادیا اور روشنی ہاتھ میں دیدی۔ دماغوں میں تحریک رجحان پیدا ہو گیا ہے اور گھروں پر پہونچ کر جدید طریقوں سے کام لینے کے دل ہی دل میں منصوبے گٹھ رہے ہیں۔

نمائش کی تفصیل تو ایک ضخیم کتاب کی صورت میں پیش کی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ کانفرنس کی رپورٹ میں اس کا تفصیلی تذکرہ ہو۔ مگر ناظرین کی آگاہی کے لئے نمائش کا ایک مختصر خاکہ ذیل میں درج کرتا ہوں۔ جس سے اس کی اہمیت اور شان کا خفیف اندازہ

ہو سکے گا۔

(۱) مشتاق منزل میں بچہ کی پیدائش اور زچہ کی حفاظت کے متعلق نقشے اور تصویریں اور ماڈل جمع کئے گئے تھے۔ لیڈی ڈاکٹر مسز بیلو دیکھنے والوں کو اس مبحث پر ان نقشوں، تصاویر اور ماڈلوں کے حوالہ سے سمجھاتی تھیں کہ دوران حمل میں اور پیدا ہونے کے بعد بچہ کی حفاظت کیونکر کی جائے۔ بچے کی پیدائش کے وقت کیا کیا سامان موجود ہونا چاہیے۔ زچہ کی تیمارداری کیونکر ہو۔ صحت کے دشمنوں مکھی، مچھر وغیرہ سے محفوظ رہنے کی کیا تدابیر ہیں۔ ایک کمرہ صرف عورتوں کے لئے مخصوص تھا جس میں مردوں کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس کمرہ میں عورتوں سے مخصوص اُن کے نفع کی باتیں میم صاحبہ عورتوں کو بتلاتی تھیں۔ اور جاہل دائیوں کے ہاتھوں جو نقصان اُٹھاتی ہیں اُن سے ان کو آگاہ کرتی تھیں۔

(۲) حمید اللہ لکچر روم میں مانٹیسوری، ڈالٹن اور کنڈر گارٹن طریقوں پر بچوں کو تعلیم دینے کا ساز و سامان اور کتابیں نقشے تصویریں اور کھلونے کثرت سے فراہم کئے گئے تھے۔ چار چار پانچ پانچ برس کے بہت سے بچے کمرہ میں واقعی تعلیم پا رہے تھے۔ ہر بچہ اپنی خوشی کے مطابق کام کرتا تھا۔ اور ان بچوں کو قوت مشاہدہ کو تیز کرنے، ان کی معلومات میں اضافہ کرنے اور ان کی قوت تخلیق اور ایجاد کو حرکت میں لانے کے لئے طرح طرح کے کھلونے اور آلات و سامان اُن کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ اس مبحث پر بہت سی مفید کتابیں بھی موجود تھیں۔

(۳) نظام میوزیم کے ایک حصہ میں طرح طرح کا قدیم و جدید کھیلنے کا سامان، آلات ورزش اور اسلحہ سجائے گئے تھے۔ قسم قسم کے ڈھال، تلوار، خنجر، برچھی بھری، گتگا، مگدر، ڈنڈا کشی، لیزم گیند بلے، گلی ڈنڈے، بنیٹی، ڈمبل، کلبس، ٹینس، ہاکی، کرکٹ اور فٹ بال کا سامان موجود تھا۔ اور اسکاؤٹنگ کے متعلق مفید کتابیں جمع تھیں۔

(۴) نظام میوزیم کے تیسرے حصہ میں تعلیم ریاضی کے بیشمار آلات فراہم تھے۔ ابتدائی تعلیم سے لیکر انتہائی تعلیم کا سامان اور کتابیں اسی کمرہ میں جمع تھیں، ریاضی علم ہیئت و فلکیات

اور طبیعات کے جن مسائل کے حل میں طلبار برسوں دماغ سوزی کیا کرتے ہیں۔ ان کو محض نظر سے سمجھانے کے لئے جو عجیب و غریب آلات ایجاد ہوئے ہیں وہ سب موجود تھے۔

(۵) پیک منزل کے دو وسیع ہالوں میں مختلف حصص ہندوستان کے طلبار کی کھینچی ہوئی رنگین و سادہ تصویریں نقشے اور قدرتی مناظر ہر زبان اور ہر قسم کی خوشخطی کی وصلیاں اور طلبار کے ہاتھ کا بنا ہوا طرح طرح کا چوبی سامان، ملکی مصنوعات از قسم پارچہ جات سوتی و ریشمی و سامان چوبی لوہے اور لکڑی کی اشیار اور لیتھو کی چھپائی کے نمونے آراستہ کئے گئے تھے۔ اسی کمرہ میں سب سے زیادہ قابل قدر بہت پرانے پرانے قلمی نسخے مذہب اور مطلا قرآن شریف اور حمائلیں اور دیگر کتابیں، شاہی فرمان، سندیں اور پروانے موجود تھے۔ اس نادر ذخیرہ میں قرآن شریف، احادیث اور شمائل نبویؐ صلعم کے متعلق ایسی ایسی قلمی کتابیں بھی شامل تھیں۔ جو شہنشاہ اورنگ زیب اور دیگر نامور بادشاہوں اور بیگمات کے مطالعہ میں رہ چکی تھیں۔ اور انکے ہاتھ کی لکھی ہوئی یادداشتیں ان کتابوں کے حاشیوں پر موجود ہیں۔ میر شاکر علی مرحوم خوشنویس و منصب دار حضور نظام کے ہاتھ کے لکھے ہوئے محیرالعقول کتبے بھی رکھے ہوئے تھے۔ یہ کتبے شیشہ پر یا ریشم پر خط غبار اور خط گلزار میں لکھے ہوئے ہیں۔ ایک فلسکیپ صفحہ پر تین سو صفحہ کی مکمل تاریخ انگلستان اردو میں مع تصاویر نہایت خوشخط نستعلیق لکھی ہوئی ہے۔ اسی طرح ایک آئینہ پر گلستاں کے دو باب نہایت خوشخط بشکل کھجور لکھے ہوئے ہیں اسی میں بعض مشاہیر متاخرین کے قلمی خطوط بھی نمایاں کئے گئے تھے۔ ہندوستان کے بعض موجودہ مصنفین اور مولفین نے اپنی تازہ تصانیف اور تالیف کے غیر مطبوعہ مسودات بھی بھیجے تھے۔ جن کو لوگوں نے نہایت دلچسپی سے دیکھا۔

(۶) تصدق رسول خاں لکچر روم میں تعلیم بالغان کے متعلق نہایت نادر اور کارآمد لٹریچر فراہم کیا گیا تھا۔ ان کتابوں میں بتلایا گیا ہے۔ کہ دیہاتیوں، مزدوروں، اور پیشہ وروں اور شہر میں رہنے والے بڑی عمر کے ناخواندہ لوگوں کو کس طرح تعلیم دی جائے۔ کہ وہ ملک اور سوسائٹی کے حق میں مفید ثابت ہوں۔ اور آرام کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں۔ اسی کمرہ میں

یونان، مصر، چین، فارس اور انگلستان کے قدیم تمدن اور رسوم کو ظاہر کرنے والی تصاویر آویزاں تھیں۔ نیز ہندوؤں اور مغلوں کی طرزِ معاشرت کے مرقعے بھی دکھلائے گئے تھے۔ ان تصاویر کی اہمیت کا اندازہ صرف ایک اس مثال سے ہوسکتا ہے کہ مصری معاشرت کے سلسلہ میں چند تصویریں یہ ظاہر کررہی تھیں۔ کہ قدیم مصریوں کا عقیدہ تھا کہ بعد مرگ روح کا وزن کیا جاتا ہے۔ اور معینہ وزن سے روح کے کم و بیش ہونے پر جزا و سزا کا انحصار تھا تین تصویروں میں ایک مردہ کی روح کا وزن ہونا اور اس متوقع معیار کے مطابق پورا اُترنا اور ہر مردہ کا بہشت میں پہنچنا سب بالتفصیل دکھایا گیا ہے۔ ان تصویروں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعد مرگ میزان سے کام پڑنے کا تخیل بہت پرانا ہے۔

(۷) آسمان منزل میں تاریخ اور جغرافیہ اور علم طبقات الارض کے متعلق بیشمار نقشے، خاکے نمونے اور کتابیں جمع تھیں۔ اس کمرہ میں پروفیسر ابرار حسین صاحب قادری بدایونی کے بنائے ہوئے پانی پت کی معرکہ آرائیوں کے ماڈل اور سانچی ٹوپ (بدھ کے زمانہ کا یادگار گنبد) اور ماسٹر محمد یاسین صاحب کے بنائے ہوئے مختلف براعظموں کے ماڈل نیز ستون اشوکہ کا ماڈل جس پر بزبان ہندی کتبے لکھے ہوئے تھے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر قاضی جلال الدین صاحب کے مرتب کئے ہوئے دس نقشے موسوم بہ نقشہ جات ارض القرآن قابل دید تھے۔ ان نقشوں میں طوفانِ نوحؑ سے لے کر حضرت رسولِ خدا صلعم کے زمانہ تک کے ان جملہ مقامات کو دکھایا گیا ہے۔ جہاں جہاں انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے یا جہاں جہاں انھوں نے تبلیغ کی۔ ان سب مقامات کو نمودار کیا گیا ہے۔ اور اقوام عاد و ثمود وغیرہ کے ملکوں کا پتہ بتلایا گیا ہے۔

(۸) برکت علی روم میں سقیم الجسم یعنی اندھوں، بہروں، گونگوں اور فاتر العقل لوگوں کی تعلیم و تربیت کا خاص سامان اور اس مبحث پر نہایت مفید کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ اور عملی طور پر اس تعلیم کا مشاہدہ کرانے کی غرض سے ایک نہایت ہوشیار نابینا استاد اور اس کے چند نابینا شاگرد کمرے میں موجود تھے۔ اس نابینا استاد کو عقل کا پتلا کہنا چاہئے۔ نہایت دلچسپ

طریقہ سے جملہ حاضرین کو اندھوں کے تعلیم دینے کا طریقہ سمجھادیا گیا۔ وہ لوہے کے ایک قلم سے ہاتھ سے بھی لکھتا تھا۔ اور ایک قسم کے ٹائپ رائٹر جیسے آلہ سے بھی کاغذ پر نقوش چھاپتا تھا۔ اس تحریر کی بنیاد صرف چھ اُبھرے ہوئے نقطے ہیں۔ ان نقطوں کی مختلف تعداد سے مختلف حروف بنتے ہیں۔ اور نابینا شاگرد انگلی سے ان ابھرے ہوئے نقطوں کو چھو کر بے تکلف اسطرح عبارت پڑھتے ہیں۔ جس طرح آنکھ والے لڑکے پڑھتے ہیں۔ اسی طرح اندھوں کی تفریح کے لئے خاص قسم کے تاش، گنجفے، شطرنج، چوسر وغیرہ بنے ہوئے ہیں اور مذکورہ بالا اُبھرے ہوئے نقطوں کی مدد سے اندھے یہ سب کھیل نہایت آسانی کے ساتھ کھیل سکتے ہیں۔ وقت پہچاننے کے لئے اندھوں کے واسطے خاص قسم کی گھڑیاں بھی بنی ہوتی ہیں جن کے ذریعہ سے وہ آسانی سے وقت پہچان لیتے ہیں۔

اسی کمرہ میں لڑکوں اور بچوں کے پڑھنے کے قابل نہایت عجیب وغریب کتابوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ موجود تھا۔ جن میں سے خود میں نے اور دیگر اصحاب نے بہت سی کتابوں کے پتے ان کے طلب کرنے کی غرض سے وہیں لکھ لئے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ اس قسم کی کتابیں ہنوز ہمارے ملک میں نہیں پہنچی ہیں۔ شیکسپیئر کے بہت پُرانے پُرانے نسخے موجود تھے۔ اور دیواروں پر انسانی چہروں کی بہت سی تصاویر آویزاں تھیں۔ جن میں مخارج حروف ادا کرنے کی ہیئت دکھلائی گئی ہے۔

(۹) کالج کے کمرہ بیالوجی میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے پروفیسر مسٹر شرما کی کھنچی ہوئی مختلف تاریخی اور صنعتی مناظر کی دلفریب تصاویر آویزاں تھیں۔ ان تصاویر میں روغنی تصویریں، واٹر کلر، چارکول، پنسل کا کام، برشس کا کام اور مجسموں کی شبیہہ۔ غرض فن مصوری کے جملہ اصناف کے نادر نادر نمونے دکھلائے تھے۔

(۱۰) محمود منزل میں کنڈر گارٹن کے گوناگوں سامان اور آلات، طرح طرح کے صنعتی کارخانوں کی مشینوں کے، ریلوے انجنوں کے موٹروں کے، جہازوں کے، ہوائی جہازوں کے، مختلف

قسم کے برقی پریسوں کے، پن چکیوں کے، ہوائی چکیوں کے ماڈل رکھے ہوئے تھے۔ نیز بذریعہ ماڈلوں کے آبشار اور پہاڑی مناظر بھی نہایت خوبصورتی کے ساتھ دکھلائے گئے تھے۔

نمائش میں جو کچھ آنکھوں نے دیکھا۔ اس کا صحیح اندازہ تحریر کے ذریعہ سے ہونا بہت دشوار ہے۔ اوپر جو کچھ عرض ہوا وہ محض مشتے از خروارے ایک جزوی خاکہ ہے۔ امید ہے کہ آئندہ نمائش کا سلسلہ جاری رہے گا۔ مگر نمائش میں مجموعی حیثیت پیدا کرنے کے بجائے اگر ہر سال اس کا کوئی خاص شعبہ تفصیلی معائنہ اور مطالعہ کے لئے منتخب کر لیا جایا کرے تو زیادہ مفید ہوگا۔

نمائش میں جس قدر سامان دیکھا۔ اس کا بڑا حصہ غالباً ایسا ہے کہ جو آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب انگلستان سے اپنے ہمراہ لائے ہیں۔ ایسا بھی مستعار سامان تھا۔ جس کے مالک درخواست ہونے پر قوم کی تعلیمی اغراض کا لحاظ کر کے کانفرنس یا یونیورسٹی کو ہمیشہ کے لئے یا ایک معینہ میعاد کے لئے دے سکتے ہیں۔ کاش اگر ایسا سامان مستقل طور پر کانفرنس یا یونیورسٹی کے کمروں میں رکھ دیا جائے اور اس کی مکمل فہرست شائع کر دی جائے تو نہ صرف یونیورسٹی کے ٹریننگ کالج کے طلبار اور دیگر زیر تعلیم نوجوانوں کو بلکہ دوسری یونیورسٹیوں کے طلبار کو بھی اس تعلیمی ذخیرہ سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہنے کا موقع ملے گا۔ اور اسی طرح رفتہ رفتہ علمی ریسرچ کا علیگڈھ مرکز بن جائے گا۔" (ماخوذ از رپورٹ کانفرنس ۱۹۲۳ء)

نمائش کی بابت ایک اور ماہر تعلیم بزرگ خان بہادر مولوی محمد بشیر الدین صاحب بانی اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ و اڈیٹر اخبار البشیر کے اظہار رائے پر ہم اس ضمن کو ختم کرتے ہیں:

"میں جس وقت کہ آل ایشیا ایجوکیشنل کانفرنس بنارس اور اس کی نمائش کو دیکھتا تھا تو میرے دل میں مرحوم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ تعلیمی مضامین پر لکچر دلانے کا خیال ہندوؤں کو بھی پیدا ہوا۔ لیکن صاحبزادہ صاحب مرحوم کو ۱۹۲۳ء میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا۔ جو لوگ واقعات کو غور سے دیکھنے کے عادی ہیں تسلیم کریں گے کہ ۱۹۲۳ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جو اجلاس علیگڈھ میں صاحبزادہ صاحب مرحوم کی حسن کوشش سے کیا

گیا تھا۔ اور ماہرین فن تعلیم نے اس میں جو لکچر دیے تھے وہ زیادہ عمدہ تھے"

(ماخوذ اخبار البشیر اٹاوہ۔ جنوری ۱۹۳۱ء)

آخر میں ہم کو صاحبزادہ صاحب کے خطبۂ صدارت کی بابت مختصراً کچھ عرض کرنا ہے۔ یہ فرض شروع ہی میں ادا کرنے کے بجائے ہم نے قصداً بلفحوائے "لقمۂ شیریں بدہن آخر" کے واسطے ملتوی رکھا۔

یہ خطبہ انگریزی اور اُردو دونوں میں شائع ہوا ہے۔ اُردو میں اسّی صفحات اور ریاسی عنوانات پر مشتمل ہے۔ یہ ایک معرکتہ الآرا تعلیمی دستاویز ہے جس میں قومی زندگی کے ہر پہلو مذہبی۔ سیاسی و معاشی پر ضروری بحث کی گئی ہے۔ قدرتی طور پر اس کا بڑا حصہ علی گڈھ تحریک کی ہر شاخ یعنی کالج، یونیورسٹی اور کانفرنس کے کارناموں پر ریویو ہے۔ اور باوجود محبّت اور عظمت کے خیالات کے جو بانی تحریک کی ذات اور صفات کے متعلق ان کے دل میں جاگزیں تھے۔ صاحبزادہ صاحب نے علی گڈھ تحریک کے تاریک پہلو کو بھی ظاہر کر دینے میں ذرا تامل نہیں کیا ہے اور انصاف اور اعتدال کے ساتھ ہر اچھے اور بُرے پہلو کو نمایاں کر دیا ہے۔ کہ جو اُن کی حق پسندی اور دیانت کا بیّن ثبوت ہے۔ اس سلسلہ میں صاحبزادہ صاحب کو بڑا قلق اس بات کا تھا کہ مسلمانوں نے یورپ کے تہذیب و ترقی کے ذخیرہ میں سے جس چیز کو زیادہ تر اختیار کیا ہے وہ انگریزی معاشرت و مسرفانہ طرز زندگی ہے۔ کہ جو اس ملک اور بالخصوص اسلامی تمدن اور روایات کے خلاف ہے۔ اور جس کا نتیجہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی مالی مشکلات اور پریشانی ہے اور جس کی وجہ سے وہ اپنا قومی فرض تو درکنار ذاتی ذمہ داریوں کو بھی پورا کرنے میں اکثر قاصر رہے ہیں۔ سادہ اسلامی زندگی اور کفایت شعاری جس کی سب سے زیادہ ضرورت ہندوستان کے مفلس مسلمانوں کو ہے۔ اس سے وہ کوسوں دور ہیں۔ اور اُنکو ابنائے وطن سے جو تعلیمی اور مالی حیثیت سے بدرجہا بہتر ہیں۔ سبق حاصل نہیں ہوا۔ اس خطبہ میں صاحبزادہ صاحب نے اپنے محبوب مسئلہ عبدیت اور نیابت الٰہی پر بھی اثر انگیز طریقہ سے بحث کی ہے۔

اور مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کو مسئلۂ مذکور سے بے تعلقی پر محمول کیا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ مذہبی روح و ولولہ جس کا اثر ان کی زندگی پر روز افزوں تھا۔ خطبہ کے اوراق میں اکثر جگہ جلوہ فرما ہے۔ ہم کو اعتراف ہے۔ کہ ہم اس خطبہ کے جملہ مضامین پر یہاں بوجہ عدم گنجائش بحث نہیں کر سکتے۔ اور صرف فہرست عنوانات نقل کرنے پر اس ضمن کو ختم کرتے ہیں۔ لیکن ناظرین کرام سے ہماری استدعا ہے۔ کہ وہ دفتر کانفرنس سے خطبہ کی کاپیاں حاصل کرکے اصل کو ملاحظہ فرمائیں۔ تو ان کو اندازہ ہوگا۔ کہ کس قدر جانکاہی سے قومی زندگی کے ہر پہلو پر مفید معلومات جمع کردی گئی ہیں۔ اور جن سے استفادہ اس وقت بھی ممکن ہے جیسا کہ تحریر خطبہ کے وقت۔

فہرست عنوانات :۔

شکریہ۔ تعلیم کی اہمیت۔ سرسید کی یاد۔ عام خدمات۔ تعلیمی خدمات۔ سیاسی خدمات۔ سرسید اور سوراج کا تخیل۔ مذہبی خدمات۔ سرسید کے مذہبی عقائد۔ ایک تریاق کی تلاش۔ سرسید کے نزدیک شعائر و مبادی اسلام کی اہمیت۔ سرسید کے نزدیک روح و جسم کا تعلق۔ رجعت قہقری۔ ایک مسلمان کا مقصد حیات۔ ایمان اور ارکان۔ اسوۂ حسنہ۔ عبدیت و نیابت الہی۔ انتخاب نائب اللہ کا اصل اصول۔ کتاب و حکمت۔ مسلمانوں کی علمی ترقیات۔ نئی بساط۔ تعلیمی پستی کا اثر اسلامی ممالک پر۔ ہمارے دماغی سرمایہ کا اتلاف۔ مغربیت کی ترویج۔ باہر جانے والے ہندوستانی طلبار۔ عام مسئلہ تعلیم۔ تعلیم انگلستان۔ اطفال کی تعلیم۔ عہد صبوت کی تعلیم۔ لندن کونٹی کونسل کا نظام۔ طبی معائنہ وغیرہ۔ مصارف۔ ثانوی تعلیم فرانس میں۔ یونیورسٹی کی تعلیم اور اس کی اہمیت۔ عہد رجولیت کی تعلیم۔ ہندوستان میں اس طریقۂ تعلیم کی ترویج۔ یہ طریقہ تعلیم اور مسلمان۔ قومی تعلیم اور ہندوستان۔ ہندوستان میں تعلیم اناث ناقص القوی بچوں کی تعلیم۔ ہندوستان میں قومی تعلیم۔ گورنمنٹ اور رعایا کے مابین تعلیمی اتحاد عمل اتحاد کا یقینی ذریعہ۔ ایک توضیح۔ علی گڈھ کی تحریک۔ مسلم یونیورسٹی کی غایت بنا۔ علی گڈھی

تحریک کا تاریک پہلو۔ شدھی اور سنگھٹن۔ کامیابی کی شرط اول۔ ہمارا سیاسی مستقبل۔ سوراج کا نتیجہ۔ خاتمہ۔

۱۹۲۳ء کی کانفرنس کے بعد ہی صاحبزادہ صاحب کا انتخاب وائس چانسلری پر ہو گیا تھا۔ اور وہ اس کام میں ہمہ تن منہمک ہو گئے تھے۔ بایں ہمہ وہ کوشش کر کے دسمبر ۱۹۲۴ء میں کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے واسطے بمبئی گئے اور دو ضروری ریزولیوشن خود پیش کر کے پاس کرائے۔ جو مسلمانوں میں اعلیٰ تجارتی تعلیم کی ترقی اور تجارت پیشہ حلقوں میں اعلیٰ خصائل اور عمدہ تعلیم کی ضرورت واشاعت پر مشتمل تھے۔ (ریزولیوشن نمبر ۳ و ۶ اجلاس مذکور)

اول الذکر میں کامیابی سے مسلمانوں کو ٹریڈ کمشنر (Trade Commissioner) اور ٹریڈ ایجنٹ کے عہدے ملنے میں آسانی متصور ہے اور آخر الذکر سے آزاد تجارت پیشہ مسلمانوں کو واقعی طور پر بڑے بڑے تاجر بننے کے موقعے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے یورپ کی موجودہ تجارتی تعلیم و ترقی کے حالات شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے اور ثابت کیا کہ مسلمانوں کو ان شعبوں میں داخل ہونے کی کس قدر شدید ضرورت ہے۔

دسمبر ۱۹۲۵ء میں علی گڈھ کی مشہور جبلی کے ساتھ کانفرنس کا اجلاس بھی علی گڈھ میں انھوں نے منعقد کرایا۔ اور نہ صرف اس آل انڈیا تعلیمی کانفرنس بلکہ اردو کانفرنس، مسلم تنظیم کانفرنس، مسلم راجپوت کانفرنس اور پریس کانفرنس کے اجلاس بھی علی گڈھ ہی میں ہوئے۔ مسلم لیگ کا اجلاس بھی اسی ہفتہ میں علی گڈھ میں ہوا۔ جس کے مسٹر جناح اول مرتبہ صدر ہوئے۔

پریس کانفرنس اس سے قبل بھی علی گڈھ میں مختصر پیمانہ پر ہوئی تھی۔ لیکن اس مرتبہ اس کا خاص اہتمام تھا۔ اس کے صدر خان بہادر مولوی محمد بشیر الدین صاحب ایڈیٹر اخبار البشیر اٹاوہ کا خطبۂ صدارت پُر مغز اور بہت سی عمدہ معلومات و مفید مشوروں پر مشتمل تھا۔ صاحبزادہ صاحب باوجود شدید مصروفیت و علالت کے جو جشن جوبلی کی وجہ سے ان کو لاحق تھے، اجلاسوں میں

شریک ہوکر ضروری مشورہ سے اجلاسوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ لیکن ہم کو اس امر واقعہ کا اظہار کرنا ہے کہ جبلی کی وجہ سے یہ سب کانفرنسیں ماند پڑ گئی تھیں اور وہ اپنی اہمیت اس درجہ محسوس نہ کرا سکیں جن کی وہ مستحق تھیں۔

۱۹۲۵ء کے بعد صاحبزادہ صاحب یونیورسٹی کی اہم مصروفیتوں کی وجہ سے ۲۷-۱۹۲۶ء کی کانفرنسوں کے کسی اجلاس میں شریک نہ ہو سکے۔ حتیٰ کہ شروع ۱۹۲۸ء میں وہ مرض الموت میں مبتلا ہو گئے۔

۱۹۲۳ء کی کانفرنس کی صدارت و تعلیمی نمائش کے علاوہ جن کے حالات اجمالاً گذشتہ صفحات میں درج ہوئے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب نے بزمانہ ممبری انڈیا کونسل پراونشل کانفرنسوں کے اجلاسوں میں شرکت کی۔ اور اپنے اثر و مشورہ سے جو کام انجام دئے ان کی ضروری تفصیل دَور دوم میں کر دی گئی ہے۔ اور اب اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اس باب کو ختم کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حاجی انوار احمد صاحب زبیری مرحوم (جن کا تعلق سفارت اور دفتر کانفرنس سے نہایت طویل و عمیق رہا ہے) کی محنت اور تکلیف کا اعتراف کیا جاوے جو انھوں نے صاحبزادہ صاحب کی خدمات کانفرنس کے حالات جمع کرنے میں اٹھائی۔ یہ نوٹ نہایت مبسوط اور تقریباً چار سو صفحات پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس باب کی تیاری میں ان سے بہت مدد لی گئی ہے اور اظہار تشکر کے ساتھ مرحوم کے واسطے دعائے مغفرت کی جاتی ہے۔

باب ششم

معاشرتی اور عام تعلیمی خدمات

باب چہارم اور پنجم میں علی الترتیب علی گڈھ کالج اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس باب میں ان خدمات کا تذکرہ ہوگا جو مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور علی گڈھ کالج کے علاوہ دوسری درسگاہوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ بھی دکھایا جائے گا کہ بنی نوع انسان کی ہمدردی کے کیا کیا کام صاحبزادہ صاحب نے انجام دیے۔

علی گڈھ میں قحط کے متعلق کام

۱۸۹۷ء میں ہندوستان پر طاعون اور قحط کی جو وبا نازل ہوئی تھی شہر علی گڈھ بھی اس سے مستثنیٰ نہ رہا۔ قحط کے متعلق صاحبزادہ صاحب نے علیگڈھ میں جو خدمات انجام دیں ان کا ذکر انھوں نے اپنے روزنامچہ میں اس طرح کیا ہے :-

"قحط کی سختی حد سے گذر گئی ہے۔ کثرت سے غریب مخلوق بھوکی مر رہی ہے۔ خصوصاً وہ جو شریف کہلاتے ہیں اور سب سے زیادہ واجب الرحم پردہ نشین مستورات ہیں۔ ایسی حالت میں سب خوش حال لوگوں کا فرض ہے کہ اس مرتی ہوئی مخلوق کی مدد کریں چنانچہ ایسی مدد کی میں نے فوراً تجویز پیش کی علیگڈھ کے وکلاء نے اس تجویز سے اتفاق کیا کہ قحط زدگان کی امداد کے واسطے جلد از جلد ایک کمیٹی بنائی چاہئے۔ اور سب متحد ہو کر یہ کام کریں۔ چنانچہ "لائل لائبریری" میں ہم نے جلسہ کیا اور سب جج صاحب کو جلسہ کا صدر بنایا۔ کمیٹی قائم کرنے کی مفصل تجویز میں نے پیش کی جس سے سب نے اتفاق کیا اور آئندہ اتوار کو ایک بڑا عام جلسہ کرنا قرار پایا تاکہ چندہ کی فہرست کھولی جائے اور امدادی کام فوراً شروع کر دیا جائے۔ اب میں طریق عمل کے قواعد مرتب کر رہا ہوں کہ عملی کام کس طریقہ سے ہونا چاہئے"۔

۱۱ر فروری کو یعنی دوسرے ہی دن صاحبزادہ صاحب نے ایک اور جلسہ کرکے وہ قواعد پیش کردئے جو قحط کی امدادی کمیٹی کے لئے انھوں نے بنائے تھے۔ وہ لکھتے ہیں "ہم ہندوستانیوں میں بڑی خامی یہ ہے کہ اتحادِ عمل نہیں جانتے لیکن میں حتّی المقدور کوشش کرتا ہوں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ شہر مختلف حلقوں میں تقسیم کیا جائے اور ہر حلقہ میں کم از کم دو سکریٹری مقرر ہوں اور امداد کا کام انھیں کے سپرد کیا جائے۔ ایک جنرل سکریٹری مقرر ہو۔ اس کے علاوہ چند وائس پریسیڈنٹ ہوں جہاں تک ممکن ہے میں یہی کوشش کروں گا کہ کام آسانی سے ہو۔ پیچیدگی اور دشواری نہ ہونے پائے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ روپیہ ہمیں کتنا ملتا ہے۔ شاید گورنمنٹ بھی کچھ مدد کرے۔ مگر ہم کو اپنے ذریعوں پر بھروسہ کرکے اپنے فرائض شہریوں کی طرح سے انجام دینے کی سعی کرنی چاہئے۔"

۱۴ر فروری کو اتوار کے دن بڑا مجوزہ جلسہ لائل لائبریری میں ہوا۔ ایک سو پچاس کے قریب معززین شہر شریک ہوئے۔ صاحبزادہ صاحب نے جلسہ کے مقاصد بیان کرکے قواعد پیش کئے۔ اس کے بعد کمیٹی کا انتخاب ہوا۔ ایک سکریٹری تو صاحبزادہ صاحب منتخب ہوئے اور دوسرے سکریٹری بابو طوطا رام صاحب (جو اُس زمانہ میں دیوانی کے نامور وکلا میں سے تھے) بنائے گئے۔ چندہ کی فہرست کھولی گئی علاوہ عطیات کے قریب دو سو روپیہ ماہوار کے چندہ کا وعدہ کیا گیا۔ اُس زمانہ میں ہندوستانی ایسی فراخدلی سے چندہ دینا نہ جانتے تھے جیسا کہ اب دیتے ہیں۔ بس اِسی قدر چندہ غنیمت خیال کیا گیا۔

قحط کے امدادی کام جاری ہوئے اور صاحبزادہ صاحب نے اس کام میں نہایت دلسوزی اور شاقہ محنت سے کام کیا۔ اور اس کام کو اپنا ذاتی کام سمجھ کر انجام دیا۔ جس طرح کالج اور کانفرنس کے کاموں میں دلچسپی لیتے تھے اُسی طرح قحط کے کام کو انھوں نے مخلوق خدا کی خدمت سمجھ کر انجام دیا۔ بعدہٗ صوبہ کی گورنمنٹ نے بھی اِن خدمات کا اعتراف کیا۔ سر انٹونی میکڈانل لفٹیننٹ گورنر نے ایک سرٹیفکٹ بھیجا اور

سرکاری گزٹ میں اُس کی اشاعت ہوئی۔

صاحبزادہ صاحب کا الٰہ آباد یونیورسٹی کا فیلو مقرر ہونا

صاحبزادہ صاحب کا علی گڈھ کالج کے ساتھ شغف روز بروز ترقی پذیر تھا اور عام تعلیمی اداروں سے ان کی دلچسپی بھی دن بدن بڑھتی جاتی تھی۔ چنانچہ بعض اسکولوں کے منتظمین اور تعلیمی اداروں کے مہتمم اکثر ان کو اپنے یہاں مدعو کرتے تھے۔ اور ان سے اپنے اسکولوں اور اداروں کا معائنہ کراتے تھے اور وہاں اس کام کے علاوہ عام تعلیم پر مفید لکچر دیا کرتے تھے۔

صاحبزادہ صاحب کی تعلیمی سرگرمیاں اسکولوں ہی تک محدود نہ تھیں۔ وہ اعلیٰ تعلیم کی ضرورت اور اس کے حصول کے ذرائع پر اکثر موقعوں پر پُر مغز اور ولولہ انگیز اسپیچیں دیتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۲ء کی کانفرنس دہلی میں جب لارڈ کرزن کی مقرر کردہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ پر معرکتہ الآرا مباحثہ شروع ہوا تو اس موقع پر صاحبزادہ صاحب نے کمیشن مذکور کی سفارشات بالخصوص قومی یونیورسٹیوں اور وظائف و فیس اگر وہ منظور کر لی گئیں تو وہ مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کی راہ میں نہایت شدید دشواریاں پیدا کر دیں گی۔ کانفرنس نے صاحبزادہ صاحب کی اس رائے سے پورا اتفاق کیا۔ غالباً اسی قسم کی تعلیمی سرگرمی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۰۳ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی نے صاحبزادہ صاحب کو فیلو مقرر کیا جس پر علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے اظہار پسندیدگی کیا۔ ناظرین کی دلچسپی کے لئے اس نوٹ کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ "ہمیں یہ خبر شائع کرنے سے نہایت خوشی ہے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بیرسٹر ایٹ لا علی گڈھ کو ہز آنر لفٹننٹ گورنر صوبہ متحدہ نے جو الٰہ آباد یونیورسٹی کے چانسلر ہیں الٰہ آباد یونیورسٹی کا فیلو مقرر کیا ہے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ایسے شخص ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اعزاز کے معنی ذمہ داری ہیں۔ جہاں علی گڈھ میں کسی کو اس سے تعجب نہ ہوگا جب کہ آفتاب احمد خاں اس نئے منصب کے متعلق بھی اسی عزم اور شدید مصروفیت سے کام کریں گے جس کے واسطے وہ مشہور ہیں۔ وہ کالج کے ٹرسٹی ہیں۔ پس آفتاب احمد خاں

کی عزت کرنے سے چانسلر خود منتظمان کالج کی عزت افزائی ہے۔"

یتیم خانہ آگرہ اور دیگر درسگاہوں کا معائنہ

صاحبزادہ صاحب کو مسلمانوں کی تعلیمی و معاشرتی اصلاح کے مسئلہ سے رفتہ رفتہ اس قدر دلچسپی بڑھ گئی کہ اُن کو درسگاہوں کے معائنہ کے لئے مختلف اداروں کے منتظمین دعوت دیتے اور ان سے مشورہ حاصل کر کے اس سے فائدہ اُٹھاتے۔ بعض موقعوں پر وہ بلا طلب بھی خود معائنہ کو جاتے تھے۔ چنانچہ ۸ نومبر ۱۹۰۵ء کو آگرہ پہنچ کر آپ نے وہاں کے یتیم خانہ کا اچانک معائنہ کیا۔

یہ یتیم خانہ مولوی عبدالحمید صاحب نے کھول رکھا تھا۔ صاحبزادہ صاحب نے یتیم خانہ نہایت خراب حالت میں پایا۔ بارہ ۱۲ بچے تھے۔ رہنے کا مکان نہایت خراب خوراک نہایت ناقص اور تعلیم و تربیت کا انتظام نہایت غیر قابل اطمینان تھا۔ اچانک معائنہ پر سب اصل حال ظاہر ہوگیا۔ صاحبزادہ صاحب نے مہتمم صاحب کو اس کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی اور اُنھیں بتلایا کہ خلوص اور دیانت سے کام کرنے پر کامیابی کا انحصار ہے۔

اُسی ماہ کے دوسرے ہفتہ میں صاحبزادہ صاحب نے اٹاوہ کا اسلامیہ اسکول دیکھا اور اطمینان کا اظہار کیا اور مولوی بشیرالدین صاحب بانی مدرسہ کو چند مشورے دیے۔ شام کو مدرسہ کے طلبار کو نہایت نصیحت آمیز لکچر دیا۔ اسی سال لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلمار اور کانپور میں مدرسہ الٰہیات کا معائنہ کیا۔

مدرسہ دیوبند میں دستاربندی کا جلسہ

۱۷، ۱۸، ۱۹ اپریل ۱۹۱۰ء کو دیوبند میں دستاربندی کا جلسہ تھا۔ صاحبزادہ صاحب بھی وہاں گئے اور دیوبند میں ۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۱۰ء کو قیام کیا۔ قریب پندرہ ہزار کے آدمی جمع تھے لیکن زیادہ تعداد سہارنپور، مظفرنگر اور میرٹھ کے دیہات کے مسلمانوں

کی تھی۔ علمار کا اپنے قدیم طریقہ کا سیدھا سادہ انتظام تھا۔ پہلے دن صبح کو دستار بندی
کے جملہ مراسم ادا کیئے گئے۔ سہ پہر کو مدرسہ کے چند طلبار نے عربی میں ایسی برجستہ تقریریں
کیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ عربی زبان پر اُن کو پورا عبور تھا۔ مولوی عبدالحق صاحب
حقی بغدادی نے جو علیگڈھ کالج سے دیوبند گئے تھے عربی میں تقریر کرنے والے طلبار
کی تعریف کی۔ صاحبزادہ صاحب نے بھی خواہش ظاہر کی کہ انھیں بھی تقریر کا موقع
دیا جائے۔ لیکن علمار نے اختلاف کیا اور تقریر کی اجازت نہ ملی۔ بالآخر دوسرے دن
شام کو تقریر کی اجازت مل گئی۔ صاحبزادہ صاحب نے پہلے تو اِس اجازت سے متعلق
نہایت مناسب موقع الفاظ میں علمار کا شکریہ ادا کیا اور پھر قدیم اور جدید تعلیم کے
طریقوں پر ایک بسیط تقریر کی۔ اس کے بعد علمار کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اگر دارالعلوم دیوبند
کے کچھ فارغ التحصیل طلبار علیگڈھ کو انگریزی اور سائنس کی تکمیل کے واسطے بھیجے جائیں
تو کالج کی طرف سے ہر ایسے طالب علم کو پچیس روپیہ ماہوار وظیفہ کی امداد دی جائے گی۔
اور جب وہ کالج کی تعلیم حاصل کر چکیں گے تو مسلم جماعت میں ایسے علمار پیدا ہونے
شروع ہوجائیں گے جن کی موجودہ زمانہ میں اشد ضرورت ہے۔ اُس وقت ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ صاحبزادہ صاحب کی یہ تجویز پسند کی گئی۔ لیکن بعد کو یہ معلوم ہوا کہ بعض
علماء نے یہ فرمایا کہ دیوبند کے فارغ التحصیل طلبار کو ایسی اجازت نہیں دی جاسکتی۔
خیر اُس وقت اگرچہ ایسی اجازت نہ دی گئی مگر بعد میں اس ضرورت کا احساس ہوا۔
چنانچہ ربع صدی گذر جانے پر الحاج مولانا محمد سلیم صاحب مرحوم مہتمم مدرسہ صولتیہ
مکہ معظمہ اپنے رسالہ ندائے حرم میں جو حال میں شائع ہوا ہے فرماتے ہیں۔

"ہماری موجودہ درسگاہیں دینی ہوں یا دنیوی اس قسم کے آدمی تیار کر رہی ہیں
جو زمانہ حال کی دینی یا دنیوی ضرورتوں کو مل کر پورا نہیں کر سکتے۔ جو خیال آج ہمارے
ذہن میں ہے پچیس سال پیشتر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کو اس ضرورت کا

احساس ہوا تھا۔ اپنے اس خیال کو لے کر وہ علیگڈھ سے دیوبند پہونچے۔ سچے درد اور پورے اخلاص کے ساتھ اُنھوں نے اِس تحریک کی ابتدار کی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے دین اور علیگڈھ کی دنیا کا سنگم ملادیں۔ صاحبزادہ صاحب مرحوم کا مقصد تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل طلبار مولوی ہونے کے بعد کچھ زمانہ کے لئے علیگڈھ رہیں اور کالج کے گریجویٹ مسٹر ہونے کے بعد تھوڑا سا زمانہ دیوبند میں گذاریں یہ انفرادی عزم مبارک عزم تھا۔ حسب عادت ملک کی بعض جماعتوں نے اس خیال کی تائید کی اور بعض نے حسبۃً للہ مخالفت شروع کردی۔ مگر اس تحریک کے شاندار نتائج پر کسی نے اطمینان سے غور کرنے کی زحمت برداشت نہ کی۔ اٰمَنُوْا ہیں تو سب کے آگے ہیں مگر عَمِلُوا الصَّالِحَات مشکل ہے''۔

مدرسہ الٰہیات کانپور کے سالانہ جلسہ کی صدارت

مدرسہ الٰہیات کانپور کا سالانہ جلسہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو ہونا قرار پایا تھا۔ مدرسہ کے ٹرسٹیوں نے صاحبزادہ صاحب کو جلسہ کا صدر بنانا تجویز کیا۔ اس انتخاب پر صاحبزادہ صاحب کو حیرت ہوئی۔ صدارت منظور کرنے میں بہت پس وپیش کیا۔ آخر چند اصحاب بالخصوص مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے اصرار سے انھوں نے صدارت قبول کرلی۔ اس جلسہ میں جہاں ملک کے بڑے بڑے علمار موجود تھے خطبۂ صدارت کا دینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لیکن صاحبزادہ صاحب کا یہ ایڈریس نہایت کامیاب ہوا اور خوب شائع کیا گیا۔ ایڈریس کا وہ حصہ خصوصًا نہایت پسندیدہ تھا جس میں قرآن مجید کے محاسن اور اُسوۂ آنحضرت (صلعم) اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذہبی اور تاریخی کارناموں سے مفصل بحث کی گئی تھی۔ حاضرین پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔ دو گھنٹہ سے زیادہ ایڈریس میں لگے اور جلسہ نہایت کامیاب ہوا۔

چونکہ مدرسۂ الٰہیات کانپور کی صدارت کا واقعہ صاحبزادہ صاحب کی زندگی کا

ایک کارنامہ ہے۔ اس لئے اُن کے خطبۂ صدارت کا نہایت ہی مختصر خلاصہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اِس ایڈریس میں خاص خاص باتیں جن پر نہایت عمدہ پیرایہ میں بحث کی گئی تھی حسب ذیل تھیں۔

(۱) قدیم تعلیم کے علماء اور جدید مغربی گروہ کے لوگوں میں اتحاد عمل کی اشد ضرورت پر بہت زیادہ زور دیا گیا تھا۔

(۲) اسلام کے خاص اصول۔

(الف) خالص توحید کے پانچ اصول۔

(ب) عبد اور معبود۔ عبدیت کا سب سے پہلے الحمد شریف میں واضح کردیا جانا۔

(س) انسان کا خلیفۃ اللہ ہونا۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط سے ثبوت۔ پھر "خلیفہ کی حیثیت سے فرائض انسانی" اِن امور کو صاحبزادہ صاحب نے آنحضرت صلعم اور خلفائے راشدین خصوصاً حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے عہد کی تاریخ اور اُن کے عمل و کارناموں سے نہایت وضاحت کے ساتھ ثابت کیا۔

(۳) علماء سے صاحبزادہ صاحب نے اپیل کی کہ مسلمانوں کی جماعت میں وہ اپنے اثر اور اقتدار سے جان ڈالیں اور روشنی پھیلائیں اور مسلمانوں کے ایماندار دلوں کی زمین میں ایسی بابرکت تخم ریزی فرمائیں کہ وہ اپنا پھل لائے۔ صاحبزادہ صاحب نے کہا کہ ایسی تخم ریزی کے مواقع علماء کو ہر روز پانچ دفعہ جماعت کی نمازیں ہفتہ میں جمعہ کی نماز کے بعد اور عیدین کے واجب دوگانہ میں سال میں دو بار ملتے رہتے ہیں۔

(۴) آخر میں صاحبزادہ صاحب نے کہا مجھے یقین ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ نہایت دیانت اور پورے عزم کے ساتھ یہ کوشش کی جائے کہ قدیم تعلیم کے علماء اور جدید مغربی تعلیم یافتگان کے درمیان اتحاد عمل پیدا کیا جائے۔

اس سلسلۂ صدارت میں ایک امر قابل تذکرہ ہے اور اس سے صاحبزادہ صاحب کی سادگی اور ظاہری طمطراق سے اور خودنمائی سے دور رہنے کا پتہ چلتا ہے۔ واقعہ اس طرح پر ہے کہ منتظمان جلسہ کی خواہش پر بذریعہ مراسلت یہ بات طے ہوچکی تھی کہ فلاں تاریخ اور وقت پر وہ کانپور پہنچیں گے۔ لیکن چونکہ صاحب زادہ صاحب کو استقبال اور جلوس کے طریقوں سے حتی الوسع اجتناب تھا اس لئے وہ وقت مقررہ سے پہلی ٹرین میں کانپور اسٹیشن پر پہنچ گئے اور وہاں سے کرایہ کی ایک گاڑی لے کر اپنے دوست حافظ محمد حلیم مشہور تاجر کے مکان پر پہنچ گئے۔ استقبال کرنے والی پارٹی کو وقت مقررہ پر صاحبزادہ صاحب کے ٹرین میں نہ ہونے سے حیرت و استعجاب اور افسوس ہوا۔ آخر کار جستجو کے بعد وہ لوگ حافظ صاحب کے مکان پر پہنچے اور نرم الفاظ میں شکایت کی کہ آپ نے ہم کو موقع نہ دیا۔ اس پر صاحبزادہ صاحب نے نرمی اور اخلاق کے ساتھ معذرت کی کہ میں نے یہ کارروائی قصداً کی ہے۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ قومی جلسوں کے موقع پر ایسی کارروائی نہ ہوا کرے۔ مندرجہ بالا واقعہ سے ہمارے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے کہ وہ بالطبع ان تمام ظاہری شان وشوکت کے سامانوں سے بہت دور تھے اور اُن کو جب موقع ملتا تھا تو وہ اسی قسم کی کارروائی کرتے تھے۔ چنانچہ کشمیر کے سفر میں بھی جب کہ اُن کو انجمن نصرت الاسلام نے خاص طور پر مدعو کیا تھا۔ جب وہ سری نگر پہنچے تو سیدھے ایک ہوٹل میں جاکر مقیم ہوگئے۔ کانپور کی طرح سری نگر کے اصحاب بھی شاکی ہوئے کہ آپ بلا ہم کو اطلاع دئے ہوئے یہاں تشریف لے آئے اور ہم کو موقع استقبال کا نہیں دیا۔ اس وقت بھی انھوں نے ویسی ہی معذرت کردی جیسی کہ کانپور میں کی تھی۔

ایک علمی سوسائٹی کی تجویز صاحبزادہ صاحب نے ایک نئی سوسائٹی کی تجویز کو کامیاب بنانے کے لئے ۲۳ نومبر ۱۹۱۰ء کو اپنے یہاں ایک دعوت پر شمس العلماء مولوی خلیل احمد صاحب مولوی محمد اسلم صاحب جیراجپوری

میر ولایت حسین صاحب، مولوی ادریس احمد صاحب، مولانا سید طفیل احمد صاحب کو مدعو کیا اور دعوت کے بعد یہ تجویز پیش کی "کہ ایک سوسائٹی قائم کی جائے جس میں لکھے ہوئے علمی اور تاریخی مضامین پڑھے جایا کریں۔ پہلا مضمون یہ تجویز کیا گیا" اسلام اور اسلام کی تعلیم کے ماتحت اصول پر مورخانہ نظر"۔

اس تجویز کے متعلق صاحبزادہ صاحب کالج کے عربی پروفیسر ڈاکٹر ہارویز سے پہلے گفتگو کر چکے تھے اور ڈاکٹر موصوف سے کہا تھا کہ وہ اسلام سے قبل کی تاریخ مختلف دوروں میں تقسیم کر دیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے تاریخ قبل از اسلام چار زمانوں یا دوروں میں اس طرح تقسیم کر دی۔

"دور اول" ابتدائے آفرینش سے موسیٰ علیہ السلام تک۔

"دوم"۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد اہل بابل کی جلا وطنی تک۔

"سوم"۔ اہل بابل کی جلا وطنی کے بعد سے حضرت مسیح علیہ السلام تک۔

"چہارم"۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تک۔

حاضرین جلسہ نے صاحب زادہ صاحب کی اس تجویز سے بھی اتفاق کیا کہ ڈاکٹر ہارویز سے خواہش کی جائے کہ دور اوّل کے متعلق سب سے پہلا مضمون وہی لکھیں۔ کیونکہ ایسے مضمون لکھنے کے سب سے زیادہ اہل وہی تھے۔

نوٹ۔ افسوس ہے کہ ہم کو کسی معتبر دستاویز کے ذریعہ اس سوسائٹی کی مزید کارروائی کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔

انجمن حمایت الاسلام کے جلسہ کی صدارت

اس جلسہ کی صدارت صاحبزادہ صاحب نے ۶ اپریل ۱۹۱۲ء کو کی۔ انجمن حمایت الاسلام لاہور کو پنجاب کی ایجوکیشنل کانفرنس بھی کہنا چاہیئے۔ صاحبزادہ صاحب کی تقریر ڈیڑھ گھنٹہ ہوئی جس میں باہمی اتحاد پر بہت زور دیا گیا تھا۔ پھر دوسرے امور سے بحث کرتے ہوئے صاحبزادہ صاحب نے کہا کہ قرآن مجید سمجھ کر اور اسوۂ رسولؐ کریم پیش نظر رکھ کر پڑھنا چاہیئے کیونکہ حضور نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا خود طرزِ عمل اور طریقِ معاشرت قرآن مجید کی اصل تفسیر ہے۔ اسکے بعد پنجاب کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلمانوں میں خصوصاً تعلیم دینے والوں میں ایثار کی کمی ہے۔ اکثر بڑی بڑی تنخواہیں ملنے پر بھی انھیں قناعت نہیں ہوتی اِسی وجہ سے مسلمان طلبا، دَورانِ تعلیم ہی سے نمائش اور اسراف کے عادی ہو جاتے ہیں اور اِس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے تعلیم دینے والوں کی شان اور طرزِ ماند و بود کی نقالی کرتے اور آخر میں ناکام اور برباد ہوتے ہیں۔ اِسی ضمن میں صاحبزادہ صاحب نے ہندو درسگاہوں کے پرنسپلوں اور پروفیسروں کی تنخواہوں اور اُن کے ایثار سے مسلم درسگاہوں کے اسٹاف کا موازنہ کیا اور ہندو درسگاہوں کے طلبار کی سادگی سے مسلمان طلبار کے کروفر کا مقابلہ کیا۔ اِس موقع پر موصوف کی تقریر کا کچھ اقتباس نذرِ ناظرین کیا جاتا ہے۔

"دیانند کالج لاہور میں آٹھ سو سے زیادہ طالب علم ہیں۔ سبھی قسم کی تعلیم اِس کالج میں دی جاتی ہے۔ یعنی آرٹس، سائنس انجینیری، گھوڑے کی سواری، تیراکی، کشتی رانی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حیرت کا مقام ہے کہ یہ سب کام ایک ہندو پرنسپل اور ہندو پروفیسروں کے زیرِ اہتمام نہایت کامیابی سے ہو رہے ہیں۔ علیگڈھ کالج کی کامیابی میں بڑا حصہ یوروپین اسٹاف کا ہے۔ خود آپ کے اسلامیہ کالج لاہور میں جب کام نہ چلا تو انگریز پرنسپل رکھنا پڑا۔ آخر وہ کیا چیز ہے جس کی قوت پر دیانند کالج اِس کامیابی سے کام کر رہا ہے اور کسی یوروپین پرنسپل یا پروفیسر کی وہاں ضرورت نہیں۔ جہاں تک میں نے غور کیا اس کا سبب صرف ایک ہے اور وہ ہندوؤں کا ایثار ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ کچھ عرصہ ہوا جب تک لالہ ہنسراج صاحب صرف پچاس روپئے ماہوار پر پرنسپل کے عہدہ کی ذمہ داریاں سالہا سال تک ادا کرتے رہے۔ اور اب کچھ دنوں سے جو صاحب پرنسپل ہیں وہ ہندوستان کی یونیورسٹی کے ایم اے اور کیمبرج یونیورسٹی کے بی۔ اے ہیں۔ لیکن باوجود اس قابلیت کے صرف پچھتر روپیہ ماہوار پر کالج کی خدمت کر رہے ہیں۔ دوسرے ایک اور پروفیسر ہیں جو بطور گورنمنٹ

اسکالر کے آج ولایت میں تعلیم پا رہے ہیں۔ لیکن انھوں نے معاہدہ کر لیا ہے کہ واپسی پر وہ بیس سال تک کالج کی خدمت صرف پچھتر روپیہ ماہوار پر کریں گے۔ میری قطعی رائے ہے کہ اس قدر ایثار بغیر خاص اخلاقی قوتوں کے نہیں ہو سکتا۔ اور جس میں ایثار ہو اس کو مشکل سے مشکل کام کا انتظام کر لینا کچھ دشوار نہیں۔ اسی ایثار کا یہ نتیجہ ہے کہ آج دیانند کالج لاہور کا سالانہ خرچ بہت کم ہے۔ کیونکہ قابل سے قابل استاد وہاں بہت کم تنخواہ پر مل جاتے ہیں۔ یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہوگی کہ لاہور کے گورنمنٹ کالج میں فی طالب علم تعلیم کا سالانہ خرچ ۲۸۳ روپئے ہے۔ آپ کے اسلامیہ کالج لاہور کا فی طالب علم سالانہ خرچ ۱۸۲ روپیہ ہے۔ لاہور کے مشن کالج کا فی طالب علم ۱۴۲ روپیہ سالانہ خرچ ہے۔ لیکن دیانند کالج میں جو ایک نہایت دولت مند قوم کا کالج ہے۔ فی طالب علم صرف ۱۴ روپیہ سالانہ خرچ ہے۔ چنانچہ اتنے بڑے کالج کا جس میں آٹھ سو سے زیادہ طالب علم ہیں سالانہ خرچ صرف بائیس ہزار روپیہ ہے۔ پس مسلمان اور ہندوؤں کے اخلاق اور ایثار کا اسی ایک واقعہ سے فرق معلوم ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم اپنے طرز معاشرت میں اصلاح کریں۔

پھر خاص کر مسلمانوں کے تعلیم یافتہ گروہ کو مخاطب کرتے ہوئے صاحبزادہ صاحب نے اُس تقلید پر پوری بحث کی جو یورپ کے فیشن اور طرز معاشرت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے مضر اور برباد کن نتیجے بتائے اور بزرگان اسلام کی سادہ زندگی و عظیم الشان کارناموں کی تاریخ سے نظیریں پیش کیں۔ اور واضح کیا کہ یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے اپنے خون اور پسینے سے اکناف عالم کی زمین سینچی اور اپنی ہڈیوں کی ان زمینوں میں کھاد دی جس سے اقبال اور اقتدار کے درخت اُگے اور شاداب ہوئے اور بعد کو آنے والے مسلمانوں نے صدیوں ان کے پھل کھائے پس یہی بڑی مثالیں ہیں اپنے سامنے رکھ کر نفس کو ہلاک کر دینا چاہیئے۔ ہمارا ایثار خالص ہو ہماری یہ غرض ہرگز نہ ہو کہ ہم جو کر رہے ہیں۔ اپنے واسطے

کر رہے ہیں۔ نہیں بلکہ آج جو کچھ ہم کریں وہ کل آنے والی مسلم نسل کے لئے کریں اور یہ
تب ہی ہوگا۔ کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی تعلیم پر چلیں جو ہم مسلموں کو
دی گئی ہے۔ اور وہ تعلیم ادائے فرض اتحاد و اخوت اور ایثار کی ہے۔ تقریر کے آخر میں
تعلیم یافتہ طبقہ کو یہ جتلا کر کہ وہ اپنا فرض پورا ادا نہیں کرتے۔ صاحبزادہ صاحب نے ادائے
فرض کے پہلو بھی واضح کر دیئے۔

مسوری کے سفر میں اندھوں کے اسکول کا معائنہ

راجپور میں جو مسوری کے قریب واقع ہے۔ ۲۹ مئی ۱۹۱۲ء کو صاحبزادہ صاحب نے اندھوں کا مدرسہ
دیکھا جو ایک انگریز لیڈی کی سرپرستی اور نگرانی میں جاری تھا۔ مدرسہ میں اندھے لڑکوں
اور لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا، ٹوکریاں بنانا، چٹائیاں بننا وغیرہ سکھایا جاتا ہے۔ مدرسہ کا مینجر
بھی نابینا تھا۔ یہ پہلے پوسٹ آفس کا ملازم تھا اور جب بینائی جاتی رہی تو اس مدرسہ میں
کام کرنے لگا۔ مدرسہ دیکھ کر صاحبزادہ صاحب پر بڑا اثر پڑا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر خدا نے
مدد فرمائی تو علیگڈھ میں۔ میں بھی ایک ایسا ہی اسکول قائم کروں گا۔ (یہ ارادہ صاحبزادہ
صاحب کا خدا نے پورا کیا۔ اور علیگڈھ میں اندھوں کا مدرسہ انھوں نے قائم کیا جس کا حال آئندہ
صفحات میں پیش کیا جائے گا۔)

اہل حدیث کانفرنس میں شرکت

اسی زمانہ میں علیگڈھ میں اہل حدیث کی کانفرنس ہوئی۔
صاحبزادہ صاحب اُس میں شریک ہوئے۔ ایک تقریر بھی
کی جس کا موضوع "ہمارا علم و عمل" تھا۔ اس تقریر میں صاحبزادہ صاحب نے مختلف
اسلامی فرقوں کے علماء کے باہمی اختلافات کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا اور اس کے
دور کرنے کی ضرورت بتائی۔ اس تقریر سے صاحبزادہ صاحب کا منشا یہ تھا کہ علماء میں
باہم اتحاد پیدا ہو۔ صاحبزادہ صاحب کی یہ تقریر علماء کے طبقہ میں پسند کی گئی۔

ندوۃ العلماء میں طلبہ کی اسٹرائک (ہڑتال)

۱۹۱۳ء و ۱۹۱۴ء میں مسلمانوں کی مشہور

عربی درسگاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء پر ایک نازک وقت گزر رہا تھا۔ طلبار دارالعلوم نے اسٹرائک کر دی تھی اور ندوۃ کے اراکین میں دو فریق ہو گئے تھے۔ ایک فریق طلبار کی طرفداری کر رہا تھا جسمیں مولانا شبلی نعمانی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد شامل تھے اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب جیسے مقتدر شخص بھی اُن کے ہمنوا ہو گئے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ نہ صرف اسٹرائک کے لئے بلکہ ندوۃ العلمار کے دیگر نقائص دور کرنے کے لئے ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھایا جائے اراکین ندوہ کی طرف سے طلبار سے کہا گیا تھا کہ وہ بلاکسی شرط کے اسٹرائک ختم کر کے مدرسہ میں آجائیں گے تب اُن کی شکایات پر توجہ کی جائے گی۔ اس کا طلبار کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا تھا کہ جب تک ایک غیر جانب دار کمیشن کا تقرر نہ ہوگا اُس وقت تک وہ دارالعلوم میں داخل نہ ہوں گے۔ مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد اِس اسٹرائک کو بجا ثابت کرنے کے لئے اُس کے اسباب یہ بتا رہے تھے کہ ناظم ندوۃ کی طرف سے بخاری شریف کا درس سننے کے لئے طلبار کو بعد مغرب دارالاقامہ سے باہر جانے کی ممانعت کی گئی اور مجلس میلاد میں طلبار کو تقریر کرنے اور بغیر منظوری پرنسپل کے نظم پڑھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ حالانکہ اسٹرائک کی ابتدا ایک طالب علم کے اخراج پر ہوئی تھی۔ جو اساتذہ اور پرنسپل کی گستاخی کرنے پر نکالا گیا تھا۔

مولانا شبلی نے تو اسٹرائک کے جواز کے فتوے میں یہاں تک لکھ دیا تھا کہ حقوق طلبی کی جو عام ہوا چل رہی ہے اس سے کسی درسگاہ کے طلبار کیسے بے اثر رہ سکتے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب نے حقوق طلبی اور طلبار کے اسٹرائک کا فرق اپنے مضامین میں دکھلایا تھا جو ۶ مئی ۱۹۱۴ء و ۲۰ مئی ۱۹۱۴ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئے تھے۔ آپ نے بتایا تھا کہ طلبار کی اسٹرائک اور سیاسی و تجارتی معاملات کی ہڑتال بالکل ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ۶ مئی ۱۹۱۴ء کے مضمون میں مولانا شبلی کو مخاطب کر کے جو فقرے انھوں نے لکھے تھے۔ ان کا اس موقع پر نقل کرنا خالی از دلچسپی

نہ ہوگا جو یہ ہیں :۔ "مولانا برائے خدا حقوق طلبی کے اصول کو تعلیم گاہوں سے متعلق نہ کریں ورنہ اگر اُن کے خیال کو صحیح مان لیا جائے تو گھروں میں رہنا دشوار ہو جائے گا۔ کیونکہ نوعمر بچے حقوق طلبی کے شوق میں استادوں کی پگڑی اُتارنے کے بعد باپوں سے کھانے کے متعلق، لباس کے متعلق، رہنے کے متعلق، بول چال کے متعلق حقوق طلبی کیا کرینگے۔ جس کا نتیجہ ساری سوسائٹی کے لئے تباہی اور خرابی ہوگا۔"

۲۰ رمئی ۱۹۱۴ء کے مضمون میں صاحبزادہ صاحب نے صاف طور پر اس بات کو ثابت کیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا شبلی دونوں اس بات کو جانتے تھے کہ اسٹرائک کا آغاز فی الواقع اس گستاخی سے ہوا جو کلاس میں ایک طالب علم نے نہ صرف دیگر اساتذہ کے ساتھ بلکہ پرنسپل دارالعلوم کے ساتھ بھی کی تھی۔ اور جب وہ اس خطا پر خارج کیا گیا تو دوسرے طلبار نے اس کی حمایت میں اسٹرائک کر دی۔ ان سب واقعات کے علم کے باوجود اِن اصحاب نے اراکین ندوۃ کے خلاف ایجی ٹیشن (شورش) جاری رکھا۔ جس سے طلبار کی ہمت افزائی ہوتی رہی۔ صاحب زادہ صاحب اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ صرف ندوہ ہی نہیں بلکہ دوسری اسلامی درسگاہوں کے حالات بھی اصلاح طلب ہیں اور ان کی اصلاح کی طرف قوم کو ضرور متوجہ ہونا چاہیئے۔ لیکن اِس طریقۂ اصلاح کو جو اسٹرائک کے سلسلہ میں چاہا جاتا تھا۔ بے جا اور بے محل سمجھتے تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ اس طریقے کے اختیار کرنے سے بجائے اصلاح کے تخریب ہوگی۔ دارالعلوم ندوہ جیسی درسگاہ کی ہمدردی کو مدنظر رکھ کر باوجود اس کے کہ وہ ندوۃ کی انتظامی جماعت کے رُکن نہ تھے انھیں میدان میں آنا پڑا اور وہ اظہار حق کے معاملہ میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب نہ ہوتے تھے اور اس طریقہ سے نہ صرف ندوۃ العلمار کو فائدہ پہونچایا بلکہ تعلیمی درسگاہوں کے اسٹرائک اور سیاسی اور تجارتی معاملات میں ہڑتال کے فرق کو نمایاں کرکے انھوں نے عام درسگاہوں کے

منتظمین کی مشکلات کو ایک حد تک دور کر دیا۔

۱۹۱۵ء میں انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں شرکت

یکم اپریل ۱۹۱۵ء کو صاحبزادہ صاحب علیگڈھ سے لاہور کو روانہ ہوئے جہاں انجمن حمایت الاسلام کا نہایت عظیم الشان جلسہ تھا۔ شام کو نواب سر ذوالفقار علی خاں، نواب فتح علی خاں، مولوی محبوب عالم، خان بشیر علی خاں۔ میاں فضل حسین، ڈاکٹر محمد اقبال اور جسٹس شاہ دین سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اور مشورہ ہوا۔ ۲ اپریل ۱۹۱۵ء کو انجمن کے جلسہ میں شرکت کی۔ صاحبزادہ صاحب کی تقریر کا موضوع تربیت و تعلیم تھا۔ یہ تقریر نہایت مدلل اور مؤثر تھی جو بہت سے اخباروں میں شائع ہوئی اور بڑے ذوق سے پڑھی گئی۔

علیگڈھ مسلم گرلس اسکول کے متعلق صاحبزادہ صاحب کا طرزِ عمل

ہرہائی نس بیگم صاحبہ (مرحومہ) بھوپال کو تعلیم سے جس قدر دلچسپی تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ بالخصوص تعلیم نسواں کی وہ سرگرم سرپرست تھیں اکتوبر ۱۹۱۵ء میں اُن کے پاس ایک گمنام خط پہنچا جس میں علی گڈھ مسلم گرلس اسکول کی جو اب مسلم یونیورسٹی کا ڈگری کالج ہے۔ شکایت کسی نے ہرہائی نس کو لکھ بھیجی تھی اس پر ہرہائی نس نے یہ حکم دیا کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے پاس اس خط کو بھیج کر معاملہ کی تحقیقات مخفی طور پر کرائی جائے۔ چنانچہ یہ خدمت صاحبزادہ صاحب نے نہایت رازدارانہ طریقہ سے انجام دی اور کسی پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ حضور عالیہ والیۂ بھوپال کی طرف سے کوئی تحقیقات اُن کے سپرد کی گئی ہے اور بجز اپنے روزنامچہ میں درج کر دینے کے کسی طرح اس واقعہ کا اظہار نہیں کیا اور اس طرح منتظمین کی وقعت کو قائم رکھا جس کی اسکول کے مفاد کے لحاظ سے ضرورت تھی۔ اپنی تحقیقات کی رپورٹ بصیغۂ راز بھوپال روانہ کی اور اس کا آخری نتیجہ بحق اسکول مفید ثابت ہوا۔

انگلستان کے تعلیمی اصول پر ہندوستان کے مسئلہ تعلیم کو حل کرنے کا خیال

صاحبزادہ صاحب ۱۹۱۸ء میں جب انڈیا کونسل کی ممبری کی وجہ سے انگلستان میں قیام پذیر تھے اس زمانہ میں بھی انڈیا کونسل کی مصروفیتوں کے باوجود انگلستان کے انتظام تعلیمات کو نہایت غور سے مطالعہ کرتے رہتے تھے جسکی صرف یہی وجہ تھی کہ مسئلہ تعلیم ان کا ایسا محبوب مشغلہ تھا۔ جس سے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی توجہ نہیں ہٹاتے تھے۔ مارچ ۱۹۱۸ء میں ہاؤس آف کامنس (دارالعوام) لندن میں مسٹر فشر نے انگلستان کی تعلیم کے متعلق جو مسودہ پیش کیا تھا۔ اس کا پورا منشار صاحبزادہ صاحب نے اپنے روزنامچہ میں درج کیا ہے۔ اور اس کے آخر میں اپنا ریمارک دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان کے اس ایجوکیشن بل کے متعلق روزنامچہ میں یادداشت لکھنے سے ان کا صرف یہ مطلب تھا۔ کہ انھیں اصولوں پر وہ ہندوستان کے تعلیمی مسئلہ کو حل کرنے کی سعی کریں گے۔

بچوں کی اطاعت کی تخئیل

بچوں کو اطاعت سکھانے کے متعلق صاحبزادہ صاحب کے خیالات کا پتہ ایک خط سے چلتا ہے جو یہ ہے :۔

"بچوں کو اطاعت سکھانے کا اب وہ زمانہ نہیں ہے۔ بلکہ حفظ مراتب ادب۔ یا اخلاق حسنہ کے نام سے مقصد قرار دے کر بچوں کی تربیت ہونی چاہئے۔ اطاعت سکھانا اور خودداری کا قائم کرنا۔ یا غلامی کی بو نہ پیدا ہونے دینا۔ آسان نہیں ہے۔ گذشتہ زمانہ میں بچوں کو جو اطاعت سکھائی جاتی تھی وہ انھیں خیالات اور اصول کے زیر اثر ہوتی تھی۔ جو "استبداد" اور حکومت میں رنگے ہوتے تھے اس لئے بجائے اطاعت کے "ادب سلیقہ اور حفظ مراتب کی تعلیم و تربیت ہونی چاہئے تاکہ اطاعت کے مفہوم میں غلامی کا جو عنصر ہے وہ باقی نہ رہے اور بچوں کو حفظ مراتب اور بزرگوں کے ادب کا احساس ہو اور اس پر عامل ہونے کی ان کو عادت ہو جائے۔

صاحبزادہ صاحب نے یہ نہایت باریک بات لکھی ہے۔ اس کی قیمت اور قدر وہی لوگ جان سکتے ہیں۔ جو فن تربیت کے ماہر ہیں۔ یعنی جب بچہ والدین یا استاد یا اتالیق کے شدید بیجا دباؤ سے ایسی اطاعت پر مجبور کردیا جاتا ہے کہ اس میں غلامی کی بو پیدا ہو جاتی ہے تو پہلی بات تو یہ ہوتی ہے کہ اس میں خودداری عزّت نفس اور جرأت اخلاقی باقی نہیں رہتی ہے اور یہی انسان کی بہترین صفات ہیں۔ دوسرے قاعدۂ قدرت کے موافق جلد وہ زمانہ آتا ہے کہ والدین یا اُستاد یا اتالیق اس بگڑے ہوئے غلام نما بچہ کے جو اَب جوان ہوچکتا ہے سر پر نگراں کو باقی نہیں رہتے۔ پس اب یہ جوان آزاد ہو کر عموماً سب سے بدتر آدمی ثابت ہوتا ہے۔

ولایت میں تعلیم پانے والے ہندوستانی طلبار کے لئے صاحبزادہ صاحب کی کوشش

ولایت میں تعلیم پانے والے ہندوستانی طلبار کے متعلق صاحبزادہ صاحب نے انگلستان میں رہ کر کیا کوششیں کیں اُس کے متعلق اُن کے بعض خطوط سے پتہ چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

(۱) عرصہ سے میں اِس خیال میں تھا کہ ہندوستان سے جو طلبار یہاں آتے ہیں۔ اُنکے لئے کچھ کیا جائے۔ چند ماہ سے میں یہاں رائے دے رہا تھا کہ اس کُل مسئلہ پر غور کرنے اور اس کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے کمیشن مقرر کیا جائے۔ یہاں کے لوگ میرے مخالف تھے لیکن شکر ہے کہ سکریٹری آف اسٹیٹ نے میرا ساتھ دیا اور یقین ہے کہ اب جلد ایک کمیٹی مقرر ہوگی جس کے لئے ہندوستان سے دو یا تین ہندوستانی ممبر بلائے جائیں گے۔ اُمید ہے کہ میں بھی اُس میں ہوں گا۔ میری کوشش یہ ہے کہ ہندوستان میں سوراج کے لئے اول ضرورت یہ ہے کہ گورنمنٹ کے مختلف صیغوں کی ذمہ داریاں انجام دینے کی قابلیت رکھنے والے ہندوستانی پیدا کئے جائیں۔ اُسکی شکل سب سے بہتر یہی ہے کہ ہندوستانی طلبار جو انگلستان میں ہیں اُن کو مختلف شعبوں

کے لئے تیاری کا موقع دیا جائے۔کیونکہ تیاری اور حصول قابلیت کے لئے اول ضرورت اعلیٰ نمونوں کی ہے اور مختلف شعبوں کے لئے جس قسم کے اعلیٰ نمونے یہاں موجود ہیں۔ ویسے ہندوستان میں نہیں ہیں۔غرضکہ میرا جو خیال ہے اس کے مطابق میں کوشش کررہا ہوں۔ کہ یہاں جو ہندوستانی طلبار ہیں اُن کے دلوں اور دماغوں میں قومی حیات اور عظمت اور کامیابی اور الوالعزمی کا وہ معیار قائم ہو جو انگلستان کے باشندوں کا ہے۔"

(ii) میں ہندوستانی طلبار کے مسئلہ کے متعلق سکریٹری آف اسٹیٹ پر زور دے رہا ہوں کہ اس کے حسب دلخواہ حل ہونے کے لئے کچھ انتظام کیا جائے۔چنانچہ اس کے متعلق ایک کمیٹی مقرر ہوئی ہے۔جس کا میں بھی ممبر ہوں۔یہ کمیٹی اوّل تو اس ملک میں تحقیقات کریگی اور اس کے بعد موسم سرما میں ہندوستان جائے گی اور وہاں اس کے متعلق تحقیقات کریگی جس کے لئے غالباً اکثر صوبجات میں دورہ کرنا ہوگا اس لئے مجھ کو بھی اس کے ساتھ سفر کرنا ہوگا۔"

مندرجہ بالا خطوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی طلبار کے متعلق یہ کمیٹی قائم ہونا صرف صاحبزادہ صاحب کی کوشش کا نتیجہ تھا۔یہ کمیٹی لیٹن ([illegible]) کمیٹی کے نام سے مشہور ہے۔ اپنی نوعیت اور نتائج کے لحاظ سے صاحبزادہ صاحب کا یہ کام بھی عظیم الشان ہے۔چونکہ اس تحقیقاتی کمیٹی کے صاحبزادہ صاحب بھی ممبر تھے اس لئے اب ان کو انگلستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے دیکھنے اور ماہرین تعلیمات سے ملنے اور گفتگو کرنے کا زریں موقع ہاتھ آیا۔انگلستان کے بڑے تعلیمی مرکزوں کے دورہ سے صاحبزادہ صاحب کی تعلیمی معلومات میں بہت بڑا اضافہ ہوا۔ انگلستان کے دورہ کے بعد صاحبزادہ صاحب کی اس تحقیقاتی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے انھوں نے ہندوستان کے کئی بڑے شہروں کا بھی دورہ کیا۔

جون ۱۹۲۱ء میں کمیٹی کا انگلستان میں دورہ شروع ہو چکا تھا۔کیمبرج کے دورہ کے بعد آکسفورڈ میں تحقیقات کے ضمن میں وائس چانسلر اور پروفیسروں کے اظہار قلمبند کئے گئے۔

آکسفورڈ سے کمیٹی نے فرصت حاصل کرکے برسٹل۔ برمنگھم۔ لورپول۔ لیڈس اور ایڈنبرا وغیرہ کا دورہ کیا اور وسط جولائی میں خاص لندن میں کام شروع ہوا۔ یہاں "سررشتۂ طلبا" کے افسروں کے اظہار لکھے گئے۔ اس سررشتہ کے ایک عرصہ تک آرنلڈ صاحب بھی سکریٹری رہے تھے لیکن ان کے زمانہ میں سررشتہ کا کام بہت ابتر تھا۔ صاحبزادہ صاحب نے لکھا ہے :۔

"کل آرنلڈ صاحب کی خود شہادت ہے۔ دیکھئے۔ جرح میں کیا حال ہو۔ کیونکہ ان کے زمانہ میں کام بہت ابتر رہا ہے۔ اُن میں انتظامی قوت نہیں ہے۔ کوئی شخص فرشتہ صفات کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر کار منصبی کے لئے موزوں نہ ہو تو اس کی اچھی صفات بھی مجروح اور مشتبہ ہوجاتی ہیں۔ آرنلڈ صاحب معاملہ فہم اور منتظم نہیں ہیں۔ ہندوستانی طلبا کو ان سے نقصان پہونچا۔ اِس دَورہ میں تعلیمی معاملات سے مجھے بہت زیادہ واقفیت حاصل ہوئی۔ انگریزوں کا ملک لائق لوگوں کی کان ہے۔ اب امپائر یونیورسیٹز کانگریس میں انڈیا آفس کی طرف سے مجھے جانا ہے۔ مجھ کو یہ اطلاع ملی ہے کہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کا نمائندہ بھی میں ہوں گا۔ گو خود مسلم یونیورسٹی کے اراکین نے مجھ کو کوئی اطلاع نہیں دی ہے۔ لیکن اس کانگریس کے جو مہتمم صاحبان یہاں ہیں۔ اُن کو ممالک متحدہ کی گورنمنٹ کی طرف سے یہ اطلاع دی گئی ہے کہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کا نمائندہ آفتاب احمد خاں ہوں گے۔ اگست میں یہاں تحقیقات کا کام ختم ہوجائے گا۔ اور میں ۲ ستمبر ۱۹۲۱ء کو کمیٹی کے کام کی غرض سے ہندوستان کو روانہ ہوجاؤں گا۔ اس ملک کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں کا بہت کچھ حال مجھ کو معلوم ہوگیا ہے۔ مردوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ عورتوں کی تعلیم کا یہاں اس قدر اہتمام ہے کہ اس کی حد نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں کے استاد نہایت ہی قابل ہیں۔ اور اس کام میں عورتیں بڑا نمایاں حصہ لے رہی ہیں۔ نہ صرف اسکولوں میں بلکہ کالجوں میں بھی عورتیں لکچراری اور معلمی کا کام انجام دیتی ہیں۔

برنارڈ ہومس یعنی ڈاکٹر برنارڈ کے اداروں کا معائنہ

چونکہ صاحبزادہ صاحب عزم کر چکے تھے کہ انڈیا کونسل کی میعاد ممبری ختم ہونے پر پھر کوئی دوسری خدمت سوائے ملکی اور قومی خدمت کے نہ کریں گے۔ اور ایسی خدمت تعلیم سے متعلق ہوگی۔ اس لئے اپنی انڈیا کونسل کی ممبری کے آخر زمانہ میں یعنی ۱۹۲۳ء میں جہاں تک اُن سے ممکن ہوا تعلیم کے ہر پہلو سے واقفیت حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ صاحبزادہ صاحب نے محسوس کیا کہ جہاں تک ممکن ہو تعلیم کے طریقہ اور یونیورسٹیوں کے انتظامات وغیرہ کے متعلق واقفیت حاصل کریں۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے انگلستان کے قیام میں ڈاکٹر برنارڈ (Bernard Homas) کے اداروں کو غور سے دیکھا جس کی نسبت وہ لکھتے ہیں :-

ڈاکٹر برنارڈ ہومس اِس ملک میں مشہور ہیں اور متعدد ہیں جن میں تقریباً ساڑھے سات ہزار لاوارث اور غیر مستطیع والدین کے بچّے رکھے جاتے ہیں۔ جن کو کھانا۔ کپڑا۔ تعلیم و تربیت مفت دی جاتی ہے۔ سالانہ خرچ سوا کروڑ روپئے کے قریب ہے جو سب چندہ سے ہوتا ہے۔

اس ادارہ کے تفصیلی حالات شرح و بسط کے ساتھ صاحبزادہ صاحب نے اپنے روزنامچہ میں درج کئے ہیں لیکن اس کتاب کے صفحات اس کے اعادہ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں کا معائنہ

صاحبزادہ صاحب نے یونیورسٹیوں کے متعلق صرف یادداشت ہی نہیں لکھی۔ بلکہ ان کے عملی کام دیکھنے کے لئے مئی ۱۹۲۳ء میں سفر کی زحمت برداشت کی۔ پیرس۔ ویانا میونک اور برلن کی یونیورسٹیوں کو دیکھا۔ انھوں نے اپنے روزنامچہ میں ان میں سے ہر یونیورسٹی کے معائنہ کی مفصل کیفیت لکھی ہے جو اس قابل ہے کہ اگر یونیورسٹیوں کے متعلق ان کی مذکورہ بالا یادداشت کو رسالہ کی صورت میں شائع کیا جائے تو اسی کے ساتھ ان چشم دید حالات کو بھی شامل کر دیا جائے۔ ان حالات کے پڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صاحبزادہ صاحب نے یورپ کے ان علمی اداروں کی عالیشان عمارتوں اور ان کے ساز و سامان ہی کو سرسری نظر سے

دیکھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہر شعبہ کا عمیق نظر سے مطالعہ کیا انھوں نے ان مشاہدات سے اپنے روزنامچہ میں جو نتیجہ نکالا ہے اُس میں صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ اس سے ان کی معلومات میں اضافہ اور خیالات میں وسعت ہوئی اور اس کے ساتھ انھیں اپنے ملک کی پست حالت کا یورپ کی علمی ترقی سے موازنہ کرنے کا موقع ملا۔ وہ نہایت حسرت کے ساتھ لکھتے ہیں :-

"اِس میں شک نہیں کہ سفر میں میری معلومات میں بہت کچھ اضافہ اور خیالات میں وسعت ہو رہی ہے۔ لیکن یورپ کے ملکوں کے ساز و سامان دیکھ کر حوصلہ پست ہوا جاتا ہے کیونکہ یہ ملک ہم سے اس قدر زیادہ بڑھے ہوئے ہیں اور ان کی تیاری اور انکے ساز و سامان کا پیمانہ اِس قدر مکمل اور وسیع ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا ملک اور ہماری قوم کس طرح اس منزل کو طے کرے گی اور کسقدر مدت اُس کے لئے درکار ہوگی۔ تعلیم ان ممالک میں ایسا عظیم الشان مضمون اور مسئلہ ہے۔ اس کے اس قدر پہلو ہیں۔ اور اس قدر اہتمام اور ساز و سامان مہیا ہیں کہ ان کے دیکھنے اور سمجھنے کے لئے ایک مدت چاہیئے۔"

لندن کی تعلیمی نمائش

اسی زمانہ میں جب کہ صاحبزادہ صاحب پیرس، برلن وغیرہ کے سفر سے لندن واپس آگئے تھے۔ ۲۵ رجون ۱۹۲۳ء کو لندن میں تعلیمی نمائش کا افتتاح ہوا۔ صاحبزادہ صاحب کا تقرر اِس نمائش میں شرکت کے لئے انڈیا آفس کے قائم مقام کے طور پر ہوا تھا اُن کے دل میں لندن کی اس شاہی نمائش کا پروگرام دیکھ کر حب وطن کی جوش کا دریا اُمنڈ آیا۔ انھوں نے ہندوستان کے مختلف صوبجات کے گورنروں اور وزرائے تعلیم کو لکھا کہ ہندوستان کے جو نمائندے اس نمائش کو دیکھنے کیلئے لندن آئیں۔ وہ پہلے اُن سے ملیں اور ان سے تبادلۂ خیال کے بعد اپنے اپنے صوبوں کی گورنمنٹوں کو رپورٹ دیں کہ ان کے صوبہ میں اس قسم کی نمائش کس پیمانہ پر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پنجاب۔ صوبہ متحدہ۔ مدراس وغیرہ کے نمائندے نمائش دیکھنے کے لئے لندن پہنچے ان کو صاحبزادہ صاحب نے اپنے ساتھ لے جا کر نمائش کے ہر شعبہ کا معائنہ کرایا
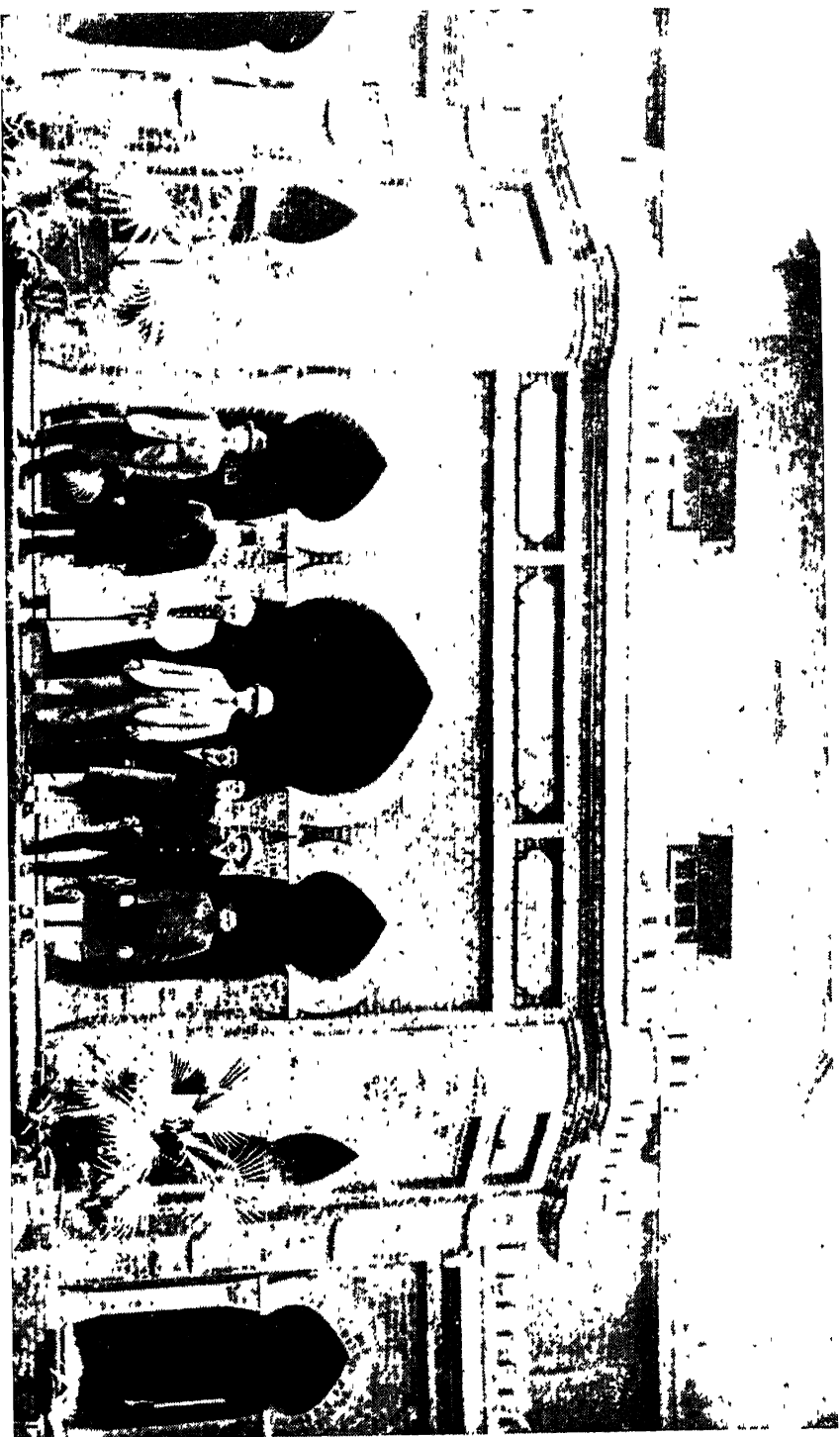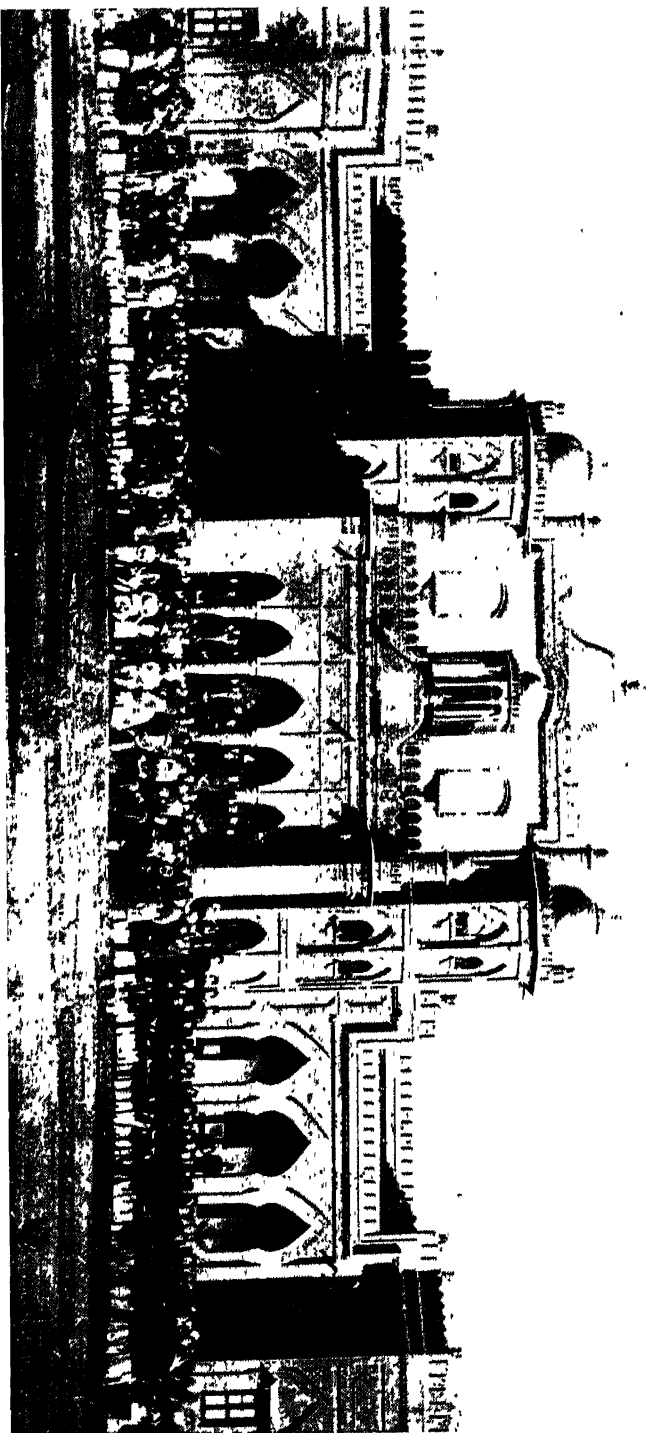
فوٹو گروپ بعد افتتاح مدرسہ احمدی نابینایاں سر ولیم میرس معہ ممبران کمیٹی وغیرہ ۲۷ نومبر ۱۹۲۶ء

SAHIBZADA AFTAB AHMAD KHAN

اور تعلیمی بورڈ کے افسروں کے ذریعہ سے یہ انتظام کرادیا کہ نمائش کی ہر چیز کے دیکھنے میں آسانی ہو۔ صاحبزادہ صاحب نے کتب خانوں۔ عجائب خانوں۔ تصویر خانوں۔ غرض کہ نمائش کے ہر شعبہ کو خود دیکھا۔ اور ہندوستان کے دوسرے قائم مقاموں کو دکھلایا اور وہ اُس نمائش کا اثر لے کر ہندوستان واپس آئے۔ ۱۹۲۳ء کے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے ساتھ علیگڈھ میں تعلیمی نمائش منعقد کی جو ہندوستان میں اپنی قسم کی پہلی نمائش تھی۔ اور جس کا مفصل ذکر کانفرنس کے باب میں کیا گیا ہے۔

احمدی اسکول نابینایاں علیگڈھ

صاحبزادہ صاحب کی مصروف و مفید زندگی کا سب سے آخری کام وہ مدرسہ ہے جو نابینا لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے لئے انھوں نے علیگڈھ میں صرف اپنے بڑے بھائی اور ہمشیرہ کی مالی مدد سے قائم کیا۔ یہ مدرسہ اب تک جاری ہے۔

اصل میں اس قسم کے مدرسہ کا خیال ان کے والد نواب غلام احمد خاں مرحوم کو ہوا تھا۔ جب ریاست گوالیار سے نواب صاحب مرحوم کی پنشن ہوگئی تو وہ اندھوں کی امداد کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوئے۔ انھوں نے مختلف مقامات کے دورے کئے اور اندھوں کے متعلق تحقیقات کی۔ ان کا منشا یہ تھا کہ نابیناؤں کی آنکھوں کی جانچ کی جائے جو قابل علاج ہوں ان کا علاج کیا جائے اور جو ناقابل علاج ہوں ان کی تعلیم کے لئے مدرسے کھولے جائیں اور اُن کو ایسے کام سکھائے جائیں جن سے وہ اپنی روزی پیدا کریں۔ چنانچہ نواب صاحب مرحوم نے یہ کام نہایت محنت اور توجہ سے شروع کیا اور یہ کوشش کی کہ شہروں میں کمیٹیاں قائم کی جائیں اور اندھوں کی ہر امکانی امداد کی جائے۔ پہلا اندھوں کا مدرسہ انھوں نے گوالیار میں کھولا۔ لیکن ۱۹۰۰ء میں نواب صاحب کا انتقال ہوگیا اور جو کام انھوں نے شروع کیا تھا وہ آگے نہ بڑھ سکا۔

نواب صاحب مغفور کے دونوں صاحبزادگان یعنی صاحبزادہ سلطان احمد خاں۔

اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو اپنے والد کی یہ ہمدردی اس قابل رحم و مجبور گروہ کے ساتھ کبھی فراموش نہ ہوئی۔ جب آفتاب احمد خاں انڈیا کونسل کے ممبر ہوئے تو اس دوران میں منجملہ دوسرے کاموں کے انھوں نے اندھوں کے متعلق ولایت میں ہر ممکن واقفیت حاصل کی ان کی تعلیم و تربیت کے کالج اور مدرسہ دیکھے۔ بورڈنگ ہاؤس دیکھے۔ خصوصیت کے ساتھ لندن کا مشہور مدرسہ رائل کالج اپریل ۱۹۲۰ء میں نہایت غور سے دیکھا اور اسی طرز پر وہ اپنے مدرسہ کو جاری کرنا چاہتے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں صاحبزادہ صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ اسی سال انھوں نے مجوزہ اندھوں کے مدرسہ کا عملی کام بھی شروع کردیا۔ ۱۴ر جون ۱۹۲۵ء کو انھوں نے ہندوستان کے مشہور طبیب حکیم عبدالوہاب صاحب انصاری المعروف بہ حکیم نابینا سے اس مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھوایا۔ مدرسہ کی عمارت نہایت شاندار بنائی۔ ماسٹروں کے رہنے کے مکان اور لڑکوں کے رہنے کا بورڈنگ ہاؤس۔ غرضکہ سب ضروری مکانات تعمیر کرا کے کام شروع کردیا۔

اس مدرسہ کا باضابطہ افتتاح ہز ایکسیلینسی سر ولیم میرس گورنر صوبجات متحدہ نے ۲۹ر نومبر ۱۹۲۷ء کو کیا۔ اس موقع پر جو ایڈریس ہز ایکسیلینسی کے سامنے پیش کیا گیا اُس میں انگلستان اور ہندوستان کی امداد اور تعلیم و تربیت کا شمار و اعداد سے مقابلہ کرکے دکھایا گیا ہے۔ کہ انگلستان اور ویلز کے بیالیس ہزار ایک سو چوالیس اندھوں پر وہاں چورانوے لاکھ ننانوے ہزار تین سو بیس روپیہ سالانہ خرچ کیا جاتا ہے جب کہ ہندوستان کے چار لاکھ اناسی ہزار چھ سو سینتیس اندھوں کی امداد کے مدرسوں کا صوبہ وار حسب ذیل حال ہے۔

نام صوبہ	صوبہ میں اندھوں کی تعداد	صوبہ میں اندھوں کے مدرسے
بنگال	۳۴۰۲۱۵	۱

صوبہ متحدہ	۱۰۶,۹۲۹	۰
مدراس	۳۷,۱۶۲	۱
بہار	۳۱,۰۹۲	۱ امدادی گورنمنٹ
بمبئی	۴۹,۷۰۶	۲ "
پنجاب	۶۵,۰۵۱	۱ "

ایڈریس میں ایسی تفصیل صرف اس لئے کی گئی تھی کہ ہندوستان کے اندھوں کی حالت زار گورنر صاحب کے اچھی طرح ذہن نشین کردی جائے۔ یہ دکھانے کے بعد ایڈریس میں لکھا تھا کہ نواب غلام احمد خاں کے ورثا نے اندھوں کے اس مدرسہ کے لئے زمین اور سب ضروری عمارتیں چالیس ہزار روپیہ کی لاگت سے مہیا کردی ہیں۔ اور آئندہ مصارف کے لئے کچھ وقف بھی کردیا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ گورنمنٹ بھی اس اشد ضروری کام میں مدد فرمائے گی۔ ہز اکسلینسی نے ایڈریس کا نہایت ہمت افزا جواب دے کر ایک خاص مدرسے جو اُن کے اختیار میں تھی پندرہ سو روپیہ دیا۔ اور گورنمنٹ کی طرف سے چھ ہزار روپیہ سالانہ کی امداد منظور فرمائی۔ اس موقع پہ نواب بہادر سر محمد مزمل اللہ خاں نے اپنے برادر حاجی محمد احمد سعید خاں صاحب مرحوم کی یادگار میں (جو آخر عمر میں بصارت سے محروم ہوگئے تھے) دس ہزار روپئے کے گرانقدر عطیہ کا اعلان فرمایا۔ جس میں سے پانچ ہزار اسی زمانے میں ادا کردیا تھا۔

صاحبزادہ صاحب نے جس اعلیٰ اور وسیع پیمانے پر اس اسکول کے قائم کرنے اور چلانے کا ارادہ و اہتمام کیا تھا۔ افسوس کہ ان کی طویل علالت و وفات کی وجہ سے اس درجہ پر نہ پہنچ سکا۔ تاہم موصوف کی بیگم صاحبہ و فرزندان کی مالی امداد اور خاں صاحب میر ولایت حسین کی توجہ اور محنت سے یہ مدرسہ چل رہا ہے۔

اس موقع پہ یہ ظاہر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ صاحبزادہ صاحب کے برادر معظم سر سلطان احمد

خاں صاحب مرحوم کو بھی اپنے والد مرحوم نواب غلام احمد خاں صاحب کے جذبۂ ہمدردی وخدمت نابینایاں سے کافی حصہ ملا تھا۔ جس کا آخری ظہور اِس واقعہ سے ہوتا ہے کہ سر سلطان احمد خاں نے اپنے وصیت نامہ میں ایک گراں قدر رقم مبلغ پچاس ہزار روپیہ کی اس غرض سے محفوظ کی ہے کہ خاص گوالیار میں جو مدرسہ نابینایاں اُن کے والد مرحوم نے قائم کیا تھا۔ اُس کی تکمیل میں یہ روپیہ صرف کیا جاوے۔ ؎

"اجرش دہد خدائے کہ دست یاوری
باآں کساں کہ یاور و ناصر نداشتند"

———·×·———

باب ہفتم

سیاسی خدمات

(سیاسی خدمات پر مولوی طفیل احمد صاحب مرحوم نے اصل مسودہ پر غائر نظر ڈالی ہے اور انڈیا کونسل کا پورا باب جناب مرحوم نے بہت کاوش سے مرتب کیا ہے)

سیاسی معلومات حاصل کرنے کی ابتدا

حب الوطنی کا جذبہ صاحبزادہ صاحب کی فطرت میں داخل تھا۔ اس لئے اپنے ملک کی سیاسی ترقی کی فکر ان کو زمانہ طالب علمی سے دامنگیر تھی۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی کی تعلیم کے زمانہ میں بیرسٹری کی تیاری کے ساتھ ساتھ سیاسیات کی کتابیں اور اخباروں کے مضامین غور سے مطالعہ کرتے تھے اور نہ صرف مطالعہ کرتے تھے بلکہ ان کے خلاصوں کو اپنی یادداشت میں لکھ لیتے تھے۔ وہاں کی تعلیم و تربیت اور آزاد آب وہوا نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے جذبہ خدمت وطن و قوم کو اس درجہ جلادی کہ وہ وہاں کے حالات کا مقابلہ اپنے بدقسمت ملک کے اس زمانہ کے حالات سے جب وہ کرتے تھے تو بے اختیار وہ انگریزی قوم کے اس طرز حکومت پر جو ہندوستان میں اپنی نفع کشی اور تجارتی فروغ کے لئے اختیار کیا تھا۔ اس پر زار و قطار روتے تھے اور اپنی بے بسی پر جو بوجہ طالب علمی اس وقت تھی بدرجہ غایت افسوس کرتے تھے۔ خود آئرلینڈ کے ساتھ انگریزوں کا برتاؤ جس کی تفصیل اس زمانہ میں آئرش ہوم رول بل کی پیشی کی وجہ سے اخبارات میں چھپتی تھی۔ صاحبزادہ صاحب کو اس نتیجہ پر لے گئی "کوئی حکمراں قوم کسی دوسری محکوم قوم سے اس وقت تک انصاف نہیں کرتی جب تک کہ خود محکوم قوم انصاف طلبی کی قوت اور صلاحیت اپنے اندر پیدا نہیں کرتی"۔ ہندوستان اور آئرلینڈ پر جو مباحثے دارالعوام (House of Commons) میں ہوتے تھے۔ ان کو آٹھ آٹھ نو نو گھنٹے بیٹھ کر وہ سنتے تھے اور پھر ان کے خلاصے اپنے

روزنامچہ میں درج کرتے تھے۔ اور ان سے وہ نتائج اخذ کرتے تھے جن کا اشارہ ہم نے اوپر کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اگر ان کے اس زمانہ کے روزنامچہ کے نوٹس ہی ایک علٰحدہ رسالہ کی شکل میں مرتب کر دئے جائیں تو وہ انگریزی سیاست اور ہندوستان کے مسئلہ پہ ایک مفصّل تبصرہ ہو جائے گا۔ اور نوجوان طلبہ کو صحیح سیاسی مسلک اختیار کرنے میں رہنمائی کرے گا۔

کانگریس کے متعلق سب سے پہلی رائے

صاحبزادہ صاحب نے سیاسیات اور اقتصادیات پر انگلستان کی تعلیم کے زمانہ میں جو غور خوض شروع کر دیا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ ہندوستان کے سیاسیات کے متعلق مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے صحیح رائے قائم کریں۔ ۲۷ر نومبر ۱۸۹۳ء کے روزنامچہ میں جو انگلستان کی سرزمین پر بیٹھ کر لکھا گیا تھا وہ اس طرح رقمطراز ہیں۔

" آج لندن کے اخبار ٹائمس میں میں نے پڑھا کہ لاہور کے مسلمانوں نے جلسہ کر کے یہ یہ ریزولیوشن پاس کیا کہ مسلمان نیشنل کانگریس سے قطعی علٰحدہ رہیں۔ کیونکہ مسلمان خیال کرتے ہیں کہ کانگریس مسلمانوں اور ملک کے مقاصد کے خلاف ہے۔ قیاس اور گمان غالب ہے کہ ایسا جلسہ سرسید احمد خاں کے مقلدین نے منعقد کیا ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ با اثر مسلمانوں نے ایسا رویّہ اختیار کیا ہے اور قومی تحریک اور اُسکے فوائد کی اصلیت ابھی تک محسوس نہیں کی۔ ایسی تحریک کے متعلق سرسید احمد خاں کی پالیسی واقعی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، کانگریس کے مطمح نظر کی بابت یہ لوگ غلطی پر ہیں۔ ایسی پالیسی اختیار کرنے سے کسی اور کو اتنا نقصان نہ پہنچے گا جتنا کہ خود مسلمانوں کو۔ کیونکہ وہ ابھی تک اپنی اصلی حالت یا اپنے مفید مطلب اغراض و مقاصد سمجھے ہی نہیں ہیں۔ پس مسلمانوں کو اگر کسی نفع کی اُمید ہو سکتی ہے تو اسی طریقہ سے ہو سکتی ہے کہ وہ ایمانداری اور پورے اعتماد کے ساتھ اپنے برادران وطن کے ساتھ شریک ہو جائیں اور اپنی بساط بھر اس دباؤ میں حصہ لیں جو گورنمنٹ پر اس غرض سے ڈالا جا رہا ہے کہ ہندوستانیوں کو ان کے

جائز حقوق دے دئے جائیں۔ گورنمنٹ کی نیت چاہے جس قدر بھی بہ خیر ہو لیکن جب تک کہ ہندو مسلمانوں کی باہم مخالفت رہے گی وہ کچھ نہیں کرے گی۔ چنانچہ اس معاملہ میں مجھ سے جہاں تک ہوسکے گا میں کوشش کروں گا۔"

اجلاس انڈین نیشنل کانگریس جو الہ آباد میں ۱۸۹۲ء میں منعقد ہوا تھا۔ اسکے حالات اخبار میں پڑھ کر صاحبزادہ صاحب نے اپنے روزنامچہ میں لکھا ہے :۔

"پریسیڈنٹ اور دوسرے لوگوں کی تقریروں اور ریزولیوشنوں کا لہجہ نرم اور معتدل تھا۔ یہی بات ہونی چاہئے۔ سب سے زیادہ فائق وہی لوگ ہوتے ہیں۔ جو اعتدال کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اور اُس کے ساتھ مستقل بھی ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے مصلحین کے معتدل دعاوی دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ ایسی حالت میں مجھے کانگریس سے قطعی ہمدردی ہے اگرچہ عملی طریقہ سے یہ سوال اُٹھانے کے لئے میں ابھی تیار نہیں ہوں۔ لیکن اصولاً میں کانگریس سے اتفاق کرتا ہوں۔"

۱۸۹۵ء کے آخر میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب انگلستان کی تعلیم ختم کرکے ہندوستان واپس ہوئے۔ پچھلے صفحات میں ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا۔ کہ انھوں نے علیگڈھ میں بیرسٹری شروع کی اور اس کام کے بعد جس قدر بھی اُن کو وقت ملتا تھا۔ تقریباً وہ سب علیگڈھ تحریک اور کالج کی نذر ہوتا تھا۔ نیز مقامی رفاہ عام کے کاموں کی طرف ان کی توجہ برابر مبذول رہی اور ۹۷۔۱۸۹۶ء میں جو سخت قحط پڑا۔ اس میں انھوں نے انسانی ہمدردی کے اس جذبہ کے جو ہمیشہ اُن کے دل میں جاگزیں رہا عملی ثبوت بدرجہ اتم پیش کیا۔ پھر ۱۸۹۸ء میں سرسید کے انتقال کے بعد نازک حالت نے ان کی پوری توجہ سرسید میموریل فنڈ کی طرف کھینچ لی اور وہ ہمہ تن اسی کام میں منہمک ہوگئے۔ ان وجوہ سے وہ ۱۹۰۳ء تک سیاسی کاموں میں کوئی نمایاں حصہ نہ لے سکے۔

۱۹۰۳ء میں مسلمانوں کی سیاسی تحریک کی تنظیم کا	محمڈن پولیٹکل آرگنائزیشن

کام نواب وقار الملک بہادر نے شروع کیا۔ اسی کا نام بعد کو مسلم لیگ ہوا۔ اس انجمن کے اراکین ہر ضلع سے بحیثیت قائم مقام ضلع منتخب ہوتے تھے۔

۲۶ر جولائی ۱۹۰۳ء کو ایک جلسہ علیگڈھ میں ہوا۔ صاحبزادہ صاحب اس جلسہ کے صدر تھے۔ اس موقع پر صاحبزادہ صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ چونکہ اب تک سیاسی تحریک میں جیسی کہ انڈین نیشنل کانگریس ہے مسلمان عموماً شریک نہ ہوتے تھے بلکہ وہ علیٰحدہ رکھے گئے تھے۔ مسلمانوں میں یہ خوف پیدا ہوگیا تھا کہ ہر سیاسی تحریک میں شریک ہونے سے گورنمنٹ ناراض ہوجاتی ہے۔ یہی خوف اپنی فصیح تقریر کے ذریعہ سے صاحبزادہ صاحب نے لوگوں کے دلوں سے دور کرنے کی کوشش کی اور ثابت کیا کہ ایسے پُرامن سیاسی جلسے گورنمنٹ کی بدخواہی نہیں ہیں بلکہ عین خیر خواہی ہیں۔ اس تقریر میں ہندو مسلمان کے باہمی اختلافات پر نہایت افسوس کا اظہار کرتے ہوئے دونوں قوموں میں باہمی اتفاق پر بہت زور دیا۔

مسلم لیگ کے سب سے پہلے اجلاس میں شرکت

دسمبر ۱۹۰۶ء کے آخری ہفتہ میں مسلمانوں کا اہم قومی اجتماع ڈھاکہ میں ہوا۔ جب کہ بالخصوص بنگال میں اور بالعموم تمام ہندوستان میں تقسیم بنگالہ کا شور برپا تھا۔ اس موقع پر اول آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا جس کا انتظام صاحبزادہ صاحب نے سب سے پہلی بار بحیثیت آنریری جوائنٹ سکریٹری کے کیا تھا۔ اس اجلاس کے بعد ۳۰ر دسمبر کو مسلم لیگ کا سب سے پہلا اجلاس زیر صدارت نواب وقار الملک بہادر منعقد ہوا۔ صاحبزادہ صاحب نے مقاصد مسلم لیگ کے رزولیوشن میں ترمیم پیش کرتے ہوئے ایک تقریر کی تھی اور اسی جلسہ میں وہ صوبہ متحدہ کی طرف سے منجملہ دیگر ممبران کے ایک ممبر بھی منتخب ہوئے تھے۔

جداگانہ انتخاب پر صاحبزادہ صاحب کے خیالات

۲۳ر مئی ۱۹۰۹ء کو علیگڈھ میں مسلم لیگ کا ایک جلسہ ہوا۔ جس میں یہ مسئلہ پیش تھا کہ مسلمانوں کو

جداگانہ حق انتخاب مانگنا چاہیئے یا نہیں۔ سر علی امام جداگانہ انتخاب کے خلاف تھے۔ لیکن صاحبزادہ صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا۔ کہ موجودہ حالت میں عارضی طور پر جداگانہ انتخاب رہے۔ جب مسلمان تعلیم میں ترقی کرکے اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کے قابل ہو جائیں تو پھر ان کو ہندؤوں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیئے۔ اس پر سر علی امام نے بھی اپنی رائے تبدیل کردی اور صاحبزادہ صاحب کی رائے کے موافق فیصلہ ہوا۔

صاحبزادہ صاحب اور صوبہ کی کونسل کی ممبری

۱۵ر نومبر ۱۹۰۹ء کو جدید ریفارم اسکیم کا گورنمنٹ گزٹ میں اعلان ہوا۔ ۱۹ر نومبر کو مسٹر (اب حاجی) ابوالحسن صاحب اسسٹنٹ سکریٹری علیگڑھ کالج اور صاحبزادہ صاحب کے ایک دوسرے دوست خان بہادر حبیب اللہ خاں صاحب ان سے ملنے آئے اور کونسل کی ممبری کے لئے کھڑے ہونے کو صاحبزادہ صاحب سے اصرار کیا۔ انھوں نے صاف انکار کردیا۔ جب دونوں صاحب نہ مانے تو صاحبزادہ صاحب نے فرمایا۔ کہ اگر آپ کا ایسا ہی اصرار ہے۔ تو احباب کا ایک جلسہ کیجئے میں اس کے سامنے اپنا جواب پیش کردوں گا لیکن اس پر بھی اصرار کیا گیا تو مجبوراً ان کو یہ کہنا پڑا کہ آپ لوگ پہلے نواب وقارالملک اور نواب محمد مزمل اللہ خاں بہادر سے مشورہ کرلیں اس کے بعد مجھ سے ممبری کے واسطے کھڑا ہونے کو کہیں دوسرے ہی دن خانبہادر نواب مزمل اللہ خاں صاحب اور نواب وقارالملک بہادر کے پیغامات پہونچے۔ کہ صاحبزادہ صاحب ممبری کے واسطے ضرور کھڑے ہوں۔ صاحبزادہ صاحب سے ملاقات ہونے پر نواب وقارالملک بہادر نے یہ کہا کہ اگر آپ کونسل کے ممبر ہو جائیں گے تو قوم کی بڑی خدمت کریں گے۔ اس منزل تک پہونچنے کے بعد دہلی میں چند اصحاب نے یہ طے کیا کہ خواجہ غلام الثقلین صاحب کے واسطے کوشش کی جائے۔ چنانچہ کھلا مقابلہ شروع ہو گیا۔ غرض کہ نومبر کے آخر ہفتہ سے لے کر وسط دسمبر تک مقابلہ جاری رہا۔ حلقۂ انتخاب میں بارہ اضلاع تھے۔ اصل میں

صاحبزادہ صاحب نے خود اس سلسلہ میں زیادہ کام نہ کیا۔ وہ صرف فتح گڈھ اور آگرہ گئے۔ یہ جبانا بھی ان کو نہایت ناگوار تھا اور اپنے لئے ووٹروں سے ووٹ مانگنا انھیں پسند نہ تھا۔ مگر صاحبزادہ صاحب کی طرف سے ہر ضلع میں ان کے لئے کوشش ہوتی رہی۔ ممبری کے تین امیدوار تھے یعنی خواجہ غلام الثقلین صاحب، نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب (دتاؤلی) اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب۔ انتخاب کا جب نتیجہ برآمد ہوا تو ہر ایک امیدوار کے حق میں حسب ذیل ووٹ آئے:-

خواجہ غلام الثقلین صاحب ۵۵ ووٹ

نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاؤلی ۱۳ ووٹ

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب ۱۷۵ "

بعد انتخاب صاحبزادہ صاحب نے ہمیشہ اپنے حلقۂ انتخاب کے مفاد پر نظر رکھی۔ اپنی تقریروں اور سوالات کے ذریعہ سے وہ پبلک کی خدمت کرتے رہے۔ اُس زمانہ میں کونسل کے اختیارات آج کل کی اسمبلی (Assemblies) کی طرح نہ تھے بلکہ نہایت محدود تھے اور ممبر سوال کرنے اور ریزولیوشن پیش کرنے اور بجٹ پر عام مباحثہ کرنے کے سوا اور کچھ نہ کرسکتے تھے۔ بجٹ پر کہ جس کے بغیر کوئی کام نہیں ہوسکتا ہے ممبران کو کوئی اختیار نامنظوری نہ تھا۔

بجٹ سیشن کے موقع پر ان کی تقریروں کی عام طور پر داد دی جاتی تھی۔ کونسل کے زمانہ میں ان کی نظر زیادہ تر اصلاح تعلیم پر رہی۔ بالخصوص مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ کو انھوں نے کبھی فراموش نہیں کیا۔

کونسل کے زمانہ میں ایک خاص واقعہ علی گڈھ کالج کے متعلق

بہ زمانہ ممبری کونسل صاحبزادہ صاحب کا سرجان ہیوٹ لفٹنٹ گورنر سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ یہ صورت حال زیادہ تر مسٹر آرچبولڈ اور

نواب وقارالملک کے اختلافات کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گورنمنٹ نے جرائم پیشہ قوم یعنی ہبوڑہ وغیرہ کی ایک نوآبادی قلعہ میں جو کالج کے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر ہے زیر سرپرستی مکتی فوج (Salvation Army) قائم کی۔ مقصد یہ بتایا گیا کہ علٰحدہ رکھ کر ان کی اصلاح کی جائے۔ کالج کی طرف سے ان کے قیام کی مخالفت ہوئی۔ مگر حکومت نے توجہ نہ کی۔ نتیجہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ اس زمانہ میں بعض اساتذہ اور اکثر طلبا ہوا خوری کے لئے شام کو قلعہ کی طرف جاتے تھے۔ یہ جرائم پیشہ کالج کے اطراف میں زراعت کو نقصان پہنچاتے اور طلبہ سے گستاخانہ پیش آتے تھے۔ انھیں حکومت کی سرپرستی کا گھمنڈ تھا۔ ایک دن شام کو طلبہ سے کچھ جھگڑا ہوا۔ دونوں طرف مبالغہ کے ساتھ خبریں پہنچیں کالج میں مشہور ہوا کہ چند طلبہ کو ہبوڑوں نے پکڑ لیا ہے۔ یہ سُن کر لڑکوں کا ایک بڑا مجمع ہاکی اسٹکس وغیرہ لے کر وہاں پہنچا۔ ادھر قلعہ کا یوروپین افسر پولیس کو اطلاع دینے چلا قریب تھا کہ دونوں میں مڈبھیڑ ہو جائے لیکن حسن اتفاق سے صاحبزادہ صاحب جو شام کو اس طرف چہل قدمی کے لئے جاتے تھے۔ موقع پر پہنچ کر حد فاصل بن گئے۔ اس یوروپین افسر کو سمجھا کر واپس کیا اور لڑکوں کا جوش بھی ٹھنڈا کیا۔ اور کالج آکر پرنسپل اور سکریٹری کو اس واقعہ کی اطلاع کر دی۔

کالج سے پھر ان لوگوں کے ہٹانے کی تحریک ہوئی۔ لیکن سر جان ہیوٹ اس پر رضامند نہ ہوئے۔ صاحبزادہ صاحب نے اس مسئلہ کو بطور سوال پیش کیا کیونکہ ممبروں کو اس سے زیادہ کوئی حق اس زمانہ میں نہ تھا۔ گورنمنٹ کی طرف سے جواب دیا گیا کہ کالج بلاوجہ ایک اصلاحی اسکیم کی مخالفت کر رہا ہے۔ اس وقت صاحبزادہ صاحب کو خاموش ہونا پڑا۔ لیکن جب بجٹ کے سلسلہ میں انھیں اپنے خیالات ظاہر کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے کھول کر حکومت کی اس ضد کی بابت بتایا کہ کسی تعلیمی مرکز کے قریب جرائم پیشہ مردوں اور عورتوں کو بسانا ایک اخلاقی جرم ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب کسی بستی میں طاعون آتا ہے تو طاعون زدہ لوگوں کو علٰحدہ ہٹادیا جاتا ہے۔ تاکہ دوسرے متاثر نہ ہوں اور یہ فطری حق حفاظت خود اختیاری کالج کو بھی ہے۔ موجودہ

صورت میں اس نوآبادی کے نتائج کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔ اس وقت یہ معاملہ بلاتصفیہ ختم ہو گیا لیکن سرجان کے صوبہ سے جانے کے بعد یہ لوگ قلعہ سے ہٹا کر دوسرے اضلاع میں بھیج دیے گئے۔

مسلم لیگ کا علیگڈھ سے ہٹایا جانا

ٹرسٹیاں کالج اور یوروپین اسٹاف کے باہم ۱۹۰۹ء میں اختلافات درپیش تھے۔ اور اس سلسلہ میں ۹ اگست ۱۹۰۹ء کو لکھنؤ میں ہزآنر سرجان ہیوٹ گورنر صوبہ متحدہ مُرّدتی کالج کے سامنے ایک وفد پیش ہوا تھا۔ اُسی جلسہ میں ہزآنر نے کہا تھا۔ کہ مسلم لیگ کا مرکز علیگڈھ سے ہٹا دیا جانا مناسب ہے۔ صاحبزادہ صاحب کا ماتھا اُسی وقت سے ٹھنکا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ اس کی تہ میں کیا راز پوشیدہ ہے۔ صاحبزادہ صاحب نے حتی المقدور کوشش کی کہ ایسا نہ ہو۔ لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی۔ جنوری ۱۹۱۰ء میں ہز ہائینس سرآغا خاں علیگڈھ آئے اور نواب وقارالملک سے ملکر یہ معاملہ طے کیا کہ مسلم لیگ کا مرکز علیگڈھ سے ہٹا دیا جائے۔ بالآخر ۲۹، ۳۰ جنوری ۱۹۱۰ء کو دہلی میں مسلم لیگ کا جلسہ ہوا جس میں باضابطہ طور پر لیگ کا مقام علیگڈھ سے لکھنؤ منتقل کیا جانا منظور کیا گیا۔ اور حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب (مرحوم) کی جگہ مولوی عزیز مرزا صاحب کو سکریٹری مقرر کیا گیا۔ اس واقعہ نے علیگڈھ کی سیاسی مرکزیت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔

ہندو مسلم اتحاد کانفرنس

صاحبزادہ صاحب یکم جنوری ۱۹۱۱ء کو الہ آباد کی "صلح کانفرنس" میں جو ہندو مسلم اتحاد کے متعلق منعقد ہوئی تھی شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کے صدر ہز ہائینس سرآغا خاں تھے۔ کانفرنس میں ہندو اور مسلم لیڈر موجود تھے۔ سر ولیم ویڈربرن نے جو انگلستان سے انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت کرنے آئے تھے۔ کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے اپنی تقریر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہم صلح پر بہت زور دیا۔ اس تقریر کے بعد ہز ہائینس سرآغا خاں نے تقریر کی۔ اُن کی تقریر

ختم ہونے پر پہلے ہندوؤں نے پھر مسلمانوں نے تقریریں کیں۔ مسلمانوں کی طرف سے صاحبزادہ صاحب نے تقریر کرتے ہوئے اُردو ہندی کے مسئلہ پر خاص طور سے زور دیا اور فرمایا۔ کہ جب تک ہندوستان کی مشترکہ زبان نہ ہوگی دونوں قوموں میں اتحاد ہونا مشکل ہے۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ باہمی صلح کے واسطے ایک بورڈ قائم کیا جائے۔ جس میں آٹھ ہندو اور آٹھ مسلمان ممبر ہوں۔ صاحبزادہ صاحب بھی اِس بورڈ کے ممبر بنائے گئے۔ لیکن اس بورڈ نے آئندہ کوئی عملی کام نہیں کیا۔ ممکن ہے کہ سر آغا خاں کی توجہ اس طرف نہ رہی ہو کیونکہ وہ ہی اس کے محرک اول تھے اور وہ ہی اپنے ساتھ بہت سے مسلمانوں کو لائے تھے۔

۱۹۱۲ء میں ایران اور ٹرکی کی سیاسیات

۱۹۱۲ء میں ایران اور ٹرکی کی حالت تشویش ناک تھی۔ اس لئے مسلمان عموماً حالت انتشار میں تھے۔ جنوری ۱۹۱۲ء میں بریلی سے مولوی عبدالودود صاحب اور حکیم خلیل اللہ خاں صاحب علیگڈھ آئے اور صاحبزادہ صاحب سے مشورہ چاہا۔ کہ مسلمانوں کو ان حالات میں کیا کرنا چاہئے۔ صاحبزادہ صاحب نے اِس معاملہ کے متعلق اپنی ذاتی رائے نہایت تفصیل کے ساتھ دونوں صاحبوں سے بیان کرکے مشورہ دیا۔ جس کی نوعیت کا اندازہ روزنامچہ کے حسب ذیل اقتباس سے ہوگا:-

"میرے رنج و غم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ تبریز میں روسی ایران کے فدائیوں کو بیدریغ قتل کر رہے ہیں۔ ان فدائیوں کی صرف یہ تقصیر ہے کہ وہ ایران کی آزادی برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اسی مقصد سے جنگ کر رہے ہیں۔ اس چرخ نیلوفری کی بھی عجیب گردش ہے۔ کہ اس صفت کی بدولت جو ایک قوم کی مایۂ ناز ہے ان محبان وطن کو یہ صلے مل رہے ہیں۔ اور وہ موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں۔ اسی کا نام دنیا اور انسانی تقدیر ہے۔ انگلستان کے ہیمپڈن اور کرامویل (Cromwell & Hampdan) نے خود اپنے بادشاہ کے خلاف انگلستان

کی آزادی کی خاطر جنگ کی تھی۔ اور اس جنگ سے کسی بیرونی حملہ آور کی مدافعت کا تعلق نہ تھا۔ آج تاریخ میں یہی ہیمپڈن اور یہی کرامویل ایسے محبان وطن شمار کیے جاتے ہیں۔ کہ ان کا نام لازوال ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے خلاف تبریز کے فدائیوں کی تقدیر دیکھیے۔ کہ روس جیسے ظالم اور ناخدا ترس بیرونی حملہ آور کی مدافعت میں وہ جنگ کر رہے ہیں۔ اور خدا ہی کو علم ہے کہ ان میں کتنے ہمپڈن اور کرامویل اپنے ملک ایران کی آزادی کی خاطر موت کے گھاٹ اتر گئے اور ان کا کوئی نام لیوا نہیں افسوس ہے کہ گورنمنٹ ایران کے جمود پر کہ وہ کچھ بھی ان فدائیوں کی مدد نہیں کرتی۔"

الہ آباد کی سیاسی کانفرنس میں شرکت

۳۰ مئی ۱۹۱۵ء کو الہ آباد میں ایک سیاسی کانفرنس منعقد ہوئی جس کا مقصد یہ تھا۔ کہ ہاؤس آف لارڈس کی اس کارروائی پر کہ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کو ایگزیکیٹو کونسل نہ دی جائے صدائے احتجاج بلند کی جائے۔ حالانکہ اس قسم کی کونسل قائم کرنے کی لفٹیننٹ گورنر سر جیمس میسٹن اور وائسرائے لارڈ ہارڈنگ اور لارڈ کریو وزیر ہند نے بھی سفارش کی تھی کہ اس کانفرنس میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے قائم مقام شریک تھے۔ کانفرنس کے صدر مہاراجہ صاحب محمود آباد تھے۔ منجملہ اڑتالیس اضلاع کے چوالیس ضلعوں سے قائم مقام آئے تھے۔ نہایت شاندار اور باوقعت جلسہ تھا۔ بڑے بڑے سربرآوردہ اور قابل لوگ موجود تھے۔ اس کانفرنس میں صاحبزادہ صاحب بھی شریک تھے اور ڈاکٹر ستیش چندر بنرجی جیسے علامہ کے پیش کردہ رزولیوشن کی تائید میں جو نہایت معرکۃ الآرا تقریر اس عظیم الشان جلسہ میں ہوئی وہ تقریر صاحبزادہ صاحب ہی کی تھی۔ آپ نے نہایت مدلل طریقہ سے ثابت کیا تھا کہ صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کو اس کونسل کی کیوں ضرورت ہے۔

پیرس کی صلح کانفرنس

صاحبزادہ صاحب کی سیاسی خدمات میں اُنکی شرکت پیرس کی صلح کانفرنس (Paris Peace Conference

میں جو ۱۹۱۹ء میں منعقد ہوئی ایک اہم واقعہ ہے۔ اس لئے ہم ان حالات کو ذرا تفصیل کے ساتھ ذیل میں بیان کرتے ہیں:۔

۱۹۱۹ء میں انڈیا کونسل کی ممبری کے زمانہ میں جب وہ انگلستان میں مقیم تھے تو وہ ٹرکی کی حمایت میں مسلسل کام کرتے رہے اور چونکہ اس وقت یورپ اور امریکہ کی عام رائے ٹرکی کے خلاف تھی۔ اور ٹرکی کی قسمت کا فیصلہ پیرس کی صلح کانفرنس میں ہونے والا تھا اس لئے صاحبزادہ صاحب نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی اور مسلمانوں کی طرف سے ایک وفد بھی گیا تھا جس میں خود صاحبزادہ صاحب، ہز ہائی نس سر آغا خاں، اور علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب شریک تھے اور ہندوستان کی طرف سے مہاراجہ بیکانیر بھیجے گئے تھے۔ اس کانفرنس میں صاحبزادہ صاحب نے جو تقریر کی اس کا خلاصہ ذیل میں درج ہے۔ انھوں نے پہلے امور ذیل پر زور دیا:۔

۱۔ سلطنت برطانیہ عظمیٰ میں ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان بہت بڑی عظیم الشان اہمیت رکھتے ہیں۔

۲۔ سلطنت کی دیگر رعایا کی طرح ہندوستان کے مسلمانوں نے جنگ عظیم میں اپنا خون بہایا اور ہر طریقہ سے ایسی عملی مدد دی کہ اتحادیوں کو فتح حاصل ہوئی۔

۳۔ صرف دوسرے محاذات ہی پر ہندوستان کے مسلمانوں نے دشمن سے جنگ نہیں کی بلکہ اپنے ہم مذہب مسلمان ترکوں سے بھی سخت مقابلے کئے اور چونکہ اتحادیوں نے آزادی اور انصاف کے نام سے یہ جنگ کی تھی۔ لہٰذا تمامی مذاہب اور اقوام کو مساوی حقوق مانگنے کا حق حاصل ہے۔

۴۔ جب ہندوستان کے مسلمانوں نے اس جنگ پنج سالہ میں ہر ایک قسم کی سختی اور تکلیف برداشت کی اور فتح حاصل کی ہے تو ٹرکی کے متعلق فاتحین کے آئندہ فیصلہ سے ان کا قدرتی تعلق ہونا حق بجانب ہے۔

۵- رہی یہ افواہ کہ ترک قسطنطنیہ سے خارج کر دئے جائیں گے یا ایشیائے کوچک کے ٹکڑے کر کے فرانس۔ اٹلی اور یونان کے حوالے کر دئے جائیں گے۔ اور شام، فلسطین، عراق پر غیر مسلم حاکم حکومت کریں گے۔ تو اس کے متعلق صاحبزادہ صاحب نے کہا کہ قسطنطنیہ ایشیائے کوچک اور تھریس کے متعلق دول کو انھیں اصول پر کاربند رہنا چاہئے۔ جن کا پریسیڈنٹ ولسن اور برطانیہ کے وزیر اعظم نے خاص کر ٹرکی سلطنت کے متعلق اعلان کیا ہے۔ صلح کانفرنس نے اب تک جو فیصلہ کیا ہے اُس سے صاف ظاہر ہے کہ شکست خوردہ ممالک کا قومیت کے اصول پر فیصلہ کیا جائے گا۔ پس یہی اصول اور طریق کار ٹرکی کے ساتھ بھی ملحوظ رکھا جائے۔ ٹرکی سلطنت میں تمامی صوبجات اور ممالک کے درمیان زیادہ کثرت سے ترک قوم آباد ہے۔ اس لئے صلح کانفرنس کے فیصلہ کا اثر خلیفہ یعنی سلطان ٹرکی کی سلطنت پر نہ ہوگا۔ بلکہ ترک قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ پس اگر ٹرکی کے ایسے ٹکڑے کئے گئے اور ترک قوم غیروں کی محکوم بنائی گئی تو محض اس وجہ سے کہ ٹرکی ایک اسلامی سلطنت ہے۔ ہندوستان کے مسلمان بہت ناراض ہوں گے اور نہ صرف ہندوستان کے مسلمان ناراض ہوں گے بلکہ کل عالم اسلام میں تلخ خیالات پیدا ہو جائیں گے۔ دوسری زبردست بات صاحبزادہ صاحب نے اس سلسلہ میں یہ کہی کہ جب قسطنطنیہ ٹرکی سے خالی کرایا جاتا ہے تو پھر کوئی منصفانہ یا جائز وجہ باقی نہیں رہتی کہ جرمن، آسٹریا اور بلگریا سے اُنکے دارالحکومت خالی نہ کرائے جائیں۔ پس مناسب اور قرین مصلحت یہی ہے کہ ٹرکی بہ حال خود قائم رکھا جائے اور رفتہ رفتہ اس کو مجلس اقوام میں بھی جگہ دی جائے۔ عراق اور عرب، شام اور فلسطین پر بھی اسلامی فرمانروائی رہے۔ اور ہم ہندوستان کے مسلمانوں کی یہی خواہش ہے۔ صاحبزادہ صاحب نے اس فقرہ پر بہت زور دیا کہ ہندوستان اور کل دنیائے اسلام کے مسلمان نہایت غور سے دیکھ رہے ہیں اور نہایت بےچینی کے ساتھ منتظر ہیں کہ حسب وعدہ یہ صلح کانفرنس ٹرکی کے معاملہ میں کیا فیصلہ کرتی ہے۔"

انھوں نے دیگر ممالک کے آئندہ انتظام کے متعلق جو ابتک ٹرکی کے تحت میں تھے۔
حسب ذیل امور پر صلح کانفرنس کو توجہ دلائی:۔
(۱) ان صوبجات یا ممالک پر واقعی اصل اسلامی حکومت ہو برائے نام حکومت ہرگز نہ ہو۔
(۲) جنگ کی وجہ سے ان ممالک کی اقتصادی ترقی کی راہ بند ہوگئی ہے اس لئے ایسے سامان مہیا کئے جائیں جن سے ترقی کا راستہ کھلے۔ خوشحالی کے قدرتی وسائل کی حفاظت کی جائے اور ان قدرتی وسائل پر کسی غیر ملکی کا قبضہ نہ ہونے پائے۔
(۳) اخلاقی اور ذہنی ترقی کے واسطے ہر قسم کی جدید تعلیم کا سامان مہیا ہو
(۴) ان ممالک کی ترقی و خوشحالی کو معائنہ کرنے کے لئے جو کمیٹیاں یا کمیشن مجلس اقوام وقتاً فوقتاً مقرر کرے انکے اراکین میں ان ممالک کے قائم مقاموں کو کافی تعداد میں ہمیشہ شریک کرنا چاہئے تاکہ رفتہ رفتہ یہ ممالک بھی مجلس اقوام میں جگہ پائیں۔

آخر میں صاحبزادہ صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ انھیں امور کا لحاظ رکھتے ہوئے تمامی مسلمانان عالم یہ فیصلہ پرکھیں گے۔ جو ٹرکی کے متعلق یہ صلح کانفرنس صادر کرے گی۔ اور ٹرکی کے ہی فیصلہ پر ہندوستان کے مسلمانوں اور گورنمنٹ برطانیہ کے تعلقات کا انحصار ہے اور یہی حال باقی دنیائے اسلام کا ہے۔ لہذا ایسے اسباب ہرگز نہ پیدا ہونے دیئے جائیں۔ کہ کل عالم اسلام میں بے چینی پیدا ہو اور نتیجہ خطرناک نکلے۔

مختصر یہ ہے کہ اس تقریر میں صاحبزادہ صاحب نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اس کتاب میں پوری تقریر شامل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ صرف اس کا خلاصہ دینے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ جس سے ان کی قابلیت اور قومی ہمدردی اور اخلاقی جرأت کا پتہ چلتا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی یا عالم اسلام کے دوسرے مسلمانوں کی ناراضگی کی صاحبزادہ صاحب نے اپنی تقریر میں کوئی جھوٹی دھمکی نہ دی تھی بلکہ ان کی نگاہ دوربیں نے دیکھ لیا تھا کہ اگر ٹرکی کے ساتھ ضرورت سے زیادہ سختی کی جائے گی تو عام مسلمانوں میں شدید

بے چینی پیدا ہو جائے گی جس کے اثرات گورنمنٹ کے حق میں اچھے نہ ہوں گے۔ چنانچہ جب ٹرکی کے ساتھ نرمی کا برتاؤ نہ کیا گیا تو نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہندوستان میں تحریک خلافت کا آغاز ہوا۔ ہندو بھی اس تحریک میں مسلمانوں کے ہمنوا ہو گئے۔ اور دونوں کے اتحاد سے گورنمنٹ کو تشویش کا سامنا کرنا پڑا۔

ٹرکی کے متعلق ایک اور اہم خدمت

(۱) جنگ عظیم کے بعد جو افتاد ٹرکی پر پڑی اس کا صاحبزادہ صاحب کو گہرا احساس تھا۔ اس کا پتہ اس واقعہ سے چلتا ہے کہ ٹرکی کے متعلق ۱۹۲۱ء میں جو اپیل لیگ آف نیشن LEAGUE oF NATIONS (مجلس اقوام) کے سامنے پیش کی گئی۔ اُس کا مسودہ صاحبزادہ صاحب ہی نے مرتب کیا تھا اور اس کی نسبت انھوں نے اپنے ایک دوست کو ولایت سے لکھا تھا۔

"وہ اپیل مفصل پمفلٹ کی شکل میں طبع ہوئی۔ اور اس کا خلاصہ انگریزوں اور ہم سب کے دستخطوں سے طبع ہوا۔ مجھ کو صرف اپنے نام سے طبع کرانے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور نہ ہے لیکن مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے کر رہا ہوں۔ وہ بیشک اوّلاً ٹرکی اور مسلمانوں کے نفع کے لئے ہے۔ لیکن ایک طرح سے خود برٹش گورنمنٹ کے لئے از بس مفید ہے۔ کیونکہ ٹرکی کے معاملہ میں انگلستان کے وزراء نے ایسی نازیبا کارروائیاں کی ہیں کہ ان کے سبب سے اپنی عظیم الشان سلطنت کے اعتماد اور وقار کو دنیا کی نگاہ میں سخت صدمہ پہونچا ہے جس کا نتیجہ اس ملک کی آئندہ نسلوں کو معلوم ہوگا پس اس معاملہ کی اصلاح کے لئے جو کوشش کی جا رہی ہے وہ محض ٹرکی کے لئے نہیں بلکہ خود برٹش امپائر کے لئے ضروری ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ جو کچھ مفید اصلاح ٹرکی کے صلح نامہ میں ہوگی وہ محض اس وجہ سے ہوگی کہ مصطفےٰ کمال پاشا کو یونان کے مقابلہ میں کامیابی ہوئی ہے اور انگلستان کے وزراء کو یقین ہو گیا ہے۔ کہ ان کی قوت سے یہ باہر ہے۔ کہ وہ شرائط عمل میں لائی جائیں۔ جو ٹرکی کے خلاف انھوں نے قرار دی تھیں۔ اس لئے اب ۲۱ فروری ۱۹۲۱ء کو لندن میں کانفرنس

ہو گی جس میں ٹرکی اور یونان کے قائم مقام آئیں گے اور امید ہے کہ ٹرکی کی موافقت میں کچھ اصلاحیں ہوں گی۔ اس میں شک نہیں کہ حق کے خیال سے نہیں بلکہ محض فریقین کی قوت کی حالت کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔

(۳) لیکن مسلمانوں کا کون سا کام امید افزا حالت میں ہے۔ آجکل یہاں ترکوں کے وفد قسطنطنیہ اور انگورہ سے آئے ہوئے ہیں۔ اور گذشتہ ہفتہ میں اتحادی قوتوں کی کانفرنس کے سامنے وہ پیش ہوئے اور انھوں نے اپنا حال عرض کیا۔ باوجود اس کے کہ ان کے ملک پر تباہی ہے۔ اور ان کے ملک کے متعلق جو صلح نامہ ہونے والا ہے اس کی شرائط دنیا کے سامنے سال گذشتہ سے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کو جس طرح اپنے مطالب پیش کرنے چاہئے تھے اُس طرح پیش نہ کر سکے۔ اور مجھ کو اب اندازہ ہو گیا کہ ان لوگوں میں فی الحقیقت قحط الرّجال ہے۔ اِن کو اُن لوگوں سے سابقہ پڑا ہے جو دماغی اور عملی ارتقاء کے اعلیٰ مراتب طے کر چکے ہیں۔ جو غلطی اُن سے ہوئی ہے اس کے متعلق میں نے ان کو مسٹر .... اور .... کے ذریعہ متنبہ کر دیا ہے۔ دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے۔

ہندوستان سے[1] .... اور .... اور .... صاحبان آرہے ہیں۔ غالباً اگلے ہفتہ میں وہ یہاں پہنچیں گے۔ مجھ سے اس معاملہ میں جو کچھ ہو سکتا تھا اس میں کمی نہیں کی ہے۔

(۴) ہندوستانی صاحبان یہاں تشریف لائے ہیں آپ کو معلوم ہے۔ کہ ٹرکی کا معاملہ اور مسئلہ کتنے عرصہ سے دنیا کے سامنے ہے۔ ٹرکی کا صلح نامہ بھی تقریباً سال بھر سے پبلک کے سامنے ہے۔ یہ حضرات چھ ہزار میل سے ٹرکی کی وکالت کے لئے مسلمانوں کی طرف سے آئے ہیں۔ باوجود ان حالات کے جب میں نے ان اصحاب سے گفتگو کی تو ان کو صلح نامہ کی وہ دفعات تک معلوم نہ تھیں جو ٹرکی کے واسطے سب سے زیادہ مضر ہیں۔ جب میں نے

[1] روزنامچہ میں ان لوگوں کے نام لکھے ہیں مگر اس جگہ نہیں لکھے گئے۔

اپنی لکھی ہوئی اپیل ان کو دی اور اس کا مطالعہ انھوں نے کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اب وہ سمجھے کہ ٹرکی پر کس قدر ظلم ہو رہا ہے۔

جب حالت یہ ہو تو ایسی قوم کی زندگی کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ پرسوں دیر تک ان سے گفتگو کی۔ کل پھر ان کی قیام گاہ پر جاکر میں نے ان کے سامنے کل مسئلہ پر پوری گفتگو کی گویا ان لوگوں کو جج بنایا اور خود وکیل بنا۔ میں نے جو کچھ تقریر کی اس کے ان لوگوں نے مفصل نوٹ لیئے۔ اب انھوں نے یہ خواہش کی کہ وہ تمام کاغذات کا مطالعہ کریں گے" بعد کو پھر میرے سامنے تقریر کریں گے جو وزیر انگلستان کے سامنے کی جائے گی۔ چنانچہ ایسی تقریر کے لیئے وقت نکالا جائے گا۔ حیرت ہے کہ ان اصحاب کے پاس ٹرکش ٹریٹی (Turkish Treaty) (صلح نامہ ترکی) کی نقل بھی نہ تھی۔ اور نہ ضروری کاغذات تھے۔ (لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں) ان سب کاغذات کی فہرست میں نے ان کو دی تب انھوں نے دوکان پر جاکر وہ سب کاغذات خریدے۔ یہ حالت اس تحریک کے نظم و نسق کی ہے۔ جس پر قوم کا لاکھوں روپیہ صرف ہو چکا ہے۔ اور ہو رہا ہے۔ ان سب باتوں سے اس کے سوا اور کچھ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ مسلمان مردہ قوم ہیں وہ زندہ نہیں ہیں اور جو کچھ بھی ان میں حرکت نظر آتی ہے وہ ایسی ہے جیسی مردہ نعش کو کوّے اور گدھ کھینچتے ہیں۔

۶۔ چونکہ میں نے ٹرکش ٹریٹی کا مطالعہ کیا ہے وزیر ہند نے مجھ سے یہ خواہش کی ہے کہ اس صلح نامہ کی مالی اور اقتصادی دفعات کی نسبت اپنی رائے دوں۔ کہ کون کون دفعات قابل ترمیم ہیں۔ تاکہ ٹرکی کی مالی حالت محفوظ ہو سکے۔ اس سلسلہ میں مجھ کو ٹرکی کے سابقہ قرضوں کے متعلق حالات معلوم کرنے پڑے جن سے معلوم ہوا کہ ۱۸۵۴ء سے ٹرکی نے یورپ کی سلطنتوں سے قرض لینا شروع کیا اور اس جنگ عظیم سے بہت پیشتر ٹرکی کی اندرونی آزادی میں بہت کچھ کمی آچکی تھی۔ کیونکہ ۱۸۸۱ء میں ٹرکی سلطنت کے بعض بعض صوبوں کی

آمدنیاں ان قرضوں میں رہن ہو چکی تھیں۔جن کو بیرونی قرضخواہوں کے قائم مقام خود وصول
کرتے تھے۔اِسی سلسلہ میں میں نے انگریزی فارین آفس (Foreign office)
کے ایک افسر کی رائے دیکھی جس سے مجھ پر بہت اثر ہوا۔وہ لکھتا ہے" ٹرکی کے سرکاری قرضہ
کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ کل کا کل غیر ملکوں کا ہے۔خود ٹرکی کے لوگوں کا بالکل نہیں ہے۔
جس طرح دوسرے ملکوں میں گورنمنٹ ہمیشہ خود اپنے ملک کے لوگوں سے قرض لیتی ہے اور
شاذ حالتوں میں غیر ملکوں سے لیتی ہے لیکن ٹرکی پر جس قدر سرکاری قرضہ ہے وہ سب غیر ملکوں
کا ہے۔اس کی وجہ اس انگریز افسر نے یہ لکھی ہے۔کہ اس کا سبب ٹرکی کی رعایا کا افلاس اور
قرآن کی تعلیم ہے جس کی رو سے سود لینا حرام ہے۔حقیقت یہ ہے کہ خود افلاس بہت کچھ
ان عقائد کا نتیجہ ہے جو سود کے متعلق اسلامی دنیا میں رائج ہیں" اس انگریز افسر کی یہ رائے
کوئی نئی رائے نہیں ہے۔جو لوگ سود کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔وہ بلا غور و خوض کلام
پاک پر اعتراض کر دیتے ہیں۔

(۷) ٹرکی کے متعلق جو نوٹ میں نے لکھا ہے.......... کی معرفت ڈاکٹر رشاد کو
اس کی نقل بھیجی تھی ڈاکٹر رشاد ترک ہیں اور انگورہ سے جو وفد لنڈن کانفرنس کے موقع پر
فروری گزشتہ میں آیا تھا اس کے ایک رکن یہ بھی تھے۔جو گفتگو انھوں نے کانفرنس کے سامنے
کی تھی اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ قابلانہ تھی۔ ڈاکٹر رشاد نے ....
سے میرے نوٹ کے متعلق کہا کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی ترکوں میں سے کسی کو بھی خبر نہیں۔

(۸) آج کل ٹرکی۔یونان۔اور یورپ کی حکومتوں کے متعلق پڑھنے اور سوچنے میں وقت
اور توجہ زیادہ صرف کر رہا ہوں۔مجھ کو سب سے زیادہ حیرت ہے۔کہ ترکوں نے صرف جنگ
ہی میں فتح حاصل نہیں کی بلکہ سمرنا پہونچنے پر اور فتح کی تکمیل پر انھوں نے اس ضبط کا ثبوت
دیا۔جس کی توقع کم تھی۔اس لئے امید ہوتی ہے کہ ان کا مستقبل امید افزا ہے۔برخلاف
اس کے یونانیوں اور ان کے طرفدار انگریزوں نے جس ظالمانہ اور رکیک طرز عمل کا ثبوت

دیا۔ اس سے یورپ کی تہذیب کی ایک گونہ قلعی کھل گئی۔ قدرت کے عجیب کرشمے ہیں۔ حیرت ہے کہ انگلستان باوجود اپنی مشہور دانشمندی و فراست کے آجکل ایسے راستہ پر چل رہا ہے جس کا انجام یقیناً اس کے لئے پرخطر اور ناکامی ہے۔ اور اس کی وجہ سوائے اسکے کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ غیر معمولی کامیابی سے اس کا دماغ چل گیا۔ حق و ناحق کا احساس دھندلا ہوگیا۔ اور خود غرضی کے نشہ سے عقل پر پردہ پڑ گیا۔ سچ یہ ہے کہ انجام کار کچھ ہی ہو مصطفےٰ کمال پاشا اور اُس کے ساتھی ترکوں نے دکھادیا۔ کہ باوجود ہر قسم کی تباہی اور مصیبت کے ملک کے سپوت کیا کچھ کر سکتے ہیں لیکن میری دلی دعا یہ ہے کہ جو کامیابی حاصل ہوئی ہے اُس سے ترکوں اور نیز دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے بھی دماغ نہ چل جائیں۔ کیونکہ مشکلات کا ابھی وسیع میدان سامنے ہے۔ اور حقیقی اور آخری کامیابی ابھی بہت دور اور مشتبہ ہے۔ مسلمانوں کو نہایت ضبط اور احتیاط کے ساتھ عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

(۹) تین روز ہوئے کہ برٹش گورنمنٹ نے ٹرکی کے ساتھ جنگ کا اعلان کردیا تھا۔ یعنی اس قسم کی تیاری اور ارادہ کا اعلان کیا تھا جس کا نتیجہ یقیناً جنگ ہوتا لیکن برٹش قوم کو قدرت نے حقائق سمجھنے کا بڑا ملکہ دیا ہے۔ چنانچہ یہاں کی پبلک نے برٹش گورنمنٹ کی اس غلط کارروائی اور پالیسی کی فوراً مخالفت کی اور تقریباً ہر ایک اخبار میں گورنمنٹ کے اعلان پر سخت اعتراضات ہوئے۔ اور مزدوروں کے لیڈروں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس جنگ کے لئے ہم نہ کوئی آدمی دیں گے۔ نہ ایک توپ۔ نہ ایک جہاز غرضکہ فوراً پبلک کی طرف سے ایسی مخالفت ہوئی۔ کہ گورنمنٹ کی پالیسی میں تزلزل ہوگیا اور اُمید ہے کہ شاید اب ترکوں سے جنگ نہ ہو۔ گو مجھ کو ابھی سخت اندیشہ ہے لیکن چونکہ فرانس اور اٹلی پورے اہتمام سے ٹرکی کے ساتھ ہیں اور اس معاملہ میں انگلستان کے خلاف ہیں۔ اور انگلستان کی پبلک بھی برٹش گورنمنٹ کے ساتھ نہیں ہے۔ نیز کنیڈا اور جنوبی افریقہ کی طرف سے تائید نہیں ہوئی۔ اس لئے مجبوراً مسٹر لائڈ جارج اور ان کے ساتھی انگریزوں کو

اپنے ارادوں سے باز آنا پڑا۔ گو میرے خیال میں حتی الامکان جھگڑے کے سامان پیدا کرنے میں کمی نہ کریں گے۔ تمام دنیا میں ایسی باتوں سے برٹش گورنمنٹ بدنام ہوگئی ہے۔

"جس کسی کو ایسی قوت کے وجود سے انکار ہو جو اس دنیا کے حالات اور واقعات پر پورے طور سے قادر ہے۔ اس کو چاہئے کہ ٹرکی کے مسئلہ پر پورے طور پہ غور کرے۔ وہ حکومت جو چند ہفتہ پیشتر تمام عالم کی قوتوں سے بڑھ کر اپنے آپ کو سمجھتی تھی اور مصطفٰے کمال اور اس کے ساتھیوں کی کوشش کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی اور ترکوں کی قوم کو ہمیشہ کے لئے فنا کر دینے کی تیاری کر چکی تھی۔ آج وہ اُسی مصطفٰے کمال کے سامنے مجبور ہو کر اُس کے مطالبات پورے کر رہی ہے۔ وہ لائڈ جارج جس نے ۴ر اگست ۱۹۲۱ء کو پارلیمنٹ میں نہایت تکبّر کے ساتھ ترکوں کے متعلق نہایت حقارت آمیز الفاظ کہے تھے آج اپنے عہدے سے معزول کیا جا رہا ہے۔ اور تمام اُس کے منصوبے خاک میں مل رہے ہیں۔ اور یہ حیرت انگیز انقلاب چند دنوں میں وقوع میں آگیا۔ نہ صرف لائڈ جارج اور اس کے ناعاقبت اندیش ساتھی آج دنیا میں ذلیل کئے جا رہے ہیں۔ بلکہ برٹش امپائر کو جو اثر اور وقار اور عالمگیر قوت کل دنیا میں جرمنی پر فتح سے حاصل ہوئی تھی۔ اس کی بنیاد ہل گئی۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اسلامی آبادیاں جو اس جنگ کے سبب سے یورپ کے زیر حکومت ہوگئی تھیں ان کے لئے ایک امید افزا مستقبل پیدا ہوگیا ہے۔ یہ وہ نتائج ہیں جو برٹش قوم کے لئے خاص اثر رکھتے ہیں۔ اور یہ سب اُس خود غرضانہ، ظالمانہ اور متکبرانہ پالیسی کا نتیجہ ہے جو انگلستان کے حریص اور ناعاقبت اندیش افراد نے لائڈ جارج کی سرکردگی میں قائم کرنی چاہی تھی۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ پالیسی برٹش امپائر کو اور زیادہ صدمہ پہنچائے بغیر نہ رہے گی۔ چنانچہ وہی ہوا۔ اگر لائڈ جارج اور اُس کے ساتھیوں کا بس چلتا تو وہ برٹش امپائر کو اور زیادہ صدمہ پہنچاتے۔ لیکن وقت پر اس ملک کی پبلک کی آنکھیں کھُل گئیں اور انھوں نے ایک زبان ہو کر گورنمنٹ کو مجبور کیا کہ وہ اپنی پالیسی بدلے ورنہ انگلستان کی طرف سے جنگ کرنے میں کچھ کسر نہیں رہی تھی۔

اس سے از سرِ نو آگ پھیلتی اور معلوم نہیں دنیا میں کیا کچھ ہوتا۔ مگر یہاں کی پبلک نے بہت جلد اس طرف توجہ کی اور اب سب پارٹیاں علی الاعلان کہہ رہی ہیں۔ کہ لائڈ جارج نکالا جائے۔ کیونکہ اب ملک کو اس پر اور اس کی گورنمنٹ پر اعتماد نہیں ہے۔ اور یقیناً آپ چند روز میں سُنیں گے کہ ایسا ہوا۔

(۱۱) ترکوں کی فتح کے متعلق میرے دل پر خاص اثر ان کی اخلاقی فضیلت نے کیا ہے سمرنا کو فتح کرنے کے وقت جو ضبط انھوں نے دکھلایا اس کا یونان کے عمل میں کہیں پتہ نہ تھا۔ ترک راست گوئی میں تمام یورپ سے بڑھ کر ہیں۔ یورپ میں کذب وافترا پولیٹیکل معاملات میں معمولی بات ہے۔ چنانچہ یونان سے جو خبر آئی وہ غلط نکلی۔ لیکن انگورہ سے کوئی خبر غلط ثابت نہیں ہوئی۔"

اوپر کے گیارہ اقتباسات ٹرکی کے متعلق کافی ہیں جن سے اس معاملہ میں صاحبزادہ صاحب کے عمل اور خیالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

انگلستان کے ہندوستانی طلباء کے سیاسی خیالات کے اصلاح کی کوشش

صاحبزادہ صاحب کو انڈیا کونسل کی ممبری کے زمانہ میں کیمبرج جانے کا اتفاق ہوا۔ کیمبرج کے مختلف کوچوں میں پھرے اور کالج دیکھے اپنی طالب علمی کے زمانہ سے بہت کم فرق پایا۔ کیمبرج کی مسلم ایسوسی ایشن نے صاحبزادہ صاحب کو عید ڈنر پر بلایا۔ جو ایک ہوٹل میں منعقد ہوا تھا۔ ڈنر کے بعد صاحبزادہ صاحب نے "جامِ صحت"* کے سلسلہ میں تقریر کی اور اراکین کو بتایا کہ ایسوسی ایشن کی صحت سے مراد اس کے ممبروں کی صرف جسمانی صحت نہیں ہے بلکہ اس قوم کی اخلاقی اور علمی صحت ہے جس کے وہ فرد ہیں پس جب تک وہ اس ملک میں ہیں وہ اپنی علمی اور اخلاقی صحت کے

نوٹ*۔ انگلستان میں ڈنر کے بعد جو تقریریں ہوا کرتی ہیں اُس میں خاص خاص مہمانوں کا جام صحت پیا جاتا ہے اور تقریر میں اُنکے کارناموں کی تعریفیں کی جاتی ہیں۔ یہ مہمان جواب میں میزبان کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور انکا جام صحت تجویز کرتے ہیں۔

بڑھانے میں پوری سعی کریں جس کا اس ملک میں ان کو پورا موقع حاصل ہے۔ یہ تقریر خاصی طویل ہے۔اور بخوف طوالت اس کو ہم یہاں پر نقل نہیں کرتے ہیں۔

یوروپین حکام کی ڈالیوں کے متعلق صاحبزادہ صاحب کی رائے

سر چارلس بیلی اُس زمانہ میں حیدرآباد کے ریزیڈنٹ تھے۔ جبکہ صاحبزادہ صاحب حیدرآباد گئے تھے۔ اس کے بعد یہ مشرقی بنگال اور پھر صوبہ بہار کے لفٹیننٹ گورنر رہے۔ اب وہ انڈیا کونسل کے ممبر تھے۔ انھوں نے ولایت میں صاحبزادہ صاحب کی رائے اس امر کے متعلق خاص طور پر دریافت کی کہ ہندوستان میں انگریز عہدے داروں کو تحائف لینے چاہئیں یا نہیں۔

صاحبزادہ صاحب نے ان سے صاف صاف کہدیا کہ اضلاع میں حکام ضلع جس طرح رئیسوں کی سواریاں استعمال کرتے ہیں۔ اور بڑے دن میں اور دوسرے موقعوں پر ڈالیاں لیتے ہیں۔ اُس سے عام لوگوں میں نامناسب خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور اب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انگریز ناجائز فائدہ اُٹھانے میں دریغ نہیں کرتے۔ سر چارلس نے صاحبزادہ صاحب سے پورا اتفاق کیا۔ یہ معاملہ پولیٹکل کمیٹی میں پیش تھا۔ جس کے سر چارلس بھی ممبر تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد ہندوستان میں احکام جاری ہوئے تھے۔ کہ حکام اس معاملہ میں زیادہ احتیاط کریں مگر حکام کی تعمیل افراد (حکام) کے عمل پر منحصر ہے اور اس کی جانچ نہیں کی جاتی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں میں سیاسی خیال کے دو فریق

فروری ۱۹۱۸ء میں صاحبزادہ صاحب اگرچہ انڈیا کونسل کے کام میں مصروف تھے۔ لیکن وہ ہندوستان کے اخبار انگلستان میں رہ کر برابر مطالعہ کرتے اور مسلمانوں کے سیاسی حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ابتدائے فروری میں جو ہندوستان کے اخبار پڑھ کر انھوں نے ہندوستان کے ۱۹۱۸ء[۱] کے سیاسی حالات پر رائے قائم کی ہے۔ اس کا پتہ ان کے روزنامچہ سے چلتا ہے۔

[۱] India in 1918

وہ لکھتے ہیں۔

" مسلم لیگ کے متعلق عجیب گڑ بڑ ہے۔ الہ آباد میں ایک علحدہ سیاسی مسلم انجمن قائم ہوئی ہے۔ اخبار البشیر اٹاوہ نے یہ رائے دی ہے کہ جس طرح انگلستان میں لبرل اور کنسرویٹیو دو پارٹیاں ہیں۔ اسی طرح اب مسلمانوں میں دو پارٹیاں ہوں گی۔ ایک مسلم لیگ کے ہم خیال افراد اور دوسرے الہ آباد کی انجمن کے موید۔ لیگ کانگریس کے ساتھ مل کر انتہا پسند اصول کے مطابق مطالبات طلب کرے گی۔ اور الہ آباد کی انجمن گورنمنٹ کے ساتھ رہ کر قومی حقوق طلب کرے گی۔ البشیر نے اس پر بھی بہت زور دیا ہے کہ ہم اوّل مسلمان ہیں۔ اور بعد کو ہندوستانی۔ یہ حضرات نہیں سمجھتے کہ اس اصول کے کیا معنی ہیں۔ اگر ہم ہندوستانی نہیں ہیں۔ تو پھر کس بنا پر ہم ہندوستان کی گورنمنٹ میں حصہ چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس خیال نے تباہ کر دیا کہ " اول وہ مسلمان ہیں۔ اور بعد کو ہندوستانی " اس سے خود اسلام کو نقصان پہنچا ہے اور پہونچے گا۔ کیونکہ اسلام کو ہم اُسی حالت میں نفع پہونچا سکتے ہیں۔ جبکہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کی حالت اچھی ہو۔ اور اسی طرح ان کی آواز میں اثر ہو۔ یہ اُسی حالت میں ہو سکتا ہے کہ تعلیم میں، حکومت میں، تجارت میں، صنعت میں دولت میں مسلمانوں کا پورا پورا حصہ ہو اور وہ اپنے ملک کے حالات اور ضروریات کے مطابق اپنا طرز عمل رکھیں۔

منچسٹر میں چیمبر آف کامرس کے جلسہ میں شرکت

۲۱ر فروری ۱۹۱۸ء کو مسٹر سی۔ جے۔ فیر فیکس اسکاٹ (C. J Fair fax scott) صاحبزادہ صاحب سے ملنے آئے اور خواہش کی کہ وہ اس جلسہ میں شریک ہوں جو ۲ر مارچ کو منچسٹر میں ہونے والا تھا۔ جلسے کا مقصد یہ تھا کہ منچسٹر چیمبر کے چندہ سے جو ہوائی طیارہ (Aeroplane) بنایا گیا تھا۔ وہ ہندوستان کو ہدیتہً پیش کیا جائے۔ انگلستان میں ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی جس کا

نام امپیریل ایر فلیٹ کمیٹی (Imperiul air Fleet Committi) تھا۔ اس کی غرض یہ تھی کہ ہوائی جہازوں اور عبارہ [illegible] کے فن کو ترقی دی جائے۔ انگلستان میں اس سلسلہ میں یہ تجویز کی گئی تھی کہ انگلستان کے لوگ بارہ ہزار چھ سو پونڈ کے چندے سے چھ ہوائی جہاز سلطنت برطانیہ کی آبادیوں کو جہار) ہوم رول تھا نذ کریں۔ فی الحال تو یہ جہاز جنگ میں کام کریں مگر بعد کو جس نو آبادی کو یہ جہاز نذر کیا گیا ہو اُسی کے سپرد کر دیا جائے۔ چنانچہ کنیڈا (Canada) نیوزی لینڈ (Neuzea Land) نیو فاونڈ لینڈ (New Faund Land) جنوبی افریقہ کو تو ایک ایک ہوائی جہاز نذر کیا جا چکا تھا۔ اب ہندوستان کے واسطے منچسٹر چیمبر آف کامرس نے اپنے چندے سے جہاز تیار کیا تھا۔ ۲ مارچ کو منچسٹر کا جلسہ اسی غرض سے ہونے والا تھا کہ جہاز نذر دینے کی باضابطہ رسم عمل میں لائی جائے صاحبزادہ صاحب نے شرکت کا وعدہ کر لیا۔

۲ مارچ کو یہ جلسہ ہوا۔ صاحبزادہ صاحب منچسٹر گئے۔ جلسہ میں شریک ہوئے۔ مسٹر اسٹوکر (Mr Stoker) نے جو منچسٹر چیمبر آف کامرس کے پریسیڈنٹ تھے۔ ہوٹل میں ڈنر دیا۔ قریب ایک سو کے مہمان تھے۔ جلسہ میں تقریریں ہوئیں پریسیڈنٹ نے شہنشاہ معظم کا جام صحت تجویز کیا۔ اس کے بعد لارڈ ڈربرونے ہندوستان اور اُس کے قائم مقاموں۔ یعنی صاحبزادہ صاحب اور سر پربھاشنکر پٹنی کا جام صحت تجویز کیا۔ صاحبزادہ صاحب نے اس کا جواب دیا۔ اور سر پربھاشنکر نے تائید کی۔ صاحبزادہ صاحب کی تقریر نہایت پسند کی گئی۔ تقریر میں اصل زور اس بات پر دیا گیا تھا کہ ہندوستان اس قدر مردم خیز اور وسیع ملک ہے کہ اگر پورے طور پر اس کو ترقی دی جائے تو برٹش امپائر کی قوت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے۔ لیکن یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ حال میں جو فراخدل پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس پر پورے طور پر عمل کیا جائے اور ہندوستان اور اس کے باشندوں کو کافی طور پر اور فی الواقع برٹش امپائر کی ترقی اور اقبال میں حصہ دیا جائے۔

اِس کے بعد سب لوگ اس مقام پر گئے جہاں ہوائی جہاز رکھا ہوا تھا۔ پریسیڈنٹ نے جہاز ہندوستان کی نذر کیا۔ اور صاحبزادہ صاحب نے اُسے ہندوستان کی طرف سے قبول کیا اور لفٹنٹ کرنل بوٹر کو اس درخواست سے سپرد کیا کہ وہ ہوائی جہاز جرمنی کے مقابلہ میں استعمال کیا جائے اور جنگ کے بعد ہندوستان کو واپس کر دیا جائے۔

اس تقریب میں لفٹنٹ ملک بھی موجود تھے۔ یہ سب سے پہلے ہندوستانی سکھ نوجوان تھے۔ جو ہوائی جہاز میں پرواز کر سکتے تھے۔ جنگ شروع ہونے کے وقت وہ آکسفورڈ میں طالب علم تھے لیکن جلد فوج میں داخل ہو کر فرانس کے محاذ پر جنگ میں شریک ہو گئے اور دو مرتبہ زخمی ہوئے۔ اس کے بعد وہ برٹش ایر سروس میں داخل ہو گئے۔

لندن مسلم لیگ کا جلسۂ دعوت

۱۷ر جولائی ۱۹۱۸ء کو "لندن مسلم لیگ" کی طرف سے سوائے (Savoy) ہوٹل میں مہاراجہ پٹیالہ اور سر ایس۔ پی سنہا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مسٹر باسو اور سر پربھاشنکر کو لنچ دیا گیا۔ اس دعوت میں لارڈ ہیمنگٹن سر تھیوڈ ورماریسن اور دوسرے بہت سے مہمان شریک تھے۔ دعوت کے بعد رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب نے ہندوستان کے پانچوں مہمانوں کے جام تندرستی کی تحریک کی۔ جواب میں سر ایس۔ پی سنہا نے اپنی طرف سے اور مہاراجہ پٹیالہ کی طرف سے تقریر کی اور اس میں ہندو مسلمانوں کے باہمی اتفاق پر زور دیا۔ اس کے بعد صاحبزادہ صاحب نے تینوں ممبران کونسل کی طرف سے جوابی تقریر کی جس میں مسلم لیگ کے مقاصد کی وضاحت کی۔ پہلے صاحبزادہ صاحب نے مسلمانوں کی مشکلات کا ذکر کیا۔ کہ گذشتہ دو سو سال سے ہندوستان میں مسلمانوں کو جن پیچیدگیوں اور دشواریوں کا سامنا ہے اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہ مل سکے گی۔ گویا مسلمانوں کا حال اس شعر کی مصداق تھا۔ ؎

شبِ تاریک و بیم موج گردابے چنیں حائل　　کجا دانند حال ما سبکسارانِ ساحل ہا

اس کے بعد صاحبزادہ صاحب نے کہا۔گو مشکلات کا سامنا مدتوں تک رہے گا۔لیکن اب مسلمانوں کا جہاز سیدھے راستہ پر ہو لیا ہے۔مسئلہ ہند تین اصلی عناصر سے مرکب ہے۔اول انگریز۔دوسرے ہندو۔تیسرے مسلمان۔ان کے سیاسی عقیدہ میں ان تینوں کے اتفاق باہمی پر اس مسئلہ کا صحیح حل منحصر ہے۔مسلمانوں کا سیاسی عقیدہ تین بنیادی اصول پر قائم ہے اور انھیں تین اصول پر اس کا انحصار ہے۔

(۱) شاہنشاہ ہند سے کامل وفاداری جن کے ظل عاطفت میں ہر ایک آسائش اور امن اور پوری مذہبی آزادی حاصل ہے۔

(۲) کامل وفاداری مادر ہند جس کی فرزندی اور شہریت اصلی بنیاد ان تمام حقوق اور مراعات کی ہے۔جو ہندوستان میں ہم کو حاصل ہوں۔یا جن کے لئے ہم دعویدار ہوں۔اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام ان کوششوں میں جن کا مقصد مادر ہند کی خدمت اور بہتری ہو۔ان میں ہم اپنے تمام ہم وطن اشخاص اور خاص کر اپنے ہندو بھائیوں کا ساتھ دیں۔

(۳) تمام ان مواقع اور سہولتوں کے لئے مطالبہ کرنا جن کے ذریعہ سے ہم مسلمان ہندوستان کے کارآمد اور پورے طور پر قابل شہری ہوسکیں اور اس طرح پر اپنے ملک میں حکومت خود اختیاری کو کامیاب کرنے میں عملاً حصہ لے سکیں۔

اس کے بعد صاحبزادہ صاحب نے کہا خدا کا شکر ہے جہاں تک پہلی دو باتوں کا تعلق ہے۔ہندوستان کے مسلمان عملاً ان پر عامل ہونے کا ثبوت دے چکے ہیں۔موجودہ جنگ میں ہندوستان کے مسلمانوں کو جس امتحان کا مقابلہ کرنا پڑا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔مسلمانوں نے اپنے طرز عمل سے ثابت کردیا کہ وہ اپنے شہنشاہ اور سلطنت کے سچے خادم ہیں۔اس کے علاوہ حال میں جو رفارم اسکیم درپیش ہے اس سے اتفاق کرنے میں مسلمانوں نے ثابت کردیا کہ ان کو اپنے ملکی بھائیوں کی نیک نیتی پر پورا بھروسہ ہے۔پس اب وقت آگیا ہے کہ مسلمانوں کی بہتری اور ترقی کا مسئلہ محض انکا قومی مسئلہ نہ رہے

بلکہ کل ملک کے نیشنل پروگرام کا وہ ایک اہم جز قرار دیا جائے۔ کیونکہ مسلمانوں کا مسئلہ مسئلہ ہند کا ایک اہم جز ہے۔ اس لئے اس کے متعلق فکر اور کوشش صرف مسلمانوں یا گورنمنٹ ہی کا فرض نہ رہے بلکہ ہمارے ہندو بھائیوں پر بھی اس کی ذمہ داری ہو۔ کیونکہ اب ہم مسلمانوں نے اور ہندوؤں نے جو متفقہ کوشش کی اور راستہ اختیار کیا ہے اس سب کا مقصد یہ ہے کہ باہم یک جہتی اتفاق اور ملکی حمیت پیدا ہو اور اس طرح پر باہمی تعلقات اس نقطہ پر پہونچ جائیں جبکہ ایک دوسرے سے کہہ سکیں۔

"من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری"

مسٹر گاندھی کی نسبت صاحبزادہ صاحب کے خیالات

صاحبزادہ صاحب نے ۱۹۲۰ء کے روزنامچہ میں لکھا ہے:۔
"میں آجکل مسٹر گاندھی کی کتاب "انڈین ہوم رول" پڑھ رہا ہوں اور میں حیران ہوں کہ گاندھی جی نے انگلستان

نوٹ۔ صاحبزادہ صاحب نے جن خیالات کا اظہار اس زمانہ میں کیا تھا وہ مبنی ان واقعات پر تھے جو اس زمانہ میں پیش آ رہے تھے۔ لیکن ہندوستان کی سیاسی نشو و نما جو پچھلی پچیس سال میں ہوئی وہ نہایت تیز رفتاری سے رونما ہوئی مگر یا یں ہمہ کسی کے حاشیہ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس صدی کی سب سے بڑی جنگ کا نتیجہ ہندوستان کے حق میں اس قدر حیرت انگیز ہوگا۔ اس جنگ میں جس نسبت سے کہ امریکہ اور روس کو فروغ ہوا۔ اسی نسبت سے انگلستان و دیگر ممالک یورپ کے اقتدار کو زوال ہوا اور انگریزوں کی جو برتری اس وقت تک دنیا کے پالٹکس میں قائم تھی وہ یک لخت کافور ہوگئی اور اس کا اثر ہندوستان پر بین طور پر محسوس ہونے لگا کہ انگریز اپنے ملک کی مشکلات سے تنگ آکر ہندوستان پر اپنا قبضہ قائم نہ رکھ سکنے کا صحیح خواب دیکھنے لگے۔ اور آخر کار کربس مشن اور وزارتی مشن نے ہندوستان کے واسطے آزادی کا دروازہ کھول دیا۔ اب ہندو اور مسلمان دونوں اس دروازہ میں داخل ہوگئے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ پانچ سال میں اپنے اپنے حصہ ملک پر حکمرانی کرنے میں کس طرح اپنی سیاسی دانشمندی کا ثبوت دیتے ہیں۔

کی زندگی کو اس قدر حقارت سے کیوں بیان کیا ہے:۔

اگر اس قسم کی کورانہ اور یک طرفہ دقیانوسی تخیل کا اثر ملک میں ہو گیا تو تمام وہ تعلیمی تحریک جس کے بغیر ہندوستان میں نئی حیات پیدا نہیں ہو سکتی برباد ہو جائے گی اور جس قدر ترقی ہوئی ہے وہ معکوس ہو جائے گی۔ اگر موقع اور وقت ملا تو میں اس کا جواب لکھوں گا۔"

"مسٹر گاندھی کو میں ایماندار اور با اصول سمجھتا ہوں۔ مگر سیاسی اور تعلیمی معاملات میں گاندھی جی کی رائے کو بہت کچھ غلط یقین کرتا ہوں۔ گاندھی جی پر "رسکن" اور ٹالسٹائی" (Tolstoy) کی تصانیف کا بہت زیادہ اثر ہے۔ لیکن رسکن اور ٹالسٹائی نے جو کچھ لکھا ہے وہ یورپ کی مادیت اور دولت پرستی کے خلاف لکھا ہے۔ جو بہت کچھ درست اور با موقع تھا لیکن گاندھی جی ان خیالات کو ہندوستان پر چسپاں کرتے ہیں اور یہ سراسر غلطی ہے۔

"میرا یہ خیال ہے کہ جہاں تک تعلیم اور نئی تہذیب کا تعلق ہے اس کی نسبت مسٹر گاندھی کی تحریک کامیاب نہ ہو گی کیونکہ وہ زمانہ کے خلاف دنیا کو لے جانا چاہتے ہیں۔ جس میں آجتک کوئی کامیاب نہ ہوا۔ رہا مسلمانوں کا حال تو اُن کی نسبت تو قدرت کا فتویٰ یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کو اور زوال ہو۔ مسٹر گاندھی کا اثر تو اُن پر صرف ایک سال سے ہے۔ لیکن آپ سنہ ۱۹۱۲ء سے اب تک کے حالات پر توجہ کیجئے۔ کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی کیا حالت رہی ہے اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی کیا گت انھوں نے بنائی۔ مسلمانوں کا زوال تو دو سو برس سے جاری ہے۔ سر سید اتفاق سے پیدا ہو گئے تھے اور ان کے سبب سے کچھ دن زندگی کے سامان نظر آنے لگے تھے۔ لیکن ان کا اثر سطحی تھا۔

قوم کے جسم میں فساد موجود تھا۔ جو اپنا رنگ لایا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ شاید ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے مسلمانوں کو بھی سیدھے راستے پر چلنا آجائے۔ لیکن ابھی تک ہندو بھی اہم امور میں محتاج ہیں۔ اس زمانہ میں زندہ اور آزاد رہنے کے لئے قوموں کو کوشش، قوت اور قابلیت کی ضرورت ہے وہ ابھی ہم میں بہت کم ہے۔ البتہ اگر ہند و

اور مسلمان دونوں مل کر صحیح راستہ پر چلیں تو دونوں کو مدد ملے گی اور خاصکر مسلمانوں کا نفع ہوگا۔
ہمیں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کس قسم کی نیشنل تعلیم کی ہم کو ضرورت ہے مسٹر گاندھی پانچ ہزار سال پیشتر کا نظام تعلیم رائج کرنا چاہتے ہیں اور زمانہ حال کی تحقیقات اور ایجادات کے خلاف ہیں۔ اس قسم کے خیالات کی جانچ پڑتال ضروری ہے اور پبلک کے سامنے اس کی حقیقت پیش کرنی چاہیئے۔"

صاحبزادہ صاحب کے یہ اُس زمانہ کے خیالات ہیں جبکہ سنہ ۱۹۲۰ء میں مسٹر گاندھی کے عدم تعاون کی تحریک کے حامیوں کی طرف سے مغربی علوم کی درسگاہوں کو تباہ کرنیکی کوشش کی جارہی تھی اور مسلمانوں کی واحد قومی درسگاہ علیگڈھ محمڈن کالج پر اسی مقصد سے حملہ ہوا تھا۔ اِن حالات میں قومی تعلیم کے مسئلہ کے متعلق صاحبزادہ صاحب کا تردّد حق بجانب تھا۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ مسٹر گاندھی کی حب الوطنی خلوص اور سیاسی خدمات کے معترف نہ تھے۔ بلکہ وہ ہمیشہ اُن کے ایثار کی تعریف کرتے تھے۔ اور سنہ ۱۹۲۲ء میں دہلی میں اُن سے ملے بھی تھے۔

فرنچائز کمیٹی کی ممبری[1]

سنہ ۱۹۱۸ء میں جب صاحبزادہ صاحب انڈیا کونسل کی ممبری کے کام کی وجہ سے انگلستان میں مقیم تھے۔ ۱۸ ستمبر کو جب کہ تفریح کے لئے وہ لندن سے باہر گئے ہوئے تھے مسٹر مانٹیگو (Montague) کے پرائیوٹ سکریٹری کا خط اُن کو ملا جس کا مضمون یہ تھا کہ "ایک نہایت اہم معاملہ کے متعلق مسٹر مانٹیگو سکریٹری آف اسٹیٹ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کل صبح انڈیا آفس میں اُن سے مل سکتے ہیں؟" چنانچہ ۱۹ ستمبر کی صبح کو صاحبزادہ صاحب لندن واپس آئے اور دس بجے کے بعد مسٹر مانٹیگو سے دفتر میں ملے۔ انھوں نے صاحبزادہ صاحب سے کہا "میں چاہتا ہوں کہ آپ ہندوستان

---

[1] حق رائے دہندگی کی توسیع کی تجاویز مرتب کرنے والی کمیٹی۔

جائیں۔ نئی ریفارم اسکیم کے متعلق جو فرنچائز کمیٹی ہندوستان میں کونسلوں میں رائے دہندگی کا فیصلہ کرنے کو مقرر ہونے والی ہے اس میں مسلمان ممبر کے عہدہ کے لئے میں نے آپ کو حسب خواہش والسرائے منتخب کیا ہے۔ میری خواہش نہ تھی کہ آپ اس قدر عرصہ کے لئے انڈیا آفس سے علحٰدہ رہیں۔ لیکن والسرائے کے اصرار سے میں نے اتفاق رائے کیا۔

صاحبزادہ صاحب نے کہا کہ وہ بخوشی جانے کو تیار ہیں۔ ستمبر کے آخر میں ہندوستان جانا تجویز ہوا۔ صاحبزادہ صاحب کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس سال اُن کو ہندوستان جانا ہوگا۔ اور وہ اپنے فرزند اکبر شمشاد احمد خاں کو لکھ بھی چکے تھے کہ جنگ کی وجہ سے اُن کا آنا نہ ہوسکے گا۔ مگر اب یہ قدرت کی طرف سے سامان ہوگیا۔ اس سے کچھ پہلے سر ولیم میرس نے صاحبزادہ صاحب سے اس کمیٹی کے ممبروں کے انتخاب کے متعلق گفتگو کی تھی۔ یہ صاحبزادہ صاحب کو معلوم تھا کہ کمیٹی کے دو ہندو اور ایک مسلمان ممبر ہونگے۔ چنانچہ سر ولیم میرس کو صاحبزادہ صاحب نے دو مسلمانوں کے نام بتائے تھے کہ ان میں سے ایک منتخب کرلیا جائے۔ یعنی ایک تو جسٹس سر عبدالرحیم اور دوسرے سر سید علی امام۔ لیکن اپنے متعلق صاحبزادہ صاحب کو یہ خیال بھی نہ تھا۔ اور نہ کبھی اُن کے دل میں ایسا خیال یا خواہش پیدا ہوئی تھی۔ اس کمیٹی (Franchise Committee) کے پریسیڈنٹ لارڈ ساؤتھ برو (South Borough) مقرر ہوئے تھے۔ وہ صاحبزادہ صاحب سے ملنے آئے۔ یہ نہایت خلیق اور قابل شخص تھے اور انھیں کے ساتھ صاحبزادہ صاحب کو کام کرنا تھا۔

۳۰ ستمبر کو روانگی قرار پائی۔ راستہ اس طرح تجویز ہوا کہ لندن سے سَتھمپٹن اور وہاں سے جہاز میں فرانس کے بندرگاہ ہیور (Havre) یہاں سے ریل میں پیرس اور پیرس سے ریل میں اٹلی کے دارالحکومت روم وہاں سے اٹلی کے بندرگاہ ٹارنٹو کو اور ٹارنٹو سے جہاز میں پورٹ سعید یہاں سے جہاز بدل کر جھنڈواڑہ جہاز میں ہندوستان کو روانگی۔ اس طرح آخر اکتوبر ۱۹۱۸ء میں بمبئی پہونچنے کا خیال تھا۔ چونکہ اس زمانہ میں

بوجہ جنگ عظیم راستہ کھلا ہوا نہ تھا۔ اس لیے یہ پُرپیچ راستہ اختیار کیا تھا۔ ۲۵ر اکتوبر کو عدن پہونچے اور آخر کار بخیر و عافیت یکم نومبر ۱۹۱۸ء یوم جمعہ کو بمبئی پہونچے۔

ممبران کمیٹی کے لینے کو گورنمنٹ ہند نے شملہ سے مسٹر ہاگ۔ آئی۔ سی۔ ایس کو بمبئی بھیجا تھا۔ وہ جہاز پر آکر کمیٹی کے پریسیڈنٹ لارڈ سوتھ برو سے ملے۔ ان سے معلوم ہوا کہ چونکہ دہلی میں انفلوئینزا کی شدت تھی اس لیے والئسرائے ابھی شملہ میں قیام رکھیں گے اور ممبران کمیٹی کو بھی شملہ ہی جانا ہوگا۔ ۸ر نومبر کو کمیٹی کا ابتدائی جلسہ ہوگا اور اسلئے سب ممبران وہاں جمع ہونگے

جہاز سے اتر کر صاحبزادہ صاحب تاج محل ہوٹل کو گئے جہاں سرکاری طور پر ان کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ لارڈ سوتھ برو کا بھی اُسی ہوٹل میں قیام تھا۔ صبح کو مولوی انوار احمد سفیر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے ملے جو سورت سے صاحبزادہ صاحب سے ملنے بمبئی آئے تھے انوار احمد صاحب کانفرنس کے انتظام کی غرض سے سورت آئے ہوئے تھے۔ کیونکہ کانفرنس کا آئندہ سالانہ اجلاس سورت ہی میں دسمبر میں ہونے والا تھا۔ منجملہ دوسری خبروں کے صاحبزادہ صاحب کو انوار احمد صاحب سے نواب محمد اسحاق خانصاحب کی وفات کی خبر ملی تھی جو ۲۷ر اکتوبر ۱۹۱۸ء کو دفعتًا میرٹھ میں واقع ہوئی تھی۔ اس خبر سے صاحبزادہ صاحب کو بہت رنج ہوا۔

ان تاریخوں میں بمبئی میں موجودہ ریفارم اسکیم کے متعلق اعتدال پسند جماعت کا اجلاس ہو رہا تھا جس کے صدر مسٹر (بعدہٗ سر) سریندرو ناتھ بنرجی تھے وہ بھی تاج محل ہوٹل میں مقیم تھے۔ صاحبزادہ صاحب کی اُن سے ملاقات ہوئی۔ ریفارم اسکیم کے متعلق ہندوستانیوں میں دو فریق ہو گئے تھے۔ ایک انتہا پسند جو ریفارم کو ناپسند کرتا تھا اور اسکیم میں بہت زیادہ ترمیم و اضافہ چاہتا تھا۔ اس فریق کے لیڈر مسز اینی بلیسنٹ اور مسٹر تلک تھے اور ان کے ساتھ مسٹر جناح اور مسٹر حسن امام اور بڑی جماعت نوجوان کی تھی۔ دوسری جماعت اعتدال پسندوں کی تھی جو موجودہ ریفارم اسکیم کو پورے طور پر پسند کرتی تھی۔ گو چند اصلاحات اسکیم میں چاہتی تھی۔ لیکن اگر ایسی اصلاحات نہ بھی ہوتیں تب بھی اسکیم مان لینے کو تیار تھے۔ اس

جماعت کے لیڈر مسٹر سریندرو ناتھ بنرجی تھے۔ مسٹر واچا، مسٹر شاستری، مسٹر چنتامنی اور ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو وغیرہ وغیرہ ان کے ساتھ تھے۔

صاحبزادہ صاحب کی رائے اعتدال پسندوں کے موافق تھی۔ لیکن ایک حد تک انتہا پسندوں کے خیال کی بھی اس لئے ضرورت محسوس کرتے تھے کہ ان کے خیال میں ایسی تحریک مفید تھی۔ کیونکہ ایسی تحریک کا اثر انگلستان کے اُن انگریزوں پر ہونا یقینی تھا جو ریفارم اسکیم کے مخالف تھے۔

۳ر نومبر کو صاحبزادہ صاحب اور پارٹی بمبئی سے روانہ ہوئی۔ اس سفر میں صاحبزادہ صاحب علیگڈھ ہوکر، ۷ر نومبر کو شملہ پہونچ گئے وہاں ۸ر نومبر کو صاحبزادہ صاحب گورنمنٹ ہوس میں مسٹر میفے پرائیویٹ سکریٹری سے ملے۔ اس کے بعد لارڈ ساؤتھ برو سے ملے۔ اور معلوم ہوا کہ کمیٹی کا نظام عمل اس طرح بن گیا ہے کہ ۱۳ر نومبر کو شملہ سے روانہ ہوکر ۱۴ر نومبر کو دہلی پہونچا۔ ۱۶ر نومبر تک قیام۔ ۱۷ر کو پٹنہ ۲۱ر تک قیام۔ وہاں سے لکھنؤ ۲۹ر تک قیام۔ پھر دہلی کو واپسی۔ ۳ر دسمبر کو لاہور۔ ۸ر دسمبر تک قیام۔ پھر ناگپور۔ اور وہاں ۱۳ر دسمبر تک قیام۔ پھر کلکتہ۔ جہاں ۲۱ر دسمبر تک قیام۔ اور بڑے دن کی تعطیل میں یکم جنوری ۱۹۱۹ء تک کمیٹی کا کام بند۔ ۲ر جنوری سے ۱۱ر جنوری تک کلکتہ میں پھر قیام۔ وہاں سے مدراس جہاں ۲۲ر جنوری تک قیام ہوگا۔ وہاں سے بمبئی جہاں آخر جنوری تک کام اور قیام بمبئی سے پھر دہلی کو واپسی جہاں کمیٹی کی رپورٹ تیار کی جائے گی۔ اس طرح فروری ۱۹۱۹ء کے آخر تک سب کام ختم ہوگا۔ اور مارچ میں انگلستان واپسی ہوگی۔

کمیٹی نے اس پروگرام کے مطابق تین ماہ تک دورہ کیا۔ گواہوں کے بیانات لئے شروع فروری ۱۹۱۹ء میں دہلی واپس آئے اور رپورٹ تیار کی جو ۲۲ر فروری ۱۹۱۹ء کو گورنمنٹ میں پیش کردی گئی۔ ۲۵ر فروری ۱۹۱۹ء کو صاحبزادہ صاحب انگلستان واپس چلے گئے۔ کیونکہ ابھی انڈیا کونسل کی ممبری کا زمانہ بہت باقی تھا۔

باب ہشتم

صاحبزادہ صاحب انڈیا کونسل میں

تقرر

۱۹۱۶ء کے آخر میں سر مرزا عباس علی بیگ مسلمان ممبر انڈیا کونسل کی میعاد ممبری ختم ہونے والی تھی۔ سر سلطان احمد خاں اسی عہدہ کے خواہشمند ہوئے اور انھوں نے اپنے بھائی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سے کہا کہ وہ لفٹننٹ گورنر صوبہ متحدہ سے ان کے (سلطان احمد خاں) تقرر کے واسطے سفارش کرادیں۔ چنانچہ اُن کے ایمار سے صاحبزادہ صاحب جنس مسٹن لفٹیننٹ گورنر صوبہ متحدہ سے ۲۶ جنوری ۱۹۱۷ء کو اپنے بھائی کی نامزدگی انڈیا کونسل کی ممبری کے واسطے سفارش کی۔ لفٹننٹ گورنر نے کہا کہ خود اپنے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جس کا جواب صاحبزادہ صاحب نے یہ دیا کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ایک خاص نظام عمل کے مطابق کام کر رہے ہیں اس لئے علیگڈھ چھوڑ کر انگلستان نہیں جاسکتے۔ اس کی تہ میں آزادی کا فطری جذبہ بھی کام کر رہا تھا جو ملازمت اور اس کی قیود سے لازمی طور پر دور رہتا ہو۔ یہی جذبہ اس سے پیشتر ریاست گوالیار کی ملازمت قبول کرنے میں مانع آیا تھا۔ صاحبزادہ صاحب کا انکاری جواب سُن کر لفٹننٹ گورنر نے کہا کہ آپ اپنے بھائی کے کاغذات میرے پاس بھیج دیجئے۔ یہ مسئلہ اسی منزل تک محدود رہا۔ اس کے ایک مہینے بعد قائم مقام لفٹننٹ گورنر صوبہ متحدہ کا ایک خط صاحبزادہ صاحب کا موصول ہوا جس کا مضمون یہ تھا:۔

"حسب الحکم ہز ایکسی لینسی وائسرائے ہند آپ کو لکھتا ہوں کہ آپ کو وزیر ہند انڈیا کونسل کا ممبر مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ اور ہز ایکسی لینسی وائسرائے اور وزیر ہند کی یہ خواہش ہے کہ آپ یہ عہدہ منظور کرلیں"۔ خصوصیت کے ساتھ وائسرائے کی طرف سے یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ ان کو صاحبزادہ صاحب پر پورا اعتماد ہے۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ یہ عہدہ قبول کرلیا جائے۔"

اس خط کے موصول ہونے پر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے اپنے دوستوں اور عزیزوں سے

مشورہ کیا (جس میں سر سلطان احمد خاں بھی شریک تھے) چونکہ کثرت رائے قبول عہدے کے واسطے تھی۔ اِن مشوروں کے بعد انھوں نے بادل ناخواستہ اپنی رضامندی دے دی لیکن روانگی انگلستان کے واسطے انھوں نے وائسرائے سے یہ کہدیا کہ اکتوبر سے پہلے وہ نہ جاسکیں گے۔ وائسرائے نے اس کی اطلاع سکریٹری آف اسٹیٹ کو دے دی۔

انگلستان کو روانگی

اب صاحبزادہ صاحب نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ جب روانگی کا زمانہ قریب آیا تو احباب، کالج و کانفرنس کے اسٹاف، رؤسا اور حکام نے دعوتیں اور پارٹیاں دینی شروع کیں۔ ضلع کی طرف سے دعوتیں اور پارٹیاں شروع ہوئیں۔ اور آخر کار کالج اسٹاف و کانفرنس کے عملہ نے بھی شاندار پیمانہ پر دعوت کی۔ ان دونوں دعوتوں میں جو تقریریں ہوئیں اُن سے اس عظمت اور وقعت کا پتہ چلتا ہے جو ان اصحاب کے دلوں میں صاحبزادہ صاحب کی تھی اور جس کا واسطہ ان سے پڑتا تھا۔ بالآخر ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو بڑی شان و شوکت کیساتھ صاحبزادہ صاحب کی روانگی انگلستان کو ہوئی۔

اس سفر میں اول صاحبزادہ صاحب نے مہاراجہ گوالیار سے اور پھر ہر ہائی نس بیگم صاحبہ سے ملاقات کی۔ یہاں سے بموجب پروگرام خان بہادر مولوی بشیر الدین صاحب (اٹاوہ) صاحبزادہ صاحب کے ہمسفر حیدرآباد ہوئے اور وہاں سے سر سید مسعود اور دیگر احباب سے مل کر عازم بمبئی ہوئے۔ بوجہ جنگ عظیم اس زمانہ میں سفر انگلستان معمولی طریقہ سے نہ ہوتا تھا کیونکہ جرمن آبدوز کشتیاں جہازوں کو غرق کر دیا کرتی تھیں اس لئے جنگی جہازوں کی حفاظت میں مسافروں کے جہاز چلا کرتے تھے چونکہ یہ جہاز خاص تاریخوں پر روانہ ہوتے تھے۔ اس لئے اس درمیانی وقفہ میں صاحبزادہ صاحب کو بمبئی میں قیام کرنا پڑا جہاں اُن کے احباب نے شاندار پارٹیاں و ڈنران کے اعزاز میں دئے اور ان مواقع پر صاحبزادہ صاحب نے ملکی اور تعلیمی ضروریات کے متعلق تقریریں کیں۔ نیز پونا کے مسلمانوں کی درخواست پر وہاں بھی تشریف لے گئے اور وہاں کے جلسوں میں جو اُن کے اعزاز میں کئے گئے تھے تقریریں کیں۔ خاص طلبار کے ایڈریس کے جواب میں اُن کو اُردو میں مناسب نصیحتیں کیں اور بمبئی واپس ہوئے

اور آخر کار بحری سفر یکم ستمبر ۱۹۱۷ء کو شروع ہو کر ۲۱ ستمبر ۱۹۱۷ء کو بخیریت ختم ہوا۔ اور صاحبزادہ صاحب لندن میں اول ہوٹل میں اسکے بعد رجمنٹ کی پہاڑی پر ایک مکان لے کر اقامت گزیں ہوئے اور پھر ۲۳ ستمبر ۱۹۱۷ء سے انڈیا کونسل کی ممبری کا جائزہ لیا۔ اور ۲۵ ستمبر کے انڈیا کونسل کے اجلاس میں شریک ہوئے جس میں مسٹر مانٹیگو (وزیر ہند) نے اُن کو خوش آمدید کہا اور اُمید ظاہر کی کہ جو اہم معاملات آئندہ پیش ہونے والے ہیں اُن میں صاحبزادہ صاحب سے بہت مدد ملے گی۔ یہ اجلاس چند منٹ میں ختم ہو گیا تین چار کاغذات تھے جو پڑھے گئے

مسٹر آسٹن چیمبرلین سابق وزیر ہند کے یہاں دعوت

۹ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو مسٹر آسٹن چیمبرلین سابق وزیر ہند نے صاحبزادہ صاحب کو اپنے یہاں مدعو کرتے ہوئے حسب ذیل خط لکھا:۔

"اگرچہ اب میں وزیر ہند نہیں ہوں اور اسی لئے انڈیا آفس میں آپ کا خیر مقدم نہ کر سکا لیکن میں چاہتا ہوں کہ انگلستان میں آپ کے آنے کے متعلق آپ کا خیر مقدم کروں۔ پس براہ مہربانی آج آپ میرے ساتھ کھانا کھائیں"۔ ایک بجے صاحبزادہ صاحب مسٹر آسٹن چیمبرلین کے مکان پر گئے۔ وہ نہایت مہربانی سے ملے۔ مسٹر چیمبرلین، ان کی بیوی اور صاحبزادہ صاحب نے ساتھ کھانا کھایا۔ باتیں ہوتی رہیں۔ صاحبزادہ صاحب آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے رہے۔ اس گفتگو میں یہ اندازہ ہوا کہ مسٹر چیمبرلین کو ہندوستان سے اچھی طرح واقفیت نہ تھی۔ مگر وہ انتہا درجہ کے شریف اور خلیق تھے۔

کونسل کا خاص اجلاس اور مسٹر مانٹیگو کی ہندوستان کو روانگی

۱۹ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو کونسل کا خاص جلسہ ہوا۔ اسلئے اب مسٹر مانٹیگو وزیر ہند مع چند انگریز افسروں کے ہندوستان آرہے تھے۔ یہ خاص جلسہ اس لئے کیا گیا تھا کہ گورنمنٹ ہند کے مراسلہ مورخہ ۲۴ نومبر ۱۹۱۶ء موسومہ وزیر ہند کے جواب کا مسودہ اُس میں منظوری کے لئے پیش کرنا تھا۔ مسٹر مانٹیگو نے اس موقع پر نہایت اہم

تقریر کی جس کا خلاصہ درج ذیل ہے :-

"میں وائسرائے کے بلانے پر ہندوستان جارہا ہوں۔ میرے ہندوستان پہونچنے پر وائسرائے کے اثر و اختیارات پر کچھ اثر نہ پڑے گا۔ یہ حالت نہایت نازک اور پیچیدہ ہے اور مجھ کو کچھ معلوم نہیں کہ جس مقصد سے میں ہندوستان جارہا ہوں اس میں کامیابی ہوگی یا نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے انگریز اور ہندوستانی جو واقعی دل سے اور صداقت کے ساتھ ملک کی خدمت کرنے کو آمادہ ہوں۔ باہم مل کر مسئلہ ہند کے حل کرنے میں سعی کریں مسز اینی بسینٹ جس وجہ اور جس غرض سے انڈین نیشنل کانگریس کی پریسیڈنٹ منتخب ہوئی تھیں وہ ہم کو معلوم تھا۔ لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ مسٹر محمد علی (مرحوم) مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے ہیں۔ اس سے جو حالت پیدا ہوگی وہ ظاہر ہے۔ مسز بسینٹ تو محض اس وجہ سے نظر بند کی گئی تھیں کہ ان کا طریقہ پسندیدہ نہ تھا۔ لیکن جن لوگوں نے ہمارے دشمنوں سے ساز کیا ہو ان کی حالت مسز بسینٹ سے قطعی جداگانہ ہے۔ گورنمنٹ ہند نے ۲۴ نومبر ۱۹۱۶ء کا مراسلہ جن حالات کے لحاظ سے تیار کیا تھا ان حالات میں بہت کچھ اب تک تبدیلی واقع ہوچکی ہے اور اب خود وائسرائے کا بھی یہ خیال ہے کہ اصلاحات کے مسئلہ پر موجودہ حالات کے لحاظ سے غور ہونا چاہئے۔ ریفارم کمیٹی نے سر ولیم ڈیوک کی صدارت میں نہایت عمدگی سے کام انجام دیا ہے۔ میں بہت مشکور ہوں کہ اس کمیٹی نے اصلاحات کے متعلق جو رپورٹ تیار کی ہے وہ ممبران کونسل کو دی جائے گی۔ اور ممبران کو چاہئے کہ اس عرصہ میں وہ اس مسئلہ پر غور کریں اور جو کچھ اصلاح ان کی رائے میں مناسب ہو اُس سے مجھے میری واپسی پر مطلع کریں۔"

مسٹر مانٹیگو کی مندرجہ بالا تقریر سے ظاہر ہے کہ وہ مسٹر (مولانا) محمد علی کو مسز بسینٹ سے زیادہ خطرناک سمجھتے تھے۔ اس لئے مولانا محمد علی کی رہائی کم سے کم اختتام جنگ تک قریب قریب ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ اس سے صاحبزادہ صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ مسز بسینٹ کا رہا ہونا اور مسٹر محمد علی کا بدستور نظر بند رکھا جانا کوئی عاقلانہ پالیسی نہ ہوسکتی تھی۔ کیونکہ اس سے ہندوستان

کی کل مسلم جماعت یہ نتیجہ نکالے گی کہ گورنمنٹ کو ہندوؤں کی رعایت منظور ہے اور مسلمانوں کے ساتھ خاص سختی مدنظر ہے۔

انڈیا آفس کے سردفتر کی رائے

ممبری کے کام کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ انڈیا کونسل کا سردفتر پہلے دن صاحبزادہ صاحب کے پاس مسلوں کا ایک انبار دستخط کرانے لایا تو صاحبزادہ صاحب نے حیرت سے کہا کہ اتنے بہت سے کاغذات پر میں اس وقت کیسے دستخط کرسکتا ہوں۔ سردفتر نے کہا کہ یہاں تو اسی طرح دستخط ہوتے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب نے فرمایا کہ کاغذات چھوڑ جائیے میں تو انھیں پڑھے بغیر دستخط نہ کروں گا۔ سردفتر کاغذات چھوڑ گیا مگر اس نے اپنے دل میں کہا کہ میں بھی دیکھوں گا کہ یہ ہر کاغذ کو کس طرح پڑھیں گے۔ مگر چند روز بعد اُس نے دیکھا کہ صاحبزادہ صاحب نہ صرف مسلوں کے پڑھنے پر اکتفا کرتے ہیں بلکہ لمبی لمبی یادداشتیں لکھتے ہیں۔ یہ واقعہ سردفتر نے مسٹر پی ڈبلو مارشل سابق کلکٹر علی گڈھ سے بیان کیا جبکہ وہ انگلستان گئے ہوئے تھے۔ اور دوران جنگ میں مثل بعض دیگر سویلین کے انڈیا آفس میں کام کیا کرتے تھے اور مسٹر مارشل نے علی گڈھ کے اس جلسہ میں بیان کیا جو صاحبزادہ صاحب کے انتقال کے بعد باشندگان شہر و ضلع کی طرف سے بطور جلسہ تعزیت مسٹر مارشل کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔

حکومت ہند کو محصول لگانے میں آزادی دی جائے

دسمبر ۱۹۱۷ء سے پہلے صاحبزادہ صاحب بجائے تین کمیٹیوں کے چھ کمیٹیوں کے ممبر ہوچکے تھے۔ چونکہ کام بہت کرتے تھے اس لئے آنکھوں میں آشوب ہوگیا تھا۔ یکم دسمبر کو انھیں فنانس کمیٹی کی رپورٹ کا مسودہ ملا۔ یہ کمیٹی ریفارم اسکیم پر غور کرنے کے لئے مقرر ہوئی تھی۔ صاحبزادہ صاحب نے اس کمیٹی کے جلسہ میں زور دیا کہ

ہندوستان کے باشندوں کو مالی معاملات میں قطعی آزادی ملنی چاہیئے اور اس وقت کم سے کم اتنا ضرور ہونا چاہیئے کہ ٹیکس کی تشخیص کی منظوری میں گورنمنٹ ہند کا پورا اختیار ہو اور سکرٹیری آف اسٹیٹ کی منظوری لازمی نہ ہو۔ صاحبزادہ صاحب سے سب انگریز ممبروں نے اس معاملہ میں اختلاف کیا۔ البتہ ہندوستانی ممبر سر پربھاشنکر پٹنی صاحبزادہ صاحب کے ساتھ رہے۔ رپورٹ کے مسودہ میں یہ لکھا گیا کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو ٹیکس کے معاملہ میں کثرت رائے سے اختلاف ہے۔ اور وہ علیحدہ نوٹ لکھیں گے۔ چنانچہ صاحبزادہ صاحب نے باوجود آشوب چشم کی تکلیف کے نوٹ لکھا۔ آنکھ میں دوا ڈالتے جاتے تھے اور نوٹ لکھتے جاتے تھے۔

اِس نوٹ کے دو حصّے تھے۔ پہلے حصّہ میں یہ دکھایا گیا تھا کہ حال میں وزیر ہند نے ہندوستان کی گورنمنٹ میں اصلاح اور رعایا کو حقوق دینے کے متعلق جو اعلان کیا ہے اُس کے مطابق گورنمنٹ نے یہ ذمہ لیا ہے کہ خود مختار طرز حکومت بتدریج ہندوستان میں قائم کی جائے گی۔ چونکہ ٹیکس کے متعلق رعایا کو خود اختیاری حکومت کے لیے محض ابتدائی حق ہے۔ اس لئے اس معاملہ میں کچھ نہ کچھ معقول حق رعایا کو ملنا چاہیئے۔ اس کے بعد ہندوستان کے باشندوں کی خواہشات کا ذکر کر کے اس بات پر زور دیا کہ گورنمنٹ ہند خود انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس لئے اس کو اختیار دینے میں انگلستان کے باشندوں کے اغراض و مقاصد خطرہ میں نہ ہو سکتے تھے۔

دوسرے حصہ میں مخالفین کے اُن اعتراضات کا جواب دیا جو موجودہ قانون کی بنا پر کئے جاتے تھے۔ انگریز ممبران کی بحث یہ تھی کہ پارلیمنٹ کی طرف سے ہندوستان کی گورنمنٹ کے متعلق ذمہ داری وزیر ہند (سکرٹیری آف اسٹیٹ) پر تھی اس لئے وزیر ہند ٹیکس لگانے کے متعلق گورنمنٹ ہند کو اختیار نہیں دے سکتا لیکن صاحبزادہ صاحب نے قانون کی دفعات کی بنا پر وضاحت کے ساتھ اپنے اختلافی نوٹ کے اس دوسرے

حصہ میں دکھلا دیا کہ وزیر ہند ایسا کر سکتا تھا۔

۳ر دسمبر کو فنانس کمیٹی کا پھر جلسہ ہوا اور اس میں صاحبزادہ صاحب کا اختلافی نوٹ پڑھا گیا۔ اس کے متعلق بہت دیر تک بحث ہوتی رہی۔ بڑے بڑے لائق انگریز مخالف تھے۔ لیکن کسی کو صاحبزادہ صاحب کے اعتراضات کا جواب بن نہ آیا۔ کبھی کچھ کہتے تھے کبھی کچھ۔ مگر چونکہ ان کی کثرت تھی اس لئے انھوں نے صاحبزادہ صاحب کی رائے نہ مانی۔ سر پربھاشنکر نے صاحبزادہ صاحب کا آخر تک ساتھ دیا۔ اور صاحبزادہ صاحب کے اختلافی نوٹ پر اپنے دستخط بھی کر دئے۔ صاحبزادہ صاحب نے اپنے روزنامچہ میں لکھا ہے :-

"مجھکو انگریز ممبروں کی ہٹ دھرمی پر افسوس ہوا اس سے اُن کی خود غرضی، تنگ دلی اور کوتاہ اندیشی ثابت ہوئی۔ اسی قسم کے تنگ خیالات اور کوتاہ اندیشیوں کی وجہ سے اِن لوگوں نے امریکہ کھویا تھا اور اسی قسم کی پالیسی کا ہندوستان پر بھی بُرا اثر پڑے گا۔ بہرحال مجھ سے جہاں تک ہو سکے گا میں پرائیوٹ طور پر مل کر ان حضرات کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ گو کچھ اثر ہونے کی مجھے اُمید نہیں ہے۔"

مرکزی گورنمنٹ ہند اور صوبجات کے درمیان مالی تعلقات

اس زمانہ میں ریفارم اسکیم کے سلسلہ میں مالی امور کے متعلق سب سے زیادہ اہم سوال یہ تھا کہ مرکزی حکومت ہند اور مختلف صوبجات کے درمیان کس قسم کے تعلقات ہونے چاہئیں۔ اس مسئلہ پر ۲ دو اسکیمیں تیار کی گئیں۔ ایک اسکیم تو گورنمنٹ ہند نے تیار کی تھی اور دوسری مسٹر برونیٹ نے۔ کونسل کے انگریز ممبر اور افسران مسٹر برونیٹ کی اسکیم کے مداح اور دل دادہ تھے۔ کیونکہ اس اسکیم ذریعہ سے ہندوستان کو کچھ بھی نئے حقوق نہ ملتے تھے۔ لیکن گورنمنٹ ہند کی اسکیم میں ہندوستان کو کچھ حقوق دینے کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ صاحبزادہ صاحب نے مسٹر برونیٹ کی

اسکیم سے سخت اختلاف کیا اور انتیس ۲۹ صفحات کے نوٹ میں پوری تفصیل کے ساتھ
مسٹر برونیٹ کی اسکیم کے نقائص دکھلائے اور گورنمنٹ آف انڈیا کی اسکیم کو ترجیح دی
اور پورے طور پر مسٹر گوکھلے کی اس تجویز کی تائید کی جو انھوں نے اپنے مرنے سے پہلے
تیار کی تھی اور جو گذشتہ اگست میں ہز ہائی نس سر آغا خاں نے شائع کی تھی۔ لیکن
سر پر بھاشنکر کی یہ کوشش تھی کہ وہ انگریزوں کو بھی خوش رکھیں اور اپنے ملک ہندوستان
کے لوگوں کو بھی مطمئن کر دیں۔ مگر دونوں فریق کا خوش کرنا مشکل تھا۔ جب اس مسئلہ پر
کونسل میں بحث ہوئی تو انگریز ممبروں نے تو یہ کوشش کی کہ سر پر بھاشنکر کو لفظوں
کے ہیر پھیر میں لاکر اپنے موافق کر لیں اور سر پر بھاشنکر اِس فکر میں رہے کہ وہ انگریزوں
کو اپنے موافق کر لیں۔ صاحبزادہ صاحب خاموش بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے۔ آخر کار جلسہ
ملتوی ہو گیا۔ صاحبزادہ صاحب لکھتے ہیں:۔ ”غالباً اس قسم کی تدبیروں سے سر پر بھاشنکر کو
ہندوستانی ریاستوں میں کامیابی ہوتی ہوگی۔ لیکن یہاں تو اُن لوگوں سے مقابلہ ہے
جو ہم سے قابلیت اور قوت دونوں میں زیادہ ہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ میری ناچیز
رائے میں بہترین پالیسی یہی ہے کہ اپنا خیال نہایت صفائی کے ساتھ بیان کر دیا جائے
بہرحال یہ پالیسی بہترین ہو یا نہ ہو مجھ کو تو اس طریق کے سوا اور کوئی طریقہ معلوم نہیں۔
اور نہ میں اس کے سوا اور کسی راہ پر چل سکتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن لوگوں نے
۲۰ ر اگست ۱۹۱۷ء کو اعلان تو کر دیا کہ وہ ہندوستان کو خود مختار حکومت دینا چاہتے
ہیں۔ لیکن اب جب کہ عملاً حقوق دینے کا وقت آیا تو تدبیروں اور لفظی بھول بھلیوں کے
ذریعہ ضمنی اور فروعی باتوں سے کام نکالنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ طریقہ اچھا نہیں ہے۔
اس کا انجام نیک نہیں۔ سر پر بھاشنکر اپنی پالیسی پر قائم رہے اور دوسرے جلسہ میں
جو ۳ر جنوری ۱۹۱۸ء کو ہوا انگریز ممبروں نے انھیں اپنے موافق کر لیا۔“

الیسٹ انڈین ریلوے کو سرکاری انتظام میں لینے کا سوال

صاحبزادہ صاحب نے الیسٹ انڈین ریلوے کے متعلق مسل دیکھی۔ معاہدہ کے بموجب ۱۹۱۹ء میں اس کمپنی کی میعاد ختم ہو جانے والی تھی۔
اب سوال یہ تھا کہ آئندہ گورنمنٹ ہند یہ ریلوے اپنے انتظام میں لے لے یا کمپنی سے نیا معاہدہ کرے۔ ہندوستان کی پبلک کی رائے کمپنی کے خلاف تھی لیکن ریلوے بورڈ بڑے شد و مد کے ساتھ کمپنی کے موافق تھا۔ مگر اب گورنمنٹ آف انڈیا نے بڑے زور کے ساتھ کمپنی کے خلاف انڈیا آفس کو مراسلہ بھیجا تھا اور یہ مسئلہ اُس وقت انگلستان کی پبلک ورکس کمیٹی کے سامنے تھا۔ یقینی بات تھی کہ انگریز ممبران خصوصاً سرلاینل ابراہام (Sir Lionel Abraham) کمپنی کے موافق رائے دیتے۔ لیکن صاحبزادہ صاحب نے قصد کیا کہ وہ گورنمنٹ ہند اور ہندوستانی پبلک کی رائے کی تائید کریں۔

۲۹ر جنوری کو ریلوے کمپنی کا مسئلہ پبلک ورکس کمیٹی میں پیش ہوا جیسا کہ خیال تھا سب کے سب انگریز ممبر گورنمنٹ ہند کے مراسلہ کے خلاف تھے۔ بہت دیر تک اس بات پر بحث رہی کہ قطعی رائے دینے سے پہلے انگلستان کے ماہرین بلا کر ان کی رائے لی جائے لیکن سرلاینل ابراہام نے اس سے بھی اختلاف کر کے یہ تحریک کی کہ "فی الحال یہ مسئلہ ملتوی کیا جائے کیونکہ جنگ کی وجہ سے حالت ایسی نہ تھی کہ اس قدر اہم معاملہ کے متعلق صحیح رائے قائم کی جاسکے۔ سردست کچھ عرصہ کے واسطے کمپنی کے معاہدہ کی تجدید کر دی جائے"۔ لیکن صاحبزادہ صاحب نے اس رائے کی سخت مخالفت کی اور کمیٹی کو جتلایا کہ گورنمنٹ ہند نے اس معاملہ کے متعلق پوری تحقیقات کر کے ہندوستان میں رائے لے کر ایک آخری تجویز پیش کی ہے اور یہ سب کچھ گورنمنٹ نے خود سکریٹری آف اسٹیٹ کے مراسلہ مورخہ ۱۹ر نومبر ۱۹۱۵ء کی تعمیل میں کیا ہے۔ جب سکریٹری آف اسٹیٹ کی تحریک پر یہ کارروائی ہوئی تھی تو اب اس کو ملتوی کرنے کے کیا معنی ہیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو ہندوستان کے لوگ

یقیناً یہ نتیجہ نکالیں گے کہ چونکہ گورنمنٹ ہند کی رائے ہندوستانی پبلک کے موافق ہے اسلئے یہ کُل مسئلہ ٹالا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ صاحبزادہ صاحب نے بہت بحث کی لیکن نتیجہ کچھ نہ ہوا۔ صاحبزادہ صاحب روزنامچہ میں لکھتے ہیں :۔

"یہ لوگ اپنے مطلب کی وجہ سے کچھ نہیں دیکھتے۔ حق وناحق کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ گورنمنٹ ہند کو چونکہ واقعات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اس لئے وہ ہندوستانیوں کے حقوق کا کچھ خیال کرتی ہے۔ مگر یہاں کے اصحاب امن چین سے یہاں بیٹھے ہوئے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ چنانچہ تجویز یہ ہوئی ہے کہ اس مضمون کا تار مسٹر مانٹیگو کو بھیجا جائے لیکن میں نے اکثریت کی رائے کے خلاف اپنی رائے لکھ کر دے دی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس کل مسئلہ پر مفصل نوٹ لکھ کر پیش کروں گا۔" چنانچہ صاحبزادہ صاحب نے ایسا ہی کیا۔ یہ نوٹ اکتیس صفحات سے زیادہ پر ہے۔ جس میں نہایت تفصیل کے ساتھ مسئلہ زیر بحث کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس نوٹ کی نقل موجود ہے اور اس قابل ہے کہ اس کو علیحدہ شائع کیا جائے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ آخر کار ایسٹ انڈیا کمپنی سے میعاد مقررہ کے بعد جدید معاہدہ نہیں کیا گیا۔ اور یہ مشہور اور بڑی ریلوے گورنمنٹ کے براہ راست زیر انتظام آ گئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اس ریلوے پر ہندو مسلم ملازمین کی تعداد خاصی ہو گئی ہے۔ اگر یہ انتظام نہ ہوا ہوتا تو کمپنی اپنے اصول کے موافق حسب معمول اینگلو انڈین کو ہی اجارہ دار بنائے رکھتی۔

امریکہ سے چاندی کی خرید کا مسئلہ

انڈیا کونسل کی ممبری سے صاحبزادہ صاحب کو روز بروز نئی باتوں سے جن کا تعلق انگلستان اور ہندوستان کے باہمی انتظامات سے تھا آگاہی اور آگاہی کے ساتھ ان کی حیرت بڑھتی چلی جاتی تھی۔ چاندی کی خرید کا مسئلہ بھی انہیں مسائل میں سے تھا۔ صاحبزادہ صاحب لکھتے ہیں :۔

۵ مارچ ۱۹۱۸ء کے اجلاس میں ایک مسئلہ یہ پیش تھا کہ امریکہ سے جو انگلستان کیلئے چاندی خریدی جاتی ہے اس پر پریمیم (Premium) (بڑھوتری) ادا کی جاتی ہے تاکہ لندن میں چاندی کا نرخ گراں نہ ہو جائے۔ سر پربھاشنکر سے جو آجکل فنانس کمیٹی کے ممبر ہیں معلوم ہوا کہ یہ پریمیم ہندوستان کے خزانہ سے دیا جاتا ہے اور لطف یہ ہے کہ جو چاندی یہاں آتی ہے اس میں سے انگلستان کی ٹکسال اور فرانس کی ٹکسال میں بھی جاتی ہے۔ ہندوستان کے ذریعہ سے نرخ ارزاں کرایا جاتا ہے اور اس سے فائدہ فرانس اور انگلستان اُٹھاتے ہیں۔ سر پربھاشنکر نے اس پر اعتراض کیا اور میں نے بھی اعتراض کیا لیکن یہ لوگ اس کی مطلق پروا بھی نہیں کرتے اور خود غرضی نے اُن کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ آخر اس قسم کی شرمناک کارروائیاں وہ کب تک کر سکیں گے۔ اب انگلستان کی ٹکسال کو لکھا گیا ہے کہ آئندہ سب خریدار حصہ رسدی پریمیم ادا کیا کریں لیکن آخر میں اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اور یہی طے کیا گیا کہ حسب دستور سابق پریمیم ہندوستان ہی کے خزانہ سے دیا جایا کرے۔"

ہندوستان میں ہوم رول کی تحریک کی بابت صاحبزادہ صاحب کی رائے

اس متذکرہ بالا خیال کی تائید میں ہم ایک واقعہ خود صاحبزادہ صاحب کے قلم کا لکھا ہوا ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

"۳ مارچ ۱۹۱۸ء کو بمبئی کے بیرسٹر مسٹر بیپٹسٹا (Baptista) سے ملاقات ہوئی۔ آپ آجکل ہوم رول کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ مسٹر تلک کے بڑے مداح اور ان کے پیرو ہیں۔ بہت دیر تک ہندوستان کی سیاسیات پر باتیں ہوتی رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کے متعلق یہاں آکر اور انگریزوں کا انڈیا آفس میں طرز عمل دیکھ کر میرے خیالات میں بہت کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔ انگریز عہدہ دار سخت تنگ دل ہیں اور ہندوستانیوں کو جائز حقوق دینا نہیں چاہتے۔ اصل بات یہ ہے

کہ قوت اور اختیار اپنے قبضہ سے کوئی بھی دینا نہیں چاہتا۔ یہ فطرت انسانی میں داخل ہے کہ خوشی سے اپنے اختیار میں کوئی بھی کمی نہیں چاہتا۔ دنیا کی تاریخ میں غالباً جاپان نے یہ مثال ضرور قائم کی ہے کہ اس کے با اختیار اور باقوت طبقوں نے اپنے اختیارات بخوشی ملک کے حوالہ کردئے ورنہ میرے علم میں اور کوئی دوسری مثال ایسی نہیں ہے۔ بہرحال انگریز اپنے اختیارات چھوڑنا نہیں چاہتے۔ چونکہ اس وقت تک عام طور پر ہندوستانی ناسمجھ اور ناواقف تھے اس لئے انگریز اس کے عادی ہوگئے کہ محض باتوں میں ان کو ٹال دیں۔ ۱۸۳۳ء کے ایکٹ میں جو حقوق دئے گئے یا ۱۸۵۸ء کے اعلان شاہی میں جو وعدے اور مراعات کئے اور دئے گئے وہ سب اس وقت تک بے اثر رکھے گئے ہیں۔ اس کا اصلی سبب یہی ہے کہ خود ہندوستانیوں میں اپنے حقوق کی حفاظت کی قابلیت نہیں تھی۔ لیکن اب رفتہ رفتہ جس قدر قابلیت آتی جاتی ہے اس کے مطابق نئے حقوق ملنے کا سامان ہوتا جاتا ہے۔ اس جنگ نے دنیا کی آنکھیں کھول دیں اور اس نازک وقت میں ہندوستان نے سلطنت کی جو خدمت کی ہے اس کا بہت کچھ اثر اس ملک میں ہوا ہے لیکن ہندوستان کے انگریز عہدیداروں پر کچھ اثر معلوم نہیں ہوتا۔ نیز انڈیا آفس کے جو انگریز عہدیدار ہیں ان پر بھی کچھ اثر نہیں ہے۔ یہ سب اب بھی باتوں میں ٹالنا چاہتے ہیں۔ ان حالات کے لحاظ سے ہوم رول کی تحریک بے موقع نہیں معلوم ہوتی۔ گذشتہ اگست میں گورنمنٹ کا نئی پالیسی کے متعلق اعلان اسی تحریک کا نتیجہ ہے۔"

ہندوستان کی خام پیداوار پر بندشیں

صاحبزادہ صاحب نے وہ رپورٹیں پڑھیں جو ہندوستان کی خام پیداوار کے متعلق امپیریل انسٹیٹیوٹ نے تیار کی تھیں۔ یہ رپورٹیں پڑھ کر وہ حیران رہ گئے۔ اُن کو یہ اُمید تھی کہ جنگ کے بعد ہندوستان کی صنعت و حرفت کو ترقی دی جائے گی لیکن انگلستان میں یہ فکریں ہو رہی تھیں کہ ایسی تدبیریں کی جائیں جن کے ذریعہ سے ہندوستان کی تمام خام

پیداوار اول تو تمام انگلستان اور اس کی نوآبادیات کے تصرف میں آجائے اور اس سے جو کچھ بچے وہ انگلستان کی اتحادی سلطنتوں کے لئے محفوظ ہو جائے۔ چنانچہ صاحبزادہ صاحب نے فوراً ارادہ کیا کہ مدلل رپورٹ لکھ کر اس سے اختلاف کریں۔ انھوں نے اٹھارہ صفحات کا اختلافی نوٹ لکھا اور سر پربھاشنکر کو دکھلایا۔ جنھوں نے اس سے قطعی اتفاق کیا۔ چونکہ سر پربھاشنکر ہندوستانی ممبر تھے۔ اس لئے صاحبزادہ صاحب ان سے مل کر کام کرنا چاہتے تھے اور اکثر بڑے اہم معاملات میں ان کا ساتھ دیتے تھے۔ ۱۹ مارچ کی ریونیو کمیٹی میں صاحبزادہ صاحب کا یہ اختلافی نوٹ پیش ہوا۔ سرٹی ہولڈرنس اور لارڈ ای لنگٹن نے صاحبزادہ صاحب پر زور ڈالنے کی بہت کوشش کی لیکن انھوں نے صاف کہہ دیا کہ جب کہ کمیٹیوں نے ہندوستان کے مقاصد قطعاً نظرانداز کر کے محض انگلستان کے تجارتی نفع اور مقصد کو ترقی دینے کی کوشش کی ہے۔ تو پھر اس کے متعلق خرچ کا بار ہندوستان پر کیوں ڈالا جائے۔ اصل میں اس وقت عدن کے سابق ریزیڈنٹ کی ریزیڈنسی کی بجلی کی روشنی کے صرفہ سے بحث کی تھی جس کی رقم حسب معاہدہ بمبئی گورنمنٹ کو ادا نہیں کی گئی تھی۔ اور اب یہ بحث تھی کہ یا تو وہ رقم قطعی معاف کر دی جائے یا اس میں بہت کچھ تخفیف کر دی جائے اور بمبئی کی گورنمنٹ بقدر تیس ہزار روپیہ کے خسارہ برداشت کرے۔ صاحبزادہ صاحب لکھتے ہیں :-

"غضب خدا کا کہ تجاویز تو وہ ہوں جن سے ہندوستان کا قطعاً نقصان اور انگلستان اور نوآبادیوں کا سراسر نفع ہو۔ اور اس سب کارروائی کے متعلق روشنی کے لئے تیس ہزار روپیہ کے خرچ کا بار ہندوستان پر ڈالا جائے۔ آج کل ہندوستان میں صنعتی کمیشن (Industrial Commission) تحقیقات کر رہا ہے۔ اس کا خرچ علیحدہ اور یہاں ان کمیٹیوں کا خرچ مزید براں۔ اصل میں مجھے صرف خرچ کا خیال نہیں بلکہ سخت اندیشہ یہ ہے کہ انڈسٹریل کمیشن کی تجاویز کی تکمیل کو تو مدت چاہئے اور

یہاں پیشتر ہی سے ہندوستان کی مختلف قسم کی خام پیداوار کے متعلق انگریزوں کو اس قسم کے حقوق دیے جائیں گے کہ جب انڈسٹریل کمیشن کی تجاویز پر عمل کا وقت آئے گا تو کہا جائے گا کہ فلاں فلاں امور کی نسبت تو ہمارے حقوق پیشتر سے قائم ہیں اسلئے ان کی بابت کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح چاندی کی (Premium) پریمیم کے متعلق پندرہ لاکھ روپئے کا بار مفت ہندوستان پر ڈالا جا چکا ہے۔ سر پربھاشنکر نے اور میں نے ہرچند حجت کی لیکن کچھ نتیجہ نہ ہوا اور خود غرض انگریز ممبروں نے کچھ نہ سنا اور کثرت رائے انھیں کی ہے اور خود غرضی انھیں کچھ نہیں دیکھنے دیتی۔ اس ملک کی اخلاقی حالت میں بہت ضعف آگیا ہے۔ افسوس ہے کہ کونسل میں جو انگریز ہیں وہ اچھے نمونہ کے نہیں ہیں۔ نہ کچھ قابل ہیں نہ اصول رکھتے ہیں نہ اخلاق کے متعلق انھیں کافی احساس ہے۔ جب حکمراں قوم میں ایسی پست خیالی اور خود غرضی راسخ ہو جائے تو قومی اقبال قائم رہنا مشکل ہے۔ انھیں نہ خدا کا خوف ہے نہ اخلاقی حیا ہے۔ ہندوستان بیچارہ ایک مفلس ملک اور اس کے سرمایہ کے یہ لوگ امین ہیں۔ امانت کو نہ صرف اپنے نفع کے لئے صرف کرنا بلکہ دنیا بھر کے ساتھ ہندوستان کے سرمایہ پر فیاضی کرنا حد سے بڑھی ہوئی نازیبا اور اور نامناسب کارروائی ہے۔

" ہر روز کوئی نہ کوئی مسئلہ ایسا آتا ہے جس میں مجھ کو دوسرے ممبروں سے اختلاف کرنا پڑتا ہے۔ انگریز ممبروں پر ہندوستان کے متعلق جو ذمہ داری ہے اس کا مطلق خیال نہیں کرتے بلکہ سب کے سب اپنے قومی فائدہ کے نقطۂ خیال سے ہر ایک مسئلہ کے متعلق رائے دیتے ہیں۔ اس دفتر کی پالیسی ہندوستان کے مقاصد کا کچھ لحاظ نہیں کرتی بلکہ محض اس ملک کے لوگوں کے نفع کو مدنظر رکھتی ہے۔

" اس زمانہ میں متعدد اہم امور کے متعلق میں نے نوٹ لکھے ہیں۔ اسٹورس ڈیپارٹمنٹ یعنی خرید سامان کے محکمہ کے ایک بڑے معاملہ کی نسبت ایک نوٹ لکھا اور پھر اس کی

تائید میں گذشتہ اجلاس کونسل میں تقریر کی جس کا اثر ہوا۔ ایک بڑا اہم مسئلہ اس عرصہ میں یہ پیش ہوا کہ برٹش گورنمنٹ اس پر آمادہ ہے کہ اپنے ملک یعنی انگلستان کی صنعت وحرفت کو ترقی دینے کے لئے پروٹکٹو ڈیوٹیز (Protective Duties) (حفاظتی محصول) نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ ہندوستان میں بھی قائم کرے۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ ہندوستان کی جس قدر پیداوار ہے وہ کسی غیر ملک کو نہ بھیجی جائے گی بلکہ سب انگلستان اور اس کے ملحقہ ممالک کے لئے مخصوص کر دی جائے گی۔ یہ بھی تجویز ہے کہ دیگر ممالک کی مصنوعات ہندوستان میں نہ آئیں بلکہ صرف انگلستان کی آئیں۔

اس پر صاحبزادہ صاحب نے لکھا کہ "غضب ہے کہ انگلستان کے دولتمندوں کو ہندوستان کے غربا کی کمائی کے ذریعہ اور زیادہ امیر بنایا جاتا ہے۔ اُسے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنا مال بجز انگلستان کے کسی کے ہاتھ فروخت نہ کرے اور نہ کسی ملک سے سستا مال خرید سکے۔ ہندوستان کا نفع اس میں ہے کہ جن اشیاء کی ضرورت خود یہاں کے صنعتی کاموں کے لئے ہے اُن کی برآمد پر محصول لگائے اور بیرونی ممالک کی مصنوعات کی درآمد پر محصول قائم کرے۔" صاحبزادہ صاحب نے لکھا کہ "انگلستان کے لوگ چاہتے ہیں کہ ہر طرح سے انگلستان ہی کی صنعت وحرفت کو ترقی ہو۔ خواہ اس سے ہندوستان کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔ شاید قابل غور امر یہ ہے کہ سالہا سال سے ہندوستان کے لوگ واویلا کر رہے تھے کہ ہندوستان کی صنعت وحرفت دوسرے ممالک کی مصنوعات کی وجہ سے تباہ ہو رہی ہے اور ہندوستان میں صنعت وحرفت کو ترقی دینے کے لئے ضروری ہے کہ (حفاظت) پروٹیکشن (Protection) کے اصول پر عمل کیا جائے مگر برٹش گورنمنٹ نے ہمیشہ اس کی مخالفت اس بنا پر کی کہ سلطنت برطانیہ میں (فری ٹریڈ۔ Free-Trade) آزاد تجارت کے اصول پر عمل درآمد ہے لیکن اب خود اپنے ملک کے لئے فری ٹریڈ، کو بالائے طاق رکھ کر پروٹیکشن (حفاظت) پر عمل درآمد ہونے والا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب کہ پروٹیکشن کی ضرورت تسلیم کر لی گئی تو پھر ہندوستان کو یہ اجازت کیوں نہ ہو کہ وہ اپنے تحفظ کے لئے پروٹیکشن قائم کرے لیکن ہندوستان کو تو اجازت نہیں۔ برخلاف اس کے انگلستان کے نفع کے لئے پروٹیکشن خود ہندوستان میں قائم ہونا تجویز ہوا ہے - میں نے اس کے خلاف نوٹ لکھے ہیں۔ دو لکھ چکا ہوں ایک اور لکھنے والا ہوں۔ مجھ کو اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ مجھ کو کامل یقین ہے کہ گورنمنٹ سراسر غلطی پر ہے۔ اس پالیسی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان میں گورنمنٹ کے خلاف خیالات پیدا ہوں گے۔ انتہا پسند (Extremist) تحریک کو یقیناً تقویت ہوگی کیونکہ اس پالیسی سے گورنمنٹ کی نیت اور خود غرضی کی نسبت سخت خیالات پیدا ہوں گے اور انتہا پسندوں کے ہاتھ میں یہ بڑا با اثر ہتھیار ہوگا۔ مگر گورنمنٹ اور انگریز اپنے مطلب میں ڈوبے ہوئے ہیں اور انجام کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ یہ ضرور ہے کہ اسوقت اور ابھی مدت تک اُن کے ہاتھ میں قوت ہے اور جو پالیسی چاہیں اس کو نافذ کر سکتے ہیں مگر آخر حق و ناحق کا خیال بھی ضروری ہے۔ خوف خدا بھی چاہیئے۔ خود غرضی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔"

اسی سوال کی مزید تصریح صاحبزادہ صاحب نے مئی کے روزنامچہ میں حسب ذیل کی ہے:-

بالفور کمیٹی (Balfour Committee) نے جو تجاویز ہندوستان میں درآمد اور برآمد کے محصولات کے متعلق قائم کی ہیں اور جو منظور ہونے والی ہیں اُن پر میں نے اختلافی نوٹ لکھا ہے۔ تجویز یہ ہے کہ جنگ کے بعد یہ قانون نافذ کیا جائے۔ ہندوستان کی جس قدر پیداوار ہے وہ جرمنی وغیرہ بالکل نہ جائے اور دوسرے ملک اگر خریدنا چاہیں تو پچیس فیصدی برآمد پر محصول ادا کرنے پر خرید سکیں لیکن انگلستان اور اس کی نوآبادیات بغیر کسی محصول دیئے خرید سکیں۔ غرضکہ ہندوستان کی جس قدر پیداوار ہے

وہ انگلستان کے لئے مخصوص اور محدود کر دی جائے۔ اسی طرح جرمنی اور دوسرے غیر ملکوں کی مصنوعات اور پیداوار ہندوستان میں کم از کم پانچ سال کے لئے بالکل نہ آسکیں اور دیگر ممالک سے اگر آئیں تو محصول ادا کرنے پر آسکیں۔ لیکن انگلستان اور اس کی نوآبادیات کی مصنوعات ہندوستان میں بغیر کسی قسم کا محصول ادا کئے ہوئے آسکیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان مجبور ہو کر جو کچھ خریدے انگلستان یا اس کی نوآبادیات سے خریدے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں طرح ہندوستان کا نقصان ہوگا۔ اس کے پیداوار کی قیمت میں کمی ہوگی۔ اور جو کچھ وہ خریدے گا اس کے لئے دنیا کے نرخ سے زیادہ انگلستان کے سوداگروں کو ادا کرے گا۔ بس ہر طرح پر ہندوستان کا نقصان اور انگلستان کا نفع ہے :۔

"میں نے ان تجاویز سے سخت اختلاف کیا ہے۔ گزشتہ کمیٹی کے اجلاس میں میرا اختلافی نوٹ پیش ہوا۔ اس میں میں نے رائے دی تھی کہ یہ تجاویز انڈسٹریل کمیشن کے پاس جو آج کل ہندوستان میں تحقیقات کر رہا ہے بھیج دی جائیں اور جب تک ان تجاویز پر کمیشن ہندوستان کی صنعت و حرفت کے نقطۂ نظر سے غور کر کے رائے نہ دے۔ اس وقت تک سکریٹری آف اسٹیٹ کو کوئی قطعی فیصلہ نہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ جب گزشتہ ریویو کمیٹی کے اجلاس میں میرا نوٹ پیش ہوا تو سکریٹری آف اسٹیٹ نے فرمایا کہ مالی پالیسی کا مسئلہ کمیشن کے حدود اختیار سے باہر رکھا گیا ہے اور نیز یہ کہا کہ کمیشن اپنی تحقیقات ختم کر چکا ہے اس لئے اس کے پاس ان تجاویز کا بھیجنا فضول ہے۔ اس پر میں نے کہا اچھا اس وجہ سے کہ ریفارم اسکیم میں مالیات کے متعلق قطعی اختیارات کا سوال نہایت اہم ہوگا تاوقتیکہ وہ طے نہ ہو جائے ابھی سے ہندوستان کی آئندہ مالی پالیسی کے متعلق تجاویز کیوں منظور کی جاتی ہیں" اس لئے میں نے دوسرا نوٹ لکھ کر بھیج دیا جس میں ریفارم اسکیم کی بنیاد پر میں نے اختلاف کیا۔

لیکن میں نے اس حد پر معاملہ ختم نہیں کر دیا بلکہ انڈسٹریل کمیشن کے تقرر کے متعلق سب کاغذات مطالعہ کیے جن سے معلوم ہوا کہ کمیشن کے دائرۂ تحقیقات سے مالی پالیسی کو خارج کرنے کی یہ وجہ ظاہر کی گئی ہے کہ ہز مجسٹی کی گورنمنٹ نے یہ طے کر دیا ہے کہ دوران جنگ میں کوئی ایسی کارروائی جس سے مالی پالیسی کی بحث پیدا ہو نہ کی جائے گی۔ یہ ریزولیوشن دیکھ کر میں نے تیسرا نوٹ تیار کیا ہے جس میں مدلل طور پر ثابت کیا ہے کہ بالفور کمیٹی کی تجاویز کو اس وقت منظور کرنا خود گورنمنٹ کے پبلک اعلان کے خلاف ہوگا۔ نیز وہ نقصانات اختصار کے ساتھ دکھلائے ہیں جو ان تجاویز سے ہندوستان کی تجارت اور صنعت و حرفت کو ہوں گے اور اس عام ناراضی اور بے اعتمادی کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس قسم کی پالیسی سے گورنمنٹ کے متعلق عام رعایا کے دل میں لازمی طور سے پیدا ہوگی۔

"گذشتہ کمیٹی کے جلسہ میں میرا نوٹ پیش ہوا۔ تو حسب معمول سب انگریز ممبروں نے مجھ سے اختلاف کیا لیکن افسوس ہے کہ ہمارے دوست سرپربھاشنکر نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیا اور فرمایا کہ انھوں نے کاغذات نہیں دیکھے ہیں۔ تاہم اُن کو زیبا یہ تھا کہ وہ میرا ساتھ دیتے کیونکہ میں نے تو کاغذات دیکھے تھے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

۴ر مئی شنبہ کے دن میں دفتر گیا اور نوٹ کا مسودہ ختم کر کے صاف کیا۔ شنبہ کو عام طور پر اور ممبر نہیں آتے ہیں نیز سب اہلکار اور چپراسی ایک بجے چلے جاتے ہیں لیکن میں نے ساڑھے چار بجے تک برابر دفتر میں کام کیا۔ ہر روز برابر میں دفتر کو جاتا ہوں اور شام تک کام کرتا ہوں۔ خالق اکبر میری مدد فرمائے اور میری محنت راس لائے۔ اپنے ہموطنوں سے مجھ کو داد یا انعام کی نہ اُمید ہے اور نہ خواہش لیکن جو ذات میری ہر ایک نیت اور ہر ایک فعل سے آگاہ ہے اُس کی خوشنودی کی تمنا ہے اور اس کے فضل پر بھروسہ ہے۔"

۱۴ر مئی کو صاحبزادہ صاحب کا نوٹ کونسل میں پیش ہوا۔ اور بعد مباحثہ یہ طے

پایا کہ گورنمنٹ ہند کو لکھا جائے کہ اس مسئلہ کے متعلق انڈسٹریل کمیشن کی رائے لی جائے اور اس رائے سے اطلاع دی جائے۔ اس حد تک صاحبزادہ صاحب کامیاب ہو گئے۔

یکم اگست ۱۹۱۸ء کو کونسل میں گورنمنٹ ہند کا جواب پیش ہوا۔ جو یہ تھا۔

"کمیشن کے اجلاس ختم ہو چکے اور چونکہ کمیشن جس غرض سے قائم کیا گیا تھا اس میں مال کا سوال شامل نہ تھا اس لئے کمیشن کی رائے لینا مناسب نہ معلوم ہوئی۔"

اس کے بعد یہ تجویز ہوئی کہ بغیر اس کے کہ ہندوستان کے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر غور ہو "نئی پالیسی" نافذ کر دی جائے۔ مگر اب بھی صاحبزادہ صاحب نے اتفاق نہ کیا اور پھر دوسرا اختلافی نوٹ لکھا۔ اس موقع پر نہایت دلی رنج کے ساتھ صاحبزادہ صاحب یہ ریمارک دیتے ہیں:۔

"نہایت افسوس ہے کہ خود غرضی نے ان لوگوں کی عقل اور انصاف کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور انھیں اپنے ملک کے نفع کے لئے ہندوستان کے نقصان کا کچھ خیال نہیں ہے۔ اب یہ تجویز ہے کہ آئندہ سے "رنگ" انگلستان میں بنائے جائیں اور ہندوستان میں دوسرے ملکوں سے رنگ نہ آسکیں بلکہ ہندوستان مجبور ہو کر انگلستان ہی سے خریدے۔ اور طریقہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ آئندہ ہندوستان کی تجارت دوسرے ملکوں سے بغیر لیسنس کے نہ ہو سکے اور ہندوستان کی جو خام پیداوار رنگوں کے بنانے میں کارآمد ہو سکے وہ دوسرے ملکوں میں فروخت نہ ہو۔ بغیر لیسنس کے پیداوار باہر نہ جا سکے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کی تجارت کو اپنے قبضہ میں کر لیا جائے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کی خام پیداوار انگلستان کے سوا کہیں نہ جا سکے۔ اور انگلستان کی مصنوعات ہندوستان کے لئے مخصوص ہو جائیں۔ ہندوستان کی پیداوار کی تجارت محدود کر دینے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ اس کی مانگ کم ہو جائے گی۔ جس سے اس کی قیمت گھٹ جائے گی۔ اور انگلستان کو ارزاں قیمت پر دستیاب ہوگی۔ برخلاف اس کے چونکہ ہندوستان صرف انگلستان کی مصنوعات خریدنے پر مجبور ہوگا اسلئے

اس کو قیمت زیادہ دینی پڑے گی۔ غرضکہ مجوزہ اسکیم سے انگلستان کو دوہرا نفع ہوگا اور ہندوستان کو دوہرا نقصان۔ بہرحال جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا اس میں انشاءاللہ کمی نہ کروں گا گو جو نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے۔"

انڈیا کونسل میں آسٹریلیا کی حقوق طلبی کا سوال

آسٹریلیا کے وزیر اعظم نے دریافت کیا تھا کہ آیا آسٹریلیا کے صیغہ انجینیری کے گریجویٹوں کو جو جنگ کے میدان میں کام کر رہے تھے ہندوستان کے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ یا محکمہ انہار میں عہدے دئے جا سکیں گے اور کیا ایسے گریجویٹ محکمہ انہار کے واسطے ہندوستان میں تیار کئے جا سکیں گے۔ ہندوستان کی گورنمنٹ نے اس کا جواب یہ دیا تھا کہ قواعد کے بموجب کوئی ممانعت نہیں ہے۔ لیکن چونکہ یوروپین لوگوں کے لئے ایسے عہدوں کی کمی ہے اس لئے اُمید نہیں ہے کہ آسٹریلیا کے گریجویٹوں کو جگہ دی جا سکے۔ لیکن آسٹریلیا کے گریجویٹ محکمہ انہار کے واسطے خوسی کے ساتھ تیار کئے جا سکتے ہیں۔

جب یہ کاغذات انڈیا کونسل میں صاحبزادہ صاحب کے سامنے آئے تو انھوں نے نوٹ لکھا کہ جب ہندوستان کے لوگوں کو آسٹریلیا میں گھسنے کی بھی اجازت نہیں ہے تو پھر آسٹریلیا والوں کے ساتھ ایسی رعایت کیوں کی جاتی ہے اور اُس ریزولیوشن کی طرف توجہ دلائی جو اس سے پہلے سال میں امپیریل کانفرنس میں باہمی تعلقات کے متعلق پاس کیا گیا تھا۔ چنانچہ صاحبزادہ صاحب نے یہ رائے دی کہ آسٹریلیا کو باہمی تعلقات والا ریزولیوشن تسلیم کرنا چاہئے۔ پس آسٹریلیا والوں کو چاہئے کہ وہ ہندوستانیوں کو بھی وہی حقوق دیں جو وہ ہندوستان میں خود حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

صاحبزادہ صاحب کو یہ نوٹ لکھ کر لندن سے کئی دن کے لئے باہر جانا پڑا۔ کونسل میں ان کی غیبت میں یہ نوٹ پیش ہوا اور اس کے مطابق مسودہ میں کچھ ترمیم کی گئی۔ لیکن باہمی تعلقات کے رزولیوشن کے متعلق کچھ نہ کیا گیا۔ صاحبزادہ صاحب نے پھر لکھا کہ اس

رزرولیوشن کی طرف ضرور توجہ دلانی چاہئے لیکن کمیٹی نے کچھ خیال نہ کیا۔ جب یہ کاغذات لارڈ آئی لنگٹن کے پاس گئے تو انھوں نے صاحبزادہ صاحب کی رائے سے اتفاق کیا اور مسودہ میں ترمیم کی تجویز کی۔ صاحبزادہ صاحب نے یہ تجویز منظور کرلی لیکن کمیٹی نے پھر اس سے اختلاف کیا۔ آخر ۷ مئی ۱۹۱۸ء کو یہ مسئلہ کونسل میں پیش ہوا۔ صاحبزادہ صاحب نے نہایت مدلل تقریر کی لیکن حسب معمول انگریز ممبران کونسل نے اتفاق نہ کیا اور سر پربھا شنکر نے بھی صاحبزادہ صاحب کا ساتھ نہ دیا۔ وہ انگریز ممبران کے ساتھ ہو گئے۔

برہما میں لعل نکالنے والی کمپنی

ملک برہما میں کان سے لعل نکالنے کی انگریزی کمپنی ۱۸۸۹ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کمپنی کے ساتھ بار بار رعایتیں کی جاتی رہیں یعنی ۱۸۹۶ء میں رعایت کی گئی۔ پھر ۱۹۰۵ء میں اور مزید رعایت کی گئی اور ۱۹۰۸ء میں اتنی بڑی رعایت کی گئی کہ کل بقایا معاف کر دیا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں اس کمپنی کے ساتھ نیا معاہدہ کیا گیا۔ یہ معاہدہ ۱۹۱۱ء تک کے لئے تھا۔ ۱۹۱۲ء کے معاہدہ میں ۱۹۱۸ء تک توسیع کر دی گئی۔ ۱۹۱۴ء میں کمپنی نے یہ کیا کہ زر مطالبہ میں سے ننو لاکھ (ایک کروڑ) روپیہ کے قریب رکھ لیا جو ادا نہ کیا۔ فروری ۱۹۱۸ء میں آخری معاہدہ کی بھی میعاد ختم ہوگئی اور کمپنی نے خواہش کی کہ ۱۹۳۲ء تک معاہدہ میں توسیع کردی جائے۔ گورنمنٹ ہند نے اس کی سخت مخالفت کی اور رائے دی کہ زیادہ سے زیادہ جنگ کے ختم ہونے کے چھ ماہ بعد تک توسیع کردی جائے ورنہ کمپنی ختم کر دی جائے۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں جب یہ مسئلہ انڈیا کونسل میں پیش کیا گیا تو صاحبزادہ صاحب نے گورنمنٹ ہند کی رائے سے اتفاق کیا لیکن مسٹر کرشنا نے اصرار کیا کہ دو سال کی توسیع اس شرط پر کی جائے کہ کمپنی بقایا کا سوا لاکھ روپیہ فوراً ادا کردے۔ اس سے بھی صاحبزادہ صاحب نے اتفاق کیا۔ چنانچہ کمپنی کو لکھا گیا کہ اگر وہ دو ماہ کے اندر سوا لاکھ روپیہ ادا کردے تو دو سال کے لئے توسیع منظور کی جاتی ہے۔ اس پر کمپنی نے بجائے سوا لاکھ روپیہ ادا کرنے کے

یہ درخواست کی کہ سات سال کے لئے میعاد میں توسیع کردی جائے۔ صیغہ والوں نے اسی درخواست کے مطابق کونسل میں مسودہ پیش کردیا۔ اب چونکہ کمیٹی کی طرف سے سراسر زیادتی تھی۔ صاحبزادہ صاحب نے قطعی اختلاف کیا لیکن دوسرے ممبر تو صیغہ کے افسروں کی ہاں میں ہاں ملانے کے لئے تیار رہا ہی کرتے تھے۔ سر پربھا شنکر نے بھی انھیں کا ساتھ دیا۔ لیکن صاحبزادہ صاحب اپنے اختلاف پر قائم رہے اور نہایت مدلل تقریر بھی کی مگر کثرت رائے کے سامنے کامیابی نہ ہوئی۔ البتہ اس مسئلہ میں مسٹر بھوپندرو ناتھ باسو نے صاحبزادہ صاحب سے اتفاق رائے کیا۔

انتخاب جداگانہ کے متعلق مسٹر مانٹیگو کی رپورٹ سے اختلاف

مسٹر مانٹیگو کی ریفارم اسکیم کی رپورٹ ایکسو چھیاسٹھ[۱۶۵] صفحات پر تھی۔ صاحبزادہ صاحب نے پہلے دن ننّو صفحات کا مطالعہ کیا ابتدائی حصہ میں تمہیدی اور تاریخی باتیں تھیں۔ دوسرے حصہ میں تجاویز تھیں۔ رپورٹ میں مسلمانوں کے انتخاب جداگانہ کے متعلق جو تحریریں تھیں۔ وہ صاحبزادہ صاحب کی رائے میں مسلمانوں کے حقوق کے لئے مضر تھیں۔ ۱۹۱۹ء میں انتخاب جداگانہ کا جو حق مسلمانوں کو منٹو مارلے اسکیم کے مطابق دیا گیا تھا اسکے لحاظ سے ہر ایک صوبہ کے مسلمانوں کو حق تھا کہ پراونشیل اور امپیریل کونسلوں کے لئے اپنے قائم مقام خود منتخب کریں۔ اسکے علاوہ ان کو یہ حق بھی تھا کہ عام انتخابات میں بھی ووٹ دیں۔ نیز یہ کہ جن صوبوں میں ان کی تعداد مردم شماری میں کم تھی ان صوبوں میں ان کی تعداد کی نسبت سے زیادہ ممبروں کے انتخاب کا حق ان کو دیا گیا تھا۔ پس ۱۹۰۹ء میں جو حق مسلمانوں کو دیا گیا تھا اس کے تین پہلو تھے۔

(۱) ہر ایک صوبہ کے مسلمانوں کو خواہ ان کی تعداد اس صوبہ کی مردم شماری میں دوسرے باشندوں سے کم ہو یا زیادہ جداگانہ انتخاب کا حق دیا گیا۔

(۲) جن صوبوں میں مسلمانوں کی تعداد دوسرے باشندوں سے کم تھی ان صوبوں میں

ان کی تعداد کی نسبت سے زیادہ ان کو ممبروں کے انتخاب کا حق دیا گیا۔

(۳) عام انتخاب میں بھی مسلمانوں کو ووٹ دینے کا حق دیا گیا۔

۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم کے باہم لکھنؤ میں سمجھوتہ ہوا۔ اس کے مطابق ہر ایک صوبہ مسلمانوں کے لئے ممبروں کی تعداد باہمی اتفاق رائے سے قرار دی گئی اور مذکورہ بالا تین اصول میں سے دو اصول قائم رکھے گئے البتہ تیسرے اصول سے مسلمانوں نے دست برداری کر کے اپنا یہ حق خود چھوڑ دیا۔

اب مسٹر مانٹیگو کی رپورٹ میں جو کچھ لکھا تھا اس کا منشا یہ تھا کہ "محض انتخاب جداگانہ کا حق تو مسلمانوں کے لئے قائم رکھا جائے لیکن دیگر حقوق واپس لے لئے جائیں۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ مسلمانوں کو یہ اس کی سزا دی جارہی تھی کہ انھوں نے گورنمنٹ سے قطع نظر کر کے ہندؤوں کا سہارا کیوں ڈھونڈا اور ہندؤوں سے اتفاق کیوں کیا۔ پس صاجزادہ صاحب کی رائے میں یہ حصہ رپورٹ کا سراسر نامناسب اور خلاف انصاف تھا اور اپنی رائے سے مسٹر مانٹیگو کو انھوں نے جلد مطلع کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اس کے متعلق ایک نوٹ تیار کیا اور اسے ایک خط کے ساتھ مسٹر مانٹیگو کے پاس بھیج دیا۔

ریفارم کی رپورٹ پر انڈیا آفس میں رائے

۳۰ رمئی ۱۹۱۸ء کو مسٹر مانٹیگو نے اپنے کمرہ میں کونسل کے سب ممبر جمع کر کے ریفارم اسکیم پر اپنی رپورٹ کے متعلق رائے دریافت کی۔ سب نے اس کی تعریف کی اور مجموعی طور پر اتفاق کیا۔ جب صاجزادہ صاحب سے رائے پوچھی گئی تو انھوں نے کہا "جہاں تک کہ مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے متعلق مجھ کو رائے ظاہر کرنی تھی میں بیشتر ہی آپ کو مطلع کر چکا ہوں باقی حصہ کی نسبت جہاں تک اصول کا تعلق ہے میری رائے میں آپ کی تجاویز نہایت قابل اطمینان ہیں۔ مسئلہ چونکہ سخت مشکل اور پیچیدہ ہے اس لئے اس کے حل کے متعلق جو تجویز بھی ہوگی وہ کامل اور بے عیب نہیں ہوسکتی لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ

بلحاظ حالات موجودہ آپ کی اسکیم بہترین معلوم ہوتی ہے۔ البتہ جزئیات کے متعلق غور کا وقت جب آئے گا اُس وقت تفصیل کے ساتھ رائے دی جائے گی۔ اس وقت تو مجھے صرف ۲ دو امور کے متعلق اعتراض ہے۔ اول یہ کہ ہندوستانیوں کے لئے فوجی تعلیم اور فن جنگ کے متعلق علم حاصل کرنے کا انتظام اس اسکیم میں نہیں ہے۔ کم سے کم فوجی رضاکاری (Volunteer) کا حق ضرور ہونا چاہئے۔ کیونکہ جب آپ سیلف گورنمنٹ دینا چاہتے ہیں تو بغیر حربی تعلیم اور قابلیت کے سیلف گورنمنٹ کیسے حاصل ہوسکتی ہے یا قائم رکھی جا سکتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مالی معاملات کے اختیارات کی بابت اسکیم میں کچھ تجویز نہیں کی گئی ہے"

حربی تعلیم کے متعلق مسٹر مان ٹیگو نے جواب دیا۔" ہم نے اس کو اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ چونکہ مسٹر ولسن امریکہ کے پریسیڈنٹ اعلان کر چکے ہیں کہ اس جنگ کے بعد کوشش کی جائے گی کہ آئندہ جنگ نہ ہو اس لئے ہم نے مناسب نہیں خیال کیا کہ جب کہ اس قسم کے خیالات اور تجویزیں جنگ کے متعلق درپیش ہیں تو ایسی حالت میں ہم ہندوستان کو جنگ کے لئے تیار کرنے کی تجویزیں کریں۔ اس جواب کے متعلق صاحبزادہ صاحب لکھتے ہیں :-

" مجھ کو حیرت ہے کہ اس قسم کی لغو وجہ بیان کرتے ہوئے مسٹر مان ٹیگو کو یہ خیال نہ آیا کہ اس قسم کی توجیہ کو کوئی ذی شعور شخص ایک لمحہ کے لئے بھی مان سکتا ہے مگر میں دیکھتا ہوں کہ ہندوستان کے متعلق غلط توجیہ کرنے کی انگریزوں کو ایسی عادت ہوگئی ہے کہ ان کو اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ سننے والے کے دل پر کیا اثر ہوگا۔"

مالی معاملات میں اختیارات کے متعلق مسٹر مان ٹیگو نے صفائی کے ساتھ بیان کیا کہ "مالی معاملات میں (لبرل) آزاد خیال (Liberal) اور (Conservative) کنسرویٹو پرانے خیالات والے لوگ ہمیشہ ایک ہو جاتے ہیں اس لئے اگر اس وقت

کوئی تجویز کرتے تو یہاں اختلاف کا زیادہ اندیشہ تھا" اس جواب کے متعلق صاحبزادہ صاحب لکھتے ہیں :-

"میں بھی اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ اس معاملہ میں انگریز سب ایک ہیں جب کہ اپنی تجارت کے متعلق وہ ہندوستان کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ بہتر ہے کہ اس وقت یہ مسئلہ نہ اُٹھایا جائے۔ لیکن اگر اصولاً دیکھا جائے تو جن دو امور کی طرف میں نے توجہ دلائی ہے ان کے بغیر کل اسکیم بیکار ہے۔ مگر موجودہ حالات کے اعتبار سے جو کچھ ہے بھی غنیمت ہے بلکہ بہت کچھ ہے لیکن یہ سب حکومت خود اختیاری کے اصول کے لحاظ سے کچھ نہیں ہے۔

جست پگھلانے کے کارخانے

ایک عرصہ سے یہ تجویز پیش تھی کہ ہندوستان میں جست پگھلانے اور گلانے کے کارخانے قائم کئے جائیں برہما کی انگریزی کمپنی جس کے پاس جست سیسہ اور برہما کی چاندی کی کانوں کا ٹھیکہ تھا وہ ان جست گلانے کے ہندوستانی کارخانوں کا بھی ٹھیکہ لینا چاہتی تھی۔ گورنمنٹ ہند کی یہ خواہش تھی کہ اس کام کے لئے ہندوستان میں علیحدہ کمپنی قائم ہو جس میں ہندوستان کا سرمایہ ہو مگر یہ بات انگلستان والوں کو پسند نہ تھی۔ چنانچہ ڈیڑھ سال سے انڈیا آفس اور گورنمنٹ ہند میں تار اور ڈاک کے ذریعہ سے مراسلت ہو رہی تھی۔ برہما کی کمپنی کو انڈیا آفس میں رسوخ حاصل تھا اس لئے وہ اپنے مقاصد کے موافق شرائط پر انگلستان کے ممبروں کو رضامند کر لیتی تھی۔ اور گورنمنٹ ہند کی رائے کی کچھ پروا نہ کی جاتی تھی۔ گورنمنٹ ہند ایک حد تک اپنی رائے پر زور دیتی تھی لیکن آخر کار جب انڈیا آفس سے اصرار ہوتا تھا تو مجبور ہو جاتی تھی۔ اب آخری مسودہ انڈیا آفس میں اس لئے پیش ہوا کہ کمیٹی مالیات اس پر غور کرے۔ صاحبزادہ صاحب نے اس کے متعلق ایک اختلافی نوٹ لکھا اور ۱۲ر اگست کو پیش کر دیا۔ اس نوٹ میں نہایت تفصیل کے ساتھ صاحبزادہ صاحب نے تمام کارروائی کی قلعی کھول کر رکھ دی اور آخر میں صاف الفاظ میں سوال

کیا کہ "اس قسم کے معاملات میں انڈیا آفس دخل انداز کیوں ہوتا ہے۔ اس کے کیا معنی کہ انگریزی کمپنیوں کے لئے شرائط اس دفتر کے ذریعہ سے طے کرائی جاتی ہیں۔ گورنمنٹ ہند کو براہ راست اِن امور کے طے کرانے کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی۔"

یہ اختلافی نوٹ صاحبزادہ صاحب نے پیش کر کے اپنا فرض ادا کر دیا۔

ملک معظم سے صاحبزادہ صاحب کی ملاقات

۱۹۱۸ء میں جبکہ صاحبزادہ صاحب انڈیا کونسل کی ممبری کی خدمت کے سلسلے میں لندن میں مقیم تھے ان کو ملک معظم جارج پنجم کی خدمت میں شرف باریابی حاصل ہوا۔ اس کا حال خود صاحبزادہ صاحب کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

"۳؍ جولائی ۱۹۱۸ء کو سر ڈنلاپ اسمتھ نے بذریعہ ٹیلیفون مجھ سے کہا کہ کیا آپ کل پونے گیارہ بجے شہنشاہ کی خدمت عالی میں جا سکتے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ بہت اچھا۔ میں نے ایسی باریابی کی خود کبھی خواہش نہ کی تھی لیکن معلوم ہوا کہ ہز مجسٹی ممبران کونسل سے ملاقات کر رہے ہیں اور کل چار جولائی کو میرا نمبر ہے۔

۴؍ جولائی کو ٹھیک دس بجکر چالیس منٹ پر میں بکنگھم پیلس کے دروازہ پر پہونچا اور ملاقات کے کمرہ میں پہونچایا گیا۔ شہنشاہ معظم کمرہ میں کھڑے تھے۔ میں نے سر تسلیم خم کیا اور اس کے بعد آگے بڑھا تو ہز مجسٹی نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور فرمایا کہ "میں نے آپ کو علی گڈھ میں دیکھا تھا۔" آپ مجھ کو یاد ہیں۔" اس کے بعد انھوں نے ایک آرام کرسی کی طرف اشارہ کیا اس پر میں بیٹھ گیا۔ خود شہنشاہ ایک چھوٹی کرسی پر بیٹھے اور اس کے بعد گفتگو شروع کی۔

میں نے عرض کیا کہ عالی جاہ نے جو پیام ہمدردی اور پیام امید ہندوستان کی رعایا کو ۱۹۰۶ء میں اور ۱۹۱۱ء میں پہونچائے تھے۔ وہ رعایا کے دل میں گھر کر گئے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تمام دنیا دیکھ رہی ہے کہ رعایائے ہند اپنے شہنشاہ اور سلطنت

کے لئے کس طرح اپنا خون بہا رہی ہے۔ اس پر شہنشاہ نے فرمایا۔ "بے شک ہندوستان نے اپنا حق ادا کر دیا" اس کے بعد جو ہندوستان کو جرمن سے اندیشہ ہے اور جرمنی کو ایران اور افغانستان کے ذریعہ سے فساد پھیلانے کا جو موقع ہے اس کی نسبت ہز مجسٹی نے فرمایا۔ گو کسی زمانہ میں روس سے ہندوستان کو اندیشہ تھا اور مدتوں تک روس ایک ہوّا بنا رہا لیکن جرمنی جو روس سے بہت زیادہ تیار ہے وہ بہت اندیش ناک ہے" میں نے کہا" افغانستان کے متعلق مجھ کو زیادہ اندیشہ نہیں ہے۔ کیونکہ افغانستان کے لوگ اپنے ملک کی آزادی کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ وہ کسی غیر قوت کو اپنے ملک میں آنے دینا نہیں چاہتے۔ اور موجودہ امیر افغانستان امیر حبیب اللہ خاں کے متعلق میں نے کہا کہ وہ نہایت دانشمند اور دوربین ہیں اور گذشتہ چار سال کے زمانہ میں انھوں نے نہایت استقلال کے ساتھ اپنی ملکی پالیسی صحیح اصول پر قائم رکھی ہے" ہز مجسٹی نے اس کو تسلیم کیا۔ مگر فرمایا۔" کیا بھروسہ ہے کہ امیر کو کوئی مرد اڈالے اور ملک میں شورش پیدا ہو جائے کیونکہ افغانستان کے لوگ زیادہ تر وحشی ہیں" میں نے اس کو تسلیم کیا مگر عرض کیا کہ" گو افغانستان کے لوگ غیر تعلیم یافتہ اور وحشی ہیں لیکن اپنی ملکی آزادی کی ضروریات وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں" ایران کے متعلق میں نے کہا کہ "وہاں کی حالت ناگفتہ بہ ہے معلوم نہیں وہاں کیا ہو رہا ہے" اس پر ہز مجسٹی نے فرمایا کہ" جنگ سے پیشتر شمالی حصہ میں روس کا اثر تھا اور جنوبی حصہ میں ہمارا تھا۔ لیکن اب وہاں کی حالت گڑبڑ ہے۔ ٹرکی نے کچھ علاقہ لے لیا ہے اور ممکن ہے کہ جرمنی اپنا دخل کرے۔ کوہستان قاف میں ٹرکی کے دخل اور اثر سے بڑا اندیشہ ہے"

اس گفتگو میں مسلمانوں کے متعلق ذکر آگیا۔ میں نے کہا کہ "اگر اجازت ہو تو میں ادب کے ساتھ یہ ضرور عرض کروں گا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو جو سخت امتحان کا مقابلہ درپیش رہا ایسا کسی قوم کو کبھی نہیں رہا۔ اور گو ان کو ٹرکی کے ساتھ دلی

ہمدردی قدرتی طور پر رہی لیکن انھوں نے اپنا فرض ادا کرنے میں دریغ نہیں کیا۔ پنجاب میں تمام صوبوں سے زیادہ گذشتہ چار سال میں فوج بھرتی ہوئی اور وہاں سب سے زیادہ تعداد مسلمان سپاہیوں کی ہے۔ یہی حالت ملک کے دوسرے حصوں کی ہے۔ اس موقعہ پر مسلمانوں نے جو خدمت سلطنت کی کی ہے وہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔" ہز مجسٹی نے فرمایا" بے شک مسلمانوں کے لئے سخت امتحان تھا اور وہ اس میں پورے نکلے۔" پھر فرمایا" ہم کو مصر کی حفاظت کے لئے فلسطین وغیرہ پر حملہ کرنا پڑا۔ چنانچہ مصر بالکل محفوظ ہے۔""

اس کے بعد ہندوستان اور وہاں کی تعلیم کے متعلق گفتگو رہی۔ اس سلسلہ میں ہز مجسٹی نے ہندوستان کے طالب علم جو انگلستان میں ہیں ان کا ذکر کیا اور فرمایا کہ "کثرت سے جو طلبار یہاں آتے ہیں وہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ اپنا مذہب بھول جاتے ہیں۔ یہاں بُرے اخلاق سیکھتے ہیں اس طرح بجائے نفع کے انھیں نقصان ہوتا ہے میں نے گورنمنٹ ہند کے افسروں سے کہا کہ ان طالب علموں کو یہاں آنے سے روکو۔" اس پر ان افسروں نے کہا کہ اگر وہ انگلستان جانے سے روکے جائیں گے تو وہ امریکہ یا فرانس یا جرمنی جائیں گے جہاں ان کے لئے اور خطرات ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ ایسا قانون پاس کرو کہ ہندوستان سے باہر یہ لوگ نہ جاسکیں۔ اس کے متعلق گورنمنٹ ہند کے عہدہ داروں نے کہا کہ ایسا قانون پاس نہیں کیا جاسکتا۔ اسی سلسلہ میں پھر ہز مجسٹی نے ڈھینگرا[1] کے قتل کا ذکر کیا اور فرمایا کہ اصل میں ڈھینگرا لارڈ کرزن کے قتل کے لئے گیا تھا لیکن وہ سر کرزن وائلی کو لارڈ کرزن سمجھا۔ جب اس کے مکان کی تلاشی ہوئی تو متعدد کارڈ برآمد ہوئے جن پر ڈھینگرا نے لارڈ کرزن کو گالیاں لکھ رکھی تھیں۔ ڈھینگرا کے

---

[1] ڈھینگرا پنجاب کا ہندو طالب علم تھا اس نے سر کرزن وائلی کو ۱۹۰۹ء کو لندن میں قتل کیا تھا۔

ماں باپ نہایت اچھے اور شریف تھے۔ لیکن یہاں آکر بدبخت ڈھینگرا ایسا بگڑ گیا۔"

جب ہز مجسٹی کہہ چکے تو میں نے عرض کیا "میں بھی ان ہندوستانی نوجوانوں کے یہاں آنے کے موافق نہیں ہوں جن کے چال چلن اور سمجھ قابل اعتماد نہ ہو اور یہاں آنے سے روکنے کا اصل علاج یہ ہے کہ خود ہندوستان میں تعلیم و تربیت کے ایسے ذرائع بہم پہنچائے جائیں۔ جیسے اس ملک انگلستان میں موجود ہیں۔"

اسی قسم کی گفتگو رہی جس کا خلاصہ میں نے لکھا ہے آخر میں مَیں خود اٹھا اور اجازت چاہی۔ چلتے ہوئے فرمایا "مجھ کو معلوم ہے کہ تم کو تعلیم سے دلچسپی ہے اور تم نے ہندوستان میں تعلیم کے متعلق کوشش کی ہے۔ اب بھی کوشش جاری رکھو تاکہ لوگوں کے خیالات درست ہوں۔ شورش سے کچھ فائدہ نہیں"۔ میں نے کہا کہ "میں ہر وقت حاضر ہوں" اور سلام کرکے میں رخصت ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ ہز مجسٹی نہایت خلیق ہیں گفتگو میں کسی طرح یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ میں انگلستان کے شاہنشاہ سے ہمکلام ہوں۔ سادگی اور بے تکلفی ہر طرح نمایاں تھی۔

ہندوستان میں جدید ٹیکس کی تجویز

۱۳ اگست ۱۹۱۸ء کو نوٹس ملا کہ ہندوستان میں جدید ٹیکس کی جو تجویز تھی اس پر مشترکہ کمیٹی میں غور کیا جائے۔ تجویز یہ تھی کہ ہندوستان جنگ کے متعلق مزید مالی امداد کرے اور چونکہ بجٹ میں گنجائش نہ تھی اس لئے جدید ٹیکس قائم کرکے آمدنی کا ذریعہ پیدا کیا جائے۔ صاحبزادہ صاحب نے جب اس تجویز کے متعلق کاغذات دیکھے تو معلوم ہوا کہ اس میں بھی بہت کچھ نامناسب کارروائی کی جانے کو تھی۔ جلسہ دوسرے دن کے لئے ملتوی ہوگیا۔

۱۴ اگست کو جلسہ شروع ہونے سے پہلے صاحبزادہ صاحب مسٹر باسو اور سر پربھاشنکر میں باہم مشورہ ہوا اور یہ طے پایا کہ جلسہ میں، جدید ٹیکس کے مسئلہ پر مسٹر باسو خاص طور پر تقریر کریں۔ اور صاحبزادہ صاحب اور سر پربھاشنکر اس سے اتفاق کریں۔ صاحبزادہ صاحب نے مختلف امور کے متعلق اپنی رائے بھی بیان کردی اور باہمی گفتگو کے بعد ایک متفقہ

رائے قائم کرلی گئی۔ دوسری شام کو میٹنگ میں کوئی کارروائی نہ ہوئی اور پھر آئندہ کیلئے ملتوی ہوگئی۔ دوسرے ہندوستانی ممبروں کے متعلق صاحبزادہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"میں یہ دیکھتا ہوں کہ مسٹر باسو میں جو قوت ہونی چاہیئے وہ نہیں ہے وہ اختلاف رائے کرتے ہیں لیکن آخر میں آکر گر پڑتے ہیں۔ ایسے اختلاف سے کیا فائدہ۔ میں چاہتا ہوں کہ اہم معاملات میں بعد غور کے جو بات ہم ہندوستانی نقطۂ خیال سے قائم کرلیں اسی پر ہم کو زور دینا چاہیئے لیکن یہ اصحاب اس معاملہ میں پوری قوت نہیں دکھلاتے اور اس کی وجہ سے اکثر مجھ کو بھی خاموش رہنا پڑتا ہے۔ گو اہم معاملات میں تن تنہا اپنے فرائض ادا کرنے میں کمی نہیں کرتا لیکن متفقہ اظہار رائے سے جو اثر ہوسکتا ہے وہ ایک ہندوستانی ممبر کی رائے کا نہیں ہوسکتا۔ اب اس ٹیکس کے معاملہ میں مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ان دو ممبروں کی رائے میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔ برہما کی جست گلانے والی کمپنی کے معاملہ میں میں نے اختلافی نوٹ لکھا تھا وہ زیر بحث تھا۔ سر پربھاشنکر نے پورا وعدہ کیا تھا کہ وہ میرا ساتھ دیں گے۔ لیکن جلسہ میں جب سر ولیم ڈیوک نے ذرا زور دیا تو سر پربھاشنکر ان کے ساتھ ہوگئے۔ آخر مجھ کو تنہا اختلاف کرنا پڑا لیکن میں اپنے فرض سے مجبور ہوں۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ میں صریحاً دیکھوں کہ ہندوستان کے نفع کے خلاف عمل ہورہا ہے۔ اور خاموش رہوں۔ کاش یہ اصحاب اس خیال پر کاربند ہوتے تو ہماری متفقہ آواز میں بہت کچھ اثر ہوتا۔"

لندن سے عارضی غیر حاضری کے بعد انڈیا کونسل کے کام میں پھر مصروفیت

اگست ۱۹۱۸ء تک انڈیا کونسل میں صاحبزادہ صاحب نے جو کام کیا اس کو ناظرین مطالعہ کرچکے ہیں ستمبر ۱۹۱۸ء میں یہ کام عارضی طور پر چھوڑنا پڑا۔ چیمس فورڈ مان ٹیگو اسکیم کے متعلق ہندوستان کو جدید اصلاحات دینے کی جو تیاریاں ہورہی تھیں اس کے سلسلہ میں فرنچائز کمیٹی کی ممبری پر آپ کی خدمات کی ضرورت محسوس ہوئی

اور آپ کو انڈیا کونسل کا کام عارضی طور پر چھوڑ کر ہندوستان آنا پڑا۔ نومبر ۱۹۱۸ء سے فروری ۱۹۱۹ء تک وہ ہندوستان میں اس کام کو کرتے رہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ باب ہفتم میں کیا جا چکا ہے۔ پھر ۲۳ مارچ ۱۹۱۹ء کو لندن پہونچ کر اپنے پورے عزم و ہمت سے انڈیا آفس میں کام شروع کیا۔ اس وقت جنگ عظیم عملاً ختم ہو چکی تھی۔ جرمنی اور اس کے متحدین، کو ہزیمت ہو گئی تھی جن میں ٹرکی بھی تھا۔ اب صلح نامہ کی کارروائی جاری تھی اور سب سے زیادہ اہم ٹرکی کے فاتحین کے درمیان تقسیم ملک کا سوال تھا اور ٹرکی کو معدوم کر دینے کی کارروائی ہو رہی تھی۔ یہ بات دنیائے اسلام کے لئے جان کاہ تھی۔ اسی کی صاحبزادہ صاحب کو سب سے زیادہ فکر تھی۔ حسن اتفاق سے وزیر ہند نے یہ مسئلہ رائے کے لئے صاحبزادہ صاحب کے پاس بھیجا۔ جس کے جواب میں انھوں نے نہایت محنت سے ایک یادداشت تیار کی جو فلسکیپ کے ٹائپ شدہ تیس صفحات پر ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

ٹرکی کے صلح نامہ سیورے (Sevres) کی نسبت رائے

وزیر ہند کو خطاب کرتے ہوئے صاحبزادہ صاحب نے لکھا کہ آپ نے صلحنامہ سیورے کی ان دفعات میں جو مالیات سے متعلق ہیں ایسی ترمیمات پیش کرنے کی فرمائش کی ہے جن کی رو سے "ٹرکی پر نگرانی کے اختیارات اُن سے زیادہ نہ ہوں جو جنگ سے قبل تھے"۔ اور ترمیمات پیش کرتے وقت حسب ذیل امور کو مدنظر رکھا جائے۔

(۱) آیا ٹرکی پر سے اقتصادی پابندیاں اُٹھالی جائیں یا جاری رہیں۔

(۲) اگر اقتصادی پابندیاں اُٹھالی جائیں تو اتحادی طاقتوں کی رعایا کے حقوق کی حفاظت کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔

(۳) کیا جملہ مطالبات کالعدم کر دئے جائیں۔

(۴) جنگ سے قبل غیر ملکیوں کے قرضہ جات وصول کرنے کی جو کونسل قائم تھی

اور جسے اصلی مگر جزوی اختیارات حاصل تھے آیا اُسے جاری رکھا جائے۔

ان سوالات کے جوابات دینے پر صاحبزادہ صاحب نے سب سے زیادہ دو امور کو مدنظر رکھا۔ اول یہ کہ خود وزیر ہند نے اپنی چٹھی میں لکھا تھا کہ "ٹرکی پر نگرانی کے اختیارات ان سے زیادہ نہ ہوں جو جنگ سے قبل تھے۔" دوسرے یہ کہ خود وزیر اعظم نے مسلمانانِ ہند کے وفد سے کہا تھا کہ "ذاتی طور پر میں جنگ کے زمانہ کے جملہ مطالبات اور تاوانوں کو کالعدم کرنے کی تائید میں ہوں۔ اُن کے قائم رکھنے سے ہمیشہ تردّدات باقی رہینگے جہاں تک برطانیہ کا تعلق ہے وہ اس قسم کے جملہ مطالبات سے دست بردار ہو کر گذشتہ ما صلوٰۃ کے اصول پر کاربند ہوگا۔" صاحبزادہ صاحب نے صلح کی ایک ایک دفعہ کو جو ٹرکی کے حقوق کے خلاف تھی لے کر پوری بحث کی ہے۔ مختصر طور پر ان میں سے چند امور کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

اتحادیوں کے مقابلہ میں ٹرکی، جرمنی، آسٹریلیا اور بلگیریا وغیرہ سب کے سب لڑے تھے مگر صلح نامہ میں سراسر ٹرکی پر زیادتی کی گئی تھی۔ مثلاً یہ کہ مندرجہ بالا ممالک کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ فوج رکھیں اور اس کے لئے کوئی شرطیں نہیں لگائی گئی تھیں مگر ٹرکی کے سپاہیوں کے لئے فوج کا لفظ نہیں استعمال کیا گیا۔ اور انھیں زیادہ تر اندرونی ملک میں امن قائم رکھنے کے اختیارات دیدیئے گئے تھے۔ جس کے معنی یہ تھے کہ وہاں کی فوج کا درجہ گھٹا کر اُسے محض پولیس بنا دیا گیا تھا۔ یہ بھی تجویز کیا گیا تھا کہ ترکوں کی فوجی تربیت کی نگرانی اتحادیوں اور انگریزوں کے سپرد ہو۔ درانحالیکہ فوجی تربیت کے بارہ میں ٹرکی کے لوگ مسلم طور پر ہر قسم کی نگرانی سے مستغنی تھے۔ ٹرکی نوجوں کو منظم کرنے کے لئے اتحادی طاقتوں کا ایک کمیشن تجویز کیا گیا تھا اور خود ٹرکی کی حکومت کا اُس میں کوئی دخل نہ رکھا گیا تھا۔ ٹرکی میں کوئی بحری یا ہوائی فوج نہ ہو۔ لیکن اتحادیوں کو ٹرکی کے ملک میں جہاز اُتارنے اور ہوائی اڈے بنانے کا اختیار ہو۔ ان جملہ اُمور کے متعلق صاحبزادہ صاحب نے

اِسی بنا پر اعتراضات کیئے کہ قبل از جنگ ترکی کو سب اختیارات حاصل تھے اور اُسے کامل آزادی تھی اس لئے وزیر ہند کے اصول کے مطابق اب بھی آزادی ہونی چاہیئے۔

اب صلح نامہ سیورے کی ان دفعات کا ذکر کیا جاتا ہے جن کی رو سے یورپین ملکوں کے مہاجن ٹرکی کی مالیات پر مسلّط تھے۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ ٹرکی پر ۱۸۷۷ء کی جنگ کے زمانہ سے انگلستان، ہالینڈ، فرانس، جرمنی، آسٹریا، ہنگری اور اٹلی کے مہاجنوں کا قرضہ چلا آتا تھا۔ جس کی تعداد ۱۸۸۱ء میں ۱۲½ کروڑ پونڈ قرار دی گئی تھی۔ اور اس کی وصولی کے لئے مہاجنوں کی ایک کونسل بنا دی گئی تھی جس کا صدر دفتر قسطنطنیہ میں رکھا گیا تھا۔ اور ادائیگی کی ایسی قسطیں رکھی گئی تھیں جس سے روز بروز قرضہ کی رقم کم ہوتے ہوتے ختم ہو جائے۔ اس کونسل کے ممبر ہر ملک کے مہاجنوں کے نمایندے تھے اور ان میں سے دو ممبر ٹرکی کے بھی تھے۔ اس کونسل کو ٹرکی کا کچھ علاقہ وصولی کے لئے دیدیا گیا تھا اور کونسل کا کام ترکی حکومت کے تحت میں تھا۔ کیونکہ ترکی حکومت ہی نے اس کونسل کا تقرر کیا تھا اور یوروپین ممالک کی حکومتوں سے اُس کا کوئی تعلق نہ تھا مگر معاہدہ سیورے کی دفعات کی رو سے کونسل کی جگہ ایک "مالی کمیشن" تجویز کیا گیا جس کے ممبر صرف تین اتحادی سلطنتوں کے نمائندے ہوں یعنی انگلستان، فرانس اور اٹلی۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کمیشن کو مالیات کے وہ تمام اختیارات دیدیئے گئے تھے جو سلطان کو اپنے ملک میں حاصل تھے یعنی یہ کہ ملک کے بجٹ کی منظوری دینا اس تعمیل کی نگرانی وغیرہ سب اس کمیشن کو دیدیئے گئے۔ اس طرح مختلف ممالک کے مہاجنوں کے قرضہ کی وصولی کے لئے نہ صرف ایک معین شدہ علاقہ بلکہ کُل سلطنت کے مالی اختیارات اتحادیوں کی گورنمنٹوں کو دیدیئے گئے تھے۔

ان دفعات کی رو سے ٹرکی کوئی قرضہ بلا رضامندی اس مالی کمیشن کے نہ لے سکتا تھا نہ سکّہ جاری کر سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ تمام حقوق ملکیت ٹرکی حکومت سے نکالکر اتحادیوں کی اس کونسل کو دیدیئے گئے تھے۔ یہاں تک کہ دیگر ممالک سے درآمد پر محصول لگانا اور تمام صوبجات

ریاست پر محصول قائم کرنا اسی کے اختیار میں دے دیا گیا۔
ان تمام مجوزہ مظالم پر یہ اضافہ ہوا کہ ممبران کمیشن کے ہاتھ میں جملہ اختیارات دینے کیساتھ انھیں ہر قسم کی ذاتی ذمہ داری سے بری کر دیا۔ اس سے ٹرکی کی بے بسی کی حالت قابل رحم تھی۔ ایک طرف تو اس پر فوجی تسلط بذریعہ فوجی کمیشن کے قائم کیا گیا تھا۔ دوسری طرف مالی تسلط بذریعہ مالی کمیشن کے قائم کیا گیا اور ترکوں کے ہاتھ میں کوئی طاقت یا اختیار باقی نہ چھوڑا تھا۔ درآنحالیکہ دعویٰ یہ کیا گیا تھا کہ "ٹرکی پر نگرانی کے اختیارات اُن سے زیادہ نہ ہوں گے جو جنگ سے قبل تھے"۔ صاحبزادہ صاحب نے اپنی یادداشت میں دکھایا تھا کہ دنیا کی تاریخ میں اس قسم کے ناواجب تسلّط کی کوئی نظیر نہیں دکھائی جا سکتی ہے۔
مختصر یہ کہ صاحبزادہ صاحب نے تجویز کیا تھا کہ معاہدہ سیورس میں سے تمام وہ دفعات خارج کر دی جائیں جو ٹرکی پر فوجی تسلّط کے متعلق ہیں۔ اسی طرح مالی تسلّط کی دفعات نکال دی جائیں۔ ٹرکی میں اتحادیوں کے ڈاک خانے جو جنگ سے قبل قائم تھے وہ رکھے جائیں۔ ٹرکی پر تاوان کا مسئلہ وزیر اعظم کے اس وعدہ کی روشنی میں طے کیا جائے جو انھوں نے مسلمانان ہند کے وفد سے کیا تھا جس میں کہا تھا کہ گذشتہ راصلوٰۃ۔ اب رہا مہاجنوں کا قرضہ وہ ایک آزاد کمیٹی کے سپرد کیا جائے جسے لیگ آف نیشنز مقرر کرے اور قرضہ کی وصولی کا اختیار کونسل کے سپرد ہوا۔ اور اس کی نگرانی لیگ مذکور کرے۔
سب سے آخر میں صاحبزادہ صاحب نے لکھا کہ چونکہ وہ خود ٹرکی کے معاملات سے پوری طرح واقف نہ تھے اس لئے ٹرکی کا ایک نمائندہ بلایا جائے اور انگلستان کا کوئی ماہر مالیات (مثل سر جیمس برونیٹ) مشورہ میں شامل کیا جائے۔ ان اصحاب کے ساتھ اس مضمون کا مطالعہ کر کے میں آپ کے سامنے اس سے بہتر تجاویز پیش کر سکوں گا۔ امید ہے کہ اس مسئلہ کو قابل اطمینان طریقہ پر جلد طے فرمائیں گے۔

مندرجہ بالا یادداشت کے علاوہ صدہا بلکہ ہزاروں صفحات پر ٹرکی کی ہمدردی میں اپنے ہاتھ سے یادداشتیں لکھی ہیں۔ اور اس مسئلہ کے متعلق مفید مواد جمع کردیا ہے جو اس قابل ہے کہ جستہ جستہ شائع کیا جائے یا اُس کا مطالعہ کرکے کوئی ایک مستقل کتاب ٹرکی کے متعلق لکھی جائے۔ ٹرکی کے متعلق اور جو اہم خدمت صاحبزادہ صاحب نے کی اُس کا ذکر باب ہفتم میں آچکا ہے۔ ناظرین اس سلسلہ میں اس پر پھر ایک نظر ڈال لیں۔

رولٹ ایکٹ کے متعلق ایک یادداشت

انڈیا کونسل کے کسی جلسہ میں سکریٹری آف اسٹیٹ ہند نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ہندوستان میں جو بلوے ہوئے اُن کی اصلی وجہ یہ تھی کہ ٹرکی کی شکست سے مسلمانان ہند ناراض تھے اس لئے ممبران کونسل اپنی رائے اس باب میں ظاہر کریں کہ سزا کے جو خاص قوانین مثل رولٹ بل وغیرہ کے ہیں اُن کی ضروری دفعات کو فوجداری کے معمولی قانون میں شامل کردیا جائے تاکہ بجائے انتظامی احکام کے ان کا عمل درآمد عدالتوں کے ذریعہ ہوسکے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے اس تجویز کی مخالفت میں ۶ رمئی ۱۹۱۹ء کو سات فلسکیپ کے ٹائپ شدہ صفحات میں ایک یادداشت تیار کرکے سکریٹری آف اسٹیٹ کو دی جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

ہندوستان کے بلووں کا سبب ایک نہ تھا بلکہ وہ بہت سے اسباب کا نتیجہ تھے واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ چار سال کا زمانہ مسلمانوں کے لئے سخت امتحان اور آزمائش کا تھا جس میں انھوں نے ثابت کردیا کہ وہ اپنے جذبات اور فرائض میں امتیاز کرتے ہیں۔ ٹائمز کے نامہ نگار بمبئی نے جو غالباً سر اسٹینلی ریڈ (Sir Stainley Reid) شورش کے اسباب مختصر طور پر حسب ذیل قرار دیے ہیں:۔

(۱) جنگ کی وجہ سے ہندوستانیوں کا تمدنی اور ذہنی انقلاب جس نے اُنکے دلوں میں توقعات اور تمنائیں پیدا کردیں۔

(۲) زیادہ نفع اُٹھانے کی وجہ سے گرانی اور ہندوستان سے غلّہ و دیگر ماکولات کی برآمد کی وجہ سے ان کی قلت ۔

(۳) انگلستان کی گورنمنٹ نے سامان رسد فراہم کرنے میں جو تساہل کیا اور بے بہا سے چربی اور چاول پر زیادہ محصول لیا اس کی وجہ سے ناراضی ۔

(۴) انفلوئنزا اور ہیضہ کی وبائیں ۔

(۵) انڈو برٹش ایسوسی ایشن کا طرز عمل جس نے لوگوں کے دلوں میں یہ شک ڈال دیا کہ پارلیمنٹ اصلاحات دینے میں انصاف سے کام نہ لے گی ۔

(۶) مسلمانوں میں ہیجان ۔

(۷) پنجاب میں مالی حالت کی خرابی اور وہاں سے سپاہیوں کی بھرتی کا دباؤ ۔

ان تمام ہیجانی حالات میں رولٹ بل کا قصہ اُٹھا دیا گیا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پنجاب میں جس طریقہ پر بھرتی کا کام جاری کیا گیا وہ ان فسادات کا بہت کچھ ذمہ دار ہے۔ جس کے حالات میں نے خود ہندوستان میں زمینداروں سے سُنے تھے ۔ اور جس کی تصدیق مجھ سے سر جان مارشل ڈائرکٹر محکمہ آثار قدیمہ نے کی تھی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دوران جنگ میں سر مائیکل اوڈائر لفٹنٹ گورنر پنجاب نے قابل قدر خدمات انجام دی تھیں مگر ان کے طرز عمل سے بد دلی پھیلی جس سے یہ بلوہ ہوا۔ خیر بلوہ کے اسباب جو کچھ بھی ہوں مگر دو امور کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۱) چار سال تک فی الجملہ ہندوستان کامل وفادار رہا۔

(۲) باوجودیکہ تمام اسلامی دنیا میں جہاد کی تلقین کی گئی مگر مسلمانان ہند اپنے بادشاہ کی اطاعت میں مضبوط رہے ۔

ان حالات میں یہ قرین قیاس نہیں کہ جنگ میں سلطنت برطانیہ کی کامیابی پر بھی اس کے خلاف کوئی گہری سازش کر کے بغاوت کی گئی ہو۔

اب رہا رولٹ کمیٹی کا تقرر وہ ۲۰ ر اگست ۱۹۱۷ء کو اعلان شاہی کے صرف چند ماہ بعد کیا گیا۔ اس اعلان کے معنی یہ تھے کہ ہندوستان کی حکومت اصلی معنوں میں قومی کر دی جائے گی اور اگر اس کا نفاذ اسی وقت کر دیا جاتا تو سلطنت سے ناراضی کے خیالات کا خاتمہ ہو جاتا مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس اعلان کے فوراً بعد دسمبر ۱۹۱۷ء میں رولٹ کمیٹی کا تقرر کیوں کیا گیا جو اُس صلح اور آشتی اور امن کے اعلان کے بالکل منافی تھا اور اسکے عملدرآمد میں اس قدر غیر معمولی جلدی کیوں کی گئی۔ بہر حال ہندوستانیوں کے شور و شغب کے باوجود اور ان کی مرضی کے خلاف محض سرکاری ووٹوں کے بل پر یہ بل پاس کیا گیا اس کا نتیجہ ترک موالات اور قتل و غارتگری ہوا۔ اس سلسلہ میں یہ نہایت افسوسناک امر ہے کہ ہوائی جہازوں کے ذریعے سے آبادی پر بم برسائے گئے جن سے بے گناہ لوگوں کی جان و مال کا تلف ہونا لازمی تھا۔ جب کہ عملداری کا فرض رعایا کی جان و مال کی حفاظت ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ فعل کس طرح جائز قرار دیا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کہ اس بارے میں کیا کیا جاتا ہے۔ ایک طرف تو گورنمنٹ ہند کی طرف سے اصرار ہے کہ اس بل کو منظور کیا جائے۔ دوسری طرف اہل ہند کی طرف سے تار آرہے ہیں کہ اُسے نامنظور کیا جائے۔ اب چاہے وہ منظور ہو یا نہ ہو۔ جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا اور اب یہ بھی قرین قیاس نہیں کہ ان حالات میں تین سال کے زمانہ میں گورنمنٹ ہند اس کا نفاذ کرنا مناسب سمجھے گی۔ مگر میں اس بارہ میں اصرار کرنا چاہتا ہوں کہ موعودہ اصلاحات کا نفاذ کیا جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پارلیمنٹ کس قسم کی اصلاحات دینے کے لئے تیار ہے واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانیوں کے دلوں میں ان اصلاحات کے نافذ ہونے کے متعلق شکوک ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ انھیں اصل کی جگہ محض آس کا سایہ ملے گا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ کم سے کم اعتدال پسند لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے پارلیمنٹ سے اصلاحات کا قانون پاس کرا دیا جائے۔

اب رہا یہ امر کہ عدالتوں کو خاص تعزیری اختیارات بذریعہ قانون کے دئیے جائیں اس کی نسبت میرا خیال ہے کہ اب جب کہ جنگ عظیم ختم ہو چکی تو کوئی ایسا موقع نہیں کہ جرمنی وغیرہ ہندوستان میں سازش کریں اور روپیہ تقسیم کریں۔ اب تو جلد سے جلد اصلاحات نافذ کرنی چاہئیں۔ اس کے بعد ضرورت ہو تو کوئی قانون نافذ کیا جائے۔

لندن میں صاحبزادہ صاحب کی علالت اور ہندوستان کو واپسی

۲۶ جون ۱۹۱۹ء کو صاحبزادہ صاحب شدید محنت میں مصروف تھے انھیں ہلکا سا انفلوئنزا ہو گیا تھا۔ لیکن ۵ جولائی کی رات میں دل کے مرض کا حملہ ہوا۔ قلب کے مرض میں بہت زیادتی ہو گئی اور اسی کے ساتھ نبض کی حرکت بالکل بے قاعدہ ہو گئی۔ اس مرض کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ ولایت کے ڈاکٹروں نے نہایت خوفناک رائے کا اظہار کیا۔ اسی کے ساتھ صاحبزادہ صاحب کی غذا میں بہت کچھ کمی ہو گئی۔ جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۱۹ء کے کچھ ابتدائی حصہ میں ولایت ہی میں علاج ہوتا رہا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا اور ضعف بڑھتا گیا۔ آخر مجبور ہو کر ہندوستان کے لئے روانہ ہوئے۔ اور یکم اکتوبر کو بمبئی پہنچے۔ جب گوالیار کے اسٹیشن پر پہونچے تو صاحبزادہ صاحب کی نقاہت کا یہ حال تھا کہ صاحبزادہ سلطان احمد خاں انکو دیکھ کر گھبرا گئے اور جب ۴ اکتوبر کو علیگڈھ پہنچے تو گھر والوں کو بھی انھیں پہچاننے میں تامل ہوا۔ چھ ماہ کامل اُن کا علاج ہوتا رہا۔

یہ لکھا جا چکا ہے کہ صاحبزادہ صاحب اس قدر محنت کیا کرتے تھے کہ اب انکی تندرستی ان کی محنت کا ساتھ نہ دے سکتی تھی۔ ان کے خیر طلب ان کو برابر مشورے دیتے رہتے تھے کہ وہ حتی المقدور کم محنت کریں لیکن چونکہ شدید محنت ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی اسلئے وہ کام میں کمی نہ کر سکتے تھے۔ اس کا جو انجام ہونے والا تھا وہ اس کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ بہرحال صحت پاتے ہی انھوں نے پھر انگلستان کا ارادہ کیا۔

صحت کے بعد صاحبزادہ صاحب کا انگلستان واپس جانا

۱۷ اپریل ۱۹۲۰ء کو صاحبزادہ صاحب علیگڈھ سے روانہ ہوئے۔ ابراہیم ملازم ساتھ لیا۔ اول حیدرآباد پہونچے پانچ دن حیدرآباد میں قیام کیا۔ ہز اگزالٹیڈ ہائی نس نے دو دفعہ دعوت کی ایک مرتبہ تخلیہ کی ملاقات کے لئے بلایا اور ایک بار دربار میں ۱۷ اپریل کو بمبئی سے انگلستان روانہ ہوئے اور ۱۳ مئی ۱۹۲۰ء کو لندن پہونچے۔ صاحبزادہ صاحب نے مسٹر پالک کو لکھ دیا تھا اور انھوں نے نمبر ۳۱ شیتھ ایونیو نیو گولڈرس گرین نارتھ ویسٹ (31, Sheath Avenue New Golders Green N.W) میں صاحبزادہ صاحب کے لئے تین کمرے کرایہ پر لے رکھے تھے۔ وہیں قیام کیا یہ مقام ہر طرح سے اچھا تھا۔ اس مرتبہ صاحبزادہ صاحب نے لندن پہونچ کر جو خطوط ہندوستان کو بھیجے ان میں اس کام کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس وقت انڈیا کونسل میں ہو رہا تھا مثلاً وہ لکھتے ہیں:۔

"آج کل دونوں دوسرے ہندوستانی ممبر ہندوستان میں ہیں اس لئے میں اکیلا ہندوستانی ممبر کونسل میں ہوں جس کی وجہ سے مجھے معمول سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے کسی کے دباؤ سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ اہم معاملات میں ہندوستان کا نقطۂ خیال کونسل کے سامنے پیش ہونے سے رہ نہ جائے۔

گذشتہ تین ہفتہ سے لارڈ ریڈنگ جو نئے وائسرائے مقرر ہوئے ہیں کونسل کے اجلاس میں آتے ہیں۔ تینوں مرتبہ متعدد مسائل کے متعلق مجھ کو ممبران کی اکثریت سے اختلاف کرنا پڑا اور لارڈ موصوف کی موجودگی میں طویل تقریریں کرنی پڑیں جنمیں گورنمنٹ کی پالیسی پر بہت کچھ اعتراضات کرنے پڑے۔ کاش میری صحت ایسی مضبوط ہو جاتی کہ میں برابر چوبیس گھنٹہ یہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے میں صرف کر سکتا۔ یہاں اسقدر بے نظیر سبق آموز حالات ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

بحری محکمہ کی ترقی ہندوستان کے نفع کے لئے

لارڈ جیلیکو (Jelleco) امیرالبحر نے بحری محکمہ کی توسیع کی تجاویز پیش کی تھیں جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کے راستوں کی حفاظت کے لئے جہازوں کا ایک بہت بڑا بیڑا تیار کیا جائے۔ بندرگاہوں کی حفاظت کے لئے آبدوز اور خاص قسم کے جہاز ہوں۔ سرنگیں صاف کرنے کا سامان ہو۔ توپیں، ہوائی جہاز اور دوسری چیزیں بندرگاہوں کو محفوظ کرنے کے لئے فراہم کی جائیں۔ اس اسکیم سے بقدر پندرہ لاکھ سالانہ کے خرچ بڑھتا تھا اس لئے نیز دیگر وجوہ سے اُسے گورنمنٹ ہند اور دفتر وزیر ہند نے نامنظور کر دیا ہے۔ مگر صاحبزادہ صاحب کچھ تبدیلیوں کے ساتھ اس کی حمایت میں تھے۔ لارڈ جیلیکو نے لکھا تھا کہ ہندوستانیوں کے ہاں جہازوں پر کام کرنے کی روایات نہیں ہیں۔ اس لئے انھیں بحری امور سے دلچسپی نہیں ہے۔ ان میں دلچسپی پیدا کرنے میں دیر لگے گی اور تجویز کیا کہ جن ہندوستانیوں کو بحری تعلیم حاصل کرنی ہو وہ انگلستان جایا کریں۔ صاحبزادہ صاحب نے اس اسکیم کی حمایت میں ایک طویل یادداشت مرتب کی تھی۔ اور اس میں دکھایا تھا کہ ہندوستانیوں کو بجز ادنیٰ کاریگروں کے کام کے اور کچھ نہیں سکھایا گیا۔ اور انھیں یکساں مواقع ترقی کے نہیں دیئے گئے۔ بیشک اس محکمہ کی ترقی سے خرچ میں اضافہ ہوا۔ مگر حفاظت ہندوستان کے لئے ہندوستانیوں کو تیار کئے بغیر سوراج مکمل نہیں ہو سکتا۔ مختصر یہ کہ انھوں نے اپنی یادداشت مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۲۱ء میں حسب ذیل سفارشات کی تھیں:-

(۱) ایک ہندوستانی بحری فوج تیار کی جائے جس میں ہندوستانیوں کی ایک معین تعداد ہو۔

(۲) بحری افسروں کی تعلیم کے لئے بندرگاہوں پر کافی تعداد میں جہاز ہوں۔

(۳) کسی بندرگاہ میں ایک بحری کالج قائم کیا جائے تاکہ بحری تعلیم کے لئے

ہندوستانیوں کو انگلستان نہ جانا پڑے۔

(۴) مچھلی کی تجارت کی ترقی کے لئے مچھلی پکڑنے کی دخانی کشتیاں کافی تعداد میں فراہم کی جائیں۔

ہندوستانی طلبار کی تحقیقاتی کمیٹی کے سلسلہ میں ہندوستان کی آمد

انگلستان میں جو ہندوستانی طلبار تعلیم پاتے ہیں انھیں سہولتیں بہم پہونچانے کی تجاویز مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی تھی

صاحبزادہ صاحب علالت کے بعد جب لندن پہونچے تو اس کے ایک ماہ بعد اس کمیٹی کے کام میں مصروف ہو گئے۔ انگلستان میں جب اس کمیٹی کا کام ختم ہو گیا تو ستمبر ۱۹۲۱ء میں اُس کے ساتھ ہندوستان آئے اور ۲۷ر مئی ۱۹۲۲ء کو انگلستان واپس چلے گئے اور وہاں اپنے کونسل کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ اس کمیٹی کے متعلق صاحبزادہ صاحب کی ایک یادداشت حسب ذیل ہے :۔

" ہندوستانی طلبار کو انگلستان کی یونیورسٹیوں میں داخلہ کی مشکلات کے باعث بعض لوگوں کی یہ تجویز تھی کہ جہاں تک ہو سکے انھیں انگلستان آنے سے منع کیا جائے۔ خود ہندوستان میں بیرسٹری کی تعلیم کا انتظام کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ صاحبزادہ صاحب نے اس کے متعلق یہ تجویز کیا تھا کہ اس وقت ہندوستان میں جو ایڈوائزری کمیٹی ہے اس کی جگہ ہر صوبہ میں ایک کمیٹی کونسل کے ممبروں کی زیر صدارت وزیر تعلیم قائم کی جائے جو ہندوستان سے طلبہ بھیجنے کے قواعد بنائے۔ اور اُس کی تعمیل کرائے اور کل مسئلہ پر غور کرنے کے لئے انگلستان میں ایک کمیٹی بنائی جائے جس میں انڈیا کونسل کے کچھ ممبر بھی شامل ہوں۔

اس آخرالذکر کمیٹی کے قائم ہونے کی تجویز سے انگلستان کے کچھ لوگوں نے بالخصوص ایک کمیٹی نے جس کا نام جے۔ اینڈ۔ پی کمیٹی تھا اختلاف کیا اور لکھا کہ اول ہندوستان میں

ایک کمیٹی بنائی جائے جو ہندوستانی طلبار کو انگلستان آنے سے روکنے کے طریقے اختیار کرے۔ صاحبزادہ صاحب نے اپنی دوسری مفصل یادداشت میں اس تجویز سے مخالفت کرتے ہوئے لکھا کہ اس سے ہندوستان میں ناراضگی پھیلے گی اور طلبار انگلستان کی اعلیٰ تعلیم سے محروم رہیں گے اس لئے ضرورت ہے کہ اول ایک کمیشن انگلستان میں بٹھایا جائے جو طلبار کے لئے سہولتیں بہم پہونچانے کے طریقے سوچے مثلاً یہ کہ بعض وقت طلبائ کے محکمہ سے جو انگلستان میں قائم ہے کہدیا جاتا ہے کہ یونیورسٹی میں جگہ نہیں ہے مگر ذاتی کوشش سے طلبار داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بعض طلبار کو نمبر ۲۱ کرامول روڈ کے دفتر سے جو ہندوستانی طلبار کی سہولت کے لئے قائم ہے طرح طرح کی شکایتیں ہیں ان کی تحقیقات کی جائے۔ ہندوستانیوں کو انگلستان کے کارخانوں میں داخل ہونے کا مسئلہ طے کیا جائے۔ یونیورسٹیوں سے طے کیا جائے کہ وہ کس قابلیت کے طلبا، کس کس تعداد میں لیں گے۔ مختصر یہ کہ اول یہ مسائل انگلستان میں طے کرلئے جائیں تب ہی ہندوستان کی کمیٹی ان امور کو مدنظر رکھ کر اپنا کام کر سکے گی۔ آخر میں صاحبزادہ صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ انگلستان کے لوگ اگر ہندوستانی طلبار کو اپنے ملک میں فراخدلی کے ساتھ اپنے عمدہ اداروں میں تربیت دیں گے۔ کارخیر کے کاموں کو دکھائیں گے، علمی اور سائنس کی تحقیقات کرنے والے اداروں میں رکھ کر ان کے خیالات اور معلومات میں وسعت پیدا کریں گے تو لازمی طور پر ہندوستان اور انگلستان کے لوگوں میں یک دلی اور باہمی ہمدردی کے خیالات پیدا کرکے سلطنت برطانیہ کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔ بالآخر وزیر ہند نے صاحبزادہ صاحب کی اس رائے سے اتفاق کیا۔

ہندوستانی طلبار کی تعلیم انگلستان کے متعلق ناظرین کی توجہ باب ہفتم صفحات پر مبذول کی جاتی ہے۔

ہندوستان پر مزید فوجی خرچہ کا بار ڈالنے کے متعلق اِشر کمیٹی کی رپورٹ

جنگ عظیم کے بعد لارڈ اِشر کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی جس کی رپورٹ پر صاحبزادہ صاحب نے سخت نکتہ چینی کی تھی۔ یہ کمیٹی ہندوستانی فوج کے متعلق تھی۔ پہلی بات تو اس کمیٹی نے یہ کی کہ کسی شخص کی کوئی شہادت نہیں لی اور کہا کہ ہمارے پاس کافی دستاویزی مسالہ موجود ہے اور ہم نے فوجی اور سول افسروں سے مشورہ کرلیا ہے۔ اِس کی بنار پر ہم رائے قائم کرسکتے ہیں۔ مگر بقول صاحبزادہ صاحب کے اِس پر اضافہ یہ کیا کہ بغیر حکومت ہند کے مشورہ لئے ہوئے اور ہندوستان آکر کمیٹی کے ہندوستانی ممبروں سے مشورہ کرنے سے قبل رپورٹ کا اہم حصّہ لکھ ڈالا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لارڈ اِشر پریسیڈنٹ کمیٹی نے وزیر ہند پر پیہم خطوط کی بمباری کرکے ان پر تقاضا کیا کہ گورنمنٹ برطانیہ کی فوری منظوری حاصل کرلی جائے تاکہ اس کمیٹی کی محنت مثل دیگر کمیٹیوں کے ضائع نہ جائے۔ اسی کے ساتھ یہ ظلم کیا کہ اس اسکیم کی عملدرآمد سے جو اخراجات ہندوستان پر پڑیں گے ان کا کوئی تخمینہ نہیں کیا۔ کیا اس قسم کی بے عنوانیاں انگلستان میں ایک منٹ کے لئے برداشت کی جاسکتی ہیں؟ اب یہ ناقص اور ناتمام اسکیم ہمارے سامنے رائے کے لئے آئی ہے تو کیا ہندوستان کے مالیات کے امین ہوکر ہم اس اسکیم کا منظور ہونا گوارا کرسکتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ چیرمین صاحب کمیٹی مذکور کو کیا ایسی جلدی پڑی ہے کہ وہ کام مکمل کئے بغیر اسکیم کی منظوری چاہتے ہیں۔ اس جلدبازی کی تہہ میں جو بات پوشیدہ تھی اُس کا افشار اخبار مارننگ پوسٹ مورخہ ۲ راکتوبر کے ایک نوٹ سے ہوگیا ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ "جب کہ جدید اصلاحات کی رو سے ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دی جارہی ہے تو یہ قرین قیاس نہیں کہ وہ لوگ فوجی معاملات سے علٰحدہ رہیں۔ اس میں لارڈ اشر کی کمیٹی کا قصور نہیں ہے کیونکہ انھوں نے تو اپنی اسکیم کے ذریعہ سے فوجی محکمہ کو ایسا بنادیا ہے کہ (ہندوستانی) بابوؤں کا اس پر

کو ذرہ اثر نہ ہو سکے" اس کی نسبت صاحبزادہ صاحب لکھتے ہیں کہ ہندوستانیوں کا یہ خوف صحیح ہے کہ اصلاحات کے نام سے جو کچھ دیا جارہا ہے وہ دوسرے ہاتھ سے واپس لے لیا جائیگا میرے اعتراضات پر یہ کہا جائے گا کہ اس وقت ایشر کمیٹی کی اسکیم کی منظوری نہیں مانگی جاتی بلکہ ان تجاویز کی منظوری مانگی جاتی ہے جنکا مسودہ وزیر ہند کے دفتر میں کیا گیا ہے مگر ان کی منظوری دینے سے قبل حسب ذیل امور غور طلب ہیں وہ یہ کہ یہ زمانہ جنگ کا نہیں بلکہ امن کا ہے۔اس امن کے زمانہ میں ہندوستان کے کمانڈران چیف کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ انگلستان کے جنرل امپیریل اسٹاف سے براہ راست یعنی "بلا وساطت وزیر ہند" احکام حاصل کرے۔ اس سے بڑھ کر قانون کی خلاف ورزی کیا ہو سکتی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ اشر کمیٹی نے جو کچھ تجویز کیا ہے وزیر ہند کی کونسل نے اپنے رزولیشنوں میں اُس سے زیادہ اختیارات حکومت برطانیہ کو دینے تجویز کئے ہیں۔ منجملہ چھ اختیارات مجوزہ اشر کمیٹی کے ایک اختیار یہ ہے کہ جنگ کی تنظیم حکومت برطانیہ کے ہاتھ میں ہو مگر وزیر ہند کے دفتر نے اس کی جگہ "جنگ کی تیاری" کا لفظ لکھ دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تمام امن کے زمانہ میں جو کچھ ہوتا رہے گا وہ جنگ کی تیاری ہوگی اور وہ حکومت برطانیہ کے ہاتھ میں ہوگی نہ کہ حکومت ہند کے ہاتھوں میں۔ مثلاً یہ کہ جنگ کے زمانہ میں ایک لاکھ اسی ہزار ہندوستانی فوج ہندوستان سے سمندر پار لگائی گئی تھی۔ وہ جدید اختیارات کی رو سے امن کے زمانہ میں بھی عراق اور مشرق قریب کے ملکوں میں لگی ہوئی ہے اور گورنر جنرل ہند نے اُسے واپس بُلانا چاہا تب بھی واپس نہ دی گئی۔

اس طرح ہندوستان کی آمدنی کا نصف سے زیادہ حصہ براہ راست انگلستان کے فوجی افسروں کے ہاتھوں میں دیا جارہا ہے۔ درآنحالیکہ ہندوستان کا اس میں نفع ہے کہ یہ روپیہ اندرون ملک کی حفاظت و ترقی میں لگایا جائے اور موجودہ تجاویز سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کے خرچ سے ٹرکی، مصر، فلسطین اور ایران و عراق میں فوج رکھی جائے گی۔ ایک لطف یہ ہے کہ انگلستان میں زیادہ فوج رکھنے پر انگلستان کے عوام اعتراض کرتے ہیں۔ اب یہ ترکیب

کی گئی ہے کہ ہندوستان کے خرچ سے سلطنت برطانیہ کے مفاد کے لئے فوجیں رکھی جائیں۔

جو اختیارات حکومت برطانیہ کے افسر اعلیٰ کو دئے گئے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ ہندوستان کے لئے کمانڈران چیف کی نامزدگی بجائے وزیر ہند کے وہ خود بہ اتفاق رائے وزیر ہند کرے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اختیار وزیر ہند سے لے کر انگلستان کے محکمہ جنگ کو کیوں دیا جاتا ہے۔ اس سے صریحًا کونسل وزیر ہند کی توہین اور بے اعتباری ہے درآنحالیکہ اُس کے تین چوتھائی ممبر انگریز ہیں۔ (تعجب ہے کہ خود دفتر وزیر ہند کی طرف سے یہ تجویز پیش کی جارہی ہے)

مختصر یہ کہ صاحبزادہ صاحب نے تجویز کیا کہ ہندوستان کے کمانڈران چیف کا تقرر بہ حکومت ہند کے ہاتھ میں بمنظوری وزیر ہند ہو۔ اور چیف آف دی جنرل اسٹاف کا تقرر کلیتًا حکومت ہند کے ہاتھ میں ہو۔ اشٹر کمیٹی نے تو یہاں تک دست درازی کی ہے کہ انڈیا آفس کے جنگی سکریٹری کا تقرر بھی انگلستان کے محکمہ جنگ کے افسر اعلیٰ کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ ایک رزرولیوشن کے ذریعہ سے ہندوستان کے جنگی سکریٹری کا عہدہ بھی توڑ دیا ہے تاکہ حکومت ہند کو کوئی شخص جنگی امور میں مشورہ دینے والا نہ رہے۔

آخر میں صاحبزادہ صاحب نے دکھایا ہے کہ بقول اخبار مارننگ پوسٹ اشٹر کمیٹی نے فی الواقع ہندوستان کے جنگی محکمہ کو (Babu Proof) یعنی ایسا مضبوط بنا دیا ہے کہ ہندوستان کے "بابو لوگ" اُس پر ہاتھ نہ ڈال سکیں۔ اور بقول سرجارج روس کیپل کے ہندوستان کو انگلستان کا "فوجی ذخیرہ" بنا دیا ہے جو قریب اور وسط مشرقی ممالک میں کام آسکے۔ صاحبزادہ صاحب نے پُرزور الفاظ میں لکھا ہے کہ اس قسم کی غلط اور تنگ نظر پالیسی سے عارضی نفع ضرور ہو سکتا ہے مگر انجام کار اُس سے سلطنت کو نقصان پہونچے گا۔ اس پالیسی سے سلطنت کے سچے خیر خواہوں کے دل ٹوٹتے ہیں اور ایسے خطرناک بیج بوئے جاتے ہیں جو جدائی کے موجب ہوں گے۔ اس وقت برطانیہ ضرور طاقتور ہے اور

بلحاظ نتائج کے اپنی قوت کا استعمال کرسکتا ہے مگر اس سے ہندوستان کی انتہا پسند تحریک کو قوت پہنچے گی درآں حالیکہ ضرورت ہے کہ اخلاقی قوت سے کام لے کر نئی اصلاحات پر اس طرح عملدرآمد کیا جائے جس سے ہندوستان اور انگلستان متحد ہو جائیں۔

جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کا مسئلہ

اس مضمون پر صاحبزادہ صاحب نے دو طویل یادداشتیں لکھی ہیں۔ اُس زمانہ میں جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی حالت کی تحقیقات کے لئے ایک کمیشن بیٹھا ہوا تھا اسکے سامنے مسٹر فلپس چیرمین "ساؤتھ افریقہ لیگ" نے اپنی شہادت میں بیان کیا تھا کہ ہم لوگوں نے ارادہ کرلیا ہے کہ یہ ملک سفید قوم کا ہوگا۔ نیز ایک وفد نے کہا کہ بمقابلہ اس کے کہ ہندوستانی بازار میں جائے (یعنی وہاں تجارت کرے) ہم پسند کرتے ہیں کہ وہ ہندوستان چلا جائے۔ اس طرح دوسرے یوروپینوں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ ہندوستانیوں کو اس قدر تنگ کریں کہ یا تو وہ اس ملک کو چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں ورنہ وہاں غلام ہو کر رہیں۔ صاحبزادہ صاحب نے لکھا ہے کہ وہاں یوروپین اور ہندوستانی پر شیر اور بکری کے بچہ کی مثل صادق آتی تھی اور شیر کے لئے بالکل جائز سمجھا جاتا تھا کہ وہ بکری کے بچہ کو ہضم کرلے۔ اس کمیشن کے سامنے ہندوستانیوں کی تائید میں سر بنجمن رابرٹسن نے شہادت دی تھی اور یہی شہادت صاحبزادہ صاحب کے سامنے حصول رائے کے لئے آئی تھی۔ صاحبزادہ صاحب نے اس کے بعض حصوں کی تعریف کی ہے مگر اُسی کے ساتھ بعض ان امور کی تردید کی ہے جن سے ہندوستانیوں کی حق تلفی ہوتی تھی۔ سر بنجمن نے کہا تھا کہ جنوبی افریقہ کو ہندوستانی خوشی سے نہ جاتے تھے۔ بلکہ وہاں کے محاورہ کے مطابق "قلی پکڑنے کے جال میں پھنس کر جاتے تھے"۔ ۱۸۶۰ء سے یہ جال حکومت برطانیہ کے حکم سے ہندوستان میں لگائے جاتے تھے اور پکڑے ہوئے لوگ جہازوں میں بھر بھر کر جنوبی افریقہ کو بھیج دئے جاتے تھے۔ البتہ ۱۸۸۴ء تک وہاں دفعہ

۳۴ کا نفاذ تھا جس کی رو سے ہندوستانیوں کو جنوبی افریقہ میں، رہنے یا نقل و حرکت کرنے مکانات، دوکانیں، کارخانے وغیرہ کا مالک ہونے اور انھیں کرایہ پر لینے کی آزادی تھی مگر ۱۸۸۵ء سے قانون نمبر ۳ کی رو سے ان سب حقوق سے وہ محروم کر دیے گئے۔ اور انھیں جداگانہ آبادیوں میں رہنے کا حکم ہوا تاکہ یوروپین آبادی صاف ستھری ہو جائے۔ اس کے بعد ایسے قوانین پاس ہوئے جن کی رو سے ہندوستانیوں کی مسلسل حق تلفی ہوتی گئی۔ صاحبزادہ صاحب نے اس بات کی شکایت کی ہے کہ ان مظالم سے حکومت برطانیہ کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ چاہتی تو کم سے کم ہندوستان سے قلیوں کی بھرتی بند کرا دیتی۔ مگر باوجودیکہ اس نے ۱۹۱۰ء میں اس کا وعدہ کر لیا۔ تاہم ۱۹۱۱ء تک بھرتی بند نہ کرائی۔

صاحبزادہ صاحب نے ہندوستانیوں کے مصائب کی تمام تر ذمہ داری حکومت برطانیہ پر عائد کی ہے جو ہندوستان اور جنوبی افریقہ دونوں کی مالک ہے مگر بدقسمتی سے حکومت برطانیہ اس بات میں کنی کاٹتی ہے اور کہتی ہے کہ حکومت ہند جنوبی افریقہ کی حکومت پر دباؤ ڈالے درانحالیکہ حکومت ہند کا جنوبی افریقہ کی حکومت پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔ اسکے بعد صاحبزادہ صاحب نے دکھایا ہے کہ اس سے بڑھ کر کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو ہندوستانیوں کو ملک چھوڑ کر جانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف انھیں خون پسینہ بہا کر اپنے کمائے ہوئے سونے کو ساتھ لے جانے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ ہندوستانیوں کا خوشحال طبقہ وہاں سے چلا جائے اور صرف غریب باقی رہ جائیں۔ کبھی تجویز کی جاتی ہے کہ اندرون ملک خالی کر کے وہ سمندر کے کنارے پر جا بسیں۔

بڑی مشکل تو یہ ہے کہ اس قسم کی بعض باتیں خود سر بنجمن نے تسلیم کر لی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہندوستانی اپنی دوکانوں کے نوکروں کو کم اجرت دیتے ہیں۔ دوکان کھولنے کے اوقات کی پابندی نہیں کرتے۔" گھنی آبادیوں میں رہتے ہیں اور صفائی نہیں رکھتے۔ انھیں مخصوص بازاروں میں تجارت نہ کرنا چاہیئے۔ چونکہ سر بنجمن ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت رکھتے ہیں

اس لئے ان کے اعتراف سے ہندوستانیوں کو نقصان پہنچے گا۔ آخر میں صاحبزادہ صاحب نے تمام تر ذمہ داری حکومت برطانیہ پر دیا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرکے ہندوستانیوں کے حقوق کی حفاظت کرے اور ان حقوق کی تفصیل دی ہے اور ایک عہدہ دار ایڈوائزر یعنی "مشیر" کے نام سے مقرر کیا جائے۔ جو وہاں رہے اسی کے مشورہ سے ہندوستانیوں کی واپسی ہوسکے۔ اور وہ ہندوستانیوں کی تعلیم اور دوسری ضروریات کی طرف سے مقامی حکومت کو توجہ دلاتا رہے۔

یادداشت کے مطالعہ کے بعد مسٹر ہنری پالک نے جن کی صاحبزادہ صاحب سے ملاقات ۱۹۱۷ء کے بحری سفر میں ہوئی تھی ایک خط میں لکھا:۔

"آپ نے یہ یادداشت نہایت جرأت کے ساتھ لکھی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ الزام کس قدر ناواجب اور لغو ہے کہ جب پبلک کام کرنے والا ہندوستانی کوئی عہدہ قبول کرلیتا ہے تو وہ ملک کے ہاتھ سے کھویا جاتا ہے۔"

اس یادداشت کے چھ ماہ بعد مئی ۱۹۲۱ء میں صاحبزادہ صاحب نے ایک اور طویل یادداشت لکھی اس میں دکھایا گیا ہے کہ اس وقت جو ہندوستانی نیٹال اور ٹرانسوال میں ہیں ان میں سے پچاس فی صدی وہیں پیدا ہوئے ہیں۔ اور اچھے تعلیم یافتہ ہیں اور جنھیں وہاں سے نکالنے یا غلام بناکر رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یا تو وہ مزدور بن کر رہیں ورنہ ہندوستان چلے جائیں اور یہاں تجارت نہ کریں درآنحالیکہ خود یورپین باشندوں نے تسلیم کیا ہے کہ ہندوستان ہی کی بدولت وہاں شکر کی تجارت کو ترقی ہوئی۔ جنوبی افریقہ کے اصلی باشندوں سے ہندوستانی مزدور کہیں اچھا کام کرتے ہیں وہ بیکار زمینوں کو لے کر کاشت کرتے اور انھیں ترقی دیتے ہیں اور انھیں یورپین کے ہاتھ فروخت کرکے خراب زمین کاشت کرنے لگتے ہیں جو یورپین نہیں کرسکتے۔

صاحبزادہ صاحب نے بڑا زور اس بات پر دیا کہ اس مسئلہ کی تمام تر ذمہ داری حکومت برطانیہ پر ہے اور حکومت ہند میں اتنی قوت نہیں کہ وہ جنوبی افریقہ کی حکومت پر کوئی دباؤ

ڈال سکے۔ بعض انگریزوں کی رائے صاحبزادہ صاحب کے خلاف تھی اس لئے موصوف نے اس یادداشت میں ان کے تمام اعتراضات کی تردید کی ہے اور ان تجاویز پر مفصل بحث کی ہے جنھیں ہندوستانیوں کے نفع کے لئے اختیار کیا جائے اور سب سے آخر میں یہ مشورہ دیا ہے کہ جنوبی افریقہ سے کچھ ہندوستانی نمائندوں کو لندن میں بلاکر امپیریل کانفرنس کے سامنے انھیں اپنے مصائب پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔

جدید اصلاحات کے متعلق مسٹر لائڈ جارج کی غلط تاویل پر احتجاج

شروع اگست ۱۹۲۲ء میں انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کی رو سے ہندوستان کو جدید اصلاحات ملے ہوئے دو برس کے قریب گذر چکے تھے۔ اس وقت پارلیمنٹ کے ایک اجلاس میں مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم نے ان اصلاحات کی جو پارلیمنٹ کے قانون کی رو سے دی جا چکی تھیں غلط تاویل کی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وزیر صاحب موصوف نے ان وعدوں سے جو برطانوی حکومت کی طرف سے ہندوستان کو حکومت خوداختیاری کی طرف لیجانے کے لئے کئے گئے تھے گریز کرنا چاہتے تھے۔ صاحبزادہ صاحب نے اس تقریر سے متاثر ہوکر وزیر ہند کو ایک چٹھی لکھی جس میں ہندوستان کی نمایندگی کا پورا حق ادا کیا۔ صاف الفاظ میں بتادیا کہ وزیر اعظم کے یہ خیالات پارلیمنٹ کی منظور کردہ پالیسی کے بالکل منافی ہیں اور ان سے ہندوستانیوں کے دلوں میں بےچینی پیدا ہو گی۔ اس چٹھی کا جو وزیر ہند کے نام بھیجی گئی تھی اقتباس حسب ذیل ہے:۔

"وزیر اعظم نے دارالعوام میں جو بیانات کل کئے ہیں ان کی بابت میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو یہ بتلاؤں کہ ان سے یقینی طور پر ہندوستان میں بے اطمینانی اور بےچینی پیدا ہوگی ان بیانات سے تمام اس پالیسی کی جسکی بنا پر کہ جدید اصلاحات بذریعہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء دی گئی ہیں، جڑ کٹ جاتی ہے۔ میں آپ کی توجہ خاص طور پر وزیر اعظم کے حسب ذیل بیان کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں:۔

اگر پہلے سے یہ بات صاف نہیں ہے تو اب میں صاف طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری غرض اصلاحات دینے سے یہ نہیں ہے کہ انجام کار ہم اپنی امانت سے بالکل دست بردار ہو جائیں بلکہ سلطنت برطانیہ کے اندر رہ کر اس امانت کا کام انجام دینے کے لئے ہندوستانیوں کو حصہ دار بنائیں۔ اس بڑی امانت کے کام کی انجام دہی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم نہ صرف ہندوستانی سول سروس کے ملازموں، ہندوستانی سپاہیوں، ہندوستانی ججوں اور ہندوستانی قانون سازوں سے مدد لیں بلکہ یہ ضروری ہے کہ ہم انگریزی افسروں کی مسلسل امداد حاصل کرتے رہیں۔ جو بات خاص طور پر میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہندوستانی بحیثیت جماعتہائے مقننہ کے یا بحیثیت مدبران ملک کے خواہ کیسے ہی کامیاب کیوں نہ ہوں مگر میرے نزدیک کوئی زمانہ ایسا نہ ہوگا کہ ان کا کام انگریزی عہدہ داروں کی ایک تھوڑی تعداد کے بغیر چل سکے گا جو ساڑھے اکتیس کروڑ کی آبادی میں کل بارہ سو ہیں۔" وزیر اعظم کے اس بیان کی بابت صاحبزادہ صاحب نے لکھا کہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جس چیز نے ہندوستانیوں کو عام طور پر گورنمنٹ کی امداد پر آمادہ کیا تھا وہ حکومت برطانیہ کے اعلان مورخہ ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کی پالیسی تھی اور جو قطعی طور پر قانون گورنمنٹ ہند ۱۹۱۹ء میں ان الفاظ میں ظاہر کر دی گئی تھی:-

"پارلیمنٹ کی پالیسی جس کا اعلان کیا جا چکا ہے یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر شعبہ میں ہندوستانیوں کی تعداد مسلسل بڑھائی جائے تاکہ اُس سے برٹش انڈیا میں بحیثیت سلطنت برطانیہ کے ایک اہم جزو کے ذمہ دارانہ حکومت کا مسلسل احساس پیدا ہو۔"

پارلیمنٹ کی مندرجہ بالا قرارداد میں کوئی حدود اس قسم کی مقرر نہیں کی گئی ہیں جو حکومت خود اختیاری کے نشوونما کے لئے ضروری ہوں۔ برخلاف اس کے وزیر اعظم نے ہندوستانی سول سروس میں بارہ سو ۱۲۰۰ انگریز افسروں کے موجود رہنے کی شرط لگا دی ہے اگرچہ ہندوستانی اپنے ملک کا انتظام کرنے کے لئے کیسے ہی قابل کیوں نہ ہو جائیں مگر

سوال ہے کہ جب کہ ان پر بارہ سنہ ۱۲ سو انگریز افسر ہمیشہ کے لئے مسلط رہیں گے تو ہندوستانیوں میں خود اپنا انتظام کرنے کی قابلیت کیسے پیدا ہوگی۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ کچھ انگریز افسر جن کا انتخاب ہندوستان کی حکومت کرے وہ بھی ہندوستان میں رکھے جائیں مگر جبریہ طور پر انگریز افسروں کے دوامی طور پر قائم رہنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ میرے نزدیک وزیر اعظم کا یہ بیان پارلیمنٹ کی اعلان کردہ پالیسی کے بالکل منافی ہے۔ اور اس سے ہندوستان نازک حالات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ انگلستان میں ہندوستانی سول سروس کی ملازمت کے لئے انگریزوں کو آمادہ کرنے کے لئے ان کے شکوک رفع کئے جائیں۔ مگر گورنمنٹ کی اس قطعی پالیسی کے خلاف جو ہندوستان میں نوآبادیات کی شکل کی حکومت قائم ہونے کی نسبت تسلیم کرلی گئی ہے کسی قسم کا اعلان کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہندوستان کو ہمیشہ کے لئے اپنے تحت میں رکھنا مقصود ہے۔ میرے نزدیک وزیر اعظم کے اس اعلان سے ہندوستان کے تارکین موالات اور انتہا پسندوں کو نہایت خوشی ہوگی :۔

میرے خیال میں موعودہ اصلاحات کی نسبت یہ کہنا کہ وہ محض تجربہ کے طور پر دی گئی ہیں اُن کی اہمیت کو گھٹانا ہے۔ اس وعدہ سے جو پارلیمنٹ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ذریعہ سے کیا ہے باہر نکلنے کی کوشش کرنا خودکشی کے مساوی ہوگا۔ میری رائے میں سلطنت برطانیہ کے لئے یہ عین وقت ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں ایک قومی پالیسی اختیار کرکے ہندوستانیوں کا اعتماد حاصل کرلے اور اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کردے کہ جو مراعات وہ ہندوستانیوں کو دیتی ہے وہ کسی دباؤ کی وجہ سے نہیں دیتی بلکہ اپنی وسیع خیالی اور فیاضی سے دیتی ہے۔

آپ چونکہ کیبنٹ (کابینہ) میں ہندوستان کے قائم مقام ہیں اسلئے میں آپ سے بہ ادب عرض کرتا ہوں کہ آپ وزیر اعظم کو یہ بتادیں کہ جو بیان انھوں نے دیا ہے وہ ہندوستان

کی موجودہ صورت کے اعتبار سے نازک حالات پیدا کر دے گا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ بیان ہندوستانی سول سروس کو اور زیادہ غیر ہردلعزیز بنا دے گا اور نیز اعتدال پسند جماعت کی تحریک کو سخت نقصان پہنچائے گا۔ دراصل یہ بیان ہر خیال کے ہندوستانیوں کو متحد کر دے گا۔ کیونکہ کوئی ہندوستانی ایکٹ ۱۹۱۹ء کی اس قسم کی تاویل کو تسلیم نہیں کر سکتا۔"

مندرجہ بالا چٹھی صاحبزادہ صاحب نے ۳؍ اگست ۱۹۲۲ء کو وزیر ہند کے نام بھیجی تھی مگر اُسے انھوں نے کافی نہیں سمجھا اور بعد میں جو خیالات اُن کے دل میں آئے اُن کی وجہ سے ۶؍ اگست کو دوسری چٹھی وزیر ہند موصوف کے پاس بھیجی جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے :۔

میں نے آپ کو ۳؍ اگست ۱۹۲۲ء کو ایک چٹھی لکھی تھی کہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات جو ہندوستان کو دی گئی ہیں وہ محض بطور تجربہ کے نہیں ہیں بلکہ اُن سے مراد یہ ہے کہ ہندوستان ارتقاء کے ذریعہ سے سوراج یا حکومت خود اختیاری کی منزل پر قطعی طور پر پہونچے۔ اس سلسلہ میں میں آپ کی توجہ اس شاہی پیغام کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو فروری ۱۹۲۱ء میں ڈیوک آف کیناٹ کے ذریعہ سے ہندوستان میں پہونچایا گیا تھا۔ اس شاہی اعلان میں جو ۹؍ فروری کو صاحب موصوف نے پہلے اسمبلی کے اجلاس کے افتتاح کے وقت بادشاہ کی طرف سے کیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

"سالہا سال سے بلکہ چند نسلوں سے ہمدردانِ ملک اور وفادار ہندوستانی اپنی بھارت ماتا کے لئے سوراج کا خواب دیکھ رہے تھے۔ آج میری سلطنت میں آپ کے لئے سوراج کی ابتدا ہو رہی ہے اور آپ کو ترقی کے وسیع ترین اور اعلیٰ درجہ کے مواقع مل رہے ہیں جن سے میری نوآبادیات کے مانند آزادی حاصل ہوگی۔"

ان الفاظ سے بالکل عیاں ہے کہ نوآبادیات کی حکومت ہندوستانیوں کو دیے جانے کی قطعی ذمہ داری کر لی گئی تھی۔ اس شاہی اعلان کے بعد وائسرائے نے اپنی تقریر میں

جدید اصلاحات کی اہمیت کے سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار حسب ذیل الفاظ میں کیا:
"مطلق العنان حکومت کا اصول اگرچہ مشروط تھا اور تمام ابتدائی اصلاحات میں قائم رکھا گیا تھا وہ اب قطعی طور پر ترک کر دیا گیا ہے۔ سلطنت برطانیہ کا تصور بہ حیثیت ایک مہربان غیر آئینی حکومت کے چھوڑ دیا گیا اور اُس کی جگہ وہ رہنمائی کرنے والی حکومت قائم کی گئی جس کا کام یہ ہوگا کہ وہ ہندوستان کو اُس سڑک پر قدم بڑھانے میں مدد دے جو امتداد زمانہ کے ساتھ سلطنت برطانیہ کے اندر کامل حکومت خود اختیاری کے مقام پر پہونچا دے گی۔ اس وقفہ میں جو اُس کام کے مکمل ہونے میں لگے گا نگرانی اور حسب ضرورت مداخلت کرنے کے اختیارات قطعی طور پر ترک کر دئے جائیں گے اور گورنمنٹ کے معاہدہ کی طرف جلد سے جلد حقیقی طور پر قدم اُٹھائے جائیں گے۔"

وائسرائے کی اس تقریر کے بعد ڈیوک آف کیناٹ نے اپنی مشہور اسپیچ میں فرمایا۔
"جیسا کہ وائسرائے نے بیان کیا کہ مطلق العنانی کا دور ترک کر دیا گیا ہے۔ اگر وہ قائم رکھا جاتا تو وہ اُس سکون کے منافی ہوتا جس کو حضور ملکہ معظمہ کوئن وکٹوریہ نے اپنے اعلان میں انگریزی عملداری کا مقصد قرار دیا تھا اور اہل ہند کے جائز مطالبات اور آرزوؤں اور اُس سیاسی ارتقاء کی منزل کے بھی منافی ہوتا جس پر ہندوستانی پہونچ گئے ہیں۔ پس اس وقت سے ہندوستان معتدبہ درجہ میں خود اپنا بوجھ اُٹھائے گا۔"

اس طرح پر شاہی پیغام وائسرائے اور ڈیوک آف کیناٹ کی تقریروں کے ذریعہ سے تمام ممکن طریقوں سے ہندوستانیوں پر سلطنت کا یہ منشاء ظاہر کر دیا گیا کہ جدید اصلاحات کی غرض یہ تھی کہ ہندوستانیوں کو سلطنت برطانیہ کے حدود کے اندر ایک وسیع ترین دائرہ اور اعلیٰ ترین موقع سوراج یا مکمل حکومت خود اختیاری حاصل کرنے کا دیا جاوے یہ سب چیزیں پارلیمنٹ کی اعلان کردہ پالیسی کے عین مطابق تھیں مگر وزیر اعظم نے سب اعلانات کو بالائے طاق رکھ کر انھیں محض ایک تجربہ پر محدود کر دیا بلکہ اس سے بڑھ کر ہندوستانیوں

کی تمام اُمیدوں اور آرزوؤں کو جو مکمل حکومت خود اختیاری کے متعلق تھیں زمین پر پٹک دیا۔ وزیر اعظم نے یہ کہا کہ "ہمیں ایک بات صاف کر دینا چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ برطانیہ کسی حالت میں ہندوستان کے متعلق اپنی ذمہ داری سے دست بردار نہ ہوگا۔"

اس کے بعد وزیر اعظم نے یہ ارشاد فرمایا کہ "اگر برطانیہ نے اپنا ہاتھ ہندوستان سے ہٹا لیا تو اس کا نتیجہ مختلف اقوام اور مذاہب کے لئے کیا ہوگا" اور پھر اپنی تقریر کا رُخ بدل کر کہا کہ "ہمارے فرائض صرف ہندوستان کے وسیع ممالک ہی کے لئے نہیں ہیں بلکہ وہاں کے والیان ملک و ریاستوں کے لئے بھی ہیں جو حضور ملک معظم کے باجگذار ہیں"

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستانی ریاستوں اور برٹش انڈیا کا جس کی آزادی کی نسبت پارلیمنٹ نے صاف الفاظ میں اعلان کر دیا۔ کیا جوڑ ہے۔ اس کے بعد وزیر اعظم نے ہندوستان میں اپنی عملداری قائم رکھنے کے وجوہ و دلائل دیتے ہوئے یہ کہا کہ "ہم اس بات کو صاف کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اصلاحات دینے سے ہمارا منشا اپنی امانت سے دست بردار ہونا نہیں ہے بلکہ منشا یہ ہے کہ سلطنت برطانیہ کے حدود کے اندر اس امانت کے کاموں کی انجام دہی کے لئے ہم ہندوستانیوں کو اپنا شریک کر لیں اور اُس امانت کے فرائض کی انجام دہی کے لئے صرف بارہ سو [۱۲۰۰] انگریز افسروں کی مسلسل امداد حاصل کرتے رہیں"

پس وزیر اعظم صاحب کی تقریر کا خلاصہ یہ ہوا کہ انگریز افسران ہی ہمیشہ کے لئے ہندوستان پر حکومت کرتے رہیں گے اور ہندوستانیوں کی حیثیت صرف یہ رہے گی کہ جب ان کی ضرورت ہو تو وہ موالات کرنے کے لئے حاضر رہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ وزیر اعظم صاحب کے یہ تصورات پارلیمنٹ کی اعلان کردہ پالیسی اور وائسرائے اور ڈیوک آف کیناٹ کے اعلانات کے بالکل منافی ہیں۔

وزیر اعظم نے اپنے دلی منشا کو ان الفاظ سے اور زیادہ واضح کر دیا کہ ان کے نزدیک کوئی زمانہ ایسا نہ آوے گا کہ ہندوستانیوں کو بارہ سو [۱۲۰۰] انگریز افسروں کی رہنمائی اور مدد کی

ضرورت نہ ہوگی۔ اس کے صاف یہ معنی ہوئے کہ ہندوستانی خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائیں مگر وہ کبھی یہ دعویٰ کرنے کے مستحق نہ سمجھے جاویں گے کہ وہ حکومت خود اختیاری کے قابل ہیں۔ اس پر وزیر اعظم نے یہ اور اضافہ کر دیا ہے کہ کم سے کم بارہ سو (۱۲۰۰) انگریز افسروں کی قید لگا دی جس کے معنی یہ ہیں کہ سول سروس میں ہندوستانیوں کی مزید توسیع بند ہو جائے گی۔ وزیر اعظم کا یہ قول ہے کہ انگریز افسران تمام صیغۂ ملازمت کے لئے بمنزلہ فولاد کے قالب (Steel frame) کے ہیں۔ اگر اس قالب کو ہٹا لیا جائے تو تمام عمارت گر جائے گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ فولاد کا قالب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انگریزوں سے مرکب رہے گا۔ ہندوستانیوں کے لئے اس کے بعد پھر کیا باقی رہ جائے گا۔

اب اس کا مقابلہ اعلان شاہی سے کیا جائے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ہندوستانیوں کو مثل دیگر نوآبادیات کے انتہائی ترقی کا موقع دیا جائے گا مگر جب تک کہ اس فولادی قالب کی رکاوٹ موجود رہے گی اہل ہند حکومت خود اختیاری کے مرتبہ تک کس طرح پہونچ سکیں گے۔

مجھے امید ہے کہ وزیر اعظم کی تقریر جس نے پارلیمنٹ اور ملک معظم کے اعلانات سے بے اعتنائی کی ہے اور اُس نے جو نازک حالت پیدا کر دی ہے اُس کا آپ کو اندازہ ہوگا اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وزیر اعظم کو یہ بتایا جائے کہ وہ اُس بے چینی کو جو اُن کے بیان سے ہندوستان میں پیدا ہوگئی ہے دور کرنے کے لئے مناسب طریقہ اختیار کریں۔ جو شرط اُن کی تقریر سے پیدا ہوگئی ہے وہ صرف انھیں کے مزید بیان سے رفع ہو سکتی ہے کیونکہ تمام سلطنت کے سب سے بڑے انتظامی افسر وہ ہی ہیں۔ اس بارہ میں آپ کا یا وائسرائے کا کوئی بیان کوئی اہمیت یا وقعت نہ رکھے گا۔

مسلمانانِ ہند کو حج میں تکالیف

سنہ ۱۹۲۳ء میں جب کہ شریف حسین کی حکومت حجاز میں ہو گئی تھی حج میں مسلمانوں کی تکالیف کی شکایتیں آئی تھیں۔لاہور کے ایک حاجی موسوم بہ مرزا محمد بیگ نے انگریزی کونسل (Council) متعینہ جدہ کو حج کی تکالیف کا حال لکھ کر بھیجا تھا جس کا خلاصہ صاحبزادہ صاحب نے یہ لکھا ہے کہ "ہر حاجی سے مالانہ ۳۶ روپیہ جدہ سے مکہ اور مدینہ تک واپسی کی بابت لیا جاتا ہے مگر راستہ کی کوئی حفاظت نہیں کی جاتی جس کی وجہ سے حاجی لوٹے جاتے ہیں۔ اور باوجود پورا کرایہ ادا کرنے کے اُسے زبردستی ینبوع (Yambo) پہنچ کر مزید کرایہ لیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ ملازمان حکومت زبردستی اور روپیہ اپنے لئے وصول کرتے ہیں۔مزید براں پانچ سو مسافروں کے جہاز میں دو ہزار حاجی بھیڑ بکری کی طرح ٹھونسے گئے۔اس شکایت پر میجر مارشل انگریزی سفیر متعینہ جدہ نے اپنی حکومت کو رپورٹ کی کہ ہاشمی حکومت حاجیوں کے آرام کا کوئی انتظام نہیں کرتی۔ایک ہندوستانی حاجی مدینہ سے جدہ واپس آیا تو اُس کی ران میں بندوق کی گولی کا زخم تھا جس سے وہ مر گیا میں نے ہاشمی حکومت کو رپورٹ کی کہ مجرم کو سزا دو اُس نے کچھ نہیں کیا۔سفیر مذکور نے لکھا ہے کہ ڈچ حکومت کا ایک جاوی حاجی جب بیمار ہوا اور اُن کے سفیر کی درخواست پر میں نے اپنے ایک ڈاکٹر کو علاج کے لئے بھیجا تو مطوف نے اُسے مکان میں گھسنے نہیں دیا۔اس پر ڈچ حکومت نے مجبور کر کے اُس مطوف سے معافی منگوائی۔انگریزی سفیر کی مندرجہ بالا شکایت پر سر ہیولاک چارلس نے یہ تجویز کیا کہ یہ کل معاملہ ہندوستان کی لیجسلیٹو کونسل (غالباً اسمبلی) کو بھیجا جائے اور مسلمانوں کو بتایا جائے کہ حجاز میں اُن کے بھائی کیسا بُرا برتاؤ کرتے ہیں۔ مگر اس پر سکریٹری صیغہ مال نے لکھا کہ حکومت ہند کو اس بارہ میں نہ لکھا جائے کیونکہ۔

"یہ مصیبت تو خود ہندوستان اور حجاز کے مسلمان لیڈروں کی پیدا کردہ ہے۔"

اس پر صاحبزادہ صاحب نے ایک طویل یادداشت میں لکھا کہ حیرت ہے کہ حجاز کی

لوٹ کو مسلمان لیڈروں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ درآنحالیکہ ہاشمی حکومت کو حجاز پر قابض کرنے کی ذمہ داری تمامتر حکومت برطانیہ پر ہے جس نے اُسے سپاہیوں اور روپیہ سے امداد دی تھی۔ ہاشمی حکومت سے پہلے ترکوں کی حکومت تھی جو حاجیوں کے قافلوں کی حفاظت کرتی تھی۔ چنانچہ خواجہ کمال الدین امام مسجد ووکنگ (ملک انگلستان) نے اپنی کتاب موسومہ "India in the Balance" میں لکھا ہے کہ جب انھوں نے دمشق سے مدینہ طیبہ تک ریل میں سفر کیا تو ایک درجہ میں ترکی پولیس ساتھ چلتی تھی اور ڈاکوؤں کی دست وبرد سے بچاتی تھی۔ اسی طرح مدینہ منورہ اور عرفات میں ترکی پولیس حفاظت کرتی تھی۔ خواجہ کمال الدین نے لکھا ہے کہ میں نے مدینہ منورہ سے جدہ تک کل ۶۵ روپئے دیے تھے۔ اُس کے مقابلہ میں موجودہ حکومت ۲۶ روپیہ وصول کرتی ہے۔ (جو پہلے سے چارگونہ ہے) صاحبزادہ صاحب نے لکھا ہے کہ ممبران انڈیا کونسل کو اس طرف توجہ کرنا چاہیئے۔ بالخصوص جبکہ ڈچ حکومت اپنی رعایا کے آرام کے لئے کوشش کرتی ہے تو پھر حکومت کیوں نہیں کرتی۔ حکومت برطانیہ نے جنگ عظیم میں مسلمان سپاہیوں کی مدد سے فتح حاصل کی اب وہی مقدس مقامات میں مصیبت اُٹھا رہے ہیں۔ شاہ حجاز حکومت برطانیہ سے مالی امداد پا رہے ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اُنھیں اِس امداد کے بند کرنے یا کم کرنے کی دھمکی نہ دی جائے تاکہ وہ ہندوستانی حاجیوں کی خبرگیری کریں۔

نوٹ۔ ہاشمی حکومت کے بعد سعودی حکومت قائم ہوجانے سے اندرونی انتظام ملک حجاز میں بہت کچھ اصلاح ہوگئی ہے۔ ڈاکوؤں وغیرہ کا نام ونشان نہ رہا۔ امن کی یہ حالت ہے کہ قافلہ تو درکنار یکہ وتنہا مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان میں بہ اطمینان سفر کرسکتا ہے۔ لیکن جہازوں میں حاجی اب بھی بھیڑ بکری کی طرح سے ٹھونسے جاتے ہیں۔ اس کی ذمہ داری گورنمنٹ ہند پر ہے اور اس طرح بحیثیت مسلمان ممبران سنٹرل لیجسلیچر یک حد تک ذمہ دار ہیں۔ ان کے بعض افراد نے اس سلسلہ میں قابل قدر کوششیں کی ہیں۔ ضرورت ہے کہ کل مسلمان ممبر اس مسئلہ کو یک طرح یک زبان ہوکر اٹھائیں تو امید ہے کہ انشاءاللہ حجاج کی تکالیف جہاز رفع ہوجائینگی

وزیر ہند اور وائسرائے ہند کے درمیان تقسیم کام

۱۷ اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان شاہی کی رو سے مندرجہ بالا عہدہ داروں کے درمیان کام کی تقسیم درپیش تھی اور اس کے لئے لارڈ کرو کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر ہوئی تھی جس کے سامنے حسب درخواست صدر مذکور صاحبزادہ صاحب نے اپنی شہادت کے لئے ایک طویل یادداشت پیش کی تھی اس کا خلاصہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

اس یادداشت میں صاحبزادہ صاحب نے گیارہ محکمے ایسے دیئے تھے جو قانون کی رو سے وزیر ہند کے تحت میں آتے تھے۔ مثلاً بری و بحری فوجیں، دیگر ممالک اور ریاستوں کے ساتھ تعلقات، قانون فوجداری مختلف ہائی کورٹ، صیغۂ مذہب عیسوی، مرکزی ہند کی پولیس، اعلیٰ ملازمتیں، سکہ شرح تبادلہ، قرضہ جات جو انگلستان میں لئے جائیں، اور مندرجہ بالا مضامین کے بجٹ۔ ان کے علاوہ جس قدر محکمے ہیں وہ حسب قانون مرکزی حکومت اور صوبجات کو سپرد کردیے جائیں۔ صاحبزادہ صاحب نے اس بات پر بہت زور دیا تھا کہ مرکزی حکومت ہند کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیے جائیں جو مقامی ضروریات سے زیادہ واقف ہے۔ اس سے بار بار انگلستان سے جزئیات میں دریافت کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ گورنمنٹ ہند چونکہ انگریزوں کے ہاتھوں میں ہے اس لئے انگلستان کے حقوق اور مفاد کی چیزیں ہر طرح محفوظ ہیں۔ اس کے بعد صاحبزادہ صاحب نے ان محکموں کی تفصیل دی ہے جو کلیتاً حکومت ہند کو دیدیے جائیں۔ اس کی وجہ سے جو کام وزیر ہند کے اور وائسرائے کے دفتروں میں دوہرا ہوتا ہے وہ صرف ایک جگہ ہو جائے گا اور اس سے بڑی آسانی اور کفایت ہو جائے گی۔ صنعتی صیغہ جات کو پوری طرح ہندوستان کو منتقل کرنا تجویز کیا تھا اور اسٹور یعنی خرید سامان کو انگلستان سے منتقل کرکے ہندوستان کے صیغۂ صنعت و حرفت کے سپرد کرنیکا مشورہ دیا تھا۔

وزیر ہند کی کونسل کے کام کی نسبت لکھا کہ ہر ممبر کو بہت سی کمیٹیوں میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ پہلے سے کاغذات نہیں دیے جاتے۔ اور فوری رائے طلب کی جاتی ہے۔ یہ طریقہ

غلط ہے۔ ایک ممبر کونسل دو یا تین سب کمیٹیوں سے زیادہ کا ممبر نہ ہو اور تمام کاغذات متعلقہ بہت پہلے سے دیئے جائیں تاکہ ممبر پوری طرح تیار ہو سکے۔ خرچ کرنے کی مد پر کونسل کے پورے اختیارات ہوں۔ حسب تجویز صاحبزادہ صاحب کونسل کا کام اگر کم کر دیا جائے تب بھی ممبروں کی تعداد یہی رہے جواب ہے۔ یعنی ۱۰ اور ۱۴ کے درمیان مگر ہندوستانی ممبر لازمی طور پر نصف تعداد میں ہوں تاکہ ہندوستان کے حقوق محفوظ ہوں۔ البتہ ممبروں کی سات سال کی میعاد کو کم کرکے پانچ یا تین سال تجویز کئے تھے۔ یہ مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان کے قابل لوگ دفتر وزیر ہند کے مختلف محکموں میں سکریٹری اور اسسٹنٹ سکریٹری مقرر کئے جائیں اور تجربہ حاصل کرکے ہندوستان واپس بھیج دیئے جائیں۔

صاحبزادہ صاحب کی خاص خاص یادداشتوں کا خلاصہ

صاحبزادہ صاحب نے انڈیا کونسل کے مسائل پر جو یادداشتیں لکھی تھیں اُن میں سے اکثر کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں آچکا ہے ان کے علاوہ انھوں نے بکثرت یادداشتیں لکھی تھیں جن میں سے خاص خاص رکھ لی گئی تھیں انھیں ان کے فرزند صاحبزادہ شہزاد احمد خاں صاحب نے بڑی محنت سے چھ ضخیم جلدوں میں مرتب کر دیا ہے۔ اُن میں سے زیادہ تر یادداشتیں اس قابل ہیں کہ وہ بجنسہٖ جُدا جُدا رسالوں میں شائع کی جائیں مگر یہ کام چونکہ سردست مشکل ہے اس لئے ان میں سے اہم یادداشتوں کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی صاحب چاہیں تو اصل یادداشتیں صاحبزادہ شہزاد احمد خاں صاحب کے پاس آفتاب منزل علیگڈھ میں ملاحظہ فرما لیں۔

(۱) مسلمان سپاہیوں کے قبرستان۔ اس یادداشت میں اُن مسلمان سپاہیوں کے دفن کے متعلق مشورے ہیں جو جنگ عظیم میں فرانس میں مارے گئے تھے۔ اس میں زیادہ تر اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ آئندہ زمانہ میں اُن کی نعشوں کو اُکھاڑ کر کسی دوسری جگہ منتقل نہ کیا جائے۔ اور نہ اُنھیں جلایا جائے اور قبروں پر جو کتبے لگائے جائیں وہ مسلمانوں

طریقہ کے مطابق ہوں۔

(۲) سول اسپتالوں کو فوجی اسپتالوں کے تحت میں کر دیا جائے۔ تجویز کیا گیا تھا کہ تمام طبی محکمہ ایک کر دیا جائے جس کے معنی یہ تھے کہ ہندوستان کے تمام سول اسپتال اور اُن کے ڈاکٹر فوج کے میڈیکل ڈیپارٹمنٹ کے تحت میں کر دیئے جاتے۔ صاحبزادہ صاحب نے اس سے سخت اختلاف کیا۔ نیز ڈائرکٹر جنرل اور سرجن جنرل کے غیر معمولی اختیارات پر اعتراضات کئے۔

(۳) صوبہ متوسط و برار کے ملازموں کی سرکشی۔ ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان شاہی کے مطابق حکومت ہند نے صوبہ جاتی حکومتوں کے نام چٹھیاں جاری کی تھیں اور دریافت کیا تھا کہ ہندوستان کے بڑے بڑے عہدوں میں ہندوستانیوں کی تعداد بڑھانے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس پر صوبہ متوسط اور برار کے انگریز عہدہ داروں نے ایک عرضداشت براہ راست وزیر ہند کو بھیجی تھی جس میں گورنمنٹ ہند کے لئے سخت بے تمیزی کے الفاظ استعمال کئے تھے اور لکھا تھا کہ ہندوستانیوں کو بڑے عہدے نہ دیئے جائیں۔ یوروپین ملازموں کا یہ طرز عمل گورنمنٹ ہند کے نزدیک قابل اعتراض تھا مگر وزیر ہند کی کونسل کے ممبروں کی اکثریت نے ان ملازم انگریزوں کو ملامت کرنے کی جگہ اپنی یادداشتوں میں ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ صاحبزادہ صاحب نے اپنی یادداشت میں اُن سے سخت اختلاف کیا اور لکھا کہ جبکہ وزیر اعظم ہی نے حکومت برطانیہ کے اعلانات سے رجوع کر لیا تو انگریز ماتحت بے تمیزی کیوں نہ کرتے وغیرہ وغیرہ۔

(۴) ریلوں کے لئے خرید سامان۔ ہندوستان کی ریلوں کے لئے انگلستان میں جو سامان کمپنی کے بورڈ کے ذریعہ جاتا تھا۔ وہ بمقابلہ اس کے کہ جو انڈیا آفس کی معرفت خریدا جاتا گراں پڑتا تھا اس پر صاحبزادہ صاحب نے اعتراض کیا اور لکھا کہ کُل سامان انڈیا آفس کی معرفت خریدا جائے۔

(۵) امپیریل انسٹیٹیوٹ تجارت کی رپورٹوں کی طباعت۔ اس ادارہ نے ہندوستان کی خام پیداوار کو انگلستان میں زیادہ مقدار میں فراہم کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی مقرر کی تھی۔ اُس کی رپورٹوں کی طباعت کی منظوری کے لئے رپورٹ سے اختلاف کرتے ہوئے صاحبزادہ صاحب نے دکھایا تھا کہ اس کی غرض انگلستان کی صنعتی ترقی تھی نہ کہ اس سے ہندوستان کا نفع مدنظر تھا۔ مندرجہ بالا رپورٹوں کی طباعت کے لئے پندرہ ہزار روپیہ کی مزید رقم مانگی گئی تھی اس سے اختلاف کرتے ہوئے صاحبزادہ صاحب نے لکھا کہ پہلے پندرہ ہزار روپیہ اس کام کے لئے دیا جا چکا ہے۔ غریب ہندوستان پر یہ مزید بار کیوں ڈالا جاتا ہے جبکہ اس سے انگلستان کے مال تیار کرنے والوں کا اصلی نفع ہے نہ کہ مفلس ہندوستانیوں کا۔

(۶) صنعتی تعلیم۔ یہ تجویز پیش تھی کہ اعلیٰ صنعتی تعلیم جس میں کان کنی کی تعلیم شامل ہو مرکزی حکومت ہند کے تحت میں اور ابتدائی صنعتی تعلیم صوبوں کی نگرانی میں رہے۔ صاحبزادہ صاحب نے اس اصول سے اختلاف کیا کہ ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کا انتظام جدا جدا ہو۔ گویا کہ بنیاد بھرنا ایک ادارہ کے ہاتھ میں ہو اور مکان بنانا دوسرے ادارہ کے اختیار میں ہو۔ صاحبزادہ صاحب نے یہ بھی دکھایا کہ انگلستان کی یونیورسٹیاں ہر قسم کی صنعتی تعلیم دیتی ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں بھی صنعتی اور ہر قسم کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہئے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ منسٹروں کے ہاتھوں میں سر رشتہ تعلیم کے ساتھ صنعتی سر رشتہ بھی ہونا چاہیئے تاکہ دونوں کا یکجا ہی انتظام ہو۔

(۷) محکمہ تجارتی اطلاعات۔ (Commercial Intelligence Department) کی تنظیم۔ سر میلکم ہاگ کی تجویز تھی کہ ہندوستان کے تجارتی اور صنعتی محکموں کو یک جا کر دینا چاہیئے تاکہ مال تیار کرنے اور اُسے دنیا کے بازاروں میں تقسیم کرنے کا کام ایک ہی ہاتھ میں ہو۔ اس سلسلہ میں صاحبزادہ صاحب نے تفصیل کے ساتھ دکھایا

کہ انگلستان کا محکمہ اطلاعات اپنے ملک کے کارخانہ داروں کو دنیا بھر کی ضروریات کی اطلاع دیتا ہے وہاں کے تجارتی کمشنر تمام دنیا کے ملکوں میں ہیں اِسی طرح ضرورت ہے کہ ہندوستان کے تجارتی نمائندے بھی تمام ممالک ہوں۔ انھوں نے تجویز کیا کہ اس کام کو سکھانے کے لئے ہندوستانی طلبار کو تین تین سو پاؤنڈ سالانہ کے وظائف دئے جائیں اور اس محکمہ میں جو عہدہ دار مقرر ہوں اُن میں اکثریت یا کم سے کم مساوات ہندوستانیوں کی ہو۔(غالباً اسی یادداشت کے اثر سے اب ہندوستانی ٹریڈ کمشنر بنا کر یورپ اور امریکہ بھیجے جاتے ہیں)

(۸) جنگ سے قبل ٹرکی کی حالت۔ اس یادداشت میں جنگ سے قبل ٹرکی کی حالت دکھانے کے بعد سوال کیا ہے کہ ٹرکی اور یونان کے درمیان جنگ کرانے کا ذمہ دار کون تھا۔ اور اس کا مفصّل جواب دیا ہے۔ پھر ٹرکی کی قرضداری کی تاریخ ۱۸۷۰ء سے پہلے شروع کرکے جنگ عظیم کے بعد تک لکھی ہے اور دکھایا ہے کہ ان قرضوں کی بدولت ٹرکی یوروپین ممالک کی اقتصادی اور سیاسی غلامی میں کس طرح آیا۔ اس کے بعد بڑے لوگوں اور نامی اخبارات کے اقتباسات ترکوں کے بارے میں دیئے ہیں۔ قرضہ کی دفعات پر جرح کی ہے۔

(۹) ترکوں کی فتح کے اثرات کے متعلق چھٹی بنام وزیر ہند۔ ترکوں کی فتح کے بعد اتحادی صلح کانفرنس منعقد کرنے والے تھے اُس وقت یہ چھٹی صاحبزادہ صاحب نے لکھی تھی اور اُس میں سوال کیا تھا کہ ترکوں کے بارے میں حکومت برطانیہ کا کیا طرز عمل رہے گا اور اُس کے جواب میں انگریزوں کے وعدوں کے اقوال نقل کئے ہیں اور یہ کہ دنیا بھر کے مسلمان کس بے چینی کے ساتھ انگریزوں کے طرز عمل کو دیکھ رہے ہیں۔

(۱۰) صیغہ نشر و اشاعت گورنمنٹ ہند۔ ۱۹۲۱ء میں جب کہ ہندوستان میں تحریک خلافت عروج پر تھی۔ صاحبزادہ صاحب نے ہندوستان کے پبلیسٹی ڈیپارٹمنٹ کے متعلق

ایک مفصل یادداشت تحریر کی تھی اس میں دکھایا تھا کہ یہ محکمہ قائم کرنے کی غرض یہ بیان کی گئی تھی کہ "گورنمنٹ کسی امر میں جو عمل یا ترک عمل کرے اس کے وجوہ بتائے جائیں تاکہ گورنمنٹ کے طرز عمل کے متعلق غلط فہمیاں دور ہوں"۔ مگر محکمہ مذکور نے اپنی طرف سے اس کے مقاصد میں "رائے عامہ" پیدا کرنے کے مقصد کا اضافہ کیا اور پھر یہ کیا کہ رائے عامہ پیدا کرتے ہوئے غلط واقعات کی نشر و اشاعت شروع کر دی۔ اس کے ثبوت میں صاحبزادہ صاحب نے مسئلہ "خلافت" کے متعلق ایک رسالہ میں سے اقتباسات دئے جو وزیر ہند کے دفتر کے دارالاخبار میں ہندوستان سے آیا تھا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ترکوں کے ساتھ وہی برتاؤ کیا گیا ہے جو جرمنی، آسٹریلیا اور بلگیریا کے ساتھ کیا گیا بلکہ بعض امور میں ترکوں کے ساتھ بہتر برتاؤ کیا گیا (جو سراسر غلط تھا) اور لکھا ہے کہ ترکوں کے دشمن اتحادی طاقتیں نہیں بلکہ انکے اصلی دشمن خود ترکوں کی ایک جماعت ہے جو اپنے کو نیشنلسٹ کہتی ہے اور جو ایشیائے کوچک میں سلطان کے خلاف لڑ رہی ہے۔ اسی قسم کی اور بہت سی باتیں لکھی تھیں۔ ان سب کا جواب صاحبزادہ صاحب نے مفصل دیا ہے اور اس غلط پروپگنڈہ کی تردید کی ہے۔ اسی محکمہ کے متعلق دوسری یادداشت میں صاحبزادہ صاحب نے ایک پبلیسٹی افسر کی چٹھی مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۲۱ء کے حوالہ سے دکھایا کہ اس محکمہ کے لوگوں نے ابتدائی اصول سے کس طرح تجاوز کیا ہے۔ افسر مذکور نے لکھا ہے کہ انھوں نے سخت محنت کر کے مضامین رسالوں اور کتابوں کے دریا بہا دئے ہیں۔ اور صاحب جائداد لوگوں کو آنے والے خطرہ سے آگاہ کر کے انھیں بیدار کیا ہے۔ اس قسم کے طرز عمل کی نسبت صاحبزادہ صاحب نے بتایا ہے کہ لوگوں کی مختلف جماعتوں کے درمیان اختلاف پیدا کر کے ان پر حکومت کرنے کا اصول برتا گیا ہے جس کے نتائج ملک و قوم کے لئے خطرناک ثابت ہونگے۔

(۱۱) ایران میں کوسکوں کے فوجی دستہ کے اخراجات۔ جنگ عظیم کے بعد حکومت برطانیہ نے کوسکوں کا ایک فوجی ڈویزن جس کا کمانڈر ایک روسی تھا ایران پر مسلط کر دیا تھا۔

اس کا خرچ ایک لاکھ تومان ماہوار تھا اور وہ ہندوستان کے خزانہ سے دیا جاتا تھا۔ صاحبزادہ صاحب نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا کہ جب کہ اُس کی نسبت طے ہو چکا ہے کہ ۳۱ مارچ ۱۹۱۹ء کے بعد وہ جاری نہیں رکھا جا سکتا تو اُس کے لئے پھر کیوں منظوری مانگی جاتی ہے انھوں نے دکھایا کہ بلجیم کے لوگوں کے مصائب پر تو بڑی ہمدردی ظاہر کی جاتی ہے مگر ایران کی تباہی کا کوئی ذکر نہیں کیا جاتا۔ اور لکھا کہ یہ کیسی بدقسمتی ہے کہ جن روسی افسروں نے ایران کے مقدس مقامات کو برباد کیا اور مسلمانانِ ہند کے دلوں کو سخت تکلیف پہنچائی آج وہی ہندوستان کے خرچہ سے اس ملک پر مسلّط کئے جاتے ہیں۔

(۱۲) مشرقی ایران پر خرچہ کا بار۔ ۱۹۱۸ء کے شروع میں حکومت برطانیہ کو یہ اندیشہ ہوا تھا کہ کوہ قاف میں ترکوں اور جرمنوں کی طرف سے اتحادیوں کے خلاف جدوجہد ہو گی اس لئے وائسرائے ہند کو تار دے کر "مالیسن مشن" کے نام سے ایک مشن جنوبی مشرقی ایران کو بھیجا گیا تھا تاکہ وہ دشمنوں کی کارروائیوں کی کاٹ کرے۔ چنانچہ یہ مشن بھیجا گیا اور ۲۱-۱۹۱۹ء میں اس پر انیس کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔ تب سے حکومت برطانیہ کا مطالبہ یہ تھا کہ اس کا نصف خرچ یعنی ۹½ کروڑ روپیہ ہندوستان ادا کرے۔ ہندوستان کی طرف سے وائسرائے کہتے تھے کہ یہ خالص فوجی مشن تھا۔ اور اس کا کل خرچہ حکومت انگلستان کو برداشت کرنا چاہئے۔ صاحبزادہ صاحب نے انگلستان کے اس مطالبہ کے خلاف بڑی تحقیق سے یہ نوٹ لکھا ہے اور انگلستان کے ذمہ دار عہدہ داروں کے اقوال سے ثابت کیا ہے کہ یہ مطالبہ ایمانداری کے خلاف ہے اور سب سے آخر میں یہ مشورہ دیا ہے کہ اگر ہندوستان ہی سے یہ روپیہ لینا ہے تو ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے سامنے اُسے منظوری کے لئے آنا چاہئے۔

(۱۳) ہندوستان کے مسلمان فرقہ وارانہ نمائندگی کیوں مانگتے ہیں۔ اگست ۱۹۲۴ء میں مسٹر سنیا موری کے خط کے جواب میں وزیر ہند نے کوئی چٹھی بھیجی تھی جس میں

مسلمانوں کے جداگانہ حق نیابت کے طریقہ پر اعتراضات تھے۔ صاحبزادہ صاحب نے جداگانہ طریق انتخاب کی تائید میں ایک طویل چٹھی وزیر ہند کو لکھی تھی اس میں اس خیال کی تردید کی تھی کہ خدانخواستہ مسلمان تنگ نظر، خود غرض یا ملک کے دشمن ہیں۔ صاحبزادہ صاحب نے انگریزوں کے اس ملک میں آنے کے وقت سے دکھایا تھا کہ اول انگریزوں کی توجہ ہندوؤں کو بڑھانے کی طرف رہی جس کی وجہ سے وہ تمام تعلیم اور ملازمتوں پر قابض ہوگئے۔ پھر غدر میں مسلمانوں کی مزید بربادی ہوئی۔ یہاں تک کہ سرسید نے انھیں اُبھارنے کا تہیہ کیا۔ صاحبزادہ صاحب کی یہ یادداشت نہایت مدلل اور مفصل ہے جس میں یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمان دیگر اقوام کے برابر پہونچ کر ہی ملک کو سوراج کے مرتبہ پر لے جاسکتے ہیں۔

(۱۴) ریلوے کی گاڑیوں کی خریداری انگلستان سے۔ ۱۹۲۱ء میں دفتر وزیر ہند کی جوائنٹ کمیٹی نے تجویز کیا تھا کہ ہندوستان کی ریلوں کے لئے تین ہزار گاڑیاں انگلستان سے خریدی جائیں اور اس کے لئے ہندوستان کی طرف سے پندرہ لاکھ پاؤنڈ کا قرضہ انگلستان کے لوگوں سے لیا جائے اور بینک کی شرح سے ½ فی صدی سود زیادہ دیا جائے اور قرضہ کی ادائیگی دو یا تین سال سے قبل نہ ہوسکے۔ یہ اس بناء پر تجویز تھی کہ انگلستان میں بیکاری تھی۔ صاحبزادہ صاحب نے اس کے خلاف تین زوردار یادداشتیں لکھی تھیں جن میں دکھایا تھا کہ ہندوستان میں اس وقت قحط سالی ہے وہ پہلے ہی انگلستان کا بہت مقروض ہے۔ انگلستان دنیا میں سب سے زیادہ دولتمند ملکوں میں سے ہے۔ یہ گاڑیاں خود ہندوستان میں بنی چاہیئں اور قرضہ کی ضرورت ہو تو بجائے انگلستان کے لوگوں کے خود ہندوستانیوں سے لینا چاہیئے۔ یہ بڑی بے رحمی ہے کہ برطانیہ کے کارخانہ داروں کے نفع کیلئے ہندوستان کی زیر باری میں روز بروز اضافہ کیا جاتا ہے۔ یہ سراسر خلاف انصاف ہے۔

(۱۵) محکمہ جنگلات کی ملازمت کے لئے تقررات۔ ۱۹۲۰ء میں وزیر ہند نے وائسرائے ہند کو اطلاع دی تھی کہ محکمہ جنگلات کی ملازمت کے لئے پانچ ہندوستانی انگلستان میں اور گیارہ ہندوستان میں لئے جائیں گے مگر نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان میں کوئی ہندوستانی نہ لیا گیا اور ہندوستان میں صرف چار آدمی مل سکے اور جو ملے ان کی نسبت لکھا کہ ادنیٰ قابلیت کے غریب آدمی تھے اور کوئی عمدہ خاندان کا نہ تھا اور تحصیلداری کے لئے بھی منتخب نہ ہوسکتا تھا۔ صاحبزادہ صاحب نے اس کے متعلق اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ انگلستان میں جو لوگ لئے جاتے ہیں اُن کے لئے محض یہ شرط ہے کہ انگلستان کی یونیورسٹی کا گریجویٹ نیچرل سائنس میں آنرز میں پاس ہو۔ اس کا معائنہ میڈیکل بورڈ کرلے مگر ہندوستان میں بہت سی شرائط لگائی گئیں جن میں سے یہ تھیں کہ اُن کا تحریری امتحان فلاں فلاں مضامین میں لیا جائے اور دہرہ دون میں پندرہ سولہ میل پیدل چلایا جائے سخت طبی معائنہ کے بعد انتخابی بورڈ کے سامنے پیش ہو۔ صاحبزادہ صاحب نے لکھا ہے کہ انگلستان سے زیادہ ہندوستان میں سخت شرائط لگانے کے کوئی معنی نہیں۔ یہ قرین قیاس نہیں کہ تمام ہندوستان میں سے چند قابل لڑکے نہ ملیں۔ ضرورت ہے کہ یونیورسٹیوں کو لکھا جائے کہ وہ قابل لوگ بھیجیں۔ ہر صوبہ سے ایک معین تعداد مانگی جائے اور پروبیشنری زمانہ کے لئے انگلستان میں انھیں دوسو پاونڈ سالانہ سے زیادہ دیا جائے انگلستان کے اُمیدواروں کے گھر اور عزیز قریب وہاں موجود ہوتے ہیں۔ ہندوستانیوں کا گزر اتنے کم میں نہیں ہوسکتا۔ انھیں سمندر پار جانے کے لئے اسی طرح زیادہ الاونس دیا جائے جس طرح کہ انگریزوں کو ہندوستان جانے پر ملتا ہے۔ انتخاب کے لئے انگلستان میں جو قواعد ہیں وہی ہندوستان میں اُمیدواروں کے لئے ہونا چاہئیں۔

(۱۶) سامان کی خریداری ہندوستان میں۔ حکومت ہند نے ۱۹۰۶ء میں یہ تجویز

کیا تھا کہ انگلستان سے براہ راست سامان منگانے کی جگہ انگلستان کی کمپنیوں کے نمائندوں سے جو ہندوستان میں ہیں براہ راست مال خرید لیا جایا کرے۔ انگلستان کے اسٹورس ڈیپارٹمنٹ نے اس کی مخالفت کی تھی اس لئے یہ تجویز نامنظور کر دی گئی تھی مگر حکومت ہند نے اس تجویز کے متعلق وزیر ہند کو لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا یہاں تک کہ صاحبزادہ صاحب کا زمانہ آگیا۔ صاحبزادہ صاحب نے اس تجویز کی پرزور تائید کی اور دکھایا کہ اس مال کی خریداری میں سہولت اور ارزانی ہوگی اور ہندوستان میں صنعتی ترقی کی ترغیب ہوگی۔ صاحبزادہ صاحب نے دکھایا کہ اُس سال بارہ کروڑ کا سامان انگلستان سے منگایا گیا تھا۔ اگر ہندوستان سے خریدا جاتا تو کس قدر سہولت ہوتی اور نفع ہوتا۔ اس مسئلہ پر صاحبزادہ صاحب نے نہ صرف ایک بلکہ مختلف اوقات میں تین یادداشتیں لکھ کر دیں جن میں ابتدا سے پوری تاریخ دی تھی اور ہر طرح ثابت کر دیا تھا کہ یہ سامان ہندوستان ہی سے خریدا جائے۔ حیرت ہے کہ ہندوستان میں بھی انگلستان کی کمپنیوں کی شاخیں تھیں مگر انگلستان والوں کو اصرار تھا کہ براہ راست انگلستان سے ہی مال منگایا جائے اگرچہ کتنا ہی گراں پڑے

(۱۷) جرمنی کا مال بند کرنے کی تجویز۔ جنگ عظیم کے بعد یہ تجویز ہوئی تھی کہ جرمنی کا مال تجارت اپنے ممالک میں آنا بند کر کے اپنے ملک کی مصنوعات کو ترقی دی جائے صاحبزادہ صاحب نے یہ تجویز کیا کہ ہندوستان کے صنعتی کمیشن کے سپرد یہ مسئلہ کیا جائے اور اس کے ہندوستانی ممبروں سے خاص طور پر رائے لی جائے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ صنعتی کمیشن اپنا کام ختم کر چکا ہے۔ انگریز ممبروں کی یہ رائے ہے کہ صاحبزادہ صاحب نے لکھا کہ جس طرح نوآبادیات کی حکومتیں اپنے مالی اُمور میں آزاد اور خودمختار ہیں۔ اسیطرح ہندوستان کو بھی آزادی دے کر انھیں اپنے مفید مطلب پالیسی اختیار کرنے کا موقع دیدیا جائے۔ بالخصوص جبکہ کنیڈا نے اس تجویز میں شرکت سے انکار کر دیا ہے تو ہندوستان کو

اپنے لئے سوچنے کا موقع دیا جائے۔

(۱۸) پنجاب کے ووٹروں کا معیار اونچا کیا جائے۔ جب ۱۹۱۷ء کی اصلاحات پر عملدرآمد شروع ہوا تو پنجاب کے لفٹنٹ گورنر کی سفارش پر ممبران کمیٹی کی اکثریت نے طے کیا کہ شہری آبادی میں اُس شخص کو حق ووٹ حاصل ہو جس کے پاس ماہنہ ۱۲ روپیہ سالانہ کا مکان ہو اور دیہات میں ۵۰ سالانہ کی مالگذاری ادا کرتا ہو حالانکہ صوبہ متحدہ اور بہار وغیرہ میں شہر کے لئے ۳۶ سالانہ اور دیہات کے لئے ۲۵ سالانہ کی شرط تھی لفٹنٹ گورنر موصوف نے یہ معیار ووٹ یہ کہہ کر بڑھایا تھا کہ پنجاب میں لوگ اس حق کو عزت کی چیز سمجھتے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب نے اپنے اختلافی نوٹ میں انگریزوں کے اقوال سے ثابت کیا تھا کہ پنجاب کے زمیندار، کاشتکار سیاسی تربیت پانے کے زیادہ اہل ہیں ان کی فوجی خدمات سب سے زیادہ ہیں۔ ہندوستان سے باہر کا زیادہ تجربہ رکھتے ہیں ان کے لئے تو ووٹ دینے کا معیار بمقابلہ دوسرے صوبوں کے بہت کم ہونا چاہیئے اور تجویز کیا کہ پنجاب میں وہی معیار رکھا جائے جو صوبہ متحدہ میں ہے۔

(۱۹) نیا ٹیکس لگانے کی تجویز جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں نیا ٹیکس لگانے کی تجویز درپیش تھی اس کی مقدار چھتر کروڑ روپیہ قرار دی گئی تھی۔ صاحبزادہ صاحب نے اپنی یادداشت میں تجویز کیا تھا کہ ٹیکس ان چیزوں اور پیشوں پر لگایا جائے جو اُسے برداشت کر سکیں۔ اس بارے میں موصوف نے لکھا کہ اب وہ وقت نہیں رہا کہ بغیر کسی روک ٹوک کے ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جن سے محض انگلستان کے کارخانوں کا نفع ہو یا آزاد تجارت کے نام سے ہندوستان میں کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو انگلستان میں ترک کیا جا چکا ہے۔ آپ نے اصولاً بتایا کہ عیش و عشرت کے ساما نوں پر مثل شراب، تمباکو وغیرہ کے محصول لگایا جائے۔ زمین کی مالگذاری نہ بڑھائی جائے جس کا اثر غریب کاشتکاروں پر پڑے گا۔

اسی قسم کا ایک اور نوٹ ۱۹۲۱ء میں لکھا جبکہ یہ تجویز درپیش تھی کہ ہندوستان پر مزید ٹیکس لگایا جائے۔ اس کی نسبت صاحبزادہ صاحب نے وزیر ہند کو ایک چھٹی لکھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انگلستان میں جہاں قومی حکومت ہے وہاں عوام کی طرف سے آئے دن شکایت رہتی ہے کہ دفتری حکومت ملک کے روپیہ کو لٹاتی ہے اور کفایت شعاری نہیں کرتی حتیٰ کہ اسی بناء پر پارلیمنٹ کے انتخابات ہوتے ہیں۔ وائے برحال ہندوستان کہ وہاں سراسر دفتری حکومت کا جو غیر ملکی ہے قبضہ ہے اور اس کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا ایسے بےبس ملک کے لوگ واجب الرحم ہیں۔ پس ضرورت ہے کہ وہاں کی حکومت کا اسراف روکنے اور کفایت شعاری اختیار کرانے کے لئے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جائے۔ اس سے قبل مزید ٹیکس لگانا ناواجب ہے۔

(۲۰) بجٹ ۲۲-۱۹۲۱ء کی بابت۔ ہندوستان کے اس سال کے بجٹ میں خسارہ ہونے کی وجہ سے وزیر ہند کی تجویز تھی کہ مزید ٹیکس لگایا جائے۔ اس کے خلاف علاوہ مندرجہ بالا چھٹی کے ایک مفصل یادداشت صاحبزادہ صاحب نے لکھی تھی۔ تجویز یہ تھی کہ سوا پندرہ کروڑ کی کمی پورا کرنے کے لئے ہندوستان کی درآمد برآمد پر محصول لگایا جائے اور ریلوے لائنیں بنائی جائیں۔ اس یادداشت میں بھی صاحبزادہ صاحب نے انگلستان کے عوام کی قوت کو دکھایا تھا کہ وہ حکومت کو مجبور کر کے ملک کے اخراجات کی تخفیف کے لئے کمیٹیاں بٹھاتے ہیں اور اس کی سفارشوں پر عملدرآمد کراتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں ہندوستان کے عوام بیکس ولاچار ہیں۔ یہ دکھایا تھا کہ پچھلی جنگ میں ہندوستان نے انگلستان کے نفع کے لئے بیشمار روپیہ خرچ کیا جسے وزیر اعظم نے تسلیم کیا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ روپیہ مع سود کے ہندوستان کو واپس دیا جاتا برخلاف اس کے ہندوستان کی درآمد برآمد پر یہ کہہ کر محصول لگایا جاتا ہے کہ وہ سلطنت برطانیہ کی شاہی عملداری میں شریک ہے۔ درانحالیکہ ہندوستان کے لوگ مشرقی افریقہ میں شہری حقوق سے محروم ہیں۔ جزائر فیجی اور کینیڈا میں جو انگلستان کی نوآبادیات

ہیں حد درجہ ذلیل اور خوار ہیں۔ وہاں ہندوستانیوں کا شاہی اقتدار کہاں چلا جاتا ہے۔
لیگ آف نیشنز کی اقتصادی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ فوج پر ۲۰ فی صدی خرچ
نہایت قابل اعتراض ہے درآنحالیکہ ہندوستان میں آمدنی کا پچاس فیصدی حصہ فوج
پر خرچ ہوتا ہے۔ہندوستان کی ریلوے کی آمدنی میں پانچ کروڑ کی کمی ہے باوجود اسکے
تجویز کیا جاتا ہے کہ غریب ہندوستانیوں پر محصول بڑھا کر پندرہ کروڑ کی لاگت سے نئی ریلوے
لائن بنائی جائیں۔مختصر یہ کہ انگلستان اپنے نفع کے لئے جس طرح چاہتا ہے ہندوستان کو
استعمال کرتا ہے۔ دفتر وزیر ہند کی تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کی جو خام پیداوار ہے اُسے
خریدنے کا حق صرف برطانیہ اور نوآبادیات کو ہو اور شرح عام سے دس فیصدی سے
کم پر یہ مال ہندوستان سے لیا جائے۔اس پر والسرائے ہند نے جو رائے ظاہر کی اسکے
متعلق دفتر وزیر ہند نے یہ نوٹ لکھا کہ "حکومت ہند نے ہندوستان کے ذکی الحس عوام
کو رضامند کرنے کے لئے غیر ضروری بزدلی کا اظہار کیا ہے۔" اس نوٹ پر صاحبزادہ صاحب
نے سخت اعتراض کیا اور لکھا کہ اس سے بڑھ کر کیا زیادتی ہوسکتی ہے کہ جب کہ تمام دنیا کو
خام پیداوار کی ضرورت ہے ہندوستان کو مجبور کیا جائے کہ وہ تمام پیداوار انگلستان اور
اس کی نوآبادیات کو دس فیصدی کم قیمت پر دیدے اور انگلستان اور نوآبادیات اپنے
منھ مانگی قیمت پر دیگر ممالک کے ہاتھ بیچ کر نفع اٹھائیں۔ وہی نوآبادیات جو ہندوستانیوں
کی تذلیل و تحقیر میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتیں اور وہی ہندوستانی جنھوں نے جنگ عظیم
میں اپنے جان و مال کی قربانیاں بیشمار اور لاتعداد کیں۔

(۲۱) ہندوستان کی فوج کا بجٹ بابت ۲۲-۱۹۲۱ء

[illegible] ہیں
والسرائے اور کمانڈران چیف کا اختلاف تھا۔ کمانڈران چیف ۶۱ [illegible] کروڑ [illegible] کروڑ کا اضافہ
چاہتے تھے۔ ممبران کونسل وزیر ہند نے اس [illegible] اضافہ [illegible] منظور کیا۔ صاحبزادہ صاحب نے اُس سے
اختلاف کرتے ہوئے ایک طویل [illegible] اضافہ اس بنا پر منظور کیا گیا تھا کہ

ہندوستان میں اندرونی بلوؤں اور بیرونی حملوں کا اندیشہ تھا۔ صاحبزادہ صاحب نے اول اندرونی بلوؤں سے بحث کرتے ہوئے دکھایا کہ مسٹر گاندھی کی تحریک عدم تشدد کی ہے اور جو تشدد کی تحریکات ہیں وہ بندوق کی چند فیر(ں) سے منتشر ہوجاتی ہیں جیساکہ امرتسر وغیرہ میں ہوا۔ ایک بالشوک تحریک سے خوف دلایا جاتا ہے مگر افغانستان درمیان میں ہے اس لئے اس سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ بالشوک تحریک تو خود انگلستان میں بھی ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ روس انگلستان پر چڑھ کر جائے گا۔ وہ تحریک محض خیالات پر اثر ڈالنے کی ہے جسے دبانے کے لئے فوج بیکار ہے۔ تمام خطروں کو محض خیالی دکھا کر آخر میں صاحبزادہ صاحب نے اسلامی ممالک کی طرف سے خطرہ کا تذکرہ کیا۔ اس کی نسبت دکھایا کہ عراق وغیرہ پر قبضہ کرکے برطانیہ نے یہ خطرہ خریدا ہے۔ اور وہ انگلستان کے نفع کے لئے ہے۔ اس لئے ہندوستان اُس کا خرچہ کیوں برداشت کرے۔ ہندوستان نے تو اُس پر بہت احتجاج کیا تھا اور ناراضی کا اظہار کیا تھا۔ آخر میں صاحبزادہ صاحب نے لکھا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ میری کچھ نہ سنیں گے مگر میں یہ کہہ کر اپنا فرض ادا کرتا ہوں کہ اس قسم کے ناواجب بار ہندوستان پر ڈال کر آپ ہندوستانیوں کے دلوں میں ناراضی کا بیج بوئیں گے جو آپ کی حکومت کے لئے مضر ثابت ہوگا۔"

(۲۲) عہدہ داران سول سروس کی پنشن کا مسئلہ۔ اس مسئلہ کے متعلق ایک کمیٹی مقرر ہوئی تھی جس کے ایک ممبر صاحبزادہ صاحب بھی تھے۔ آپ نے کمپنی کے عہد حکومت کے زمانہ سے پنشن کے طریقہ کی تاریخ لکھی ہے جس کا طریقہ یہ تھا کہ کچھ فیصدی ملازمان کی تنخواہ سے کٹتا تھا اور کچھ گورنمنٹ امداد دیتی تھی۔ یہ طریقہ مثل موجودہ پراویڈنٹ فنڈ کے تھا۔ ۱۸۲۵ء میں طے کیا گیا کہ ۲۵ سال کے بعد ایک ہزار پاؤنڈ دیا جائے جس میں نصف تنخواہ میں سے بحساب چار فیصدی کاٹا جائے اور اس پر چھ فیصدی سود دیا جائے۔ ۱۸۵۲ء میں پانچ سو روپیہ سالانہ کی غیر مشروط پنشن کردی گئی۔ اس کے علاوہ جو کچھ افسر کی تنخواہ میں سے کاٹا جائے وہ اُسے دیا جائے۔ اسی طرح

اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ ۱۸۷۰ء میں ایک ہزار پونڈ سالانہ کردیا گیا اور جو کچھ تنخواہ میں سے کاٹا جاتا وہ عہدہ دار کا ہوتا۔ وزیر ہند نے اب پنشن کا جداگانہ حساب کردیا اور ۱۸۷۴ء سے اس کا قانون بن گیا جس پر ۱۹۰۹ء تک عمل درآمد رہا۔ اب بعض سِوِلین عہدہ دار پنشن یافتوں نے یہ مطالبہ کیا کہ اُنھیں چار فیصدی کے حساب سے پُرانے قاعدہ کے مطابق وہ روپیہ دیا جائے جو چار فیصدی کے حساب سے زمانہ سابق میں کاٹا جاتا تھا۔ صاحبزادہ صاحب نے اس مطالبہ کی ناواجبیت دکھاکر لکھا ہے کہ اگر ان لوگوں کے ساتھ کوئی استثنار کیا گیا تو اسی قسم کے دوسرے مطالبات کھڑے ہوجائیں گے۔

(۲۳) **جزائر فیجی میں ہندوستانی مزدوروں کی نسبت تجویز کا کیا اثر ہوگا۔** نوآبادیات کے سکریٹری آف اسٹیٹ نے ہندوستان سے مزدور فراہم کرنے کی نسبت ایک تجویز بھیجی تھی جس کی رو سے مزدوروں سے اقرارنامے لکھاکر اُنھیں غلام بنالیا جاتا ہے۔ اس اسکیم کے فقرہ ۔۸ کے متعلق صاحبزادہ صاحب نے اعتراض کیا تھا جو غالباً اُنھیں اقرارناموں کے متعلق ہوگا۔ صاحبزادہ صاحب نے اس میں ایسی تبدیلی تجویز کی تھی جس سے ہندوستانی مزدوروں کی غلامی میں کمی آ جائے۔

(۲۴) **ہندوستان کی ملازمتوں کے لئے انگلستان میں انتخابات کون کیا کرے۔**

اس مسئلہ کے متعلق صاحبزادہ صاحب کی دو یادداشتیں ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ قانون گورنمنٹ ہند کی دفعہ ۳۳۔ کی رو سے "ہندوستان کی سول اور فوجی حکومت کی نگرانی و رہنمائی کے اختیارات گورنر جنرل اور اُس کی کونسل کو ہیں"۔ انگلستان میں حکومت ہند کا کارکن ہائی کمشنر ہے اس لئے ہائی کمشنر ہی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ ہندوستان کے مختلف محکموں کے لئے انگلستان سے تقررات کرے۔ مگر عملاً یہ ہو رہا ہے کہ وزیر ہند یہ تقررات کرتا ہے جدید اصلاحات اس امر کی مقتضی ہیں کہ قانون کے مطابق یہ اختیارات ہائی کمشنر کے لئے منتقل کردئے جائیں۔ اس وقت وزیر ہند نے ایک تار کا مسودہ رائے کے لئے پیش کیا ہے

جو ہندوستان بھیجا جائے گا۔ اُس میں اعلیٰ ملازمتوں کے تقررات تو اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں اور ادنیٰ ملازمتوں کا اختیار ہائی کمشنر کو دیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ وزیر ہند کی معرفت زیادہ قابل لوگ مل سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں صاحبزادہ صاحب نے مسٹر بیک پرنسپل علیگڈھ کالج سے لے کر اپنے وقت تک کے اُن انگریزوں کے نام اور اُن کے کارنامے گنا کر دکھایا ہے کہ ۳۵ سال کے عرصہ میں انگلستان سے علیگڈھ کالج کو جو انگریز بلا وساطت وزیر ہند کے بھیجے گئے انھوں نے جو نام پیدا کیا اس کا مقابلہ وہ لوگ نہیں کر سکتے جو وزیر ہند نے ہندوستان بھیجے دوسری بات یہ ہے کہ جن لوگوں کو وزیر ہند مقرر کر کے بھیجتے ہیں وہ اپنے کو آقا سمجھتے ہیں نہ کہ ملازم۔ ضرورت ہے کہ قانون کے مطابق تمام عہدہ داروں کا انتخاب ہندوستان کے لئے ہائی کمشنر کریں تاکہ وہ لوگ اپنے کو ہندوستان کا ملازم سمجھ کر عمدہ خدمات انجام دیں۔

(۲۵) ہندوستان میں جنگلات کی تعلیم کے کالج کا قیام۔ آخر ۱۹۲۰ء میں ایک تجویز تھی کہ انگلستان میں ایک اعلیٰ پایہ کا مرکزی کالج قائم کیا جائے جس کے اخراجات میں ہندوستان وغیرہ شامل ہوں۔ صاحبزادہ صاحب نے قابل انگریزوں کے اقوال سے دکھایا کہ جنگلات کی تعلیم کے لئے جیسے عمدہ جنگل اور سامان ہندوستان میں ہیں کہیں دنیا بھر میں نہیں ہیں۔ مسٹر باسو ممبر کونسل وزیر ہند نے صاحبزادہ صاحب سے اختلاف کرتے ہوئے کہا تھا کہ انگلستان کے مرکزی کالج کی تائید نہ کرنا بمنزلہ ترک موالات کے ہے۔ اس کا جواب صاحبزادہ صاحب نے یہ دیا کہ مسٹر باسو بھی تو اس بات کے حامی تھے کہ سول سروس کا امتحان ہندوستان میں ہوا کرے تاکہ ہندوستانی انگلستان آنے کی تکلیف سے بچ جائیں۔ صاحبزادہ صاحب نے دکھایا کہ پبلک سروس کمیشن نے سفارش کی تھی کہ محکمہ جنگلات میں پچاس فیصدی ہندوستانی ہوا کریں مگر اس پر یہ کہہ کر عملدرآمد نہیں کیا گیا کہ اس محکمہ کے لئے جنگلات کا کام سیکھے ہوئے ہندوستانی کافی نہیں ملتے لیکن اگر دہرہ دون میں یہ کالج کھول دیا جائے

تو یقینی طور پر کافی تعداد میں تعلیم یافتہ نوجوان مل سکیں گے۔

Royal Military College Dehradun

(۲۶) **شاہی فوجی کالج دہرہ دون** - یہ کالج ۱۳ مارچ ۱۹۲۲ء سے کھولا گیا تھا۔ اس کے سالانہ امتحان کا نتیجہ یہ ہے کہ ۲۷ لڑکوں میں سے صرف تین اس قابل نکلے ہیں کہ جو انگلستان کے سینڈ ہرسٹ (Sandhurst) کالج کا آئندہ سال امتحان دے سکیں گے۔ اس نتیجہ کی بنا پر اخبار لندن ٹائمز نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستانی اس قابل نہیں ہیں کہ فوجی کالج کے امتحانات میں کامیاب ہو سکیں۔ صاحبزادہ صاحب نے اِس پروپگینڈا کی تردید کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ جو کچھ نقص ہے وہ طریق انتخاب اور اسکول کی تعلیم کا ہے نہ کہ ہندوستانیوں کا۔ ہندوستانی تو اعلیٰ سے اعلیٰ قابلیت حاصل کرنے کے اہل ہیں۔ فائل بک نمبر ۵ نمبر ۸ صفحہ ۱۱)

(۲۷) ہندوستانی ممبر کو یوروپین امیدواروں کے انتخاب میں شریک نہ کرنا۔ ہندوستان کے لئے عہدہ داروں کے انتخاب کی کمیٹی میں صاحبزادہ صاحب بہ حیثیت ممبر کے بلائے گئے تھے۔ جب وہ کمیٹی میں شریک ہونے کے لئے گئے تو اُن سے کہا گیا کہ اس وقت صرف انگریز امیدواروں کا انتخاب ہے۔ جب ہندوستانی امیدواروں کا انتخاب ہوگا تب آپ شریک ہوں گے۔ صاحبزادہ صاحب نے اس پر ایک احتجاجی چٹھی لکھی کہ جب کونسل کے انگریز ممبر انگریز اور ہندوستانی دونوں اُمیدواروں کے انتخاب کرنے میں شریک ہوتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستانی ممبر بھی انگریزوں کے انتخاب کرنے میں شریک نہ ہوں بالخصوص جب کہ انتخاب ہندوستان کی ملازمت کی غرض سے کیا جا رہا ہے۔ صاحبزادہ صاحب نے ایسی کمیٹی میں شرکت سے انکار کیا جس میں قومی امتیاز کیا جاتا ہے۔ جس اہلکار نے صاحبزادہ صاحب کو کمیٹی کے وقت سے غلط اطلاع دی تھی اُس نے معافی مانگی مگر اصولاً اُس کے متعلق بہت خط و کتابت رہی۔

(۲۸) ابتدائی تعلیم کی ترقی کے لئے حکومت ہند کا سرکلر۔ قبل اس کے کہ ۱۹۱۷ء

کی موعودہ اصلاحات کا نفاذ ہو۔ حکومت ہند نے ایک گشتی حکم صوبوں کی حکومتوں کے نام جاری کرنے کے لئے ایک مسودہ تیار کیا تھا اور منظوری کے لئے اُسے وزیر ہند کے پاس بھیجا تھا۔ اس حکم میں تجویز کیا گیا تھا کہ حکومت ہند نے ابتدائی تعلیم کے پھیلانے کی یہ کوششیں کیں۔ اب یہ کام صوبوں کی حکومتوں اور لوکل بورڈوں کے سپرد کیا جاتا ہے۔ صاجزادہ صاحب نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ ۱۸۸۲ء کے تعلیمی کمیشن نے اشاعت تعلیم کے لئے بہت سی سفارشیں کی تھیں اُن پر بہت کم عملدرآمد ہوا۔ ۱۹۱۲ء سے بیشک زیادہ کوشش کی گئی مگر روپیہ کافی نہیں دیا گیا۔ اب یہ کام صوبوں کو دیا جا رہا ہے مگر سرمایہ کا انتظام نہیں ہے۔ صوبجاتی حکومتوں کو مزید ٹیکس لگانے کا اختیار دیا جاتا ہے مگر ٹیکس لگانا مشکل کام ہے۔ میرے نزدیک یہ حکم جاری کرنا قبل از وقت ہے۔ اول اصلاحات نافذ ہو جائیں اسکے بعد اس قسم کے احکام جاری کئے جائیں ورنہ بلاوجہ ہندوستانیوں کو بدگمانی کرنے کا موقع ملیگا

(۲۹) مشرقی افریقہ کی کونسل میں ہندوستانی ممبر کی نامزدگی۔ مئی ۱۹۱۸ء میں صاجزادہ صاحب نے متعدد یادداشتیں اس مضمون پر لکھی تھیں کہ مشرقی افریقہ کی کونسل میں ہندوستانی ممبر ہوا کریں۔ آپ نے دکھایا کہ ۱۹۱۴ء میں وہاں کی حکومت نے لکھا کہ چونکہ کوئی قابل ہندوستانی دستیاب نہیں ہوا اس لئے کسی ہندوستانی کی نامزدگی ناممکن ہوگئی۔ صاجزادہ صاحب نے اس بات پر تعجب کیا اور لکھا کہ ۱۹۱۴ء ہی میں ممباسہ میں ایک کانگریس کا اجلاس ہوا تھا جس میں مسٹر عبدالرسول نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں بڑی قابلیت سے دکھایا تھا کہ اس ملک کو ابتدا میں آباد کرنے میں ہندوستانیوں کا بڑا حصہ رہا ہے۔ انھوں نے اس کام میں بہت روپیہ لگایا مگر اُن کے ساتھ انصاف نہیں برتا جاتا۔ اسی طرح مسٹر جے۔ ایم۔ جیون جی نے اپنے خطبۂ صدارت میں بڑی قابلیت سے اپنے حقوق شمار کرائے اور بتایا کہ کتنے ہی قابل ہندوستانی ممبری کے قابل موجود ہیں۔ مختصر یہ کہ صاجزادہ صاحب نے

دکھایا کہ محض قومی تعصب اور رنگ کے امتیاز کی وجہ سے ہندوستانیوں کے ساتھ خراب برتاؤ ہے اور تجویز کیا کہ ہندوستانیوں کو اپنے نمائندے کونسل کے لئے خود منتخب کرنے کا اختیار دیا جائے۔

انڈیا کونسل کی ممبری پر ایک سرسری نظر

یہ ظاہر ہے کہ انڈیا کونسل کی ممبری کے لئے صاحبزادہ صاحب کی خود خواہش یا کوشش نہ تھی۔ نہایت ہی اہم ملکی اور قومی خدمت کے خیال اور احباب کے شدید اصرار نے آخر اُن کو مجبور کر دیا کہ چند سال کے واسطے وہ اُس علیگڑھ کو چھوڑیں جس کو اُس سے پیشتر انھوں نے کسی لالچ یا قیمت پر نہ چھوڑا تھا۔ ستمبر ۱۹۱۷ء سے ۳۱ اگست ۱۹۲۴ء تک وہ انڈیا کونسل کے ممبر رہے اور انڈیا آفس میں کام کیا۔ دو دفعہ اس دوران میں وہ فرنچائز کمیٹی اور ہندوستانی طلبار کی تحقیقاتی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے انگلستان سے ہندوستان آئے اور ایک دفعہ بیمار ہو کر ہندوستان آئے اور چھ مہینے کے بعد واپس گئے۔

ممبری کے دوران میں جس قابلیت اور جرأت صداقت اور دیانت کے ساتھ انھوں نے ہندوستان کے متعلق خدمات انجام دیں۔ ناظرین اُن کا اندازہ ان چند واقعات سے جو اس باب میں بیان ہوئے کر سکتے ہیں۔ اُن کی حالت یہ رہی کہ جب کسی معاملہ میں ہندوستان کو نقصان پہونچتا دیکھا تو ممبران کونسل کی رائے سے اختلاف کرنے میں کبھی پس و پیش نہ کیا اور کونسل کے بڑے سے بڑے با اثر رکن سے نہ کبھی وہ مرعوب ہوئے نہ ہاں میں ہاں ملائی اور نہ سکوت ہی اختیار کیا۔ اختلاف کرنے میں صاحبزادہ صاحب کو ٹائپ کئے ہوئے ڈیڑھ سو بڑے صفحات لکھ دینا گویا کوئی بات ہی نہ تھی۔ اور یہ کیفیت اس حالت میں تھی جب کہ اُنھیں دفتر سے اُن کے حسب منشار معلومات نہ ملتی تھیں۔ کتنی بار انھوں نے یہ احتجاج کیا کہ رائے طلب کرتے وقت اُنھیں کافی مسالہ فراہم نہیں کیا جاتا اور مسائل کا مطالعہ کرنے کیلئے کافی وقت نہیں دیا جاتا۔ کتنی بار اُنھوں نے عنوانات قائم کر کے وزیر ہند کو بھیجے کہ اُنکے

مطابق ممبروں کے پاس مسائل کی نسبت معلومات بھیجی جایا کریں۔ محنت کی یہ کیفیت تھی کہ معیّن اوقات کے علاوہ اکثر دفتر میں جاکر کام کرتے تھے اور کبھی کبھی تعطیلیں بھی وہیں صرف کرتے تھے۔ اسی سے تنگ آکر دفتر کے ایک دربان نے کسی سے کہا تھا کہ یہ ہندوستانی ممبر ایسا آیا ہے کہ ہماری تعطیلیں بھی خراب کر دیتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو انڈیا کونسل کے چھ سال کے عرصہ میں جو خدمات موصوف نے انجام دیں ملکی مفاد کے اعتبار سے اُن کا پلّہ اُن کے باقی ماندہ قومی کاموں سے زیادہ بھاری نکلے گا۔ بالخصوص اس اعتبار سے کہ انڈیا کونسل میں اُن کا کام پبلک کی نظروں سے اوجھل تھا۔ داد ملنے کی جگہ ہر وقت کوفت اٹھانی پڑتی تھی۔ دماغ میں بجز ہندوستان کی مظلومی کی تصویر کے اور کسی چیز کی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ وہاں وہ انگریز ممبروں کے ہاتھوں ہندوستان کی حق تلفیاں دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں گھٹتے اور کڑھتے تھے۔ اس کا اثر اُن کی صحت پر بہت خراب پڑا۔ درانحالیکہ اُس وقت تک یہ سمجھا اور کہا جاتا تھا کہ انڈیا کونسل کی ممبری محض سیر و تفریح اور انگریزی سوسائٹی کے عیش اور لطف اُٹھانے کے لئے عطا کی جاتی ہے۔

صاحبزادہ صاحب کی ممبری کے ابتدائی زمانہ میں یورپ کی عالمگیر جنگ جاری تھی اور ہندوستان میں سیاسی جد و جہد اور جدید اصلاحات کا نفاذ ہو رہا تھا۔ اُس زمانہ میں ٹرکی کی آزادی کے بارہ میں جو کچھ صاحبزادہ صاحب نے حصہ لیا اور ہندوستان کی سیاسیات کے متعلق جو اُن کا خیال تھا وہ اختصار کے ساتھ اس سے پہلے لکھا جاچکا ہے۔ صاحبزادہ صاحب ہندو۔ مسلم اتحاد کے حامی تھے لیکن چونکہ وہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کی قابلیت سے باخبر تھے۔ لہٰذا اُن کی رائے تھی کہ ہندوستانی جس قدر علمی اور مادی ترقی کرتے جائیں اُسی نسبت سے بتدریج سیاسی حقوق لیتے جائیں بلکہ یک دم سے آزاد خود مختارانہ حکومت کے مطالبہ پر اُن کو اعتقاد و اعتماد نہ تھا۔ کیونکہ وہ یقین رکھتے تھے کہ اس میں کامیابی نہ ہوگی اور ملک میں بدامنی پھیل جائے گی۔

صاحبزادہ صاحب کو اس بات سے روحانی تکلیف تھی کہ وہ بہت سے انگریزوں میں خود غرضی اور ہندوستان کی ترقی اور حق طلبی کے خلاف جذبات دیکھتے تھے۔ لیکن انگریزوں کی بہت سی اعلیٰ صفات کے وہ مداح بھی تھے۔ اور اُن کی بڑی تمنا تھی کہ علمی ترقی سے ہندوستانیوں میں بھی یہی صفات پیدا ہوجائیں۔ چنانچہ ممبری کے فرائض انجام دینے کے علاوہ جس میں ہندوستان کے حقوق کی حفاظت اصل مقصود تھا۔ صاحبزادہ صاحب نے مسئلہ تعلیم کی تحقیقات میں نہایت کد و کاوش سے محنت کی وہ جدید تعلیم مغربی کے طریقوں سے آگاہی اس لئے حاصل کرتے رہے کہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی میں انھیں طریقوں پر تعلیم کا رواج دیں۔ چنانچہ ولایت میں تعلیم پانے والے ہندوستانی طلبار کے متعلق نہایت کوشش سے انھوں نے ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کرائی اور اُس کے ایک رکن کی حیثیت سے تمام انگلستان کے تعلیمی مرکزوں کا معائنہ کیا۔ وہ تعلیمی نمائشوں میں شریک ہوا کرتے تھے اور پھر انھوں نے یورپ کے دوسرے ممالک کی یونیورسٹیاں خود جاکر دیکھیں۔ دنیا کی مشہور یونیورسٹیوں کے ضروری حالات جمع کرکے اُن کا خلاصہ لکھا اور اُسے اپنی یادداشت کے لئے اپنے پاس محفوظ رکھا۔ پس جب وہ انڈیا کونسل کا کام ختم کرکے ہندوستان واپس آئے تو ... تعلیمی اور معاشرتی معلومات کے متعلق ایک بڑا ذخیرہ اپنے ساتھ لائے تاکہ اپنے ملک اور اپنی قوم کو فائدہ پہونچائیں۔

باب نہم

مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری

زمانۂ قیام انگلستان میں نامزدگی کے چرچے

پچھلے صفحات میں یہ بات تفصیل سے دکھائی جا چکی ہے کہ فن تعلیم سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے صاحبزادہ صاحب نے کس قدر شاقہ محنت برداشت کی تھی اور فن تعلیم سے غیر معمولی دلچسپی کی بدولت اس سے بہت پہلے جبکہ وہ وائس چانسلری کے منصب پر فائز ہوئے ان کا شمار ہندوستان کے ماہرین فن تعلیم میں ہونے لگا تھا۔ اور علیگڈھ کالج کی انھوں نے جو خدمات زمانہ طالب علمی سے اب تک انجام دی تھیں ان کا مقتضا یہی تھا کہ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کا بار قوم کی طرف سے ان کے کندھوں پر رکھا جائے۔ ابھی آپ نے انڈیا کونسل کا کام ختم نہ کیا تھا۔ کہ اوائل ۱۹۲۳ء میں آنریبل مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب آف محمود آباد نے وائس چانسلری کے عہدہ سے استعفیٰ دیدیا اور اسی وقت سے اس عہدہ پر آپ کی نامزدگی کے چرچے ہونے لگے اور بعض دوستوں کی طرف سے ولایت ہی کے زمانۂ قیام میں آپ سے استمزاج کیا جانے لگا۔

صاحبزادہ صاحب نے اپنے ایک دوست (حبیب اللہ خاں) کو جنھوں نے بذریعہ تار اس بارہ میں ان کا منشا دریافت کیا تھا ایک مفصل خط لکھا تھا جس کا اقتباس یہ ہے:۔

”دفعتاً پرسوں آپ کا تار پہونچا جیسا کہ پچھلے ہفتہ کے عریضہ میں لکھ چکا ہوں کہ مسلم یونیورسٹی کی خدمت میرے ابتدائی تمناؤں میں سے ہے اور گو میں اس کے قابل ہوں یا

نہ ہوں لیکن اسکا حوصلہ اور ولولہ ضرور ہے کہ جس نصب العین کی تمنا میں عمر گذر گئی اس کو قریب لانے کے لئے جو کچھ ہو سکے کروں چنانچہ جیسا آپ کا ارشاد تھا میں نے اس وقت آپ کو جواب دیا کہ آپ میرا نام پیش فرما سکتے ہیں بشرطیکہ شیخ عبد اللہ صاحب اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب متفق ہوں اس شرط سے ڈر ہے کہ آپ یہ خیال فرمائینگے کہ مجھکو آپ کے حکم کی تعمیل میں کچھ پس وپیش تھا۔ لیکن چونکہ ایسے دوستوں کا اتفاق جیسے شیخ عبد اللہ اور ڈاکٹر ضیا الدین احمد ہیں کام کی کامیابی کے لئے ضروری ہے مجھ کو یقین ہے کہ آپ کو بھی اس سے اتفاق ہوگا۔*

وائس چانسلری کے معاملہ میں میرے جذبات کا جو رجحان ہے وہ میرے گذشتہ ہفتہ کے خط اور اس عریضہ کے مضمون سے ظاہر ہے لیکن دور اندیشی کا فتویٰ اس کے مطابق نہیں ہے اس کام میں جو کوفت، دردسری اور محنت لازمی ہیں ان کا اثر میری صحت پر ہوگا اس کا اندازہ مجھکو ہے اور باوجود ہر قسم کی جد وجہد کے کامیابی جس قدر مشتبہ ہے وہ بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے بنتے ہوئے اور پھلتے ہوئے کام کو تو ہر شخص سنبھالنا چاہتا ہے لیکن علیگڈھ جس درجہ کو پہنچ گیا ہے اس کے لحاظ سے وائس چانسلری قبول کرنا آسان نہیں ہے۔

بہرحال آخر اگست ۱۹۲۳ء میں یہاں سے ہندوستان کو روانہ ہونے کا ارادہ ہے اور امید ہے کہ ستمبر میں وہاں پہونچ جاؤں گا۔ سر محمد شفیع سر عبد الرحیم۔ مسٹر (حال سر) اکبر حیدری کی خواہش ہے کہ میں وائس چانسلری منظور کر لوں چنانچہ ان حضرات کو ان کی خواہش کے مطابق میں نے لکھ دیا ہے کہ بشرط انتخاب میں تیار ہوں بہتر تو یہ تھا مہاراجہ صاحب محمود آباد اپنی وائس چانسلری کی مدت پوری کرتے یعنی دسمبر ۱۹۲۳ء میں علحدہ ہوتے ؛"

* آئندہ جو واقعات پیش آنے والے ہیں انکے لحاظ سے ناظرین اس شرط کو اپنے خیال میں رکھیں۔

دوسرے خط میں ایک دوست کو لکھتے ہیں :۔

جس کام (وائس چانسلری) کے لئے میں نے خدا کے نام پر آمادگی ظاہر کی ہے اس میں سب طرف خار اور آگ کی چنگاری اور طرح طرح کے اشتعال انگیز اسباب نظر آرہے ہیں اور میں خوب جانتا ہوں کہ میں ان سب کا نشانہ بنوں گا۔

دوستوں کے تار اور خطوط کے علاوہ اسی بارہ میں ۲۶ جون ۱۹۲۳ء کو ہر ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال کے ایگزیکٹو سکریٹری صاحب کا حسب ذیل تار پہونچا تھا۔

"ہر ہائی نس چانسلر آپ کو نواب مزمل اللہ خاں صاحب کو وائس چانسلری کے خالی عہدہ کے لئے سب سے زیادہ موزوں خیال فرماتی ہیں لیکن آپ کی طولانی تعلیمی اور قومی خدمات کی وجہ سے اگر آپ مستقل طریقہ سے علیگڈھ میں قیام کریں تو آپ کو ترجیح دیتی ہیں۔ نواب مزمل اللہ خاں بہادر اس بات پر آمادہ ہیں کہ وائس چانسلری منظور کرلیں اور جب آپ انگلستان سے واپس آئیں تو یہ عہدہ آپ کے لئے خوشی سے خالی کردیں۔ ہر ہائی نس بیگم صاحبہ نواب صاحب کے اس خیال کی نہایت قدر فرماتی ہیں کیونکہ اس سے مخالفت باقی نہیں رہتی پس ہر ہائی نس اور نواب صاحب کو آپ کے جواب کا انتظار ہے براہ مہربانی تار کے ذریعہ سے جواب عنایت ہو کہ مستقل قیام کے ارادہ سے آپ علیگڈھ کب تشریف لائیں گے۔"

اس تار کا جواب صاحبزادہ صاحب نے فوراً بھیج دیا کہ مستقل قیام علیگڈھ کی نیت سے ستمبر ۱۹۲۳ء میں آؤں گا لیکن مئی تا اگست ۱۹۲۴ء انھیں ایک دفعہ پھر کونسل کی میعاد پوری کرنے کو علیگڈھ سے ولایت آنا ہوگا اس کے بعد وہ علیگڈھ میں قطعی مستقل طور سے رہیں گے۔

اس تار کے علاوہ صاحبزادہ صاحب نے بیگم صاحبہ کے ایگزیکٹو سکریٹری کو ایک مفصل خط بھی روانہ کردیا اور تار کی تفصیل کرکے یہ بھی لکھا کہ نواب مزمل اللہ خاں

صاحب کی یہ خاص عنایت ہے کہ انھوں نے میری واپسی پر علیحدہ ہو جانے کے لئے اپنی آمادگی ظاہر فرمائی ہے مجھ کو نواب صاحب سے یہی توقع تھی میں نے بیگم صاحبہ کو لکھ دیا ہے کہ نواب صاحب میرے دیرینہ دوست ہیں اور خدا کے فضل سے اُمید ہے کہ مثل ماضی آئندہ بھی ہم دونوں بہ اتفاق قومی فلاح کے لئے کوشاں رہیں گے"

ان خطوط سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وائس چانسلری کے لئے صاحبزادہ صاحب کا کوئی اپنا پروپیگنڈا نہ تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کو یونیورسٹی کی خدمت کا ولولہ تھا اور اپنے پرانے دوستوں کے تعاون کے کس درجہ آرزومند تھے۔ لیکن اس کام کو وہ نہایت پرخطر سمجھتے تھے۔ اور محض یونیورسٹی کی فلاح اور اصلاح کے لئے اس خار دار میدان میں قدم رکھنے کو تیار ہوئے تھے۔

وائس چانسلری پر انتخاب

۲۴ دسمبر ۱۹۲۳ء کو علیگڈھ میں کورٹ کا جلسہ ہوا۔ اور صاحبزادہ صاحب تین سال کے واسطے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بالاتفاق منتخب ہوئے اس موقع پر صاحبزادہ صاحب نے جو تقریر کی اس کا خلاصہ یہ ہے۔

ممبران کورٹ کا شکریہ ادا کرنے کے بعد صاحبزادہ صاحب نے کہا "مجھے اجازت دیجئے کہ مختصر الفاظ میں اس اعتماد کے متعلق جو آپ حضرات نے مجھے اس منصب پر فائز فرما کر ظاہر کیا ہے اپنے خیالات کا اظہار کروں۔

میرے خیال میں وہ اصل غرض جس کے واسطے یہ تعلیم گاہ قائم کی گئی ہے طلبار کی روحانی اخلاقی اور جسمانی تربیت ہے جس پر ہماری تمام توجہات مرکوز ہونی چاہئیں۔

طلبار کی بہبودی اور ترقی ہمارا اصل مقصد ہے

یہ مقصد طریقۂ تعلیم۔ اور اساتذہ کی جماعت کی مدد

سے حاصل ہو سکتا ہے دوسرے امور اس کا ضمیمہ ہیں۔ قوم نے ایک بڑی امانت ہمارے سپرد کی ہے اس امانت کا سب سے زیادہ اہم جزو مسلم طلبا کی روحانی، دماغی، اخلاقی اور جسمانی ترقی ہے۔ اور ہماری یونیورسٹی کی کامیابی تمام تر۔ اسی ترقی پر منحصر ہے کسی قوم کے افراد کی تہذیب اخلاقی صحت و کامیابی اور قابلیت اس قوم کی سب سے بڑی حقیقی دولت ہے لیکن افسوس یہی وہ سرمایہ ہے جس سے ہم مسلمانوں کی قوم محروم ہے اسی کمی کے پورا کرنے کو یہ مسلم یونیورسٹی وجود میں لائی گئی ہے اور یہی وہ معیار ہے جس پر ہماری یونیورسٹی کی خدمات کی جانچ کی جا سکتی ہے۔

میرے خیال میں وائس چانسلری کے فرائض نہایت مختصر الفاظ میں حسب ذیل ہیں:۔

(الف) گورنمنٹ اور قوم کی اخلاقی اور مالی امداد حاصل کرنا۔

(ب) ضروری عمارات اور سامان مہیا کرنے کے ذرائع پیدا کرنا۔

(ج) اس تعلیم گاہ میں جو تعلیم و تربیت دیجائے اس کی اصلاح اور ترقی میں کوشش کرنا۔

انتخاب کے بعد پہلا کام

انتخاب کے بعد صاحب زادہ صاحب نے یکم جنوری ۱۹۲۴ء کو اس اہم کام کا جائزہ لیا پہلے دن کا حال وہ اپنی یادداشت کے رجسٹر میں اپنے قلم سے اس طرح تحریر فرماتے ہیں:۔

(۱) یکم جنوری ۱۹۲۴ء پونے چھ بجے آج میں صبح یونیورسٹی کی بڑی مسجد میں نماز فجر کے لئے گیا اسوقت تک مؤذن صاحب بھی نہیں آئے تھے تھوڑی دیر کے بعد مؤذن صاحب جاگے اُن سے معلوم ہوا کہ چھ بجے اذان ہوتی ہے اور ساڑھے چھ بجے نماز میں نے اذان خود دی کچھ عرصہ کے بعد مولانا مولوی عبد اللہ صاحب انصاری ڈین (Dean) یونیورسٹی تشریف لائے ساڑھے چھ بجے جماعت کی نماز ہوئی جس میں

سات نمازی تھے اور ان سات نمازیوں میں یونیورسٹی کے صرف ایک طالب علم شریک تھے
بعد نماز تقریباً ساڑھے سات بجے میں شفا خانہ کو گیا۔ ڈاکٹر صاحب موجود نہ تھے
ایک کمپاؤنڈر اور دو ملازم تھے کمروں کو نہایت گندہ پایا گودام کی کوٹھری میں
سامان بالکل بے ترتیبی سے خاک آلودہ پڑا تھا دوا کا کمرہ جس میں الماریوں میں
دوائیں رکھی تھیں وہ بھی صاف نہ تھا جس کوٹھری میں دودھ وغیرہ گرم کیا جاتا ہے
وہ بھی خراب حالت میں تھی جس کمرہ میں دوائی بنائی جاتی ہے جس فلٹر سے پانی لیا جاتا
ہے جس ناند میں پانی ڈالا جاتا ہے جس میز پر دوا بنائی جاتی ہے ہر ایک نہایت گندی
اور خراب حالت میں پائی گئی باہر برآمدہ میں جہاں مریضوں کے گلے میں پھریری وغیرہ
لگائی جاتی ہے وہاں ایک بالٹی رکھی تھی جو نہایت میلی تھی معلوم ہوتا تھا کہ مہینوں سے
صاف نہیں ہوئی تھی ایک کونے میں ایک نہایت پرانی چق رکھی ہوئی تھی دریافت
کرنے پر کمپاونڈر نے کہا اس چق کی تیلیوں سے پھریری بنا کر مریضوں کے گلوں
میں لگائی جاتی ہے غسلخانہ نہایت ہی گندی حالت میں پایا گیا دو کموڈ رکھے تھے جو
نہایت گندے تھے دریافت پر کہا گیا کہ گو ایک بھنگی خاص شفا خانہ کے لئے ہے لیکن
وہ غسلخانہ کو نہیں دھلواتا ۔ جو کمرے مریضوں کے رہنے کے لئے ہیں ان کے متعدد
شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور صفائی بالکل نہ تھی ۔

ایک کمرے میں ایک ٹایفائڈ بخار (Typhoid) کے مریض کو لیٹا پایا دریافت
پر معلوم ہوا کہ انٹرمیڈیٹ کالج کا طالب علم ہے قریب تین ہفتہ سے شفا خانہ میں ہے،
لیکن اس عرصہ میں کالج یا بورڈنگ ہاؤس کا کوئی افسر اسے دیکھنے کو نہیں آیا۔
ساڑھے آٹھ بجے تک ڈاکٹر صاحب بھی تشریف نہیں لائے تھے جو مریض تھا اسکا
بستر میلا تھا دریافت پر معلوم ہوا کہ جو بستر اس کے کمرہ سے تین ہفتہ ہوئے آیا تھا۔ وہی
اب تک ہے شفا خانہ میں کوئی بستر یا چادر نہیں رکھی جاتی جن کمروں میں مریض

رکھے جاتے ہیں۔ وہ بالکل صاف نہیں بلکہ خراب حالت میں ہیں۔ جب شفاخانہ سے واپس ہونے والا تھا اسوقت شیخ عظیم الدین (ہیڈ کمپاؤنڈر) آئے ان کو جو حالت تھی میں نے دکھلائی۔

(۳) میں نے آج صبح بڑے ڈائننگ ہال کا باورچیخانہ بھی دیکھا ہر ایک حصّہ کو گندہ اور خراب حالت میں پایا۔ ایک جگہ جہاں روٹی پکتی تھی کیچڑ تھی جس حصہ میں دیگچیاں چڑھتی ہیں وہاں خاک اور کوڑا پایا۔ غرضیکہ حالت قابل افسوس پائی۔ جس کوٹھڑی میں گوشت کاٹا یا بنایا جاتا ہے اس میں زمین پر چھیچھڑے اور ہڈیاں پڑی تھیں اور فرش وغیرہ سب میلا تھا۔ دریافت پر مجھے بتایا گیا کہ ذبح سے پہلے راسوں کا معائنہ کوئی نہیں کرتا۔"

۴ر جنوری ۱۹۲۴ء

(۴) آج صبح نماز کے وقت منٹو سرکل گیا مسجد کے کمرہ میں صرف مؤذن صاحب کو موجود پایا اور آخر کار جب کوئی نہ آیا تو موذن صاحب نے مجھ سے خواہش کی کہ میں نماز پڑھاؤں۔ چنانچہ میں نے نماز پڑھائی میں امام تھا اور موذن صاحب مقتدی تھے جس وقت میں واپس آرہا تھا۔ اس وقت پیش امام صاحب تشریف لائے معذرت کی کہ ان کی آنکھ وقت پر نہ کھل سکی اس لئے ان کو دیر ہوگئی۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ نہ کوئی اسٹاف کے اراکین میں سے نماز کو آتا ہے نہ طلبا رمیں سے جب میں واپس آرہا تھا تو دروازہ کے قریب میں نے بائیں جانب کے مکان کے سامنے کوڑا کرکٹ پڑا ہوا دیکھا۔ اور ہر ایک چیز نہایت گندی حالت میں نظر آئی۔ چنانچہ وہاں گیا معلوم ہوا کہ وہ چائے کی دوکان ہے جہاں طلبار چائے پینے اور ناشتہ وغیرہ کرتے ہیں اندر سے یہ کمرہ نہایت بے ترتیب اور گندی حالت میں تھا دیواروں پر پان کی پیکیں پڑی ہوئی تھیں اور کتھے چونے کے

نشان تھے - پانی کا مٹکا نہایت میلا تھا۔

(۵) دروازہ کی دوسری طرف چوکیدار نے اپنے چولھے سے تمام دیوار کالی کر دی ہے اور ایک ٹوٹی ہوئی چھپریا وہاں پڑی ہوئی تھی۔ مجھکو حیرت ہوئی کہ عین دروازہ کے قریب جہاں سے پرنسپل صاحب اور پروفیسر صاحبان روزانہ گزرا کرتے ہونگے کسی نے اس طرف توجہ نہ فرمائی میں نے میجر ڈین صاحب پرنسپل سے اسکا ذکر بھی کیا۔

صاحبزادہ صاحب نے جائزہ لینے کے بعد اپنے سرسری گشت میں یونیورسٹی کے احاطہ میں جو منظر دیکھے تھے ان سب کو اپنی یادداشت ہی میں تحریر نہیں کیا۔ بلکہ وہ انکے دل پر نقش ہو گئے جس کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے اپنے انتخاب کے بعد اپنی تقریر میں جس پروگرام کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس کو عملی صورت میں لانے میں منہمک ہو گئے اور وہ روزمرہ پابندی کے ساتھ دفتر میں جا کر کام کرنے لگے اور یہی عمل آخر وقت تک جب تک وہ اس عہدہ پر فائز رہے جاری رکھا۔

صاحبزادہ صاحب کی وائس چانسلری کے پہلے چار ماہ

ولایت جانے سے قبل وائس چانسلری کا چارج لینے کے بعد تقریباً چار ماہ تک صاحبزادہ صاحب کو علیگڈھ میں قیام کا موقع ملا سب سے پہلے انھوں نے وائسرائے کو یونیورسٹی میں آنے کی دعوت دینے کی کوشش کی جس سے یہ غرض تھی کہ گورنمنٹ کی مالی اور اخلاقی مدد کی تجدید ہو کیونکہ علی گڈھ کالج کی اصل قوت اور جان وہ امداد تھی جو گورنمنٹ آف انڈیا اور صوبہ کی گورنمنٹ سے ملتی تھی اس امداد کا قیام اور اس میں ترقی اس ہمدردی اور دلچسپی پر منحصر تھی جسکا اظہار وائسرائے اور صوبہ کے گورنر وقتاً فوقتاً کالج میں تشریف لا کر فرماتے رہتے تھے لیکن ۱۹۰۸ء کے بعد

سے ۱۹۲۳ء تک کا وہ زمانہ گذرا کہ کوئی وائسرائے علیگڈھ کالج میں نہیں آیا سولہ برس کا یہی وقفہ کالج کی طرف سے عام مسلمانوں کے خیالات میں تغیر پیدا کرنے اور کالج کی وقعت اور شہرت پر برا اثر ڈالنے کے لئے کچھ کم نہ تھا پس صاحبزادہ صاحب نے وائس چانسلری کا جائزہ لیتے ہی سب سے پہلے یہی کوشش کی کہ لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند مسلم یونیورسٹی کے لئے آمادہ ہوں چنانچہ آپ نے وائسرائے سے ملاقات کی اور درخواست کی کہ علیگڈھ تشریف لائیں وائسرائے موصوف نے وعدہ کیا کہ جب آپ (یعنی صاحبزادہ صاحب) ولایت سے واپس آئیں گے۔ اس وقت وہ اپنے علیگڈھ آنے کی تاریخ مقرر کریں گے۔ اسی دوران میں ولایت جانے سے قبل تمام شعبہ جات تعلیم کے صدر صاحبان سے بتوسط پرو وائس چانسلر صاحب تعین وقت کر کے ان کے ضروریات اور حالات پر عبور حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی۔ چنانچہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب پرو۔ وائس چانسلر کے ذریعہ سے ایسا انتظام ہوگیا کہ ہر شعبہ کے اراکین صاحبزادہ صاحب سے ملیں اور ان کی ضروریات اور حالات سے واقفیت حاصل کریں۔

صاحبزادہ صاحب کے وائس چانسلری کے بجٹ (میزانیہ) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں۔ سامان آلات۔ اور فرنیچر کے لئے معقول رقمیں منظور ہوئیں اور صرف کی گئیں فزکس اور کیمسٹری کے معمل (Laboratories) لیبورٹریز توسیع کے کے محتاج تھے موجودہ عمارتوں میں ترمیم کرکے ان کا انتظام جس طرح ممکن تھا کیا گیا دوسرے شعبوں کی نسبت بھی ان کی ضروریات اور حالات کے لحاظ سے مناسب تدبیریں کی گئیں۔

ٹریننگ کالج ٹریننگ کالج کی حالت نہایت غیر قابل اطمینان تھی طلبہ

کو اجازت تھی کہ وہ ٹریننگ کالج کے علاوہ ایم۔ اے اور ایل ایل بی کے درجوں میں بھی شریک ہوں یہ طریقہ کسی گورنمنٹ ٹریننگ کالج میں نہ تھا چنانچہ ایسی غیر اطمینانی حالت تھی کہ صوبہ کے ڈائرکٹر سررشتہ تعلیمات نے کہہ دیا تھا کہ مسلم یونیورسٹی کا ٹرینڈ۔ بی۔ اے کسی گورنمنٹ اسکول میں نوکر نہ رکھا جائے گا۔ صاحبزادہ صاحب نے اصلاح کی کوشش کی ٹریننگ کالج میں ایک ریڈر (Reader) اور دو لکچراروں کا اضافہ ہوا۔

شعبۂ جغرافیہ

بر روئے قواعد یونیورسٹی اس شعبہ کا قائم ہونا لازمی تھا لیکن اب تک اس سلسلہ میں کوئی بھی قدم نہ اٹھایا گیا تھا۔ اور شعبہ کا وجود خود محض کاغذات میں تھا صاحبزادہ صاحب نے اس شعبہ کو قائم کرایا۔ اور اس وقت جو انتظام ممکن تھا کیا۔

شعبۂ عربی

مولوی عبدالحق صاحب کے بعد سے شعبۂ عربی بھی خراب حالت میں تھا لائق شخص کے تقرّر کے لئے اشتہار دیا گیا مصر اور بیروت تک سے درخواستیں آئیں یہ سب نواب صدر یار جنگ بہادر کے پاس حیدرآباد دکن گئیں آخر علامہ عبدالعزیز صاحب میمن کا انتخاب ہوا اور عربی شعبہ کی حالت بہت بہتر ہو گئی۔

پروفیسر اور ریڈر کے مدارج میں اصلاح کی کوشش

صاحبزادہ صاحب نے یہ کوشش بھی کی کہ پروفیسر کے مقابلہ میں ریڈروں کو مختلف شعبوں کی صدارت کے لئے مرجّح رکھنے کا طریقہ ختم کر دیا جائے لیکن یونیورسٹی کے قانون کی رو سے چونکہ یہ بات جائز تھی کہ ریڈر صدر ہوں۔ اس لئے اس رواج کو صاحبزادہ صاحب پوری طرح بند نہ کر سکے صاحبزادہ صاحب کی یہ رائے صحیح تھی کہ ہر شعبہ کی

عمدہ کارگزاری بہت کچھ اس کے صدر سے متعلق ہوتی ہے پروفیسروں کو ریڈروں سے تنخواہیں اس لئے زیادہ دیجاتی ہیں کہ وہ ریڈروں سے زیادہ لائق یقین کیے جاتے ہیں۔ پس ان اصولوں پر صدر وہی ہونا چاہیے جو زیادہ لائق ہو۔ مگر موجودہ حالت اس کے برعکس تھی جس کی مثال یہ ہے کہ ڈاکٹر ڈی این ملک (Dr. D.N. Malik) جیسے مشہور ماہر فن تو اپنے صیغہ کے صدر نہ تھے بلکہ مسٹر فیروزالدین مراد۔ ایم۔ ایس۔ سی۔ جو لکچرار تھے۔ وہ صیغہ فزکس کے صدر بنائے گئے تھے۔ صاحب زادہ صاحب کی رائے میں یہ قاعدہ یونیورسٹی کے ضابطہ میں جس صورت میں موجود تھا اسکا یہ اثر ہو رہا تھا کہ پروفیسروں میں ذمہ داری کا احساس نہ رہا تھا۔ اور یہ طریقہ کسی طرح مفید اور کامیاب نہ تھا۔

شعبۂ اسلامک اسٹڈیز

وائس چانسلری کا کام لینے کے بعد ہر صیغہ کے استادوں سے ملنے اور ان کی ضروریات معلوم کرنے کا جو سلسلہ صاحبزادہ صاحب نے قائم کیا تھا۔ اسی سلسلہ میں فروری ۱۹۲۴ء میں مولانا سیّد سلیمان اشرف صاحب سے ملنے کی نوبت آئی۔ مولانا موصوف جو صیغہ عربی کے مستقل لکچرار تھے اور آغاز یونیورسٹی یعنے دسمبر ۱۹۲۰ء سے اس شعبہ کے آنریری ریڈر رہتے، ۷ اردسمبر ۱۹۲۲ء کو اس صیغہ کے مستقل تنخواہ دار ریڈر مقرر ہو چکے تھے اور اب جنوری ۱۹۲۴ء سے اس کام کے نام سے ان کی تنخواہ میں پچھتر روپیہ ماہوار کی ترقی بھی صاحبزادہ صاحب کے انتخاب سے ایک ہفتہ قبل ۷ اردسمبر ۱۹۲۳ء کو اگزیکٹو کونسل کے جلسہ میں منظور ہو چکی تھی۔ صاحبزادہ صاحب نے مولانا صاحب سے اسلامک اسٹڈیز کا حال پوچھا اور اپنے سوال کا یہ جواب پر کہ ابھی یہ معلوم نہیں ہے کہ اسلامک اسٹڈیز کا مفہوم کیا ہے صاحبزادہ صاحب کو سخت حیرت ہوئی ۵ راپریل ۱۹۲۴ء تک جب کوئی کام اس شعبہ میں

نہیں ہوا تو صاحبزادہ صاحب نے اکیڈمک کونسل میں اس معاملہ کے متعلق ایک نوٹ
پیش کر دیا۔ اور یہ لکھا کہ یا تو اس شعبہ کا کام شروع ہو ورنہ اس کو بند کر دیا جائے
محض کاغذ پر اس کا قائم رہنا بے کار ہے۔ ولایت جانے کے وقت تک ان کے
نوٹ کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تھا اور اسی حالت میں صاحبزادہ صاحب ۲۳ر اپریل
۱۹۲۴ء کو ولایت چلے گئے۔ واپسی کے بعد اس سلسلہ میں جو کارروائی ہوتی رہی
اسکی تفصیل صاحبزادہ صاحب کے اس پمفلٹ میں ہے جو انھوں نے وائس چانسلری
چھوڑنے کے وقت دسمبر ۱۹۲۶ء میں ممبران کورٹ مسلم یونیورسٹی کے پاس
روانہ کیا تھا ان کی غیبت میں اس مسئلہ میں ایک نہایت ناگوار صورت اختیار کر لی
جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے۔

درس وتدریس کی نگرانی

صاحبزادہ صاحب نے اُستاد عموماً اوقات کے
پابند نہ پائے۔ بعض کام سے غیر حاضر بھی ہو جایا
کرتے تھے۔ طلبار کی ایک بڑی تعداد لکچر نہ سنتی تھی ان کو پچھتر فیصدی کی حاضری
کی بھی پرواہ نہ تھی چنانچہ اس معاملہ میں چند دفعہ صاحبزادہ صاحب نے پرووائس
چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب سے گفتگو کی اور یہ تجویز کی کہ جو طلبار
غیر حاضر رہتے ہوں یا اوقات کی پابندی نہ کرتے ہوں ان کے والدین کو بھی
اطلاع کر دی جایا کرے اور وائس چانسلر کے علم میں بھی ان کی غیر حاضری لائی
جائے تاکہ طلبار میں ڈسپلین قائم رہے۔ چنانچہ اس پر ایک حد تک عمل درآمد ہوا۔

ڈائننگ ہال کی اصلاح

درس وتدریس کے مختلف شعبہ جات کی اصلاح
کی طرف متوجہ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ڈائننگ
ہال کی اصلاح بھی ایک ضروری چیز تھی۔ صاحبزادہ صاحب کے وائس چانسلر
مقرر ہونے سے پہلے کورٹ کی توجہ اس طرف مبذول ہو چکی تھی۔ اور ۲۴ر دسمبر

سنہ ۱۹۲۳ء کے جلسہ میں جس میں صاحبزادہ صاحب وائس چانسلر منتخب ہوئے تھے کورٹ نے ایک خاص کمیٹی کا تقرر اس غرض سے کیا تھا کہ وہ ڈائننگ ہال کے متعلق جو شکایات ہیں ان کی تحقیقات کرے۔ صاحبزادہ صاحب نے وائس چانسلری کا چارج لینے کے بعد ہی ڈائننگ ہال کا معائنہ کیا ان کی صدارت میں اس کمیٹی کے کئی ایک جلسہ ہوئے جن میں بہت سے ان اصحاب کے جن کو اس مسئلہ سے دلچسپی تھی بیانات قلمبند ہوئے۔ ڈائننگ ہال کے کاغذات جانچے گئے اور تمامی حالات پر غور کرنے کے بعد کمیٹی نے مناسب تجویزیں پیش کیں صاحبزادہ صاحب نے ان تجویزوں پر عملدرآمد کرانے کی کوشش کی پرانا ٹھیکیدار علیحدہ کر کے دوسرا ٹھیکیدار مقرر کرایا۔ ایک سال کے قریب اس طرح کام ہوا۔ لیکن ان تجویزوں کو پوری طرح کامیاب بنانے کے لئے پرو وائس چانسلر کی مدد کی ضرورت تھی یہ مدد صاحبزادہ صاحب کو نہ ملی اور حالات پھر بدستور سابق ہوگئے۔ پرانا نکالا ہوا ٹھیکیدار بھی پھر واپس بلالیا گیا۔ بڑا سبب اصلاح کے راستہ میں یہ حائل تھا کہ جو ٹھیکیدار ڈائننگ ہال کا سامان خوراک مہیا کرتا تھا وہی ٹھیکیدار ڈائننگ ہال کے مہتموں اور نگران کار لوگوں کی خوراک کا سامان بھی مہیا کرتا تھا۔ ایک اور خرابی تھی کہ یونیورسٹی کے بعض ملازم بھی مختلف بورڈنگ ہاؤس اور ڈائننگ ہال کی بعض اشیاء فراہمی کے ٹھیکیدار تھے۔

ورزشیں اور کھیل

صاحبزادہ صاحب کو جس طرح طلباء کی اخلاقی اور ذہنی ترقی کی فکر تھی اسی طرح ان کی جسمانی صحت سے بھی وہ غافل نہ تھے انھوں نے اپنی وائس چانسلری کے زمانہ میں اسکاؤٹنگ اور ڈرل جاری کیں رائڈنگ اسکول کی حالت درست کی پہلے رائڈنگ

اسکول میں صرف چار گھوڑے تھے لیکن صاحبزادہ صاحب کی کوشش سے دس گھوڑے اور اضافہ ہوکر چودہ گھوڑے ہو گئے اسکے سوا صاحبزادہ صاحب نے بانک اور بنوٹ کے قدیم فنون جاری کئے اور ان کے واسطے ایک استاد مقرر کیا اور یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستانی ورزشوں کو علیگڈھ میں رواج دیا دوسرے کھیل مثلاً ہاکی کرکٹ۔ فٹ بال ٹینس وغیرہ کو بھی ترقی دئے جانے کے واسطے خاص انتظامات کئے گئے۔

صاحبزادہ صاحب کے وائس چانسلری میں تقسیم اسناد (Convocation)

صاحب زادہ صاحب کے وائس چانسلر منتخب ہونے سے پہلے یونیورسٹی کے امتحانات میں جو طلبا رکامیاب ہو چکے تھے حسب معمول ان کو اسناد تقسیم کئے جانے کا جلسہ ۲۶ فروری سنہ ۱۹۲۴ء کو منعقد ہوا۔ بہت سے ممبران کورٹ اور دیگر معزز مسلمان جن کو یونیورسٹی سے ہمدردی تھی جمع ہوئے تھے صاحبزادہ صاحب نے اس موقع پر جو تقریر کی اس میں یونیورسٹی کی اس گری ہوئی حالت کو جو اسوقت تک پیدا ہو چکی تھی صفائی کے ساتھ پیش کیا۔ ہم اس کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں جس سے ناظرین کو یہ ظاہر ہوگا کہ انھوں نے نہایت دیانت داری کے ساتھ یونیورسٹی کی اصلی تصویر پیش کر دی تھی یہ نہیں کیا تھا کہ ایک بدصورت ڈھانچے کو خوشنما لباس پہنا کر عام مسلمانوں سے اصلی حالت کو پوشیدہ رکھتے وہ یونیورسٹی کا چارج لینے سے پہلے اس کی اصلاح کا عزم کر چکے تھے۔ جس کا پتہ نہ صرف ان کی اس تقریر سے چلتا ہے بلکہ قدم قدم پر ان کا طریقہ کار اسکی شہادت دیتا ہے آپ نے اس تقریر میں فرمایا "میں چاہتا ہوں کہ کامیاب طلبہ کو جن کو آج میں نے ڈگریاں دی ہیں قوم ان ڈگریوں کے اصلی معنوں کو اور ان کی اہمیت

کو سمجھے بظاہر یہ ڈگریاں ایک کاغذ کا پرزہ ہیں جن پر کچھ حروف چھپے ہوئے ہیں لیکن یہی کاغذ کے پرزے کس طرح قیمتی ہو جاتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ان ڈگریوں کی اصلی قیمت اس اخلاق اور تہذیب پر منحصر ہے جس کی یہ اسناد تصدیق کرتی ہیں اور اس تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہیں جو اس یونیورسٹی میں دیجاتی ہے ان ڈگریوں کی موجودگی اس بات کی ضمانت ہونی چاہئے کہ ان کے حاصل کرنے والوں میں وہ اخلاقی اور ذہنی قابلیت موجود ہے جس کے لئے یہ درسگاہ مشہور ہے۔ اس لئے ان ڈگریوں کو جو چیز بیش قیمت بناتی ہے وہ اس یونیورسٹی کے ڈگری یافتوں کی اخلاقی اور ذہنی قابلیت ہے۔ یہ واقعہ اس مثال سے ظاہر و واضح ہو جاتا ہے۔

جنگ عظیم سے پہلے جرمنی میں مارک[1] کی قیمت بیس[2] شلنگ تھی لیکن جنگ کے بعد کیا قیمت رہ گئی حالانکہ جرمن مارک کی چھپائی اور کاغذ وہی تھا جو جنگ عظیم سے پہلے تھا۔ جنگ سے پہلے وہ لاکھوں کی قیمت کا تھا۔ مگر جنگ کے بعد وہ اس کاغذ کی قیمت کا بھی نہ رہا جس پر وہ چھاپا گیا تھا۔ اس کا کیا سبب تھا۔ وجہ ظاہر ہے یعنی جنگ سے پہلے جرمن قوم میں طاقت و دولت تھی۔ وہ نیک نام تھی اسکی ساکھ تھی جس نے کاغذ کے مارک کو ایک خاص قیمت کا بنا دیا تھا۔ لیکن شکست ہونے پر جرمن کی ساکھ نہ رہی اور نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کے مارک کی قیمت کاغذ بھی جاتی رہی یہ ہی حال ہماری ڈگریوں کا ہے ڈگری پانے والوں کی اخلاقی ذہنی اور جسمانی قابلیت اُس کاغذ پر منحصر نہیں ہے جس پر ڈگری چھاپی گئی ہے کیونکہ وہ کاغذ تو کاغذ ہی ہے اصل معیار قابلیت ہے اور جس کے بغیر کسی ڈگری کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہو سکتی۔

کامیاب طلبہ کو جاننا چاہئے۔ کہ تم عملی زندگی میں جب قدم رکھو گے اس وقت تمہیں سخت نکتہ چینیوں سے واسطہ پڑے گا۔ اور تمہاری ڈگریوں کی قیمت کی

[1] مارک جرمنی کے ایک سکہ کا نام ہے۔

جانچ تمہارے اس اخلاقی اور ذہنی اثاثہ سے ہوگی جو تمہاری طرف سے بازار عالم میں پیش کیا جائیگا اس لئے ان ڈگریوں کی ساکھ اور اس یونیورسٹی کی نیکنامی کلیتاً تمہارے اخلاق اور تہذیب پر منحصر ہے۔

سرسید ڈے کی تقریب سے اراکین یونیورسٹی کی عدم دلچسپی کا صاحبزادہ صاحب پر اثر۔

صاحبزادہ صاحب کو وائس چانسلری کا جائزہ لئے ہوئے ابھی پورے تین ماہ نہ گذرے تھے کہ مارچ ۱۹۲۴ء میں بانی کالج کی وفات کا دن آگیا اور چونکہ یہ یونیورسٹی کی ایک اہم تقریب ہے یونیورسٹی کالج اور اسکول میں عام تعطیل ہوگئی۔ صاحبزادہ صاحب نے اس تقریب کا ایک مختصر پروگرام بنا کر ایک نوٹس گشت کرایا جس میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ سات بجے صبح سے مسجد میں قرآن خوانی ہوگی اور فاتحہ کے بعد اسٹریچی ہال میں جلسہ ہوگا جس میں سرسید مرحوم کی زندگی کے حالات پر تقریریں ہوں گی اس نوٹس کے مطابق خود صاحبزادہ صاحب سات بجے سے کچھ پہلے مسجد میں پہونچ گئے۔ مسجد میں جاکر انھوں نے جو منظر دیکھا وہ نہایت مایوس کن تھا جس سے اسٹاف اور کالج کے طلبار کی عدم دلچسپی کا پتہ چلتا تھا صاحبزادہ صاحب نے اس منظر سے متاثر ہوکر ڈاکٹر ضیار الدین احمد صاحب پرو وائس چانسلر کو ایک خط بھیجا اس میں لکھا تھا کہ آپ کو معلوم ہے سرسید ڈے یونیورسٹی میں نہایت اہم تقریب ہے اور اسی لئے اس روز یونیورسٹی کالج اور اسکولوں میں چھٹی دیجاتی ہے کہ قرآن خوانی اور بانی مرحوم کی زندگی کے حالات بیان کرنے کے لئے جلسہ ہو اور اسٹاف کے اراکین اور طلبہ شریک ہوسکیں۔

کل نوٹس دیا جاچکا تھا۔ کہ سات بجے صبح سے مسجد میں قرآن خوانی ہوگی اور فاتحہ کے بعد اسٹریچی ہال میں جلسہ ہوگا۔ میں مسجد میں سات بجے سے کچھ پہلے پہونچ

گیا تھا۔ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے تک قرآن خوانی اور فاتحہ ہوئی آپ کو معلوم ہے کہ سرسیّد کورٹ اور سیّد محمود کورٹ جو مسجد سے بالکل قریب ہیں ان کے ٹیوٹر صاحبان میں سے صرف مسٹر بشیر علی اور حافظ عثمان صاحب تشریف لائے سرسید کورٹ میں پیرزادہ عبدالرشید اور قاضی جلال الدین صاحب دونوں میں سے ایک صاحب بھی تشریف نہیں لائے طلبہ جو سرسیّد کورٹ اور سید محمود کورٹ میں تین سو یا چار سو کے قریب رہتے ہیں اور کل یونیورسٹی میں مسلمان طلبا کی تعداد سات سو کے قریب ہے ان میں سے صرف ایک درجن کے قریب موجود تھے اگر اسکول کے طلبا نہ آجاتے تو فاتحہ خوانی کی تقریب کی جو حالت ہوئی وہ ظاہر ہے۔

آپ کے یونیورسٹی اسٹاف میں قرآن خوانی اور فاتحہ خوانی میں مسٹر خلیل احمد صاحب مراد مسٹر عبدالعزیز صاحب اور آخر میں فیروز الدین مراد تھے۔ مسٹر قریشی اور مسٹر زیدی بھی تھے یونیورسٹی اسٹاف میں سے کوئی اور نہ تھا۔ فاتحہ کے بعد اسٹریچی ہال میں اسٹاف کے جو جو اصحاب تھے اور جس قدر طلبار تھے آپ کو معلوم ہے یونیورسٹی کے طلبار مشکل سے چالیس ہوں گے حالانکہ سرسیّد کورٹ اور سید محمود کورٹ میں چار سو کے قریب طلبار رہتے ہیں۔ یہ وہ حالت ہے جو خاص توجہ کے قابل ہے براۓ مہربانی آپ مجھ کو مطلع کریں کہ سرسیّد ڈے کی اس طرح توہین کیوں گئی اور جبکہ تعطیل اس غرض سے کی گئی تھی تو مسلمان ممبران اسٹاف قرآن خوانی میں کیوں شریک نہ ہوئے اور باقی تمام ممبران اسٹاف اسٹریچی ہال کے جلسہ میں کیوں شریک نہیں ہوئے میں نے عظمت الٰہی صاحب سے کہہ دیا تھا کہ اسٹریچی ہال میں جو ممبران اسٹاف موجود تھے ان کے نام وہ لکھ لیں۔

اس لئے مہربانی فرماکر آپ جلد اس معاملہ میں توجہ فرمائیں اگر سرسیّد ڈے اس قابل نہیں ہے کہ اس میں ممبران اسٹاف اور طلبہ حصّہ لیں تو پھر اس معاملہ

پر غور ہونا چاہیئے کہ آیا سر سید ڈے کو یونیورسٹی کی مقررہ تقاریب میں رکھا جائے اور اس کی تعطیل ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ یونیورسٹی کی تقاریب میں شامل رہ کر اور اس کی تعطیل کر کے سر سید ڈے کی اس طرح توہین کرنا جیسا کہ آج ممبران اسٹاف میں سے اکثر نے اور تقریباً طلبہ میں سے تمام نے کی ظاہر ہے کہ مناسب نہیں ہے میں اس معاملہ کو نہایت اہم سمجھتا ہوں مہربانی فرما کر آپ ان ٹیوٹر صاحبان سے اور ان ممبران اسٹاف سے جو قرآن خوانی میں شریک نہیں ہوئے اور ان ممبران اسٹاف سے جو اسٹریچی ہال کے جلسہ میں نہیں شریک ہوئے جواب طلب کریں کہ وہ کیوں شریک نہیں ہوئے اور جو جواب وہ دیں اس سے مجھ کو اطلاع دیجئے دستخط آفتاب احمد خاں۔ ۲۴ مارچ ۱۹۲۴ء اس خط کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحبزادہ نے سر سید کی برسی کی تقریب سے اراکین یونیورسٹی کی عدم دلچسپی کو بدرجہ غایت محسوس کیا۔ اور اس معاملہ کو اس لئے نہایت اہم سمجھا کہ وہ بانی کالج کی سالانہ فاتحہ اور ان کی یاد تازہ رکھنے کے دن کو ضروری سمجھتے تھے تاکہ طلبا اور اسٹاف میں ان کے حالات پر تقریروں کے ذریعہ سے قومی روح پیدا ہو اور احساس فرض کا مادہ قائم رہے جو حالات اس موقع پر پیش آئے ان سے متاثر ہو کر جو خط متذکرہ صدر صاحبزادہ صاحب نے لکھا تھا وہ یونیورسٹی کی اصلاح کے واسطے نہایت اہم ہے اور اگر ایسا نہ کرتے تو یقیناً اپنے فرض کے ادا کرنے میں قاصر رہتے اس واقعہ کے بعد صاحبزادہ صاحب کے زمانے میں یہ تو تقریب بہتر طریقہ سے منائی گئی ہے اور ان کے بعد بھی کئی سال تک اس پر عملدرآمد ہوتا رہا پھر رفتہ رفتہ پہلے کی سی سہل انکاری اور بے توجہی ہونے لگی۔ افسوس ....

ولایت کے زمانہ قیام میں یونیورسٹی کی یاد	کم و بیش چار ماہ تک واپس

چانسلری کا کام کرنے کے بعد صاحبزادہ صاحب انڈیا کونسل کی بقیہ میعاد پوری کرنے کے لئے ۲۶ر اپریل ۱۹۲۴ء کو لندن کو روانہ ہو گئے مگر وہاں بھی وہ یونیورسٹی کی یاد سے غافل نہ رہے ان کی غیر حاضری میں نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب کو ایگزیکیوٹو کونسل نے قائمقام وائس چانسلر مقرر کیا تھا۔ یونیورسٹی کی اصلاح کے جو کام صاحبزادہ صاحب نے ولایت جانے کے وقت تک شروع کئے تھے ان پر کارروائی جاری رکھنے کے واسطے ایک مختصر نوٹ نواب صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) ریگولیشن (Regulation) کے تیار کرنے کی ضرورت ہے ان کے ذریعہ سے تمامی کام صحیح طریقہ پر کئے جائیں۔

(۲) اسلامک اسٹڈیز (Islamic studies)(اسلامی تعلیمات) کا نصاب (Syllabus) تیار ہو تاکہ سال آیندہ سے تعلیم شروع ہو جائے۔

(۳) یونیورسٹی اور کالج کے ممبران اسٹاف کچھ ریسرچ یعنی تحقیقات علمی کا کام کریں تاکہ یونیورسٹی میں علمی فضا پیدا ہو اور اہم علمی مضامین پر لکچر دلوائے جائیں۔

(۴) ماہران تعلیم اور مشاہیر باہر سے بلائے جائیں تاکہ تعلیمی مضامین پر تقریریں کریں۔

(۵) یونیورسٹی اسکول پر خاص توجہ کیجائے (جس کے متعلق ضروری انتظام کی ہدایتیں صاحبزادہ صاحب جاری کر چکے تھے)

(۶) اسکول میں بوائے اسکاؤٹنگ (Boy S-couting) کا اجرا۔

(۷) انگلش ہاؤس کی موجودہ حالت پر توجہ (جو نہایت غیر قابل اطمینان حالت میں تھا۔

(۸) ٹریننگ کالج پر توجہ۔

(۹) حدود یونیورسٹی کے اندر حفظان صحت کا انتظام ہو

(۱۰) ملٹو سرکل کے پانی کا نکاس

(۱۱) فزکس کی تعلیم کے لئے کافی روپیہ کا انتظام۔

ہزاروں میل کے فاصلہ پر بیٹھے ہوئے بھی صاحبزادہ صاحب نواب صاحب کو خطوط کے ذریعہ سے یونیورسٹی کے متعلق ضروری امور کی طرف متوجہ کرتے رہے اور یونیورسٹی کے لئے بہترین پروفیسروں کے انتخاب میں بھی اپنا وقت صرف کیا۔ صاحبزادہ صاحب یونیورسٹی کے متعلق سب سے زیادہ اہم فکر جو اپنے ساتھ لے گئے وہ اسلامک اسٹڈیز کا مسئلہ تھا۔ جس کا ذکر انھوں نے مذکورہ بالا یادداشت میں کیا ہے اس مسئلہ میں انھوں نے ولایت میں انگریزی و جرمن مستشرقین سے مل کر تبادلہ خیال کیا۔

آخر مئی ۱۹۲۴ء میں ہز ہائی نس آغا خاں سے ملاقات کی اس ملاقات کا تفصیلی حال انھوں نے اپنے ایک دوست کو ایک خط میں لکھا تھا اس خط کے مندرجہ ذیل اقتباس کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انڈیا کونسل کے ذمہ دارانہ کام کی مصروفیت اور انہماک کے باوجود جس کا اندازہ ناظرین کو ماقبل صفحات کے مطالعہ سے ہوا ہوگا وہ اپنی محبوب یونیورسٹی کی یاد سے غافل نہ تھے اور ان کی حالت اس شعر کی مصداق تھی ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

وہ اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ

پچھلے ہفتہ میں میں ہز ہائی نس آغا خاں سے ملا بہت دیر تک گفتگو رہی

خلافت اور یونیورسٹی کے متعلق زیادہ باتیں رہیں۔ میں نے ان سے تین درخواستیں کیں۔

(۱) جب وہ آئندہ ہندوستان آئیں تو وہ علیگڈھ آئیں اور یونیورسٹی کے سرمایہ کی فراہمی میں مدد دیں۔

(۲) جو سالانہ عطیہ وہ دیتے تھے اس کو جاری کر دیں۔

(۳) لندن میں اولڈ بوائز اور سرپرستان یونیورسٹی کا جلسہ اور لنچ ہو۔ جس میں یہاں کی یونیورسٹی کالجوں وغیرہ کے پرنسپل اور پروفیسروں کو مدعو کیا جائے اس میں ہز ہائی نس شریک ہوں۔

مہربانی فرماکر انھوں نے تینوں باتیں منظور کیں اول کی نسبت انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ علیگڈھ آئیں گے مجھسے انھوں نے خواہش کی ہے کہ میں ایک مختصر نوٹ لکھکر ان کو دوں جس میں اسکی صراحت ہو کہ یونیورسٹی کو فی الحال اور ایک مدت تک کس قدر سرمایہ کی ضرورت ہے تاکہ ایک مرتبہ کوشش کرکے اس کو پورا کر دیا جائے اور پھر بار بار یونیورسٹی کے لئے مانگنے کی ضرورت نہ ہو میں انکے لئے نوٹ تیار کر رہا ہوں۔

نمبر۲۔ اپنے عطیہ کے متعلق انھوں نے وجوہ بیان کیے جن کی بنا پر انھوں نے بند کر لیا تھا۔ اس سال سے دینے کا تحریری وعدہ فرما لیا ہے لیکن گذشتہ زمانہ کی بابت انھوں نے کہا کہ چونکہ وہ اور کاموں میں خرچ کر چکے ہیں اس لئے پچھلی رقم نہیں دے سکتے میں نے اسکی بابت اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا وہ اسی سال سے شروع ہو جائے تو بہتر ہے۔

(۳) لنچ میں بھی شرکت کا وعدہ فرمایا اور ۲۵ر جون ۱۹۲۴ء اس کے لئے مقرر کی ہے۔ اس کے اہتمام میں مصروف ہوں انشاء اللہ اس مرتبہ یہ جلسہ

پورے پیمانہ پر کیا جائے گا تاکہ یہاں کی تعلیم گاہوں کے اراکین ہماری یونیورسٹی اور علیگڈھ تحریک سے کچھ واقف ہوجائیں۔

صاحبزادہ صاحب کی طبیعت کا جو اقتضا تھا اُس پر تو ان کے اس خط کے لفظ لفظ میں موجود ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کوشش نے کس حد تک عملی صورت اختیار کی اس کوشش کو عملی جامہ پہنانے سے جہاں تک ان کی ذات کا تعلق تھا۔ اس میں کوتاہی نہیں ہوئی مد اوّل کے متعلق یونیورسٹی کی مالی حالت پر میں نے ایک نوٹ لکھ کر ہز ہائی نس کو دیدیا تھا لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا ہز ہائی نس کو اس وقت اپنے دیگر مشاغل کی وجہ سے اس طرف توجہ کرنے کی مہلت نہ ملی مد دوئم کے متعلق وہ بھی اپنی زندگی میں ہز ہائی نس کے ایفار وعدہ کی مسرت حاصل نہ کر سکے۔

صاحبزادہ صاحب کے انتقال کے بعد ہز ہائی نس دو بار علی گڈھ تشریف لائے اور ہر مرتبہ یونیورسٹی کی ناقابل اطمینان مالی حالت کی طرف ان کی توجہ مائل کی گئی لیکن نتیجہ بجز مایوسی اور کچھ حاصل نہ ہوا اور نہ ہز ہائی نس کا سالانہ عطیہ کبھی یونیورسٹی کو موصول ہوا۔

مد سوئم۔ یعنی اولڈ بوائز و سرپرستان یونیورسٹی کا شاندار لنچ جو صاحبزادہ صاحب کے اہتمام سے رائٹ آنریبل مسٹر امیر علی کی صدارت میں اُسی تاریخ ۲۵ر جون ۱۹۲۴ء جو ہز ہائی نس سر آغا خاں نے مقرر کردی تھی لندن کے مشہور سوائے ہوٹل منعقد ہوا۔ اس میں ہندوستان کے معززین اور تعلیمی طبقہ کے بڑے مشہور لوگ شریک تھے لارڈ مسٹن نے ایک دلچسپ تقریر کے ساتھ یونیورسٹی کا جام صحت تجویز کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ اپنے ذاتی مشاہدہ سے سرسید احمد خاں کی اس تعلیمی تحریک سے چالیس برس سے

واقف ہیں۔ صاحبزادہ صاحب نے جوابی تقریر کی لارڈ اولیور (Lord Oliver) سکریٹری آف اسٹیٹ کے مہمانوں کی طرف سے جواب دیا اور کہا کہ وہ اپنے عزیز مسٹر ہیرلڈ کاکس کے ذریعہ سے جو علیگڈھ میں پروفیسر رہ چکے ہیں عرصہ سے اس یونیورسٹی سے بہت کچھ واقف ہیں اور وہ یہہ جانتے ہیں کہ علیگڈھ نے ہندوستان کی قومیت کو متحد کرنے میں بہت کچھ حصہ لیا ہے اور فرقہ وارانہ خیالات سے بالاتر ہو کر ان علوم کو جو انسانی نسل سے اب تک بلالحاظ قوم و مذہب پہونچانے کا ذمہ لیا ہے اس جلسہ میں ہز ہائی نس سر آغاخاں کی علالت کی وجہ سے شریک نہ ہونے کا صاحبزادہ کو دلی افسوس ہوا لیکن اس بات سے خوشی ہوئی کہ یونیورسٹی کی یہ تقریب جو کئی سال سے بند ہو گئی تھی اس کی تجدید ہوئی جس کے ذریعہ سے اولڈ بوائز دیگر مسلمانان مقیم لندن کو یونیورسٹی کی یاد تازہ ہو گئی۔

ولایت سے واپسی کے بعد

اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ

انڈیا کونسل کی ممبری کی میعاد ۳۱ راگست سنہ ۱۹۲۴ء کو ختم کر کے ستمبر سنہ ۱۹۲۴ء میں صاحبزادہ صاحب علی گڈھ واپس آئے اور وائس چانسلری کا کام شروع کیا سب سے پہلے اسلامک اسٹڈیز کا معاملہ ان کے سامنے آیا۔ چونکہ اس کے متعلق صاحب زادہ صاحب نے انگریزی اور جرمنی مستشرقین مثلاً ڈاکٹر کرنبکو ڈاکٹر ارنلڈ اور ڈاکٹر راس سے مل کر مشورے حاصل کئے تھے اور ان کی تحریری رائیں اپنے ساتھ لائے تھے اب علیگڈھ آکر یہ رائیں مراسلت کے ذریعہ سے ڈاکٹر سر محمد اقبال مولوی محمد شفیع اور مسٹر خدابخش وغیرہ کو

روانہ کیں ان کے جواب میں نہایت مفید رائیں موصول ہوئیں ان کو صاحبزادہ صاحب نے علمار کی کمیٹی کے سامنے پیش کیا۔ یہ کمیٹی صاحبزادہ صاحب کی درخواست پر نواب صدر یار جنگ بہادر (جنکا تعلق ابتدار سے صیغہ دینیات سے رہا ہے) نے طلب فرمائی تھی اس کمیٹی نے بہت سی تجویزیں اضافہ کیں جو یونیورسٹی کے قانون کے مطابق اکیڈمک کاونسل کے سامنے پیش کی گئیں اکیڈمک کونسل نے اس کے متعلق شعبۂ اسلامک اسٹڈیز سے استصواب کیا۔ گویا کہ ایک طویل کوشش کے بعد صاحبزادہ صاحب نے اس شعبہ اسلامک اسٹڈیز کو وجود میں لانے کے لئے اس منزل تک کامیابی حاصل کی اس معاملہ میں ان کے سامنے جو ناگوار اور عجیب صورت حال ظاہر ہوئی تھی اس کا ذکر اس سے پہلے صفحات میں کیا جاچکا ہے اب ولایت سے واپس آکر ان کو معلوم ہوا کہ ان کے ۱۵ر اپریل ۱۹۲۴ء والے نوٹ پر جو انھوں نے ولایت جانے سے قبل کمیٹی میں دیا تھا مولانا سید سلیمان اشرف صاحب سے جواب مانگا گیا تھا اور اسلامک اسٹڈیز کے لضاب کی بابت دریافت حال کیا گیا تھا۔ انھوں نے اس کے جواب میں اپنی صفائی میں ایک رسالہ "السبیل" کئی جزو کا لکھا جو یونیورسٹی کے صرفہ سے چھپا اور شائع ہوا صاحب زادہ صاحب نے یہ رسالہ دیکھا اس کو دیکھکر انھیں افسوس ہوا کیونکہ وہ غیر متعلق باتوں سے بھرا ہوا تھا۔ یا زیادہ سے زیادہ مولانا صاحب نے اپنے اوپر سے الزام ہٹانے کی کوشش کی تھی صاحب زادہ صاحب نے تبصرہ کے طور پر اس رسالہ کی باتوں کا جواب لکھا اور خط کی صورت میں اسکو نواب سر مزمل اللہ خاں صاحب کے پاس بھیجدیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ خط نہ شائع ہوا نہ کمیٹی کے سامنے پیش ہوا۔ اس لئے اسکا کوئی اقتباس اس موقع پر درج

نہ ہوا۔ صاحبزادہ صاحب نے ایک مشہور پمفلٹ میں جو وائس چانسلری کا چارج چھوڑنے سے قبل ۲۸ دسمبر ۱۹۲۶ء کو یونیورسٹی کے حالات کی اصلاح کی غرض سے ممبران کورٹ کی خدمت میں بھیجا گیا تھا اس معاملہ پر مفصل روشنی ڈالی ہے لیکن اس میں بھی اس خط کی نقل نہیں دی گئی ہے بلکہ یہ لکھا ہے کہ اس قسم کے اختلافات کی اشاعت سے ہمیشہ یونیورسٹی کو نقصان پہونچا ہے اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں اس کو شائع نہ کروں گا صاحبزادہ صاحب نے اس رسالہ السبیل کے متعلق اپنے پمفلٹ مذکور بالا میں جس قدر تذکرہ کیا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ رسالہ ان کے خلاف ایک کھلا ہوا اعلان جنگ تھا۔ اس قسم کی کارروائیوں کا اثر اسٹاف اور طلبا کے ڈسپلن پر پڑنا قدرتی امر تھا جس میں وائس چانسلر کے اقتدار کا زوال مضمر تھا۔ چونکہ قانوناً اسلامک اسٹڈیز اور دیگر درس و تدریس کی اصلاح کا تعلق پرو وائس چانسلر اور اکیڈیمک کونسل سے تھا۔ صاحبزادہ صاحب کا کام صرف مشورہ دینا تھا۔ لیکن رسالہ السبیل کی اشاعت کے بعد سے ان کو یقین ہو گیا تھا کہ جو صورت حالات اس وقت پیدا ہو گئی تھی اس کے لحاظ سے ان کے لئے بہتر ہے کہ وہ یونیورسٹی کی تعلیمی زندگی کی اصلاح کی جو تجاویز اور مشورے اُن کے پیش نظر تھے ان کو ملتوی رکھیں اور انھیں وجوہ سے علما کی کمیٹی کی تجاویز کو جن کا ذکر اسکے پہلے کیا جا چکا ہے اکیڈیمک کونسل کے پاس بھیجکر اسلامک اسٹڈیز کے معاملہ کو کونسل مذکور کی رائے پر چھوڑ دیا۔ اور بقیہ مدت وائس چانسلری میں درس و تدریس کے شعبہ جات کی جو اصلاح کا جوش تھا وہ سرد پڑ گیا۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اُس زمانہ میں وائس چانسلر کا کوئی اثر اکیڈمک کونسل پر نہ تھا کیونکہ اس کے چیرمین پرو وائس چیرمین تھے اور ممبران اسٹاف کی بہت

بڑی اکثریت اس کونسل میں تھی۔

انٹرمیڈیٹ کالج

چونکہ قواعد کی رو سے اگزیکیٹو کونسل انٹرمیڈیٹ کالج کی منتظم جماعت تھی اس لئے اس کالج کے انتظامی معاملات میں وائس چانسلر کو کچھ اختیارات حاصل تھے یہی وجہ تھی کہ صاحبزادہ صاحب کو اس کالج کے اکثر معاملات میں کچھ اصلاح کا موقع ملا سب سے پہلی ضرورت یہ تھی کہ پرنسپل کا تقرر ہو۔ چنانچہ عبدالمجید قریشی ایم۔ اے کی خدمات اس عہدہ کے لئے حاصل کی گئیں۔ قریشی صاحب کی پرنسپلی کے زمانہ میں طلبار کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔ لیکن صاحبزادہ صاحب نے اس اضافہ تعداد کو اس وقت تک قابل اطمینان خیال نہ کیا جب تک کہ طلبار کی اس زیادتی کی مناسبت سے پورا۔ اسٹاف بھی مہیا نہ ہو گیا۔ یہ تناسب اس طرح پورا کیا گیا کہ آٹھ استادوں کا اضافہ کر کے اٹھائیس سے چھتیس کر دیئے گئے اور طلبا کا اوسط فی استاد انتیس ہو گیا اسی طرح عمارت میں اضافہ ہوا کالج کے کتب خانہ کو بہت ترقی دی گئی اس کے علاوہ کئی انجمنیں قائم ہوئیں مثلاً منطق کی انجمن شکسپیر سوسائٹی۔ تاریخ کی انجمن۔ دینیات کی انجمن فارسی کی سوسائٹی وغیرہ وغیرہ اس قسم کے انتظامات و ترقیات میں جنکا اوپر ذکر ہوا صاحبزادہ صاحب کا کچھ نہ کچھ اقتدار اور اختیار اس لئے تھا کہ اگزیکیوٹو کونسل کے وہ صدر تھے لیکن درس و تدریس کے علمی شعبہ پر اس کالج میں بھی پرو وائس چانسلر کا اقتدار تھا جو انٹرمیڈیٹ اگزامینیشن بورڈ کے افسر ہونے کی وجہ سے خاص اختیارات رکھتے تھے پس اس شعبہ میں کوئی قابل ذکر اصلاح نافذ کرنے کا ان کو موقع نہ ملا اور انھوں نے طلبا کے داخلہ کی اصلاح کی کوشش کی اور اس کے متعلق پرنسپل کالج کو مشورہ دیا لیکن

پرو وائس چانسلر نے ان کی ہدایات نظر انداز کیں اور واقعہ یہ تھا کہ طلبار کے داخلہ کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ سال بھر تک برابر نئے آنے والے لڑکوں کے داخلے ہوتے رہتے تھے جس سے تعلیم میں ابتری پیدا ہوتی تھی اور یہ عمل سررشتۂ تعلیم کے قواعد کے خلاف بھی تھا۔ انھوں نے اس نقص کی اصلاح کرنی چاہی مگر پرو وائس چانسلر صاحب کا طرز عمل اس میں مانع رہا جس کا پتہ اس مراسلت سے چلتا ہے جو پرنسپل صاحب انٹر کالج اور پرو وائس چانسلر سے ۱۹۲۴ء ہوئی تھی۔

یونیورسٹی اسکول

جب صاحبزادہ صاحب نے وائس چانسلر کا کام شروع کیا اس وقت یونیورسٹی اور اس کے ہوسٹل نہایت افسوس ناک حالت میں تھے پہلی بات تو یہ تھی کہ اسکول کا اپنا ہیڈ ماسٹر ہی ندارد تھا ٹریننگ کالج کے پرنسپل اس کام کو بھی کرتے تھے سامان نہایت ردی تھا چند پھٹے ہوئے نقشے تھے کرہ ارض ایک بھی موجود نہ تھا فرنیچر نہایت مبتذل حالت میں تھا استادوں کے لئے چند شکستہ میزیں تھیں بورڈنگ ہاؤس کا بھی یہی حال تھا۔ طہورحسین وارڈ میں جہاں چھوٹے بچے رکھے جاتے ہیں غسل کا سامان تک نہ تھا۔ اسی بورڈنگ ہاؤس کے کھانے کے کمرے میں چالیس طلبار میں صرف دس پیالے تھے انگلش ہاؤس کی ابتری کی تو کوئی حد ہی نہ تھی۔ یونیورسٹی سے دو سو روپیہ ماہوار دیئے جانے پر بھی وہ ایک بھاری قرضہ سے دبا ہوا تھا۔

سب سے پہلے تو صاحبزادہ صاحب نے پورے وقت کے لئے مسٹر بشیر حسین زیدی کو ہیڈ ماسٹر مقرر کرنے میں بڑی دشواری سے کامیابی حاصل کی اسکے بعد یونیورسٹی سے تین ہزار روپیہ کی امداد منظور کرائی جس سے طلبار اور استادوں کے لئے نیا فرنیچر مہیا ہوگیا۔ یونیورسٹی نے اسکے علاوہ جغرافیہ اور

سائنس کے سامان کو پورا کرنے کے لئے بھی مالی امداد دی اسکول کی نئی عمارت تعمیر کرائی جو مدتوں سے تعویق میں پڑی تھی اسکول کے لیے سر جیمس لاٹوش لفٹننٹ گورنر صوبہ متحدہ (۱۹۰۲ء) کے زمانہ میں گورنمنٹ سے بیس ہزار اور ریاست نانپارہ (اودھ) سے تیس ہزار روپیہ کی امداد حاصل ہو چکی تھی۔ اور ایک وسیع قطعہ آراضی موسوم بہ کیڈل باغ عطا کر دیا تھا اور سر ہار کورٹ بٹلر نے اپنے زمانہ لفٹننٹ گورنری میں گورنمنٹ کی امدادی رقم میں معقول اضافہ کر دیا تھا لیکن اس وقت تک اسکول کی کوئی عمارت تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ صاحبزادہ صاحب نے ۱۹۲۴ء کے آخر میں اس کام کو شروع کیا اور ۱۹۲۵ء میں اسکی تکمیل ہو گئی اور اسکول اس خوشنما اور شاندار عمارت میں منتقل ہو گیا طلبار کی تعداد بھی دوچند ہو گئی مانٹیسوری تعلیم کی کلاس بھی کھول دی گئی مدرسہ لائبریری ظہور حسین وارڈ اور دوسرے دارالاقامون کی حالت بھی درست ہو گئی سید بشیر حسین زیدی ہیڈ ماسٹر کی کوششیں اسکول کے اس ترقی میں نمایاں رہیں۔

مذہبی زندگی

مسلم یونیورسٹی کے مذہبی رنگ کا کچھ اندازہ تو ناظرین کو اسی وقت ہو چکا ہے جبکہ صاحبزادہ صاحب نے وائس چانسلری کا چارج لیا اور یونیورسٹی کی بڑی مسجد اور منٹو سرکل میں فجر کو نماز میں شریک ہوئے تھے یا سر سید ڈے کے حالات میں جو کچھ نظر آیا۔ لیکن بعد کو صاحبزادہ صاحب کی کوشش سے مذہبی معاملات میں جو ہوا اسکی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے۔

مسجد کا مکتب خانہ

مسجد سے متعلق مکتب خانہ جہاں طلبار کو فن تجوید کی تعلیم دیجاتی تھی نہایت بے توجہی کی حالت میں تھا۔

اس میں موذن سویا کرتے تھے اور اس کے بغلی کمرے سے موذن اور ناظم صاحب دینیات کے باورچیخانہ کا کام لیا جاتا تھا۔ یہ مکتب خانہ صاحبزادہ صاحب نے درست کرا کے آراستہ کرا دیا۔

(۲) پیش امام یونیورسٹی میں پہلے چھ پیش امام تھے جن میں شیعہ اور سُنّی ناظمانِ دینیات بھی شامل تھے صاحبزادہ صاحب نے علاوہ ان دو ناظموں کے تیرہ پیش امام کر دیئے۔ گویا چھ کی بجائے پندرہ پیش امام ہو گئے جو قریب قریب سب حافظ و قاری تھے۔

(۳) سامان میں اضافہ مسجدوں میں قرآن مجید کے بہت سے نسخے رکھوا دیئے تاکہ مصلّی تلاوت کیا کریں اور اپنی پسند کے نمونوں کی دری کی عمدہ نئی جانمازوں کی نہایت کافی تعداد میں صفیں بنوا دیں۔

(۴) عمارت کی توسیع مسجد کی شمالی جانب ناظم صاحب دینیات کا باورچیخانہ اور موذّن کے رہنے کے جدید کمروں کی تعمیر کا انتظام کیا۔

(۵) تعلیم تجوید فن تجوید سیکھنے والے طلبار کی صاحبزادہ نے اس طرح ہمّت افزائی کی کہ امتحانوں میں اپنی پوری توجہ کا اظہار کیا پہلے چھ وظیفے پانچ پانچ روپیہ ماہوار کے اور چار وظیفے تین تین روپیہ ماہوار کے ملا کرتے تھے لیکن انھوں نے بجائے ان دس وظیفوں کی مجموعی مقدار بیالیس روپیہ ماہوار سے اب ترقی کر کے اکیانوے روپیہ ماہوار کر دی۔

(۶) جدید ناظمان دینیات مولانا عبد اللہ انصاری اور شمس العلمار مولانا عباس حسین صاحب کی وفات پر ایسے عمدہ اور قابل ناظمان کے صحیح جانشینوں کا ملنا نہایت دشوار کام تھا لیکن صاحبزادہ صاحب کی جستجو اور کوشش سے دونوں کے جانشین میسّر

آگئے یعنی مولٰنا ابو بکر محمد شیث صاحب اور مجتہد العصر مولٰنا یوسف حسین صاحب کا تقرر عمل میں آیا۔ ان دونوں بزرگوں کی دینداری اور علم و فضل اور اسکے ساتھ روشن خیالی رواداری میں کوئی کلام نہیں۔

عملی مثال یونیورسٹی کی ہر ایک مذہبی قسم کی تقریب میں صاحبزادہ صاحب خود شریک ہوتے تھے بہت دفعہ وہ مسجد میں پانچوں وقت کی جماعت کی نمازوں میں شریک ہوئے اور جمعہ کی نمازوں میں شریک ہوتے رہے۔

لیکن باوجود اِن سب کوششوں کے ان کی رائے میں یونیورسٹی میں مذہبی حالت پورے طور پر قابل اطمینان نہ تھی جیسا کہ انھوں نے ۲۸ دسمبر ۱۹۲۶ء کے پمفلٹ میں جو کورٹ کے ممبران کے پاس بھیجا گیا تھا تحریر کیا ہے :۔

"میری ان کوششوں کا جو گزشتہ تین سال میں کی گئیں۔ اگرچہ کچھ نہ کچھ نتیجہ نکلا ہے لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ جب "تک ٹیوٹر اور استاد مسجدوں میں آکر جماعت کے ساتھ فریضہ نماز ادا نہ کریں طلبار کی مسجدوں میں باقاعدہ حاضری کی توقع رکھنا فضول ہے لیکن باوجود اس کے میں نے ایک قاعدہ بنا دیا ہے کہ ٹیوٹروں کا فرض ہے کہ وہ اس بات کی نگرانی رکھیں کہ طلبار التزام کے ساتھ نماز میں شریک ہوں۔ اور وہ ناظمان دینیات اور مانیٹروں کو نماز کی حاضری کا قاعدہ نافذ کرنے میں مدد دیں لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے یہ قاعدہ اس وقت تک کاغذ کی زینت بنا ہوا ہے بڑی وجہ یہ ہے کہ ٹیوٹر صاحبان براہ راست وائس چانسلر کے ماتحت نہیں ہیں۔ ان کی سفارش اور انتخاب پر وائس چانسلر صاحب کیا کرتے ہیں اور ٹیوٹر انھیں کے براہ راست نگرانی اور اختیار میں ہیں جب تک پرو وائس چانسلر صاحب ٹیوٹروں کے موثر طریقہ سے نگرانی نہ کریں نماز وغیرہ کے معاملہ میں کسی قسم

کی اصلاح یا ترقی نہیں ہوسکتی افسوس ہے کہ اس معاملہ میں پرو وائس چانسلر صاحب سے مجھے کچھ مدد نہ ملی نتیجہ یہ ہوا کہ جملہ انتظام متعلق نماز اور دیگر امور متعلق تربیت مذہبی حقیقت سے کوسوں دور ہیں اس کا اور بھی افسوس ہے کہ مذہبی شعبہ پر کافی روپیہ بھی صرف ہوتا ہے اور اس کی ظاہری نمود بھی موجود ہے لیکن فی الحقیقت عملی صورت کچھ نہیں۔ پس جب تک کہ اراکین اسٹاف اور ٹیوٹر صاحبان عملی طریقہ سے اس معاملہ میں دلچسپی نہ لیں گے کاغذ ہی پر اس کا وجود باقی رہے گا اور وہ صرف نمائش کی خاطر۔

صرف بڑی بڑی کتابیں پڑھانے اور دیندارانہ وعظوں سے مسلم یونیورسٹی کے طلبار میں حقیقی مذہبی زندگی پیدا نہیں ہوسکتی اگرچہ یہ باتیں بھی ضروری اور مفید ہیں لیکن جس بات کی ہمیں اشد ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اور حقیقی خداشناسی کی مثالیں ہمارے طلبار کے سامنے موجود ہوں بغیر اس کے ہماری کوشش بارآور نہیں ہوسکتی۔ عمل کے بغیر علم کبھی موثر نہیں ہوسکتا۔ پس ہمیں اپنی درسگاہ میں جس اصل چیز کی ضرورت ہے وہ عملی مثال ہے۔"

یونیورسٹی میں طلبۂ کی طبی امداد

صاحبزادہ صاحب نے وائس چانسلری کا چارج لینے کے ساتھ پہلے ہی دن مسلم یونیورسٹی کے شفاخانہ کا جو معائنہ کیا تھا اور جس حالت میں شفاخانہ اور ایک مریض طالبعلم شفاخانہ میں پایا تھا۔ اس کا حال ناظرین پڑھ چکے ہیں۔ اب وہ حالت پیش کی جاتی ہے جو صاحبزادہ صاحب کی وائس چانسلری کے زمانہ میں اس صیغہ کی تھی۔ اسی سلسلہ میں یہ امر روشنی میں آجائے گا کہ صاحبزادہ صاحب کو اس کی پوری اصلاح کرنے کا موقع کیوں نہ ملا۔

صاحبزادہ صاحب اکثر یونیورسٹی کا شفاخانہ خود جاکر دیکھتے تھے وہ مریضوں

کی آسائش تفریح اور نگہداشت کو اشد ضروری خیال کرتے تھے ان کا درد مند دل طلبا کے لئے اس واسطے زیادہ بے چین رہتا تھا کہ طلبا وطن اور اپنے والدین اور عزیزوں سے دور رہتے تھے پس بیماری کی حالت میں ان سے ہمدردی ان کی تشفی ان کے صحیح علاج ہر وقت ان کی امداد کو ایک مقدس فرض سمجھتے تھے تفریح کا سامان تو صاحبزادہ صاحب نے سب سے پہلے اس طرح مہیا کیا کہ شفاخانہ کے جنوب و مغرب کی جانب پھولوں کا خوبصورت چمن لگوا دیا۔ شفاخانہ کے سب کمروں میں رنگ کرایا۔ ہر ایک کمرے کے واسطے آرام کرسیاں اور چھوٹی میزیں مہیا کیں غسلخانہ کی صفائی کا خاص اہتمام کیا ان کا ارادہ تھا کہ آسان اور جی بہلانے والی کتابیں بھی شفاخانہ کے لئے وافر تعداد میں مہیا کردیں۔ لیکن ایسا کرنے کی مہلت اور موقع نہ ملا۔ صاحبزادہ صاحب نے میڈیکل آفیسر کے کام اور طلبار کی تندرستی کی حالت پر پوری توجہ کی معالجہ کا یہ انتظام کیا گیا کہ میڈیکل افسر روزانہ رجسٹر بیمار طلبہ (مقیم شفاخانہ) کا جس میں شدید امراض کے مریضان کی بابت خاص طور پر مختصر نوٹ ہوتے تھی وائس چانسلر کے ملاحظہ کے واسطے بھیجا کریں تاکہ بشرط ضرورت وہ خاص اور فوری انتظام کرسکیں۔ ان کی ہدایت کے موافق میڈیکل آفیسر صاحب اور ان کے مددگاروں نے جملہ طلبا کا ڈاکٹری معائنہ کرنا شروع کردیا۔ اور ہر طالب علم کی جسمانی حالت کا ایک مکمل ریکارڈ ہوگیا۔

لیکن یہ اصلاحی کوششیں جو میڈیکل آفیسر صاحب کے کام کی نگرانی کے متعلق شروع کی گئی تھیں کیوں کامیاب نہ ہوئیں اس کی وجہ دکھانے کی اس لئے اس موقع پر ضرورت ہے کہ ناظرین کو معلوم ہوجائے کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے صاحبزادہ صاحب کی انتظامی کشتی کو سکون ہی نصیب نہ ہونے دیا اور

آخرکار یہ طوفان زدہ کشتی صاحبزادہ صاحب کی انمول جان بھی اپنے ساتھ لیکر قبل از وقت غرق ہو گئی۔

میڈیکل آفیسر ڈاکٹر عطا اللہ صاحب بٹ ۱۹۲۴ء کے آخر میں جرمنی سے واپس آئے جہاں وہ خاص شرائط پر مسلم یونیورسٹی سے تعلیم کے واسطے گئے تھے اپنی واپسی پر ڈاکٹر صاحب نے میڈیکل اسٹاف میں عملہ بڑھائے جانے کی درخواست کی لیکن صاحبزادہ صاحب نے اتفاق نہ کیا جس کے وجوہ انھوں نے اپنی ۱۹۲۴ء کی رپورٹ میں لکھے ہیں اُسی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے خود اپنے گریڈ اور تنخواہ کی ترقی کے متعلق جو درخواست دی اسکی تائید بھی صاحبزادہ صاحب اس لئے نہ کر سکے کہ درخواست ان شرائط کے خلاف تھی جن پر ڈاکٹر صاحب کو جرمنی جانے کے لئے خاص رخصت دی گئی تھی یہ بات قدرتی طور سے ڈاکٹر صاحب کو ناگوار ہوئی لیکن صاحبزادہ صاحب قاعدہ اور ضابطہ کے پابند تھے جس کی وجہ سے ان کو مجبوری تھی۔

میڈیکل آفیسر کا عہدہ براہ راست وائس چانسلر کی ماتحتی میں سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جون ۱۹۲۵ء میں پرو وائس چانسلر صاحب نے ڈاکٹر بٹ صاحب کو پہلے تو عارضی طور پر شعبہ علم الحیوانات کا آنریری ریڈر بنا دیا اور وائس چانسلر سے ذکر تک نہ کیا اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کو اس شعبہ کا چیرمین کر دیا۔ اس چیرمینی کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب اکیڈمک کونسل کے ممبر کئے گئے اور کورٹ کی ممبری کے لئے جب اکیڈمک کونسل کی طرف سے ایک نمائندہ انتخاب کرنے کا موقع آیا تو ڈاکٹر بٹ ہی منتخب کیے گئے اور اب وہ کورٹ کے ممبر ہو گئے۔

یہ ہو چکا تو ڈاکٹر عطا اللہ بٹ کے اس میڈیکل ہال کا معاملہ چھڑا جو انھوں نے شہر میں کھولا تھا۔ جہاں وہ روزانہ پریکٹس کرنے کو جایا کرتے تھے اور اس میڈیکل

ہال کا حاجی محمد صالح خاں صاحب رئیس بھیکم پور دممبر کورٹ سے گہرا تعلق تھا جب یہ بات صاحبزادہ صاحب کو معلوم ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب شہر میں روزانہ مطب کرنے جاتے ہیں اور یونیورسٹی کے متعلق اپنے پورے فرائض ادا نہیں کرتے دراں حالیہ ڈاکٹر صاحب موصوف یونیورسٹی کے پورے وقت کے میڈیکل آفیسر تھے تو صاحبزادہ صاحب نے اس میڈیکل ہال کے متعلق اعتراض کیا اور معاملہ کی تحقیقات شروع کی جس کے دوران میں ڈاکٹر عطا اللہ بٹ کا بیان قلمبند کیا گیا اور حاجی محمد صالح خاں صاحب سے بھی دریافت حال کیا گیا اور کونسل کے روزولیوشن کے ماتحت تین مشہور ڈاکٹروں یعنی ڈاکٹر انصاری صاحب (مرحوم) ڈاکٹر کرنل رحمن آئی ایم ایس اور ڈاکٹر صاحبزادہ سعید الظفر خاں صاحبان سے اس معاملہ میں رائے دریافت کی گئی جو تحریری رائیں موصول ہوئیں وہ میڈیکل ہال رکھنے کے خلاف تھیں چنانچہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۶ء کو صاحبزادہ صاحب نے ایک مفصل تحریری نوٹ کے ذریعہ سے جس میں ڈاکٹروں کی رائے کی نقل بھی شامل تھی آخری فیصلہ کے لئے یہ معاملہ اگزیکیوٹو کونسل میں پیش کیا اور یہ مشورہ دیا کہ کونسل میڈیکل افیسر کو حکم دے کہ وہ شہر میں یا کسی دوسری جگہ مطب نہ کریں نہ ایسے طریقہ سے پرائیویٹ پریکٹس کریں کہ جو بہ حیثیت مسلم یونیورسٹی کے میڈیکل آفیسر ہونے کے ان کے فرائض میں خلل انداز ہو اس نوٹ پر مباحثہ کے وقت کونسل میں صاحبزادہ صاحب نے کہا اکثر طلبار متعدد اوقات میں میرے پاس آئے اور مجھ سے میڈیکل آفیسر کی شکایت کی لیکن جب میں نے طلبار سے ان کے نام پوچھے کہ میں کہ شکایات کی تحقیقات کرسکوں تو انھوں نے اپنے نام بتانے سے اس عذر کے ساتھ انکار کیا کہ نام بتانے سے وہ اس وجہ سے ڈرتے ہیں کہ ممکن ہے کہ میڈیکل آفیسر صاحب ٹیوٹروں اور پروفیسروں سے کہہ دیں جس سے ان کو نقصان پہنچ جائے اس پر میں نے اُن سے کہا کہ اگر ان میں

اخلاقی جرأت اتنی بھی نہیں ہے کہ وہ اپنے نام بتا سکیں تو ان کے لئے میں کچھ نہیں کر سکتا لیکن اسی کے ساتھ میرے دل پر یہ اثر ہوا کہ طلبا کی طبی ضروریات پر کافی توجہ نہیں کیجاتی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ میڈیکل افیسر یونیورسٹی میں اپنے اصلی کام پر اپنی توجہ کو محدود اور مجتمع کریں۔"

لیکن ایگزیکیوٹو۔کونسل میں میڈیکل افیسر کے با اثر مددگاروں کی اکثریت تھی اس لئے یہ تجویز پاس نہ ہوئی پرووائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے مخالفت کی ایک ممبر اسٹاف سے یہ ترمیم پیش کرائی کہ ڈاکٹر بٹ (میڈیکل افیسر) کو موقع دیا جائے کہ ان ڈاکٹروں کے سامنے جن کی رائے وائس چانسلر کے نوٹ میں درج ہیں وہ معاملہ اصالتاً پیش کریں اور فی الحال ان کے معاملہ پر غور کرنا ملتوی کیا جائے پس ممبران کونسل کی کثرت رائے سے جن میں ممبران اسٹاف اور حاجی محمد صالح خاں صاحب شامل تھے یہ ترمیم پاس ہوگئی لیکن اس ترمیم شدہ تجویز کو بھی عملی صورت میں آنا نصیب نہ ہوا یعنی میڈیکل آفیسر صاحب نے اپنا معاملہ کبھی اصالتاً ڈاکٹروں کے سامنے پیش نہ کیا اور میڈیکل ہال کا معاملہ صاحبزادہ صاحب کے وائس چانسلری کے زمانہ میں طے نہ ہوا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شعبہ کی اصلاح کے متعلق ان کی ساری کوششیں برباد ہوگئیں۔

بیرونی لکچروں کا انتظام

صاحبزادہ صاحب نے مسلم یونیورسٹی میں تعلیمی فضا قائم کرنے کے لئے بزمانہ قائم مقام پرووائس چانسلر (میاں محمد شریف) معمولی درسی لکچروں کے علاوہ مختلف علمی مضامین پر بیرونی لکچروں کا یہ سلسلہ جاری کرایا۔ لیکن جب مستقل پرووائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد رخصت سے واپس آگئے تو رفتہ رفتہ یہ لکچر بند ہوگئے کیونکہ

ان کی رائے لکچروں کے حق میں نہ تھی جیسا کہ ناظرین کو ڈاکٹر صاحب موصوف کی ایک تحریر سے واضح ہو جائیگا جسکو وہ سطور ذیل میں ملاحظہ کریں گے یہہ لکچر کس کس عنوانات پر دئے گئے تھے اس کا حال ذیل کے نقشہ سے واضح ہو جاتا ہے۔

نمبر سلسلہ	لکچرار کا نام	لکچر کا موضوع
۱	میجر ڈین۔ پروفیسر جغرافیہ	اعلیٰ علمی مطالعہ میں جغرافیہ کو کیا درجہ حاصل ہے
۲	پروفیسر حلیم۔ پروفیسر تاریخ	خیال کی آزادی
۳۔	پروفیسر ہادی حسن فارسی	تصوف
۴	بذراعیہ میجک لالٹین	کوہ ایورسٹ کی تحقیقاتی مہم
۵	سید سجاد حیدر صاحب رجسٹرار یونیورسٹی	زمانۂ حال کا آرٹ
۶	ڈاکٹر ریم رحیم متعلق کلکتہ یونیورسٹی	اسلامی فن عمارت
۷	مسٹر فیروز الدین مراد ریڈر فزکس	فزکس کی کامیابیاں
۸	ڈاکٹر چارلس گل کے	امریکہ کے طلبہ کا مطمح نظر
۹	مسٹر ڈکنسن پروفیسر انگریزی	انگریزی علم ادب کی تعلیم۔
۱۰	مولوی بدر الدین معلم زبان عربی انٹرمیڈیٹ کالج	یورپ والوں کا عربی ادب سے شغف
۱۱	بابو شیو پرشاد ڈپٹی کلکٹر یوپی	انگریزی علم ادب

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کی تحریر محولہ بالا کا اقتباس یہ ہے۔

اکتوبر ۱۹۲۴ء میں آفتاب احمد خاں نے ہفتہ وار ہر جمعہ کو بیرونی لکچروں کا انتظام کیا تھا ان لکچروں میں لکچرار سے زیادہ وقت وہ خود لے لیا کرتے تھے ایسے عام لکچروں کے موقعہ پر سامعین کو دو وجوہ سے لیکچر سننے کی رغبت ہوتی ہے یعنی ایک تو لکچرار کی شہرت دوسرے لکچر کے موضوع کی اہمیت لیکن ایسی توقع تو کرنی حد سے متجاوز ہے کہ یونیورسٹی کے تمامی سینیر طلبہ

اور پروفیسر باقاعدہ طریقہ سے ہفتہ میں ایک دن ایسے لکچر سننے کے لئے جمع ہوں جو ایک نیچے درجہ کا انٹرمیڈیٹ کالج کا مدرس دیا کرتا ہو۔ اور لکچر کے آخر میں عبدیت اور نیابت الٰہی پر وعظ سنایا جاتا ہو۔ پس جب میں نے دیکھا کہ لکچر فضول اور بیکار ہیں اور ان پر ہنسی اڑائی جاتی ہے تو میں نے ان لکچروں کی وضع بدل دی اور اب ہفتہ میں چار دفعہ مقررہ مضامین پر لکچر ہوا کرتے ہیں اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ خود صاحبزادہ صاحب نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے" اور پھر ڈاکٹر صاحب نے اس رپورٹ کا جو صاحبزادہ صاحب سے منسوب کی ہے نہایت دلیری سے اقتباس بھی نقل کر دیا ہے

اوپر کے دس لکچروں میں انٹرمیڈیٹ کالج کے عربی زبان کے مولوی صاحب کا صرف ایک لکچر ہے اور اس کا موضوع جیسا اہم ہے ظاہر ہے لیکن ڈاکٹر صاحب لکچرار کو انٹرمیڈیٹ کالج سے نیچے درجہ کے مدرس سے منسوب کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ریمارک سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہفتہ میں ایک لکچر میں پابندی کے ساتھ شریک ہونا دشوار امر تھا لیکن اپنے ریمارک میں وہ یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ انھوں نے ہفتہ میں چار لکچروں کا خود انتظام کیا تھا۔ جب ایک لکچر میں بقول ڈاکٹر صاحب کے حاضری دشوار تھی تو ڈاکٹر صاحب کے مجوزہ ہفتہ میں چار لکچروں میں شرکت کیسے ممکن ہو جاتی ڈاکٹر صاحب نے اپنے ریمارک میں یہ بھی نہیں بتایا کہ اُن کے مجوزہ لکچرار کون ہوتے تھے اور وہ ان لکچرار سے جن کے نام نقشہ مندرجہ بالا میں ناظرین نے پڑھا کہاں تک بہتر قابلیت کے ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس ریمارک میں خود اپنی رپورٹ کو صاحبزادہ صاحب سے منسوب کر دیا ہے اس لئے صاحبزادہ صاحب کو اس کی تردید کرنی پڑی تھی۔

صاحبزادہ صاحب کے اس نوٹ کی اشاعت کے بعد کوئی جواب نہ دیا گیا۔ صاحبزادہ صاحب نے اپنے نوٹ میں لکھا تھا:۔

"جس دیدہ دلیری سے ڈاکٹر ضیاء الدین بے بنیاد باتیں بیان کرتے ہیں وہ حیرت انگیز

ہے اپنے جواب کے صفحہ ۱۱ پر لکھتے ہیں۔ سالانہ رپورٹ میں سے جو خود صاحبزادہ صاحب نے ۲۴ ر دسمبر ۱۹۲۶ء کو کورٹ کے اجلاس میں پیش کی ہیں حسب ذیل عبارت کی طرف آپ کو نواب سر مزمل اللہ خاں وائس چانسلر کو) توجہ دلاتا ہوتا ہوں" ڈاکٹر ضیاء الدین اسکے بعد ایک عبارت نقل کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یونیورسٹی میں عام مضامین پر باقاعدہ لکچر دیئے جا رہے تھے۔ اوّل تو سال گذشتہ میں میں نے کوئی رپورٹ نہیں لکھی اور نہ میں نے اس کو ۲۴ ر دسمبر ۱۹۲۶ء کو کورٹ کے سامنے پیش کیا۔ یونیورسٹی ایکٹ کی دفعہ نمبر ۴/۳ کے بموجب جو سالانہ رپورٹ لکھی جاتی ہے۔ وہ رجسٹرار نے لکھی تھی اور انھیں نے پیش کی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو عبارت ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے نقل کی ہے۔ وہ خود ان کی اپنی رپورٹ کی عبارت ہے جو انھوں نے بہ حیثیت پرو وائس چانسلر پیش کی تھی۔ ہر شخص اس عبارت کو پڑھ سکتا ہے جو ان کی رپورٹ کے صفحہ ۹ پر چھپی ہوئی موجود ہے باایں ہمہ ڈاکٹر ضیاء الدین کو یہ لکھ دینے میں کچھ تامل نہ ہوا کہ وہ آفتاب احمد خاں کی رپورٹ سے نقل کی گئی"۔

مسلم یونیورسٹی کی کونسلیں

یہ واقعہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی کونسلیں اصلاح کی محتاج تھیں انھیں کونسلوں کے اختیار میں یونیورسٹی کے مالیہ تقرر۔ اور عمارت وغیرہ کا انتظام تھا جب علیگڈھ کالج قائم ہوا انھانوے ۱۸۹ء تک کالج کا ہر ایک عملی کام کالج فنڈ کمیٹی کے سکریٹری یعنی کالج کے بانی سرسیّد کرتے تھے۔

۱۸۸۹ء میں کالج کا انتظام ٹرسٹیوں کی مجلس کے سپرد کیا گیا سرسیّد کی حیات تک جملہ انتظامات سرسیّد کی مرضی کے مطابق ہوتے رہے۔ یہ انتظامات ٹرسٹیوں کے سالانہ جلسہ میں منظور ہو جایا کرتے تھے اسوقت کے قواعد وضوابط کے بموجب تعلیم دینے والے اسٹاف کے کسی فرد کو حکمران مجلس میں کوئی اختیار حاصل نہ تھا اور اسٹاف کا تنخواہ دار حکمران مجلس کا ممبر نہ ہو سکتا تھا۔ نواب محسن الملک بہادر کے زمانہ تک یہی طریقہ جاری رہا

لیکن ۱۹۰۸ء کے قریب جب کام کی کثرت ہوئی تو سنڈیکٹ کے نام سے ایک مجلس بنائی گئی جس میں گیارہ ٹرسٹیوں کے علاوہ پرنسپل ہیڈ ماسٹر اور ایک ہندوستانی پروفیسر شامل تھے لیکن سنڈیکیٹ کسی معاملہ کا قطعی فیصلہ نہ کر سکتی تھی بلکہ آخری منظوری ٹرسٹیوں کی مجلس سے ہوا کرتی تھی سنڈیکیٹ کے جملہ ممبر سکریٹری کی نامزدگی پر مقرر ہوتے تھے اس طرح کالج کے جملہ انتظامات اور کل اختیارات ٹرسٹیوں اور ان کے سکریٹری کے ہاتھ میں تھے اسٹاف کا تنخواہ دار شخص ٹرسٹی نہ ہو سکتا تھا مختصر یہ ہے کہ جملہ انتظامات و اختیارات قوم کے نمائندوں کے ہاتھ میں تھے جن سے اسٹاف کے ممبروں کا کوئی تعلق یا واسطہ نہ تھا۔

لیکن ۱۹۲۰ء میں جب یونیورسٹی بنی تو یہ حالت باقی نہ رہی یونیورسٹی کے نئے قواعد کی رُو سے دو کونسلیں بنائی گئیں۔ علاوہ کورٹ کی مجلس کے ایگزیکیوٹو کونسل اور اکیڈیمک کونسل اور کورٹ سب سے بڑی حکمران مجلس تھی لیکن حقیقت میں چانسلر اور وائس چانسلر کے انتخاب یا پرو وائس چانسلر رجسٹرار کے تقرر کے علاوہ اس مجلس کے اختیارات کچھ زیادہ نہ تھے۔ پرانے قواعد کی رو سے یونیورسٹی کا کوئی تنخواہ دار شخص اس کورٹ کی حکمران مجلس کا ممبر نہ ہونا چاہیے تھا اور اسی کورٹ کی بڑی حکمران مجلس کو یونیورسٹی کے مالیہ تقرر کے جملہ اختیارات ہونے چاہیے تھے۔ مگر یونیورسٹی کے جدید قواعد نے یہ حالت بدل دی یعنی یونیورسٹی کے اسٹاف کے ارکین کے لئے بھی حکمران مجلسوں کی ممبری کا راستہ کھول دیا۔ بس یہی غلطی تمام بے عنوانیوں کا سبب بن گئی۔

صاحبزادہ صاحب کی وائس چانسلری کے زمانہ میں تنخواہ دار تعلیم دینے والے اسٹاف کے پندرہ ممبر اکیڈیمک کونسل کے نمائندوں کی حیثیت سے کورٹ کی مجلس کے ممبر تھے۔

ایک یہ بات بھی قدرتی تھی کہ علی گڈھ سے دور دراز فاصلہ پر رہنے والے

باہر کے کورٹ کے ممبر کورٹ وغیرہ کے جلسوں میں معدودے چند شریک ہوتے تھے اس کے خلاف یونیورسٹی کے اسٹاف کے ممبر سب کے سب ہر جلسہ میں اس لئے باسانی شریک ہوجاتے تھے کہ ہر وقت وہ موقعہ پر موجود ہوتے تھے۔ پس اُن کی کثرت رائے سے بڑے بڑے اہم معاملات کا فیصلہ ہوجاتا تھا۔ اس کے یہ معنی تھے کہ یونیورسٹی کا تنخواہ دار اسٹاف خود حکمران جماعت بن گیا اور انتظام اس کے ہاتھ میں منتقل ہوگیا ایگزیکیوٹو کونسل کی حالت اس سے زیادہ عجیب تھی اس کے اختیار میں یونیورسٹی کے مالیہ اور عمارت وغیرہ کا انتظام تھا۔ اور اس کونسل میں بھی اسٹاف کے اراکین ہی کو غلبہ حاصل تھا اور اس غلبہ کا دستاویزی ثبوت یہ ہے کہ صاحبزادہ صاحب کے دوران وائس چانسلری میں ایگزیکیوٹو کونسل کے اڑتالیس جلسوں میں سوائے ایک جلسہ کے جو ۷ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو ہوا تھا باقی کل سینتالیس جلسوں میں اراکین اسٹاف ہی کی اکثریت موجود تھی اب اس کا نتیجہ بآسانی یہ نکالا جاسکتا ہے کہ جب منجملہ ۴۸ جلسوں کے ۴۷ جلسوں میں ممبران اسٹاف کو غلبۂ رائے حاصل رہا ہو تو کون کہہ سکتا ہے کہ سیاہ و سفید کا انتظام اسی جماعت کے ہاتھ میں نہ تھا اور چونکہ پرو وائس چانسلر صاحب تعلیمی اسٹاف کے اعلیٰ افسر تھے اس لئے جو وہ چاہتے ویسا ہونا کیا دشوار تھا۔ چنانچہ یونیورسٹی کا یہ جدید قانون کہ یونیورسٹی کے تنخواہ دار ملازم حکمران مجلسوں کے ممبر ہوں خطرناک اور مضر ثابت ہو رہا تھا۔ یہ قاعدہ ایسا تھا کہ یونیورسٹی کا ایک کلرک بھی کورٹ کا ممبر ہوسکتا تھا۔ پس محفوظ و مفید وہی پرانا طریقہ تھا جو یونیورسٹی کے قائم ہونے سے پہلے کالج کے زمانہ میں جاری تھا۔ صاحبزادہ صاحب نے اس قانون کی اصلاح کی کوشش کی اور گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری محکمہ تعلیم کو ایک مفصل چٹھی لکھی جسکا نتیجہ رحمت اللہ کمیٹی کی رپورٹ کے بعد نکلا اور اب قانون میں اس حد تک ترمیم ہوگئی ہے کہ یونیورسٹی کا کوئی ممبر تنخواہ دار ملازم سوائے اکیڈیمک کونسل کے قائمقامان کے کورٹ کا ممبر نہیں ہوسکتا نہ ایگزیکیوٹو کونسل کا رکن بن سکتا ہے

لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند کی تشریف آوری اور امید افزا توقعات

صاحبزادہ صاحب نے وائس چانسلری کا چارج لینے کے بعد یہ کوشش کی تھی کہ وائسرائے یونیورسٹی میں تشریف لائیں تاکہ وائسرائے کے تشریف لانے کا جو سلسلہ بند ہو گیا تھا وہ جاری ہو جائے صاحبزادہ صاحب کے ولایت سے تشریف لانے کے بعد جنوری ۱۹۲۵ء میں یہ موقع حاصل ہوا۔ ۲۵ جنوری کی تاریخ مقرر ہوئی صاحبزادہ صاحب نے نہایت اعلیٰ پیمانہ پر استقبال کا انتظام کیا بہت سے معزز مہمان باہر سے آئے ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال بھی جو مسلم یونیورسٹی کی چانسلر تھیں تشریف لائیں تاریخ مقررہ پر وائسرائے تشریف لائے صاحبزادہ صاحب نے ایڈریس پیش کیا جس میں یونیورسٹی کی حالت کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا اور لارڈ ریڈنگ نے جو اس ایڈریس کا جواب دیا اس سے تمام پچھلے شکوک پبلک کے دلوں سے دور ہو گئے اس طرح یہ بہت بڑی اخلاقی مدد تھی جو مسلم یونیورسٹی کے واسطے صاحبزادہ صاحب نے حاصل کی۔

ہر ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال نے اس موقع پر ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ کا گراں قدر عطیہ دیا۔ اسکے بعد صاحبزادہ صاحب نے گورنمنٹ آف انڈیا سے تین لاکھ ۲۳ ہزار روپیہ سالانہ کی مستقل امداد اور عمارات کتب اور سامان کے لیئے سترہ لاکھ پچاس ہزار روپیہ یکمشت امداد کے لئے درخواست کی اسی سلسلہ میں مختلف عہدہ داران سرکاری اور ممبران اسمبلی سے ملاقات کی اور وائسرائے کے ممبران سے دہلی اور شملہ جا کر ملے اور اسی سلسلہ میں کونسل آف اسٹیٹ کی ممبری محض اس غرض سے قبول کرلی کہ مسلم یونیورسٹی کے واسطے امداد حاصل کرنے میں کامیابی ہو جائے اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے سالانہ مستقل امداد ایک لاکھ روپیہ سے بڑھا کر ایک لاکھ پچیس ۲۵ ہزار روپیہ سالانہ کر دی اور پانچ لاکھ روپیہ یکمشت امداد کی منظوری عمارات کے واسطے دیدی لیکن سالانہ مستقل امداد کے اس اضافہ سے صاحبزادہ صاحب مطمئن نہ ہوئے اور گورنمنٹ آف انڈیا کے ممبران سے اپنی مایوسی کا اظہار

کیا جس پر انھوں نے آئندہ سال غور کرنے کا وعدہ کیا۔

علیگڈھ کالج کی پنجاہ سالہ جوبلی

چونکہ پچھلے پندرہ سال سے ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات طرح طرح کے سیاسی تحریکوں کے سبب سے منتشر ہو رہے تھے اس لیے علی گڈھ کی تعلیمی تحریک کی طرف ان کو ویسی توجہ نہ رہی تھی جیسی پہلے تھی۔ ملک میں انواع واقسام کے چندوں کی اس کثرت سے شاخیں پیدا ہو گئی تھیں کہ چندہ کی ایک بڑی نہر جو پہلے صرف علیگڈھ کی طرف بہتی تھی اب چھوٹی چھوٹی نالیوں میں بٹ کر اس کا فیض منتشر ہو گیا تھا۔ سب سے زیادہ مصیبت یہ تھی کہ ملک میں بعض تحریکوں سے چندہ کرنے والوں نے چندہ کے روپیوں کا استعمال اس طریقہ سے کیا تھا۔ کہ قوم نے چندہ جمع کرنے والوں پر اعتماد کرنا کم دیا تھا۔ اور چندہ کے نام سے اُسے وحشت ہوتی تھی۔ ایسی باتیں مسلم یونیورسٹی کی ترقی کے راستہ میں بھی حائل تھیں اس لئے صاحبزادہ صاحب نے شدید ضرورت محسوس کی کہ کوئی ایسی تجویز ہونی چاہئے کہ ہندوستان کے تمام صوبوں کے مسلمان یونیورسٹی کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ کالج کے غبن کے بعد سرسیّد علیہ الرحمۃ کس قدر مضمحل ہو گئے تھے اور پھر ۱۸۹۸ء میں انکی وفات پر کالج کس قدر نازک حالت میں تھا۔ نواب محسن الملک اور خود مسٹر بیک اور دوسرے کالج کے خیر طلب گویا سبھی تو مضطر اور پریشان ہو گئے تھے لیکن اس ہنگام میں بھی صاحبزادہ صاحب کے دماغ سے سرسیّد میموریل فنڈ کی تجویز نکلی اور اس تجویز نے تریاق کا کام کیا تھا چنانچہ اس موقع پر بھی صاحبزادہ صاحب نے ایک تجویز سوچی اور اس عظیم الشان تجویز کو عمل کا جامہ پہنا دیا۔ اور وہ تجویز پنجاہ سالہ جوبلی کی تھی صاحبزادہ صاحب کی یہ خواہش تھی کہ تمام ملک کے مسلمانوں کے قائمقام علیگڈھ بلائے جائیں تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ علیگڈھ میں کس قدر کام ہو چکا ہے اور آئندہ مسلم یونیورسٹی سے کیا کیا توقعات کی جاسکتی ہیں۔ اگرچہ یہ کام نہایت دشوار اور محنت طلب تھا لیکن صاحبزادہ صاحب کے

عزم وہمت کے سامنے کوئی دشواری ٹھہر نہ سکتی تھی اور آخر انھوں نے عزم کر لیا کہ کالج کی پچاس سالہ جوبلی کا جشن دسمبر ۱۹۲۵ء میں منایا جائے اور تمام ہندوستان کے با اثر و با اقتدار اور تعلیم یافتہ مسلمان اس جشن میں بلائے جائیں اور ان کو سب کچھ دکھایا جائے تاکہ سب کی توجہ مسلم یونیورسٹی کی طرف از سر نو مبذول ہو۔ اس جوبلی کا حال ہم کسی قدر تفصیل سے اس لئے لکھتے ہیں کہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ جوبلی کا جشن کس قدر اہتمام طلب تھا۔ اور صاحبزادہ صاحب کی قوت انتظامی کیسی تھی اور مسلم یونیورسٹی کی ترقی کی خاطر وہ کس قدر محنت کرنے کو آمادہ تھے تاکہ ان کو اپنی تندرستی کا بھی خیال نہ ہوتا تھا۔

مئی ۱۹۲۵ء میں کالج کی بنا کو پورے پچاس سال ہونے والے تھے ستمبر ۱۹۲۴ء میں انگلستان سے واپس آتے ہی جب وائس چانسلری کا دوبارہ کام شروع کیا تو یہ ارادہ کیا کہ مارچ ۱۹۲۵ء میں جوبلی کا جشن منایا جائے مگر جنوری اور فروری ۱۹۲۵ء میں لارڈ ریڈنگ وائسرائے اور سر ولیم میرس صوبہ کے گورنر علیگڈھ تشریف لانے والے تھے اس لئے یہ تجویز ہوئی کہ دسمبر ۱۹۲۵ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ ساتھ جوبلی کا جشن بھی منایا جائے صاحبزادہ صاحب کی خواہش تھی کہ یہ جشن اس طرح منایا جائے کہ وہ حقیقی معنی میں قومی جشن کہا جا سکے۔

جب یہ قرار پا گیا کہ جوبلی کا جشن ضرور منایا جائے تو اس کی تیاریوں میں وہ ہمہ تن مصروف ہو گئے اور اس مصروفیت کی مختصر کیفیت حسب ذیل ہے۔

(۱) اکتوبر ۱۹۲۴ء میں پنجاب کا دورہ کیا اور مانٹگومری کی پراونشل تعلیمی کانفرنس میں شریک ہوئے۔

(۲) دسمبر ۱۹۲۴ء میں انجمن حمایت السلام کے سالانہ جلسے میں شریک ہونے کو دوبارہ پنجاب گئے۔

(۳) اس کے بعد ہی پراونشل ایجوکیشنل کانفرنس کی شرکت کیلئے حیدرآباد سندھ کو گئے۔

(۴) دسمبر ۱۹۲۴ء کے آخر ہفتہ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم لیگ کے سلسلہ میں بمبئی کا سفر کیا۔

(۵) اپریل ۱۹۲۵ء میں جوبلی ہی کی غرض سے لکھنؤ اور الہ آباد وغیرہ کا سفر کیا۔

صاحبزادہ صاحب نے ان سب موقعوں پر عام جلسوں میں تقریریں کیں مشاورت کی مجلسیں منعقد کیں اور مسلمانوں کو دسمبر ۱۹۲۵ء کے قومی جشن جوبلی میں شریک ہونے کی دعوت دی۔

(۶) ستمبر ۱۹۲۵ء میں شملہ گئے وہاں کے اولڈ بوائز کو جمع کیا اور ان کو بہ تفصیل جشن جوبلی کی غرض وغایت بتائی اور درخواست کی کہ اس جشن کے کامیاب بنانے میں وہ حتی المقدور کوشش کریں۔

ان سفروں کے علاوہ جن میں حد درجہ کی محنت اور تکلیف برداشت کرنی پڑی وائس چانسلری کے فرائض بھی نہایت محنت سے انجام دیتے رہے اور جوبلی کے گونا گون انتظامات میں بھی شبانہ روز مصروف رہے ان کا منشا تھا کہ جوبلی کے موقع پر چند تقریروں کا بھی انتظام کیا جائے جن میں بتایا جائے کہ "علیگڈھ کی تحریک کے کیا اغراض ومقاصد ہیں" "قوم اور ملک کی اس تحریک نے کیا خدمت کی ہے" "میدان تعلیم میں ان راستوں پر جو مسلمانوں کے لئے مفید ثابت ہوچکے ہیں۔ قومی جد وجہد کا آئندہ کیا دستور العمل ہونا چاہئے" وغیرہ وغیرہ صاحبزادہ صاحب نے تقریروں کے عنوانوں کی فہرست بھی بنالی اکتوبر تک اسی طرح رات دن مسلسل محنت کرتے رہے نہ آرام کا وقت مقرر تھا نہ دماغ ہی کو خیالات کے طوفان سے کوئی سکون میسر تھا۔ اسی طرح وہ لکھنے کے کام میں برابر مصروف رہتے تھے لیکن محنت کی بھی آخر کوئی حد ہوا کرتی ہے۔ رات دن کے سفر اور دماغی مصروفیت آخر اپنا رنگ لائی۔ چنانچہ وسط اکتوبر ۱۹۲۵ء میں تندرستی نے جواب دیدیا ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ انھیں کام چھوڑ دینا چاہیئے۔ ورنہ

سخت نقصان کا اندیشہ ہے ان وجوہ سے وہ مجبوراً عملی طور پر جوبلی کے انتظام سے دستکش ہو گئے۔ مگر انتظامات کا بڑا حصّہ وہ مکمل کر چکے تھے بعض انتظامات کا خاکہ تیار کیا جس کی تکمیل کا کام نواب سر مزمل اللہ خاں قائم مقام وائس چانسلر اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب پرو وائس چانسلر کے سپرد کرتے ہوئے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کو مندرجہ ذیل خط لکھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جوبلی کے متعلق ان کی تجاویز کیا تھیں:۔

۱۹ ر اکتوبر ۱۹۲۵ء

مائی ڈیر ڈاکٹر صاحب

میری علالت اس درجہ تک پہونچ گئی کہ میرے معالج کا اب یہ اصرار ہے کہ مجھ کو سب کام چھوڑ دینا چاہیئے اور فوراً کم سے کم چھ ہفتہ تک قطعی آرام کرنا چاہیئے۔ جوبلی کا کام ملحوظ رکھتے ہوئے یہ امر ضرور افسوس ناک ہے کیونکہ اس میں آئندہ دو ماہ تک مسلسل توجّہ اور کوشش کی ضرورت ہوگی لیکن مجبوری ہے اور یہ کام مجھے کسی دوسرے کے سپرد کرنا لازم ہو گیا ہے میں ممنون ہوں گا۔ اگر آپ اس کام کی نگرانی مہربانی فرما کر اپنے ذمّہ لے لیں گے کیونکہ میں آرام کرنے کے لئے مجبور ہوں۔ آپ کو علم ہے کہ میں برابر مولوی حبیب اللہ خاں صاحب کی امداد اور مشورہ سے کام کرتا رہا ہوں جس کو آپ بھی جاری رکھیں۔ اب میں مختصراً یہ عرض کروں گا کہ کس قدر کام ہو چکا ہے اور کتنا ہنوز باقی ہے اس کو حسب ذیل مدات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) نشر و اشاعت

(۲) مہمانوں کے نام دعوتی خطوط۔

(۳) استقبال

(۴) انتظام قیام مہمانان

(۵) انتظام طعام

(۶) جلسوں کے مقامات

(۷) مختلف جلسے اور مشاغل

(۸) تعلیمی نمائش

(۹) تقریری مقابلہ

(۱۰) کھیل اور ورزشیں

اب ہر ایک مد کے متعلق عرض کروں گا۔

(۱) نشر و اشاعت کے کام کا جہاں تک تعلق ہے یہ سمجھنا چاہیئے کہ کافی طور پر انجام پاچکا ہے تاہم ضروری ہے کہ ایسے مضامین انگریزی اور اُردو اخبارات میں لکھے جائیں جو یونیورسٹی کے مختلف پہلوؤں اور مختلف ضروریات پر روشنی ڈالیں۔

(۲) **دعوتی خطوط**:۔ دعوتی خطوط انگریزی اور اُردو دونوں تیار ہیں غیر ممالک میں مہمانوں کے نام خطوط گزشتہ اگست میں بھیجے جا چکے ہیں۔ اور قریب قریب سب نے ان کی وصولیابی کی اطلاع دیدی ہے اسوقت تک غیر ممالک سے صرف دو صاحبوں نے شرکت کا ارادہ ظاہر کیا ہے ہندوستان کے اندر بھیجے جانے کے لئے تقریباً چھ ہزار خطوط تیار ہیں مہمانوں کی بہت سی فہرستیں بھی تیار ہیں۔ لہذا کوشش کرنی چاہیئے کہ اس ماہ اکتوبر کے آخر تک یہ تمام خطوط روانہ کردیئے جائیں اور جو اصحاب کہ شرکت کا ارادہ ظاہر کریں ان ناموں کی فہرست علیحدہ تیار کرنے کا خاص خیال رکھنا چاہیئے۔

دعوتی خطوط کے علاوہ ایک ایڈریس مرتب کیا گیا ہے جو بڑے بڑے والیان ریاست کی خدمت میں اسٹاف کے ممبران کی معرفت بھیجا جائیگا۔ یہ سوال کہ یہ ایڈریس کن کن والیان ریاست کو بھیجا جائے اس کا فیصلہ آپ مولوی حبیب اللہ خاں صاحب اور شیخ صاحب (شیخ عبداللہ صاحب) سے کرلیں۔

(۳) **استقبال**۔ استقبالیہ کمیٹی نے تقرر کے علاوہ سواریوں کا انتظام نہایت

ضروری ہے مہمانوں اور ان کا سامان اسٹیشن سے لانے کے لئے موٹروں کے سوا کم سے کم چھ لاریاں فراہم کرنی ہوں گی۔ موٹر کاروں کی بابت امید کیجاتی ہے کہ پانچ بھوپال سے آئیں گی۔ ایک کا وعدہ نواب ممتاز الدولہ محمد مکرم علیخاں نے کیا ہے اور امید ہے کہ ایک مولوی عبدالرحمن خاں صاحب مرحمت فرمائیں گے کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اور موٹر کار ضلع کے دوسرے رؤسا اور شرفا سے مل جائیں۔ اسی طرح گاڑیاں اور دیگر اصحاب سے مانگ لینی چاہئیں جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ ہوا کرتا ہے موٹر اور گاڑیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ کا ابھی سے بندوبست کرنا ضروری ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ رائڈنگ اسکول معزز مہمانوں کے لئے مناسب جلوداری کا انتظام کر لیا جائے اور رائڈنگ اسکول کے طلبار کی وردی اور ساز و سامان کی طرف بھی توجہ ہونی چاہئے۔ سواری کے متعلق میکنزی اینڈ کو سوداگران دہلی نے مجھکو لکھا ہے کہ وہ اپنی موٹریں بغرض کرایہ اس شرط پر لانے کو تیار ہیں کہ کسی دوسری کمپنی کو موٹریں چلانے کی اجازت نہ دی جائیں اس تجویز پر بھی غور فرمالیجئے اور جو مناسب ہو کیجئے لیکن اس امر پر غور کرنا بہتر ہوگا کہ آگرہ اور میرٹھ سے بھی کچھ تانگے منگالئے جائیں کیونکہ علیگڈھ میں تانگوں اور گاڑیوں کی تعداد کافی نہیں ہے۔

(۴) **انتظام قیام** ۔ مہمانوں کے قیام کے لئے یونیورسٹی کی حسب ذیل عمارتیں کام میں لائی جاسکتی ہیں:۔

(۱) منٹو سرکل کی دوسری منزل

(۲) میکڈانل بورڈنگ ہاؤس

(۳) نئے اسکول کی عمارت کے وہ کمرے جو اس وقت تک مُسقّف ہو جائیں

ان کے علاوہ مہمانوں کی ایک بڑی تعداد حسب معمول اسٹاف کے ممبروں کے مکانوں میں اور وائس چانسلر اور ولایت منزل میں قیام کرے گی۔ مہربانی فرما کر ایک فہرست

ان مہمانوں کی مرتب کرالیجئے جن کے قیام کا انتظام ایسے مقامات پر کیا جا سکتا ہے یہ بھی ضروری ہے کہ ان مہمانوں کا کچھ اندازہ بھی کر لیا جائے جو طلبار کے ساتھ مختلف بورڈنگ ہاؤسوں میں قیام کرنے والے ہوں پچاس ہاؤس میں حسب معمول مخصوص مہمان ٹھہرینگے لیکن آپ براہ مہربانی نواب سر مزمل اللہ خاں صاحب سے دریافت کرلیجئے کہ ان کی نئی کوٹھی میں کتنے مہمانوں کا انتظام ممکن ہے مجھے شک ہے کہ نواب صاحب کی موجودہ دو کوٹھیاں جو نمائش گاہ کے متصل ہیں مل بھی سکیں گی یا نہیں مہربانی فرما کر مسز قادری۔ نواب، حافظ، احمد سعید خاں صاحب اور عبدالغفور خاں صاحب سے درخواست کیجئے کہ وہ اپنے مکانات کل یا جزو ہمارے مہمانوں کے واسطے خالی کر دیں علاوہ ان مکانات کے جو اس کام کے لئے مل سکتے ہوں خیموں کا ایک کیمپ بنایا جائے۔ بھوپال سے بہت سے خیمے ملنے کی اُمید ہے جن میں تقریباً ایک سو پچہتر مہمان قیام کریں گے۔ ہمیں بھاولپور سے بھی بہت سے خیمے ملنے کی اُمید ہے جو نومبر میں نواب صاحب کے ساتھ دہلی میں ہوں گے۔

میں نے دیوان صاحب کپور تھلہ کو بھی لکھا ہے اور نواب سر امین الدین خاں صاحب نے بھی چند والیان ریاست کو تحریریں بھیجی ہیں مگر اسوقت تک ان کے پاس سے مجھے کوئی تحریر اس بارہ میں موصول نہیں ہوئی ہے میں ہر ہائی نس مہاراجہ گوالیار کو بھی لکھوں گا۔ اور اور یہ بھی مناسب ہوگا کہ کوئی ممبر اسٹاف مہاراجہ صاحب پٹیالہ کی خدمت میں اس غرض سے بھیجا جائے ان خیموں کے علاوہ جو ہمیں ان ذریعوں سے مل جائیں گے مولوی حبیب اللہ خاں صاحب نے میرٹھ سے ایک سو خیمے کرایہ پر منگائے ہیں جن میں سات سو مہمان ٹھہر سکتے ہیں اس صورت میں ایک ہزار مہمانوں کے لئے ہمارے پاس خیمے ہوں گے لیکن ہمیں کم سے کم خیموں کا انتظام پندرہ سو مہمانوں کے لئے کرنا چاہئے قیام کے سلسلہ میں چارپائیوں کا انتظام نہایت اہم ہے۔ ہم نے پانسو چارپائیاں بنوائی ہیں۔ دسمبر تک ان کے تیار ہو جانے کی اُمید ہے لیکن اس کے سوا رئیسوں سے چارپائیاں حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے میرا

خیال ہے کہ ہمیں چارپائیاں زیادہ تعداد میں درکار ہوں گی مجھے معلوم ہے کہ ہمارے طلبہ جن کے قومی جوش اور ایثار پر ہمیشہ اعتماد کیا جاسکتا ہے اپنی چارپائیاں ضرورت کے وقت دینے کو آمادہ ہیں۔

(۵) **طعام** ۔ چونکہ مہمان کثیر تعداد میں آنے والے ہیں۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ کھانے کا ٹھیکہ دو یا دو سے زیادہ ٹھیکداروں کو دیدیا جائے اس کے لئے ہمیں شامیانے اور بنچیں فراہم کرنی ہوں گی۔ ہم ان ٹھیکہ داروں کے لئے اشتہار دے چکے ہیں۔ مگر کوشش کرنی چاہیئے کہ یہ معاملہ جس قدر جلد ممکن ہو طے ہو جائے اور اسی عرصہ میں باورچیخانہ اور ڈائننگ ہال کی جگہ مقرر کر دی جائے۔

(۶) **جلسوں کے مقامات** :۔ چونکہ ایک ہی وقت میں کئی کئی جلسے ہوا کریں گے ضروری ہے کہ جلسوں کے لئے چند مقامات منتخب کر لئے جائیں ہم پنڈال کے علاوہ اسٹریچی ہال اور یونین ہال کو بھی جلسوں کے واسطے کام میں لائیں گے پنڈال کا ایک نقشہ میں نے مرتب کر لیا ہے اور اسکی تیاری کا ٹھیکہ دے دیا ہے بلیاں اور بانس اور دیگر ضروری سامان خرید لیا گیا ہے کیمپ کے لئے جو زمین انتخاب کی گئی ہے اس میں جو فصلیں کھڑی ہیں انکو اٹھوا کر جلد صفائی کر دینی چاہیئے تاکہ پنڈال کا کام ابتدائے نومبر سے شروع ہو جائے۔ اسکے علاوہ پنڈال کی چھت اور دوسرے حصوں کے لئے سفید سرخ اور سبز کپڑے کی ضرورت ہوگی اور علاوہ ازیں آرائش کا سامان درکار ہوگا۔ کوشش یہ کیجائے کہ پنڈال ۱۵ دسمبر تک بالکل تیار ہو جائے اور آراستہ بھی ہو جائے پنڈال کی وسعت کے لحاظ سے ہمیں امید ہے کہ اسکے اندر تین ہزار نشستیں ہو سکیں گی یہ بھی دیکھ لینا ضروری ہے کہ پنڈال کے واسطے کتنی کرسیاں اور بنچیں مل سکیں گی پنڈال کے اندر نشستوں کے انتظام کے لئے ایک کمیٹی بھی ترتیب دینی ضروری ہے۔ یہ تمام انتظامات مثلاً نشستوں کے لئے چھپے ہوئے نمبر اور مختلف حصوں کے لئے ٹکٹ جس قدر جلد ممکن ہو سکے تیار کرا لینا چاہیئے نشستوں کے انتظام

کی اسکیم آخر نومبر تک مکمل ہونی چاہیے مہمانوں کی نشستیں مخصوص کرنے کا آغاز ستمبر میں ہونا چاہیے

(۷) **مختلف جلسے اور مشاغل**: جوبلی کے جلسوں وغیرہ کا پروگرام کرلینا ضروری ہے جن اصحاب نے تقریریں کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ ان سب کو یاد دہانی کردینی چاہیے اور یہ دریافت کرلینا چاہیے کہ اس وقت تک وہ تیار کرسکیں گے یا نہیں۔ یہ تقریریں جوبلی اور کانفرنس کے پروگرام میں داخل ہونگی۔

(۸) **تعلیمی نمائش**: تعلیمی نمائش کے سلسلہ میں یکم دسمبر سے ان نمائشی اشیاء کے لئے جو موصول ہوں ایک کمرہ علیحدہ رکھنا چاہیے۔ اور اس کمرہ کا ذمہ دار کسی شخص کو مقرر کردینا چاہیے ایک مجلد رجسٹر میں ہر وہ نمائشی شئے جو موصول ہو فوراً درج کرلیجائے ۵ ار دسمبر سے تمام لکچر روم خالی رہنے چاہیے۔ مسٹر حبیب الرحمن کو تعلیمی نمائش کا انچارج بنادیا گیا ہے ان کے مددگار مسٹر زیدی اور ٹریننگ کالج اور اسکول کے ممبران ہوں گے

(۹) **تقریری مقابلہ**:۔ تقریری مقابلہ کے لئے مضامین کا اعلان ہوچکا ہے ایک کمیٹی اب مقرر کردینی چاہیے جو تاریخ اوقات اور مقامات مقرر کرے اور ضروری قواعد کا مسودہ تیار کرے اس سوال کا جلد تر فیصلہ نہایت ضروری ہے تاکہ تمغے اور انعامات وقت سے پہلے تیار ملیں۔

(۱۰) **کھیل اور ورزش**: کھیل اور ورزشوں کے متعلق ایک کمیٹی بنائی جاچکی ہے اس کمیٹی سے درخواست کی جائے کہ کھیل اور ورزشوں کے اوقات مقامات اور تاریخیں مقرر کردے کھیل وغیرہ کا پروگرام ابھی شائع نہیں ہوا۔ یہ بھی اب بلا مزید توقف کے شائع ہوجانا چاہیے جیسا کہ میں آپ سے پہلے کہہ چکا ہوں۔ میں نے مسٹر قریشی پرنسپل انٹرمیڈیٹ کالج سے درخواست کی ہے کہ وہ اس ماہ اکتوبر کی ۲۵ تاریخ سے آخر دسمبر تک مسٹر ہمت علی کو جوبلی کے کام کے لئے سبکدوش کردیں۔ انٹرمیڈیٹ کالج کی پروفیسری سے آزاد ہونے کے بعد مسٹر ہمت علی کو جوبلی کا کام آپ کی زیر نگرانی سپرد ہوجانا چاہیے میں مشکور

ہوں کہ آپ نے میری درخواست پر یہ کام اپنے ذمّہ لے لیا ہے۔

آپ کا مخلص

آفتاب احمد (وائس چانسلر)

مندرجہ بالا خط صاحبزادہ صاحب نے بیماری کی حالت میں لکھا تھا اس کے بعد ہی علاج کی غرض سے وہ علیگڈھ سے آگرہ اور اس کے بعد دہلی چلے گئے ان کی غیر حاضری میں ان کی تجاویز کو عملی صورت میں لانے کی کوشش شروع ہوئی اور جوبلی کا جشن تاریخ مقرّرہ پر منعقد ہوا مگر آگرہ اور دہلی کے قیام میں باوجود معالج صاحبان کی ممانعت کے برابر انتظام میں امداد اور مشورہ دیتے رہے۔

یہ تفصیل کہ کیسے کیسے مہمان آئے اور کیا کیا جلسے ہوئے یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں اتنا لکھدینا کافی ہے کہ ایام جوبلی میں صاحبزادہ صاحب علیگڈھ آئے لیکن بیمار تھے لٹن لائبریری میں ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے جشن کی کامیابی کے متعلق حال معلوم کرتے رہتے تھے اور ضروری مشورے دیتے رہتے تھے اور چند جلسوں میں شریک ہوئے

بہرحال جوبلی ہوئی اور صاحبزادہ صاحب کا منشا جو اس کے انعقاد سے تھا وہ ایک حد تک پورا ہو گیا۔ یعنی یونیورسٹی کو اخلاقی اور مالی مدد حاصل ہوئی قوم کے مشاہیر افراد نے اس جشن میں مسلم یونیورسٹی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی اور ان کے خیالات اور غلط فہمیوں کی بہت کچھ اصلاح ہو گئی یہ تو اخلاقی پہلو تھا اور مالی امداد کا پہلو یہ تھا کہ مسلم یونیورسٹی کو اس جوبلی کے سلسلہ میں ۳۰ر نومبر ۱۹۲۶ء تک دو لاکھ انتالیس ہزار پانچ (۲۳۹۰۰۵) عطیات کی شکل میں وصول ہو گئے۔ ایک لاکھ سے زائد کے وعدے غیر موفہ رہے اسکی وجوہ کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

ہزہائی نس نواب صاحب بہادر اور ہرہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال کی تشریف آوری

جوبلی کے بعد ۵ ارجنوری ۱۹۲۶ء سے جبکہ صاحبزادہ صاحب کی

طبیعت کچھ رو بہ اصلاح ہوئی وائس چانسلری کا کام پھر شروع کر دیا اور آخر اپریل ۱۹۲۶ء تک کام کرتے رہے یہی زمانہ ہز ہائی نس نواب صاحب حمید اللہ خاں بہادر بالقابہ فرماں روائے بھوپال کی مسند نشینی کا تھا صاحبزادہ صاحب نے تحریک کی کہ ممدوح علیگڈھ تشریف لائیں اور مجوزہ سائنس کالج کا سنگ بنیاد اپنے دست مبارک سے رکھیں یہ درخواست منظور ہوئی اور نواب صاحب ممدوح نے نومبر ۱۹۲۶ء میں تشریف لانے کا وعدہ فرمایا۔ اسی سلسلہ میں صاحبزادہ صاحب نے یونیورسٹی کے "کانووکیشن" کا جلسہ بھی تجویز کر دیا۔ ہر ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال چانسلر نے بھی تشریف لانے کا وعدہ فرمایا۔ ۱۴ نومبر ۱۹۲۶ء کو ہز ہائی نس نواب حمید اللہ خاں بہادر نے سائنس کالج کا سنگ بنیاد نصب کیا اور دو لاکھ روپیہ کے گراں قدر عطیہ کا اعلان فرمایا۔ ۱۵ نومبر کو کانوکیشن کی رسم ادا ہوئی جس میں صاحبزادہ صاحب نے ایک تقریر کی، ہر ہائی نس بیگم صاحبہ نے نصر اللہ خاں ہوسٹل کا افتتاح فرمایا اس ہوسٹل کے لئے حضور ممدوحہ نے ایک بڑی رقم عطا فرمائی تھی۔ جملہ کام اس تشریف آوری کے سلسلہ میں خوش اسلوبی کے ساتھ انجام کو پہونچے۔

مسلم یونیورسٹی کی عمارات

صاحبزادہ صاحب کو فن تعمیر سے فطری مناسبت تھی ۔ ناظرین کرام کو مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی کے خط کا وہ حصہ یاد ہوگا (جو پچھلے صفحات میں نقل ہو چکا ہے) جس میں مولوی صاحب موصوف نے ظریفانہ انداز میں لکھا ہے کہ صاحبزادہ صاحب ابتدائے طالب علمی ہی میں کالج کی عمارات کے نقشے بنایا کرتے تھے۔ ان کا یہ شوق عمر کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا گیا سب سے پہلا موقع اسکے اظہار کا اسوقت آیا جبکہ انھوں نے اپنے والد ماجد کا مقبرہ اور اس سے ملحق مسجد شاہ جمال (علی گڈھ کے مشہور قبرستان) میں بنوائی تھی اس کے بعد انھوں نے اپنا مکان آفتاب منزل خوبصورت نقشے سے جو خود ان ہی کا تجویز کیا ہوا ہے بنوایا۔ نواب محسن الملک کے زمانہ سکریٹری شپ سے وہ عمارات کالج کے منتظم قرار دئے گئے۔

اور جب نواب وقار الملک کے زمانہ میں سنڈیکیٹ قائم ہوئی تو وہ اور صیغے جات کے ساتھ ساتھ بلڈنگ ڈپارٹمنٹ کے ممبر انچارج مقرر ہوئے اور زمانہ وائس چانسلری میں یہ صیغہ براہ راست اپنی نگرانی میں رکھا۔ ہم ان کے کاموں کو دو حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں

(ا) وہ عمارات جو ان کے انتظام و انصرام سے ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۸ء تک تیار ہوئیں۔

(ب) وہ عمارات جو ان کے زمانہ وائس چانسلری میں تیار ہوئیں۔

ہر ایک عمارت کے متعلق پوری تفصیل دینا موجب طوالت ہوگا اس لئے ہم ذیل میں صرف عمارات کے نام درج کرتے ہیں اور جو خاص خاص عمارات تفصیل طلب ہیں ان کی ایک حد تک تفصیل بھی کیئے دیتے ہیں۔

(۱) آرنلڈ ہاؤس، جو آجکل پراکٹر کا دفتر ہے (جو متصل اولڈ بوائز لاج واقع ہے)

(۲) غربی پکی بارک جو ایس۔ ایس۔ ویسٹ (S.S. West) کہلاتی ہے مع اس بڑی عمارت کے جو سار منزل کے مقابلے میں جنوبی مغربی کونے پر واقع ہے جس میں آج کل صیغہ عربی اور کومرس (Commorce Department) ڈپارٹمنٹ ہیں۔

(۳) مسجد کی تزئین و ترمیم جو نواب اسحاق کے زمانے میں ہوئی وہ صاحبزادہ صاحب ہی کے اہتمام سے انجام کو پہنچی۔

(۴) مسجد اور اسٹریچی ہال کے درمیان میں اور اسٹریچی ہال اور مہدی منزل کے درمیان میں جو بڑے چھوٹے کمرے ہیں اور جن کے نام مشتاق منزل، نظام میوزیم، آسمان منزل، برکت علی خاں لکچر روم بیک منزل وغیرہ وغیرہ ان کی بنیادیں سرسید کے زمانے میں بھر دی گئی تھیں اور بعض ان میں کرسی تک تیار ہوگئی تھیں تکمیل ان کی نواب محسن الملک و وقار الملک زیر اہتمام صاحبزادہ صاحب ہوئی۔

(۵) عثمانیہ ویسٹ، "آدم جی پیر بھائی منزل" جس میں مولانا سلیمان اشرف عرصہ دراز

تک مقیم رہے اور جس میں آجکل سرسید ہال کا پروسٹ آفس ہے ۱۹۰۶ء میں جب کہ چاروں طرف کچی بارک تھی صاحبزادہ صاحب ہی کے زیر اہتمام تعمیر ہوئی۔

(۶) لاٹوش ممتاز بورڈنگ ہاؤس اپنے نقشے سے انھوں نے ۱۹۰۶ء میں بنوایا۔ اور اسی زمانے میں وہ پختہ کوٹھی بنوائی جو پرانے اسکول کی (anney تھی۔ اور جس میں عرصہ دراز تک ڈاکٹر محمد رفیع چودھری رہے۔ ان ہی کے نقشے سے تیار ہوئی[۱]

اس کے علاوہ بہت سی چھوٹی بڑی عمارتیں اور ترمیمیں جن کو ہم نے قصداً نہیں لکھا۔

(ب) ذیل میں وہ عمارتیں درج ہیں جو صاحبزادہ صاحب کے زمانہ وائس چانسلری میں تیار ہوئیں۔

(۱) سائنس لیبوریٹریز کے برآمدہ کو کمرہ میں شامل کرنے کے علاوہ عثمانیہ ہوسٹل کے شمالی حصہ کے اوپر کی منزل میں پانچ جدید وسیع لکچر روم تعمیر کئے گئے۔

(۲) اسکول کی عظیم الشان جدید عمارت کی ۱۹۲۵ء کے آغاز میں تعمیر شروع ہوئی اور صاحبزادہ صاحب کی وائس چانسلری کے ختم سے پہلے وہ اتنی تیار ہو چکی تھی کہ طلبا کو اس میں تعلیم دیجانے لگی تھی صرف خوبصورت اور عالیشان سنٹرل ہال کا فرش باقی تھا اب اسکول کی عمارت میں سائنس کا فزکس ڈپارٹمنٹ منتقل ہو گیا ہے۔

(۳) اسی عالیشان عمارت کے احاطہ میں پرائمری جماعتوں اور مانٹی سوری کلاسوں کے کام کے واسطے لکچر روم تعمیر کئے گئے۔

(۴) عثمانیہ ہوسٹل کا شمالی حصہ مکمل کر دیا گیا جس کے جدید کمروں کی تکمیل سے طلبہ کے رہنے کو بہت گنجائش ہو گئی۔

(۵) نواب لطف اللہ خاں ہوسٹل (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) مکمل ہو گیا۔ تین اور ہوسٹل تکمیل کے قریب پہونچ گئے اور ان سب کا تعلق اردن سرکل سے تھا۔

ایک جدید ہوسٹل کا جو سرسید کے نام پر ہندو طلبہ کے واسطے تجویز کیا گیا تھا کا نقشہ خود

[۱] منٹو سرکل کے چاروں بلاک میں سے تین بلاک شرقی، شمالی اور جنوبی بہ موجب نقشہ مجوزہ صاحبزادہ صاحب اور ان کی نگرانی میں تعمیر ہوئے ہیں چوتھا بلاک خان بہادر سید جعفر حسین صاحب کے نقشہ کے بہ موجب تعمیر ہوا ہے۔

صاحبزادہ صاحب نے بنایا۔ اور اسکی تعمیر کا آغاز ہوا۔ صاحبزادہ صاحب کی تجویز تھی کہ اس کا نام سرسیّد ہوسٹل رکھا جائے کیونکہ سرسیّد سب سے پہلے ہندوستانی لیڈر تھے جنھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی تعلیم دی تھی یہ ہوسٹل صرف ہندو طلبار کے لئے مخصوص ہوتا۔ اب اس عمارت میں انگلش ہوس منتقل ہوگیا ہے

(نوٹ۔ اب پھر انگلش سرسیّد ہاؤس میں منتقل ہوگیا ہے اور اس ہوسٹل کو محسن الملک ہوسٹل کے نام سے پکارا جاتا ہے اور مسلمان طلبہ اس میں رہتے ہیں۔)

(۷) ممبران اسٹاف کے لئے نئے مکانات تعمیر کئے گئے۔

(۸) سرسیّد نے ایک مکان کی تعمیر کا آغاز کیا تھا صرف کرسی تک تعمیر کی نوبت آنے پائی تھی اور اب وہ تیس برس سے اُسی حال میں پڑا تھا۔ پرانی بنیادوں پر صاحبزادہ صاحب نے کمرے ایسے تعمیر کرادئے کہ یورپین معاشرت کے غیر متاہل تین ممبران اسٹاف اس میں آرام سے رہ سکیں۔

(۹) اسسٹنٹ میڈیکل آفیسر کے لئے نیا مکان تعمیر ہوا۔

(۱۰) آٹھ جدید مکان تیار کئے گئے۔ چھ یونیورسٹی کے لکچراروں اور یونیورسٹی کے ریڈروں کے واسطے اور دو انٹرمیڈیٹ کالج کے اسٹاف کے واسطے۔

(۱۱) (Woolich College) وولیج کالج انگلستان کے سلح خانہ کے نقشہ کے مطابق سلح خانہ تعمیر کیا گیا۔ جس کے ساتھ یورپین سارجنٹ کے رہنے کے لئے ایک مکان بھی تعمیر ہوا۔

(۱۲) ملازمین کے رہنے کے لئے بھی مکانات تعمیر ہوئے۔

جس قدر تعمیرات صاحبزادہ کی وائس چانسلری کے زمانہ میں ہوئی ان کی لاگت انداز خود صاحبزادہ صاحب کے الفاظ میں پانچ لاکھ روپیہ سے کچھ زائد ہوگا۔ تعمیرات کے متعلق صاحبزادے صاحب کو بڑے بڑے اور بعض عجیب منصوبے تھے۔ چونکہ ولایت

میں انھوں نے وسیع اور خوبصورت پارک اور قدرتی سبز کوہستانی منظر دیکھے تھے لہٰذا ان کو خیال تھا کہ مسلم یونیورسٹی کے حدود میں ایک بیضاوی نہر نکالیں اور اس کے درمیان جزیرہ بنا کر کثرت سے درخت لگوا کر اس کو جنگل کی وضع سے ایسا مقام کر دیں جہاں طلبہ تنہائی میں مطالعہ کریں لیکن یہ اور ایسی دیگر باتیں خیال کی حد سے آگے نہ بڑھ سکیں ان کو اتنا وقت ہی نہ ملا کہ ایسے خواب اصلیت کی صورت میں آسکتے۔ ایسے جزیرہ اور بیضاوی نہر کے متعلق خان بہادر سید جعفر حسین صاحب انجینیر اور گوالیار کے ایک بڑے انجینیر نے جو محکمہ آبپاشی کا افسر اعلیٰ تھا علیگڈھ آکر موقع کا معائنہ بھی کیا تھا تخمینہ مصارف بھی تیار ہوا تھا لیکن مسلم یونیورسٹی کے حالات ایسے تبدیل ہوئے کہ یہ اسکیم آگے نہ بڑھی اور صاحبزادہ صاحب کو حالات نے دوسری طرف متوجہ کر دیا۔ لیکن پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ صاحبزادہ صاحب کی زمانہ وائس چانسلری کی عمارتوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے جو گذشتہ پندرہ[۱۵] بیس[۲۰] برس کے عرصہ میں تعمیر ہوئیں۔

یونیورسٹی کی مالی امداد

صفحات مندرجہ بالا کے مطالعہ سے صاحبزادہ صاحب کی مشکلات کا جو ان کو وائس چانسلری کے اہم فرائض ادا کرنے میں پیش آئیں بخوبی اندازہ ہوتا ہے لیکن باوجود اس کے انھوں نے یونیورسٹی کے لئے کافی امداد حاصل کرنے کی کامیاب کوشش کی جس کی مجموعی رقم گیارہ لاکھ چوالیس ہزار آٹھ سو اڑسٹھ روپیہ گیارہ آنہ چھ پائی ہوتی ہے۔

اس زمانے کی مخصوص حالت کے لحاظ سے اس معقول رقم کا مہیا کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔

جو سنہ ۱۹۲۴ء سے سنہ ۱۹۲۶ء تک مسلم یونیورسٹی کو وصول ہوئی۔

لیکن اس رقم کے مقابلہ میں سنہ ۱۹۱۲ء سے لیکر سنہ ۱۹۲۳ء تک جو رقم کالج کو وصول ہوئی وہ صرف اکیانوے ہزار اکیس[۲۱] روپیہ دس آنہ ایک پائی ہے۔ پس پچھلے بارہ برس اور

صاحبزادہ صاحب کے صرف دو برس کی آمدنی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

مسوری میں قیام اور تحقیقاتی کمیٹی کا تقرر

آخر اپریل ۱۹۲۶ء میں بیماری کی وجہ سے صاحبزادہ صاحب کو تبدیل آب و ہوا کے لئے مسوری جانا پڑا انھوں نے کام کا وہ انتظام کہ معمولی کام خان بہادر شیخ عبداللہ ٹریزرر اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب پرو وائس چانسلر کرتے رہیں اہم کاغذات ان کے پاس بھیجے جائیں اس زمانہ میں جبکہ وہ مسوری میں مقیم تھے ان کو ان شکایتوں پر غور کرنے کا موقع ملا جو یونیورسٹی کے تعلیمی کام اور انتخابات کے متعلق عام طور پر کی جاتی تھیں ان شکایتوں کے سدباب کے لئے صاحبزادہ صاحب نے اپنے اختیارات خصوصی سے کام لے کر جو از روے قواعد ان کو حاصل تھے جون ۱۹۲۶ء میں ایک کمیٹی تحقیقات کی غرض سے مقرر کی جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلم یونیورسٹی کی تعلیم اور پابندی قواعد وغیرہ کی تحقیقات کرے اس کمیٹی کے ارکین باہر کے کوئی غیر لوگ نہ تھے چار ممبر تو اسٹاف کے تھے اور خان بہادر شیخ عبداللہ صاحب کمیٹی کے صدر تھے۔

اس تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ ۴ ستمبر ۱۹۲۶ء کو مسوری پر صاحبزادہ صاحب کو پہونچی اس رپورٹ میں جو سفارشات کی گئی تھیں ان میں سے ایک سفارش طلباء کے داخلہ کے متعلق خاص طور پر قابل توجہ تھی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ چونکہ اکتوبر میں یونیورسٹی کا نیا ٹرم شروع ہوتا تھا۔ اس لئے اکتوبر سے طلباء کے داخلے شروع ہو کر ۵ نومبر کو ختم کر دئے جایا کریں اس کے بعد پھر کوئی طالب علم داخل نہ کیا جائے تاکہ طلباء کو پڑھنے کا پورے وقت تک موقع ملے اور پچھتر فیصدی حاضری پوری کر سکیں البتہ بیرون ہند کے طلباء کے ساتھ خاص رعایت کی جائے اور وہ پہلی ٹرم کے ختم تک داخل کیے جائیں لیکن اس کے بعد پھر نہ داخل کیے جائیں۔

دوسری بات جس پر کمیٹی نے توجہ دلائی تھی مندرجہ بالا قاعدہ، داخلوں کے نتیجہ

کے متعلق تھی جس کی وجہ سے بورڈنگ ہاوسوں میں طلبہ کے رہنے کی گنجائش نہ رہی تھی ایک
ایک کمرہ میں چار چار طلبہ رہتے تھے اور اس پر بھی گنجائش کی صورت نہ رہی تو ڈے
اسکالرس کی تعداد مقررہ نسبت سے اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ اطراف یونیورسٹی کے مکانوں
سے گزر کر طلبہ یونیورسٹی سے ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر شہر کے مکان کرایہ پر لے کر رہنے لگے
تھے جہاں نہ ان کا کوئی محافظ تھا نہ کسی طریقہ سے یونیورسٹی کا عملہ نگرانی کر سکتا تھا اور
اور نہ ان طلبہ کی کوئی نیک چلنی کی ضمانت ہوسکتی تھی مندرجہ بالا رپورٹ پر باوجود علالت
کے صاحبزادہ صاحب نے ایک طویل تبصرہ خط کی صورت میں لکھا جس کی نقل پرو وائس
چانسلر صاحب کے پاس ۱۲ ستمبر ۱۹۲۶ء کو براہ راست بھیجی گئی۔

اس خط میں صاحبزادہ صاحب نے صاف لکھدیا تھا کہ بعض تجویزوں کی نسبت
وہ اپنے اختیارات خصوصی سے جو حسب دفعات ضمنی نمبر ۲/۳ اسٹیچوٹس (Statutes)
ان کو حاصل تھے کاروائی کر رہے تھے اور پرو وائس چانسلر صاحب سے خواہش کی تھی
کہ وہ ان پر عملدرآمد کریں اپنے خط میں صاحبزادہ صاحب نے کمیٹی کی بہت سی سفارشوں
سے اتفاق کیا تھا خصوصاً داخلہ طلبار کے متعلق جو سفارش تھی اس پر بہت زور دیا تھا
اور چاہا تھا کہ اس معاملہ پر پوری توجہ کی جائے صاحبزادہ صاحب کو پوری توقع تھی کہ
ضرور توجہ کی جائے گی پرو وائس چانسلر صاحب نے صاحبزادہ صاحب کو ان کے خط
کا جواب دیا اسکا خلاصہ یہ ہے:۔

بخدمت وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

جناب من آج صبح مجھے آپ کا ٹائپ شدہ خط مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۲۶ء موصول ہوا
جس میں ۹۳ ٹائپ شدہ صفحات ہیں بدقسمتی سے اس دفعہ پورے سال آپ علیل رہے
اور تکلیف قلب اور فالج کے خفیف حملہ کی وجہ سے آپ کو اس سال یونیورسٹی کے
حالات سے بعد رہا جس کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ آپ کے خط میں کتنے نامناسب

اعتراضات موجود ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں چند تجاویز پر عملدرآمد کر رہا ہوں جن پر
صرف عاملانہ کارروائی کی ضرورت ہے بقیہ تجویزیں اپنے اپنے وقت پر محکمہ جات متعلقہ کے
سامنے پیش کیجائیں گی ۔ فقط

ضیاء الدین ۴ر اکتوبر ۲۶ء

(ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب ۔ پرو وائس چانسلر)

پرو وائس چانسلر کے اس جواب میں تعریض کی جھلک نمودار ہے صاحبزادہ
صاحب کا تمام سال بیمار رہنا فالج کا خفیف حملہ اور یونیورسٹی کے مفصل حالات سے
بُعد قطعی خلاف واقعہ باتیں تھیں صاحبزادہ صاحب تمام سال بیمار نہیں تھے اور نہ اُن
پر اس وقت تک فالج کا خفیف یا شدید حملہ ہوا تھا ۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء تک تو صاحبزادہ صاحب
جوبلی ہی کے کاموں میں مصروف تھے وسط اکتوبر میں انھیں شدید محنتوں کے سبب وہ
بیمار ہوئے اور کام چھوڑ دیا لیکن جوبلی کے ہنگام میں وہ علیگڑھ آئے اگرچہ عملی کاموں
میں وہ تندرستوں کی طرح شامل نہ ہوسکے جوبلی میں آخر دسمبر ۱۹۲۵ء میں ہوئی تھی لیکن
۱۵ر جنوری ۱۹۲۶ء کو صاحبزادہ صاحب نے وائس چانسلری کا کام پھر شروع کر دیا یہ
کل مدّت صرف تین مہینہ کی تھی آخر اپریل ۱۹۲۶ء میں وہ مسوری پہاڑ پر تبدیل آب وہوا
کے لئے گئے وہاں کے قیام میں بھی وہ کام کرتے رہے اور یونیورسٹی کے حالات سے
بے خبر نہ رہے اسی دوران میں اس تحقیقاتی کمیٹی کا کام ہوا ۔ اور کمیٹی کی رپورٹ ستمبر میں
ان کو پہاڑ پر موصول ہوئی جس پر انھوں نے ۲۹ صفحات کے خط میں پرو وائس چانسلر
صاحب کو تبصرہ لکھکر بھیجا ۔ پرو وائس چانسلر صاحب کے اس فقرہ کے الفاظ "آپ کے
خط میں اتنے نامناسب اعتراضات موجود ہیں" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ناظرین خود اندازہ کریں کہ پرو وائس چانسلر کا وائس چانسلر کو یوں مخاطب کرنا کہاں
تک حق بجانب تھا ۔ رہے جوابی خط کے آخری فقرے کہ میں چند تجاویز پر عمل درآمد کر رہا

ہوں جن پر صرف عاملانہ کارروائی کی ضرورت ہے بقیہ تجویزیں اپنے اپنے وقت پر محکمہ جات متعلقہ کے روبرو پیش کیجائیں گی'' ان کا جو حشر ہوا وہ بھی ہرگز قابل اطمینان نہ تھا۔
اسی دوران میں شیخ عبداللہ صاحب صدر کمیٹی نے صاحب زادہ صاحب کو ایک خط لکھا تھا جس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا وہ لکھتے ہیں:۔

''مجھے ہرگز یقین نہ تھا کہ اس بارہ میں کچھ ہوسکے گا لیکن خدا کا شکر ہے کہ بہت کچھ ہوگیا اگر اس رپورٹ پر عمل ہو تو یونیورسٹی کچھ چیز بن جائے گی عمل میں دقتیں دکھائی دیتی ہیں جن ممبروں کے اظہار کے لئے ان کی آنکھیں تو بخوبی کھل گئی ہیں ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے اوّل تو بہت ادھم مچایا تھا کہ میرے ماتحت افسر ہرگز اظہار نہیں دیں گے لیکن پھر جلسہ میں جب چند الفاظ میں ان کو ان کی غلطی سے متنبہ کیا گیا تو پھر بالکل ٹھیک ہوگئے اور اس کے بعد انھوں نے بھی اپنے اظہار میں کوئی ایسی بات نہیں کہی جو یونیورسٹی کے حقیقی مفاد کے خلاف ہو لیکن مجھے ان سے ڈر ہے کہ وہ حقیقی اصلاح نہیں ہونے دیں گے وہ تو موجودہ طرز اور کام کو غلط نہیں سمجھتے جب تک وہ موجود ہیں ان کو کسی دوسرے افسر کے تحت میں رکھنا ہوگا۔

(دستخط عبداللہ)

واقعہ یہ ہے کہ اس کمیٹی کی رپورٹ کا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا شیخ عبداللہ صاحب صدر کمیٹی نے اپنے خط مذکورہ بالا میں جو خطرہ ظاہر کیا تھا وہ صحیح ثابت ہوا۔

مسوری سے واپسی اور وائس چانسلری کے جدید انتخاب کی امیدواری

مسوری سے یونیورسٹی کھلنے پر ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو صاحبزادہ صاحب علیگڈھ واپس آگئے اور چانسلری کے کام میں انہماک کے ساتھ مصروف ہوگئے دسمبر ۱۹۲۶ء میں اُن کی وائس چانسلری کی میعاد ختم ہونے والی تھی۔ ان کی تندرستی بہتر تھی اور انھوں نے

اپنے دوبارہ انتخاب کا فیصلہ کیا اور اپنے اس ارادہ سے بعض ممبران کورٹ کو مطلع کیا لیکن چونکہ نواب سر محمد مزمل اللہ خاں بہادر بھی وائس چانسلری کے لئے تیار تھے اس لئے نواب صاحب کے حامیوں نے کوشش شروع کردی تھی انتخاب دسمبر ۱۹۲۶ء میں ہونے والا تھا نواب صاحب کو وائس چانسلری کی خواہش کا حق تھا لیس صاحبزادہ صاحب نے اُن کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ لیکن اس کا افسوس ہے کہ نواب صاحب کے نادان مددگاروں نے جو تدبیریں اور طریقے اختیار کئے وہ ضرور قابل اعتراض تھے منجملہ اُن طریقوں کے ایک یہ تھا کہ چار مطبوعہ خطوط جو نیاز مند خصوصی کے نام سے لکھے گئے تھے کورٹ کے ممبروں میں علیگڈھ اور علیگڈھ سے باہر تقسیم کئے گئے اور یہ گمنام خطوط اخباروں میں بھی شائع کر دئے گئے یہ خطوط نومبر میں شائع کرائے گئے اور تقسیم ہوئے اس کے بعد ہی ایک مطبوعہ خط "معین حق کی طرف سے شائع کیا گیا پہلے چار خطوط میں کچھ سوالات تھے جن کا صاحبزادہ صاحب سے مختلف معاملات کے متعلق جواب طلب کیا گیا تھا۔ خطوط کا لہجہ نہایت طنزیہ تھا۔ اور صریحاً صاحبزادہ صاحب کی گزشتہ زندگی پر اور رسابق ایم۔ اے۔ او۔ کالج سے صاحبزادہ صاحب کے تعلق پر ایک حملہ تھا۔

صاحبزادہ صاحب نے خود تو ان خطوط کی کوئی پرواہ نہیں کی لیکن بعض اصحاب نے جیسے نواب سر عبدالقیوم خاں بہادر رئے پشاور سے صاحبزادہ صاحب کو لکھا کہ ان گمنام خطوط کا لکھنے والا کون شخص ہے تحقیقات کیجائے چنانچہ صاحبزادہ صاحب نے تحقیقات کی اور ان کو خط نمبر ۲ اور خط نمبر ۱ کی ایک ایک کاپی ایسی مل گئی جن پر حاجی مولوی مقتدا خاں شروانی منیجر مسلم یونیورسٹی پریس کے دستخط تھے اس پر صاحبزادہ صاحب نے حاجی صاحب کو بلایا اور معزز اشخاص کے سامنے ان گمنام خطوط کے متعلق سوالات کئے حاجی مقتدا خاں صاحب نے جو جواب دئے وہ ایک اظہار کی شکل میں باقاعدہ قلمبند

کر لیے گئے اس اپنے بیان میں چونکہ حاجی صاحب نے اقرار کیا کہ چاروں گمنام خطوط انھوں (✠)
نے لکھے اور شائع کرائے تھے "معین حق" والے خط کے متعلق انھوں نے کہا کہ لکھنے والا
تو انھیں معلوم تھا مگر اس کا نام نہ بتائیں گے۔

چونکہ حاجی صاحب مسلم یونیورسٹی کے پورے وقت کے تنخواہ دار ملازم تھے جن کی
تنخواہ دو سو روپیہ ماہوار تھی اور چار گمنام خطوط کا لکھنا انھوں نے تسلیم کر لیا تھا۔
اس لئے صاحبزادہ صاحب نے یہ معاملہ ایگزیکیوٹو کونسل کے سامنے پیش کرنا مناسب
اور ضروری خیال کیا۔ جب یہ معاملہ کونسل کے سامنے پیش ہوا تو پرو وائس چانسلر ڈاکٹر
ضیاء الدین احمد صاحب نے مندرجہ ذیل تجویز پیش کی جس کی تائید مولانا سید سلیمان اشرف
صاحب نے کی اور حاجی محمد صالح خاں صاحب اور ممبران اسٹاف کی کثرت رائے سے
منظور کر لی گئی تجویز کا مضمون حسب ذیل ہے

(۱) کونسل یونیورسٹی کے تنخواہ دار ملازم کے گمنام خطوط لکھنے کے فعل پر جن میں یونیورسٹی
کے حکام کے کام پر نکتہ چینی کی گئی ہے سختی کے ساتھ ملامت کرتی ہے۔

(۲) یہ بھی تجویز کی گئی کہ چونکہ اس معاملہ میں چند ایسی باتیں ہیں جن کی توضیح کی ضرورت
ہے اس لئے یہ معاملہ کونسل کے آئندہ اجلاس تک بغرض مزید تجویز کیا جائے۔

اس طرح پرو وائس چانسلر صاحب کی تحریک پر یہ گمنام خطوط کا مقدمہ فیصل
ہو گیا اور یونیورسٹی کے تنخواہ دار ملازموں کے سامنے ایک نظیر پیش ہو گئی کہ اگر آئندہ
یونیورسٹی کا تنخواہ دار ملازم یونیورسٹی کے چانسلر وائس چانسلر یا کسی دوسرے
عہدہ دار کی شان میں گمنام خطوط کے ذریعہ سے نکتہ چینی یا توہین کرے تو زیادہ سے
زیادہ سزا جو دی جا سکتی ہے وہ یونیورسٹی کی ایگزیکیوٹو کونسل کی عدالت سے صرف

(✠) نوٹ۔ یہ اظہار اور اس سلسلہ کی متعلقہ امور کی تفصیل صاحبزادہ صاحب کے کمنائف کے صفحات
۱۰۱ - ۱۰۸ میں درج ہے۔

ملامت کا ووٹ ہے۔

اس فیصلہ سے صاحبزادہ صاحب نے یہ نتیجہ نکالا فرقہ بندی کس درجہ کو پہونچ گئی اور یہ کہ ان کو وائس چانسلری کے آئندہ انتخاب میں کھڑا نہ ہونا چاہیے چنانچہ فوراً دسمبر ۱۹۲۶ء میں انھوں نے اعلان کر دیا کہ وہ وائس چانسلری کے امیدوار نہیں ہیں۔

صاحبزادہ صاحب کے اس اعلان کے بعد وائس چانسلری کے عہدہ پر جنوری ۱۹۲۷ء میں نواب سر محمد مزمل اللہ خاں بہادر بالقابہ منتخب ہو گئے۔

صاحبزادہ صاحب کا مشہور پمفلٹ اور گورنمنٹ ہند کو مراسلہ

صاحبزادہ صاحب کی تین سال کی وائس چانسلری میں مسلم یونیورسٹی کی جو حالت رہی وہ ناظرین پچھلے صفحات میں ملاحظہ کر چکے۔ اب جب کہ انھوں نے وائس چانسلری کے آئندہ انتخاب میں کھڑے ہونے کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور یہ اُمید باقی نہ رہی تھی کہ آئندہ وہ یونیورسٹی کی اصلاح کی کوئی عملی کوشش کر سکیں گے اُنھوں نے اپنا فرض سمجھا کہ وہ اس منزل پر پہونچکر جبکہ اُنکی وائس چانسلری کی میعاد ختم ہونے والی تھی اور یونیورسٹی کا نظم و نسق دوسرے ہاتھوں میں جانے والا تھا۔ یونیورسٹی کے مفاد کی خاطر اراکین کورٹ کو یونیورسٹی کے اندرونی حالات سے آگاہ کر دیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایک مبسوط نوٹ انگریزی میں تیار کیا اور اس کو ممبران کورٹ کے پاس بھیجدیا۔ اس نوٹ میں انھوں نے نہایت صداقت کے ساتھ اپنی معذوریوں کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ جو ان کو یونیورسٹی کی اصلاح کے معاملہ میں پیش آئیں۔ درحقیقت یہ نوٹ ان کے عہد کے سہ سالا واقعات کا آئینہ ہے جیسا کہ انھوں نے اس نوٹ کی تمہید میں لکھا ہے۔

صاحبزادہ صاحب کو اس پمفلٹ کے لکھنے کی کیوں ضرورت پیش آئی اس کو انھیں کے الفاظ میں جو انھوں نے بطور تمہید پمفلٹ کے شروع میں لکھے ہیں درج کر دینا مناسب

اور ضروری معلوم ہوتا ہے" ذیل کے صفحات میں مسلم یونیورسٹی کی موجودہ صورت حالات کا اظہار کیا گیا ہے جس کے مطالعہ سے یقیناً سچے بہی خواہاں یونیورسٹی کو صدمہ اور سخت تردد لاحق ہوگا میں نے اس معاملہ میں قلم اٹھانے کی جرارت بہ مجبوری کی ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کرنے سے ان لوگوں کی طرف سے جن پر میری تحریر کا اثر پڑے گا طرح طرح کے حملے مجھ پر کیے جائیں گے اور میں تودۂ ملامت بنایا جاؤں گا۔ لیکن اس تعلیم گاہ کے ساتھ میری وابستگی کے دوران میں یہ پہلا موقع نہیں ہے جبکہ مجھے ان کے حقیقی اغراض کی موافقت میں ایسی راہ عمل اختیار کرنی پڑی ہے جس سے میں اس قسم کے خطروں کا ہدف بنایا گیا ہوں سنہ ۱۹۰۹ء میں صرف میں وہ ٹرسٹی تھا جس نے ایم۔ اے او کالج کے بعض اندرونی انتظامات کے متعلق ان صوبہ جات کے ایک مشہور لفٹنٹ گورنر کی پالیسی کی مخالفت کی تھی سنہ ۱۹۱۵ء میں جبکہ مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے اراکین نے شملہ پر گورنمنٹ آف انڈیا کے ممبر تعلیمات سے ملاقات کی تھی۔ اس وقت میں ہی وہ شخص تھا جس نے اس تجویز کے خلاف کہ گورنمنٹ کو یونیورسٹی کے پروفیسروں کے تقرر کا اختیار دیا جائے۔ آواز بلند کی تھی۔ مذکورہ بالا دونوں موقعوں پر بالآخر تمام اشخاص متعلقہ نے میرے خیالات سے اتفاق کیا تھا اسی طرح کے اس درسگاہ کے ان بنیادی اصولوں کی حفاظت کرنے میں جن پر میں اس کی زندگی کا مدار سمجھتا ہوں میں نے کبھی ان بااثر اولڈ بوائز کی رائے سے اختلاف کرنے میں جو برسوں سے میرے خلاف باقاعدہ پروپیگنڈا پھیلا رہے تھے تامل نہیں کیا۔

مجھے کوئی شبہ نہیں کہ آئندہ صفحات میں جو کچھ میں نے تحریر کیا ہے اس کے متعلق خلط مبحث کی ہر ممکن کوشش کیجائے گی اور اس قسم کے اعتراضات سے جیسے کہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں عام جذبات کو میرے خلاف مشتعل کیا جائے گا۔

اولاً یہ میں نے اس یونیورسٹی اور قوم کے مخالفوں کے ہاتھ میں ایک آلہ دے دیا ہے میں اس سے واقف ہوں کہ ملک اور قوم کے جذبات کی موجودہ صورت میں اس قسم کی چالیں

اکثر کامیاب ہو جاتی ہیں مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ ملک کی موجودہ صورت حالات میں ہر طرف مخالف اثرات سے گھرے ہوئے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم اپنی مرکزی اور قومی یونیورسٹی میں ان خیالات کی جو مسلمانان ہندوستان کی نسلوں کی خصائل اور شائستگی کی بنیادوں کو کھلا کر رہے ہیں نابود کرنے سے موجودہ صورت حالات کا زیادہ کامیابی سے مقابلہ کر سکیں گے جہاں تک اس یونیورسٹی کا تعلق ہے ہمارے حقیقی مخالف وہ لوگ ہیں جو ایسی صورت حالات پیدا کرنیکے خواہشمند ہیں جو شائستگی اور اخلاق کے نشوونما کے یقیناً منافی ہے ثانیاً گر میں نے گورنمنٹ سے مداخلت اور تحقیقات کی استدعا کی ہے میں آپکی توجہ اس خط کی طرف مبذول کراتا ہوں جو میں نے گورنمنٹ آف انڈیا کو تحقیقات شروع کرنیکی تجویز کے سلسلہ میں تحریر کیا ہے۔ اور جو اس کتاب کے اٹھارویں باب میں موجود ہے۔

اس نوٹ کے شائع کرنے سے پہلے گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری تعلیم کے نام بھی صاحبزادہ صاحب نے اپنا مشہور مراسلہ نمبر ۴۷۵۵ مورخہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۲۹ء بھیجا تھا جس کو انھوں نے اس نوٹ کے آخر میں ممبران کورٹ کی اطلاع کے لئے شامل کر دیا ہے جو حسب ذیل ہے اس مراسلہ کا مضمون یہ ہے:۔

گزشتہ اگست دسمبر (۱۹۲۶ء) میں میں مسوری پہاڑ پر تھا۔ ۶ر اکتوبر کو جب میں علیگڈھ واپس آیا تو میں نے افواہاً سنا کہ گورنمنٹ آف انڈیا مسلم یونیورسٹی کے امتحانات کے معیار کی تحقیقات کرنا چاہتی ہے۔ چنانچہ اصل واقعات معلوم کرنے کی غرض سے میں ایجوکیشنل کمشنر مسٹر رچی (Richi) سے بمقام دہلی ۲۳ر اکتوبر کو۔ ملاقات کی اور اس معاملہ کے متعلق

نوٹ۔ صاحبزادہ صاحب کے خلاف یہ پروپیگنڈا کیا گیا تھا کہ انھوں نے گورنمنٹ کو سب سے پہلے دعوت دی کہ وہ تحقیقاتی کمیشن مقرر کرے خطوط محولہ بالا جو گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری کے نام لکھے ہیں ان کے ملاحظہ سے ظاہر ہوگا کہ سب سے پہلے خود ڈاکٹر ضیاءالدین احمد سکریٹری سے وعدہ کر آئے تھے۔ کہ وہ گورنمنٹ کی تجویز تحقیقاتی کمیشن کو اراکین یونیورسٹی کے سامنے پیش کر کے منظور کرا دیں گے اور جس کی اطلاع انھوں صاحبزادہ صاحب کو نہیں دی۔ اس وقت تک کہ خود سکریٹری سے صاحبزادہ کو یہ واقعہ معلوم ہوا۔ اور انکے استفسار پر ڈاکٹر صاحب نے اس بات کو قبول کیا۔

استفسار کیا۔ مسٹر رچی نے کہا کہ انھوں ڈاکٹر ضیاء الدین سے کہا تھا کہ گورنمنٹ مسلم یونیورسٹی کے امتحانات کے نتیجہ سے مطمئن نہیں ہے اور اسکے متعلق تحقیقات کرنا چاہتی ہے اس پر ڈاکٹر ضیاء الدین نے کہا کہ وہ اس قسم کے تحقیقات کی تحریک یونیورسٹی کی کونسل میں کریں گے چنانچہ اس معاملہ میں گورنمنٹ ضیاء الدین کے جواب کا انتظار کر رہی ہے اور مسٹر رچی نے یہ بھی کہا کہ اس ملاقات کے متعلق ایک تحریر بھی انھوں نے ڈاکٹر ضیاء الدین کے پاس بھیجدی ہے۔

دہلی سے علیگڈھ واپس آئے میں نے ڈاکٹر ضیاء الدین سے کہا کہ وہ مسٹر رچی ایجوکیشنل کمشنر سے مقام شملہ ملے تھے اور ان کے اس ملاقات کے متعلق مسٹر رچی نے جو تحریر ان کو بھیجی ہے وہ مجھے دکھائی جائے۔ لیکن ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے مجھے وہ تحریر نہ دکھائی اور یہ کہا کہ وہ تحریر کاغذات میں مخلوط ہوگئی ہے اور دستیاب نہیں ہوسکتی ہے لیکن ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب نے مسٹر رچی سے اپنی ملاقات ہونا۔ اور مسٹر رچی کی تحریر موصول ہونا تسلیم کیا۔ تحقیقات کے متعلق ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے مجھ سے یہ کہا کہ انھوں نے مسٹر رچی سے کہا تھا کہ وہ کونسل میں یہ تحریک کریں گے کہ ہم خود گورنمنٹ کے نمائندوں کی مدد سے یہ تحقیقات کریں۔ لیکن میرے استفسار سے قبل ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے مسٹر رچی سے اپنی ملاقات کا مجھ سے کوئی تذکرہ خود نہ کیا تھا۔ اور نہ یونیورسٹی کی کونسل میں اس وقت انھوں نے کسی قسم کی تحقیقات کی تجویز پیش کی ہے۔

مجھے جو کچھ مسٹر رچی سے معلوم ہوا تھا وہ میں نے ممبران ایگزیکیوٹو کونسل سے کہہ دیا ممبران سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ بعض ممبر یہ چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ خود تحقیقات کرے اور بعض کی یہ خواہش ہے کہ افسران یونیورسٹی تحقیقات کریں۔ اپنے خیالات ظاہر کرنے سے پہلے کچھ ایسی باتیں ہیں جنکا پہلے اظہار کر دینا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

اس قسم کی تحقیقات کی نوعیت اور طریقہ خواہ کچھ ہو مگر اس کا اصل مقصد یہ ہونا چاہیے کہ یونیورسٹی کی موجودہ ناقابل اطمینان حالت دور کرنے میں امداد ہونی چاہیے یہ سچ ہے

کہ یہ یونیورسٹی مسلم یونیورسٹی ہے لیکن چند خاص حالتوں میں یہ یونیورسٹی نیشنل اور نیز سرکاری یونیورسٹی ہے پس صرف درگزر اور نکتہ چینی سے کام نہ چلے گا۔ ورنہ تحقیقات کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ یونیورسٹی حقیقی ترقی کے راستہ پر عملی طریقہ سے لائی جائے جب تحقیقات کا یہ مقصد ماہر فن تعلیم یا ایسی قابلیت کے دوسرے شخصوں کے ذریعہ سے کرائی چاہئے جو مذکورہ بالا مقصد کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ پیچیدہ مسئلہ کامیابی سے حل کرنے میں آزاد اور اس کے اہل اور غیر جانبدار ہوں۔ ان کے دماغ انصاف پسند ہوں اور دل ہمدردی سے بھرے ہوں اور وہ ہندوستان کے حالات سے پورے باخبر ہوں تاکہ ہندوستان اور انگلستان کے حالات میں امتیاز بھی کر سکیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس تحقیقات کی نوعیت اور دائرۂ عمل کیا ہونا چاہئے جو گورنمنٹ کرانا چاہتی ہے ہماری یونیورسٹی پبلک امداد سے چلتی ہے پس گورنمنٹ کا ایسی یونیورسٹی کے متعلق تحقیقات کرانا۔ ایک اہم بات ہے نہایت ہی مخصوص حالات میں ایسی تحقیقات کرانا حق بہ جانب ہو سکتا ہے لیکن ہاں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ایسے نہایت ہی مخصوص حالات موجود ہیں تو پھر تحقیقات بھی نہایت پوری اور مکمل ہونی چاہئے۔ تاکہ اس سے ایسے عمدہ نتیجے نکلیں کہ پھر آئندہ اس قسم کی تحقیقات کی ضرورت باقی نہ رہے۔

دوسرے سوالات سے قطع نظر کرکے مسلم یونیورسٹی کا جدید نظام جس پر دسمبر ۱۹۲۰ء سے عملدرآمد ہوا ہے مکمل غور اور جانچ کا محتاج ہے کیونکہ اس نظام کے بعض خاص قواعد میں علیگڈھ کالج کے گذشتہ قواعد کی خلاف ورزی کی گئی ہے اور حقیقت میں مسلم یونیورسٹی کی بہت سی موجودہ خرابیوں کا سبب بھی جدید نظام ہے جو ۱۹۲۰ء سے شروع ہوا ہے۔

یہ خیالات ملحوظ رکھتے ہوئے میں بھی گورنمنٹ کے تحقیقات کرانے کو پسند کرتا ہوں اور گورنمنٹ کے سامنے چند واقعات اور خیالات پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے تحقیقات کی نوعیت اور حد قائم کرنے میں مدد ملے گی لیکن اس مراسلہ میں جو کچھ میں لکھوں گا وہ میری ذاتی

رائے ہوگی اور اسی حد تک اس پر لحاظ ہونا چاہیئے۔

راستی کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۷۵ء سے جب سے علیگڈھ کالج وجود میں آیا وہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام ایشیا کی درسگاہوں میں اعلیٰ درجہ کا تسلیم کیا گیا ہے میں ہز اکسی لینسی سر ولیم میرس گورنر صوبجات متحدہ کی اس تقریر کا کچھ اقتباس پیش کرتا ہوں جو ممدوح نے فروری ۱۹۲۵ء میں ہمارے ایڈریس کے جواب میں کی تھی۔ انھوں نے فرمایا تھا۔ چونکہ میں اُمید کرتا ہوں اور مجھکو یقین بھی ہے کہ علیگڈھ مسلمانوں کی قسمت سدھارنے میں بہت بڑا کام کریگا۔ لہٰذا میں نے ایک تعلیمی افادہ گاہ کے ایڈریس کے رسمی جواب کی حدود سے کسی قدر تجاوز کیا جس زمانہ میں سب سے پہلے میں نے علیگڈھ کا نام سنا تھا اس وقت اس کو مسلم اصلاحات کی تحریک کی آبدار تیز اور اچھی طرح بجھائے ہوئے نیزے کی بھال کہا جا سکتا ہے اور جب میں علیگڈھ آیا تو علیگڈھ کالج کے طلبا ایک نظر میں شناخت کر لئے جاتے تھے۔ یعنی ان میں ایک خاص وضع کی ہوشیاری چستی قواعد کی پابندی اور تہذیب تھی جو ان کو دوسروں سے امتیاز کرانی تھی اور جب طاعون یا قحط وغیرہ کے سلسلہ میں اصلی کام کرنے کو ہوتا تھا۔ تو یہی لوگ مانگے جاتے تھے چنانچہ علیگڈھ کی تعلیم و تربیت میں ضرور کوئی ایسی خاص قوت تھی جس نے ایسا گروہ پیدا کیا تھا۔

میں دیگر حکام اعلیٰ اور مشہور ماہران تعلیم کی رائے بیان کر سکتا ہوں جنھوں نے علیگڈھ کالج کے نوجوانوں کے متعلق اس قسم کے خیالات ظاہر کیئے ہیں۔ اور صحیح طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی قائم ہونے تک اس درسگاہ کی کم و بیش یہی شہرت رہی۔ آپ کو علم ہے مسلم یونیورسٹی دسمبر ۱۹۲۰ء میں قائم ہوئی۔

اب یہ سوال ہے کہ اس چھ سال میں جب سے یونیورسٹی قائم ہوئی وہ کونسی ایسی بات ہوگی جس نے ہمارے طلبار کی عام تہذیب اور حالت میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی کہ گورنمنٹ نے تحقیقات کی ضرورت ظاہر کی۔ اس درسگاہ کی موجودہ حالت سے جس قدر مجھکو واقفیت

ہے اس سے مجھ کو یقین ہے کہ اس تبدیلی کی وجوہ کی تحقیقات کے ہمارے قوم کی حقوق طالب ہیں۔ لیکن وہ تحقیقات مکمل اور غیر جانبدارانہ ہونی چاہئے گورنمنٹ ہماری حالت کا زوال ان اختیارات سے منسوب کرسکتی ہے جو ہم کو یونیورسٹی ملجانے سے امتحانات لینے اور سندیں دینے کے متعلق حاصل ہوئے ہیں۔ امتحانات ہی کسی یونیورسٹی میں یونیورسٹی کے کام کی جان ہیں۔ چنانچہ اختیارات کا جا و بیجا استعمال بڑی حد تک اس تعلیم کی کیفیت پر منحصر ہے جو امتحانات کی تیاری کے زمانہ میں طلبا کو دی جاتی ہے اور جس تعلیم کے بعد سندیں دئے جانے کے واسطے طلبار کا امتحان لیا جاتا ہے اور اس لئے ان حالات پر غور کرنا ضروری ہے جس میں طلبا یونیورسٹی کے امتحانات کے لئے تیار کئے جاتے ہیں اور اسی سے یونیورسٹی کی حکمران جماعت اور تعلیم دینے والے اسٹاف کے حالات و اختیارات کا اصل پتہ لگ جائیگا جو یونیورسٹی کے نئے آئین و قواعد کے ذریعہ سے پیدا اور حاصل ہوئے ہیں:

اس مراسلہ کے بھیجنے سے صاحبزادے صاحب کا صرف یہ منشار تھا کہ وہ گورنمنٹ پر یہ ظاہر کردیں کہ یونیورسٹی کے حالات گورنمنٹ کی مداخلت اور تحقیقات کے مقتضی ہیں اگر تحقیقات کیجائے تو اسکی نوعیت کیا ہو۔ یہ کیا صحیح نہیں ہے کہ یہ مراسلہ تنہا گورنمنٹ کو بیدار کرنے کا باعث ہوا۔ کیونکہ گورنمنٹ خود ان خرابیوں کو جو یونیورسٹی میں پیدا ہوگئی تھیں معلوم کرچکی تھی۔ گورنمنٹ دیکھ رہی تھی کہ بہت سے امتحانوں میں یونیورسٹی کے اصل طلبہ کی تعداد سے بہت زیادہ تعداد کے پرائیویٹ طلبہ مسلم یونیورسٹی کے امتحانوں میں بے دریغ شریک اور پاس کئے جارہے تھے مثال کے طور پر تین سال کے میٹرک (دسویں (۱۰) درجہ کے امتحانات کے طلبہ کی تعداد غور کے قابل ہے۔

سنہ	یونیورسٹی میں اصلی تعلیم پانیوالے طلبہ	پرائیوٹ امیدوار
۱۹۲۵ء	۲۱۶	۳۹۸
۱۹۲۶ء	۲۷۶	۷۹۰

واقعہ یہ ہے کہ جنکو کہیں باقاعدہ داخلہ اور باضابطہ اسکول کی تعلیم میسر نہ آئی تھی وہ یہاں پرائیوٹ طور پر امتحانات میں شامل ہوجاتے تھے اور یہ پرائیویٹ امیدوار خاصی تعداد میں پاس کیے جاتے تھے اور پھر کثرت سے بھی یونیورسٹی کالج میں داخل ہوجاتے تھے۔ ایسی باتوں سے مسلم یونیورسٹی کے امتحان بدنام ہوگئے اور گورنمنٹ کی رائے علیگڈھ کے طلبہ کی طرف سے خراب ہوگئی طلبہ کی تہذیب اور قابلیت وغیرہ کی وہ حالت نہ رہی جو پرانے کالج کے طلبہ کی تھی۔ ان حالات کو دیکھکر گورنمنٹ نے محسوس کیا کہ مسلم یونیورسٹی کے اندرونی حالات کی تحقیقات کا وقت آپہونچا تھا۔ جسکا اظہار شملہ پر ستمبر ۱۹۲۵ء میں مسٹر رچی ایجوکیشنل کمشنر گورنمنٹ آف انڈیا نے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد پرووائس چانسلر سے کردیا تھا۔ اسکا مفصل تذکرہ صاحبزادہ صاحب کے مراسلہ موسومہ سکرٹیری گورنمنٹ آف انڈیا کے تحت میں صفحات گزشتہ میں لکھا جاچکا ہے آخر ۱۹۲۷ء کے وسط میں یہ اعلان ہوگیا کہ آنریبل سر ابراہیم رحمت اللہ کی صدارت میں ایک کمیٹی یونیورسٹی کے معاملات کی تحقیقات کرے گی اس تحقیقاتی کمیٹی کا مفصل حال آئندہ صفحات میں ناظرین ملاحظہ کرینگے

سر ابراہیم رحمت اللہ کی تحقیقاتی کمیٹی

صاحبزادے صاحب کی وائس چانسلری کی میعاد ختم ہونے کے بعد ۱۹۲۷ء میں سر ابراہیم رحمت اللہ کا تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوا لیکن جن اسباب کی بنا پر یہ کمیشن مقرر کی گئی تھی ان کا تعلق ان واقعات سے ہے جو صاحبزادہ صاحب کے عہد وائس چانسلری میں رونما ہوئے تھے اور اس کمیٹی کے سامنے جو شہادتیں پیش ہوئیں تھیں ان میں صاحبزادہ صاحب کی شہادت ایک اہم شہادت تھی اس لئے اس کمیٹی کو تو صاحبزادہ صاحب کے عہد وائس چانسلری ہی کا ایک تاریخی واقعہ سمجھنا چاہیے اگر اس سوانح عمری میں اسکا ذکر

نہ کیا جائے تو یقیناً وہ نامکمل رہے گی ہر ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال چانسلر یونیورسٹی نے اس کمیٹی کے مقرر کیے جانے کے متعلق جو نوٹ لکھا تھا اس میں اس تقرر کے اسباب پر کافی روشنی ڈالی تھی وہ تحریر فرماتی ہیں۔

میں اچھی طرح واقف ہوں کہ کوئی افادہ گاہ جو انسان کے ہاتھ سے قائم کی گئی ہو چاہے جس قدر بھی احتیاط کے ساتھ قائم کیجائے اور اس میں کتنی ہی ہوشیاری سے کام کیا جاتا ہو قطعی طور پر مکمل اور بے نقص نہیں کہی جاسکتی۔ چنانچہ اس کلیہ سے ہماری مسلم یونیورسٹی بھی مستثنیٰ نہیں ہوسکتی۔ لیکن جس بات سے بڑا تردد اور فکر ہے وہ یہ ہے کہ عام طور سے یہ مایوسی ہورہی ہے کہ موجودہ حالت کے اعتبار سے ہمارے مسلم یونیورسٹی کا اب وہ اعلیٰ اور فائق درجہ ہندوستان کی دوسری یونیورسٹی کے مقابلہ میں باقی نہیں رہا جو ہمارے پرانے ایم۔ اے کالج کا ملک کے دوسرے کالجوں کے مقابلہ میں تھا۔

علی گڈھ کالج کو ترقی کرکے مسلم یونیورسٹی کے درجہ پر پہونچنا تو اس امر کا متقاضی تھا کہ اس کی اچھی شہرت اور رتبہ میں اضافہ ہوتا لیکن افسوس اس تبدیلی کا اُلٹا یہ اثر ہوا کہ جمہور کے دلوں میں مسلم یونیورسٹی کی وہ مسلمہ وقعت باقی نہیں رہی۔ جو پرانے کالج کی تھی۔ پس ایسی یونیورسٹی کے لیے جس کی ترقی اور توسیع جمہور کی امداد اور ہمدردی پر منحصر ہو یہ تبدیلی ایک مہلک حادثہ سے کم نہیں ہوسکتی۔

"جن لوگوں کو پُرانے کالج سے قریبی تعلقات رہے ہیں ان سے پوشیدہ نہیں ہے کہ پرانے کالج کے زمانہ میں بھی تعلیم دینے والی اسٹاف اور حکمران کالج کی جماعت میں اختلاف ہوا ہے جس سے کالج کی مشین کے باقاعدہ چلتے رہنے میں خلل پڑنے کا خیال ہوا۔ لیکن وہ اختلاف اس وضع کا نہ تھا جو خطرات سے ایسا مملو ہوتا جیسا کہ اب ہماری یونیورسٹی کو ہے ان پُرانے اختلافوں میں باہمی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بغض وعناد یا شک ورقابت نہ تھی اس لئے وہ اختلافات آسانی سے رفع ہوسکتے تھے اور ایسے نہ تھے کہ کالج کا وجود بھی خطرہ میں

ڈال دیتے لیکن اب تو حالات و معاملات کا رنگ ہی دوسرا ہے جنھوں نے ہولناک صورت اختیار کر لی ہے یعنی یونیورسٹی کی حکمران جماعت اور تعلیم دینے والے گروہ میں برتری کی خاطر کھلی رقابت ایماندارانہ اختلاف کی حدود سے باہر جا پڑی ہے جس نے اصل ترقی کا راستہ بند کر دیا۔ حتیٰ کہ یہ رقابت رجعت کر کے اب ذاتی جھگڑوں اور منافشوں سے مبدل ہو گئی ہے چنانچہ انھیں جھگڑوں اور منافشوں کا برا اثر یونیورسٹی کے انتظام تعلیم اور قواعد کی پابندی وغیرہ پر پڑا ہے۔

سابق وائس چانسلر (صاحبزادہ آفتاب احمد خاں) نے اس خطرناک صورت حال کی اصلیت کسی قدر دیر سے محسوس کی اور یونیورسٹی کے ٹرسٹیز (خان بہادر شیخ عبداللہ صاحب) کی صدارت میں ایک تحقیقاتی کمیٹی اپنے اختیارات خصوصی سے ۱۹۲۶ء میں مقرر کی مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ اراکین کورٹ کے نزدیک اس کمیٹی کے کام کی پوری وقعت ہو سکتی ہے۔ مگر چونکہ یہ کمیٹی ممبران مسلم یونیورسٹی سے مرکب تھی اس لئے مسلمان پبلک اور گورنمنٹ کی نگاہ میں اس کی ایسی وقعت نہ ہو سکتی تھی۔ جو کسی ایسی کمیٹی کے کام کی ہوتی جسکے اراکین یونیورسٹی کی فضا کے اثرات سے بالکل آزاد ہوتے۔"

"علیگڈھ سے مجھے جس قدر محبت ہے اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں ہے ہم اب تک سر سید احمد خاں کا خواب سچا کر کے اسکو عملی شکل میں نہ لا سکے افسوس کہ ہم نے علیگڈھ کو مشرق کا قرطبہ نہ بنایا بلکہ ہم اپنے عزم و ہمت ایسے اختلافوں اور جھگڑوں میں صرف کر رہے ہیں جو ہم کو ہمارے اصل مقصد سے دور لئے جا رہے ہیں۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں لوگوں نے جن کو علیگڈھ کے طلبہ میں یہ روح پھونکنی چاہیے تھی کہ طلبہ ملک کے اس کنارہ سے اس کنارہ تک جا کر آزاد عملی تحقیقات کشادہ دل رواداری اور سچے بے لوث اخلاق کا وعظ کہیں خود بانی اعظم کے اعلیٰ اور ارفع تخیل کو فراموش کر دیا اور اس کی بجائے نفاق حسد اور تنگ دل تعصب کا ثبوت دے

رہے ہیں۔"

"چنانچہ انھیں پریشان کر دینے والے معاملات سے جواب آئندہ زیادہ عرصہ تک جاری نہیں رکھے جا سکتے مسلم یونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے میں نے اپنا فرض خیال کیا کہ وہ اسباب معلوم کیے جائیں جن کی وجہ سے یہ خطرناک حالات پیدا ہوئے اور ایسے بہترین مشورے حاصل کیے جائیں جن سے اس مہلک زخم کا اندمال ہو جو مسلم یونیورسٹی کی روح فنا کیے دیتا ہے اور یہی وہ روح ہے جو سر سید احمد خاں نے ہمیں امانت میں دی ہے اور یہی پچھلے پچاس سال کا مسلمانان ہندوستان کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

"چونکہ تعلیمی اسٹاف کی قابلیت کی خامی طلبہ کے درمیان ڈسپلین کی خرابی اور امتحانات کا معیار گھٹ جانے سے مسلم یونیورسٹی کی ڈگریوں کی وقعت و قیمت گھٹ رہی ہے اور اسکی وجہ سے مبالغہ آمیز افواہیں پھیل رہی ہیں تو اب اس بات کا بھی اندیشہ ہو گیا ہے کہ یہ وجوہ معقول آخر کہیں ہز اکسلنسی لارڈ ریکٹر کی طرف سے حسب دفعہ نمبر ۱۳ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ براہ راست دست اندازی اور کاروائی نہ کیجائے پس میں نے اپنا گھر سنبھالنے کی دلیرانہ کارروائی خود ہی کرنے کا عزم کیا اور یونیورسٹی کے بہترین خیر طلبوں کے مشورے سے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی اس کمیٹی کے اراکین ایسی مسلمہ قابلیتوں کے لوگ ہیں جن کی سب عزت کرتے ہیں اور تعلیم کے متعلق ان کے مشوروں پر سب کو اعتماد ہے"

ہر ہائی نس بیگم صاحبہ کی تحریر بالا سے واضح ہے کہ مسلم یونیورسٹی کا کام صرف امتحان لینا اور ڈگریاں دے دینا نہ تھا۔ بلکہ طلباء میں بانی اعظم کے ارفع تخیل کے مطابق آزاد علمی تحقیقات کشادہ دل رواداری اور سچا بے لوث اخلاق پیدا کرنا یونیورسٹی کا سب سے بڑا مقصد تھا ظاہر ہے کہ بدون ان اوصاف کے محض ڈگریاں کیا کر سکتی تھیں اور یہی وہ بات ہے جو صاحبزادہ صاحب نے کانوکیشن کے جلسہ کی تقریر میں ڈگریوں کو جرمنی کے مارک سے تشبیہ دیتے ہوئے تین سال پیشتر کہی تھی۔

تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے بیان دینے کے لئے صاحبزادہ صاحب کی تیاری

۲۷ر جون ۱۹۲۷ء کو سر ابراہیم رحمت اللہ کے تحقیقاتی کمیشن کا اخبار لیڈر میں اعلان شائع ہوا۔ اور اسی تاریخ کو صاحب زادہ صاحب کو علم ہوا کہ ایسی کمیٹی قائم ہوگئی ہے یہ وہ زمانہ تھا کہ صاحبزادہ صاحب کو وائس چانسلری کے کام سے علیحدہ ہوئے چھ ماہ سے زائد مدّت گزر چکی تھی۔ تحقیقاتی کمیشن کے مقرّر ہونے کے اعلان سے یونیورسٹی کے سچّے بہی خواہوں کو گونہ اطمینان ہوا۔ اور ان کو یہ امید ہوئی کہ یونیورسٹی میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ ان کی اصلاح ہو جائے گی لیکن ایک دوسرا فریق بھی تھا جس پر اس اعلان نے گھبراہٹ طاری کردی اور یہ وہی فریق تھا جس پر کمیٹی کی کیفیات سے یا تو خود مضر اثر پڑنے والا تھا۔ یا ان لوگوں کے ایسے جانبدار لوگ تھے جو مضر اثرات سے خاص لوگوں کو بچا لینا چاہتے تھے اور یونیورسٹی کی حقیقی اصلاح سے انھیں کچھ سروکار نہ تھا۔ چونکہ اب صاحبزادہ صاحب صرف کورٹ کے ایک ممبر تھے اور وائس چانسلر نہ تھے اس لئے جب تک کہ وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر صاحبان اجازت نہ دیتے یونیورسٹی کے کاغذات اور رجسٹروں تک جن کی کمیٹی کے سامنے شہادت دینے کی تیاری کے لئے ضرورت تھی ان کی رسائی محال تھی۔ اور اصل تو یہ ہے کہ صاحبزادہ صاحب اور چند بہی خواہان یونیورسٹی کے راستہ میں یہ بڑی رکاوٹ تھی۔

اگرچہ کمیٹی نے اپنا کام ۱۱ر اکتوبر ۱۹۲۷ء سے شروع کیا۔ لیکن صاحبزادہ صاحب نے شروع اگست ہی سے کمیشن کی امداد کے لئے ضروری مسالہ جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سامان کے جمع کرنے میں انھیں جو دشواریاں پیش آئیں اس کا ذکر انھوں نے تحریری بیان میں جو ۱۲۷ ٹائپ کئے ہوئے بڑے صفحات پر تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے پیش کیا تھا تفصیل کے ساتھ کیا ہے عموماً ان وجوہات میں یا تو معائنہ کے لئے کاغذات دینے سے

صاف انکار ہے یا ایسے عذرات سے کام لیا گیا ہے کہ وقت ٹل جائے جب اس قسم کی جوابات سے صاحبزادہ صاحب تنگ آگئے اور بہت سے اشد ضروری رجسٹروں اور کاغذات تک رسائی ناممکن نظر آنے لگی تو انھوں نے یونیورسٹی کے چانسلر ہر ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال کو یکے بعد دیگرے تین شکایتیں تحریری بھیجیں جن کے حسب دلخواہ اور معقول جواب موصول ہوئے ناظرین کے لئے اس اصل مراسلت کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

صاحبزادہ صاحب نے ہر ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال کو ۱۲ اگست ۱۹۲۷ء کو مندرجہ ذیل مراسلہ بھیجا:۔

یور ہائی نس

نہایت مودبانہ گذارش ہے کہ

(۱) تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرنے کا بظاہر اصل منشاء یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے صحیح حالات کا انکشاف ہو۔ یہ منشاء جب ہی پورا ہو سکتا ہے جبکہ کمیٹی کے سامنے اصل صحیح واقعات پیش کئے جائیں یہ بات ایسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے کہ کوئی واقف کار اور تجربہ کار معتمد شخص متعین کیا جائے جو یونیورسٹی کی تعلیمی علمی اور مالی شعبوں کے متعلق ضروری کاغذات کی جانچ کی بنا پر وہ کمیٹی کے واسطے ایک نوٹ تیار کرے۔

چونکہ ایسا انتظام کیا جانا معلوم نہیں ہوتا اس لئے میں نے اپنا یہ فرض سمجھا کہ باوجود صحت کی خرابی کے جو کچھ مجھ سے ہو سکے میں ہی کروں یہ بات اس خط وکتابت سے ظاہر ہوگی جو میں نے اس معاملہ میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر۔ پرو وائس چانسلر اور رجسٹرار سے کی تھی اور جس کی ایک نقل ملاحظہ کے لئے اس عریضہ کے ساتھ خدمت عالیہ ارسال کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں اس خط وکتابت کے ملاحظہ سے تمامی حالات خود معلوم ہو جائینگے مجھے صراحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے پس اس معاملہ کی طرف سرکار عالیہ کی توجہ مبذول کراتا ہوں۔

(۳) یورہائی نس کو غالباً معلوم ہے کہ تعلیم دینے والے اسٹاف سے مقررّہ لکچروں کے دینے میں کوتاہی ہوئی ہے اور بہت سے طلبار کی لکچروں سے مسلسل غیر حاضریاں بھی رہیں۔ لہٰذا موجودہ حالت میں یہ ایک شدید نقص ہے چنانچہ لکچروں اور حاضریوں کا سوال کمیٹی کے سامنے ایک اہم سوال ہوگا۔ اسی بنار پر میں نے ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۷ء تک حاضری کے رجسٹروں کے معائنہ کی خواہش ظاہر کی مگر پرو وائس چانسلر ڈاکٹر ضیار الدین احمد صاحب نے یہ رجسٹر مجھے دکھانے سے انکار کر دیا اور لکھا کہ بدون اجازت اکیڈیمک کونسل کے وہ ایسے رجسٹر مجھے نہیں دکھا سکتے اب غور طلب یہ ہے کہ ایام تعطیلات میں اکیڈیمک کونسل کا کوئی جلسہ نہ ہوسکیگا اور یہ تعطیل ۳۰ر ستمبر کو ختم ہوگی اور یونیورسٹی یکم اکتوبر کو کھلے گی۔ اس لئے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اکتوبر آئندہ تک مجھے حاضری کے رجسٹر دیکھنے نہ دئے جائیں گے اور اکتوبر کا مہینہ وہ ہوگا جیسا سنا جاتا ہے کہ تحقیقات کمیٹی اپنا عملی کام شروع کردیگی اس لئے مجھے کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ پرو وائس چانسلر ڈاکٹر ضیار الدین احمد صاحب نے جو طریق عمل اختیار کیا ہے اسکے یہی معنی ہیں کہ تحقیقاتی کمیشن کے سامنے پیش کرنے کو اشد ضروری شہادت دستیاب نہ ہو جس کلرک کا حاضری کے رجسٹروں سے تعلق ہے اس نے مجھ سے یہ کہا کہ حاضری کا جنرل رجسٹر چھ ہفتہ سے ڈاکٹر ضیار الدین صاحب کے مکان پر ہے۔

(۴) جیسا کہ میری مرسلہ نقل خط وکتابت سے ثابت ہوگا میں اس معاملہ میں وائس چانسلر صاحب سے برابر اپیل کرتا رہا ہوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان رجسٹروں کے متعلق کہ میں ان کا معائنہ کروں اکیڈیمک کونسل سے اجازت حاصل کرنے میں وائس چانسلر صاحب کو بھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ بہرحال تعلیمی شعبہ اشد ضروری ہے اور تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے یہ سوال بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے چنانچہ اس شعبہ کے رجسٹروں کی جانچ اشد ضروری ہے لیکن پرو وائس چانسلر صاحب نے قطعی طور پر یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ جب تک اکیڈیمک کونسل کی اجازت نہ ہوگی وہ مجھے حاضری کے رجسٹر یا دوسرے کاغذات جن کا شعبہ تعلیمی سے

تعلق ہے دیکھنے نہ دیں گے اور اس معاملہ میں وائس چانسلر صاحب مجھے مدد دینے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوئے پس ان حالات میں میرے لئے کوئی اور چارہ کار رسوائے اس کے نہیں ہے کہ یہ معاملہ سرکار عالیہ کے حضور میں پیش کروں جو مسلم یونیورسٹی کی چانسلر ہیں:۔

ہر ہائی نس نے اس خط کے جواب میں نیم سرکاری مراسلہ نمبر ۲۲ ا ستمبر ۱۹۲۷ء ارسال فرمایا اس کا مضمون یہ تھا:۔

جناب من

سرکار عالیہ نے مجھے ہدایت فرمائی ہے کہ آپ کے مراسلہ مورخہ ۲۲ راگست ۱۹۲۷ء کی رسید سے آپ کو اطلاع دوں۔ ہر ہائی نس نے آنریبل نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کو اس معاملہ میں آج تحریر فرمادیا ہے اور اس تحریر سے ایک مختصر اقتباس آپکی اطلاع کے واسطے حسب الحکم ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

میں درخواست کرتی ہوں کہ تمام ضروری واقفیت کا سامان ان لوگوں کے واسطے فوراً مہیا کیا جائے جو تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے شہادت پیش کرنا چاہتے ہیں!۔

صاحبزادہ صاحب کا دوسرا خط

موسومہ پرائیوٹ سکریٹری

ہر ہائی نس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

آفتاب منزل علیگڈھ

۵ ستمبر

جناب من

آپ کی نیم سرکاری چھٹی نمبری ۱۲۲ مورخہ یکم ستمبر کا شکریہ عرض ہے جس میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ہر ہائی نس نے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو لکھدیا ہے کہ تمام واقفیت کا سامان ان لوگوں کے واسطے فوراً مہیا کیا جائے جو تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے شہادت پیش

کرنا چاہتے ہیں اس ہدایت کے متعلق سرکار عالیہ ہز ہائی نس کے حضور میں میری دلی سپاس گزاری پیش فرمائی جائے لیکن اس سلسلہ میں مجھے یہ لکھنے کی اجازت دی جائے کہ جہاں تک میری ذات خاص کا تعلق ہے واقعات اور حالات جو یہاں پیش آرہے ہیں میری موجودہ حالت کا لحاظ کرتے ہوئے مجھے اجازت نہیں دے سکتے کہ کمیٹی کے سامنے میں شہادت کی رہنمائی کروں یہ سچ ہے کہ کسی دوسرے انتظام کے نہ ہونے کی وجہ سے میں یونیورسٹی کے بعض کاغذات کے معائنہ کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ لیکن کاغذات کی نوعیت اور تعداد اتنی پیچیدہ اور زیادہ ہے کہ کامل مطالعہ اور معاملہ کی تیاری کے واسطے حد سے زیادہ آدمیوں اور ذریعوں کی ضرورت ہے جو میرے پاس نہیں ہیں۔ چنانچہ ایسے شدید محنت طلب کام میں مدد دینے کو نہ میرے پاس عملہ ہے نہ کلرک میں میری خود تندرستی کی یہ حالت ہے کہ میں روزانہ صرف چند گھنٹے کام کر سکتا ہوں اور اتنا کام بھی میری تندرستی کے لئے خطرہ سے خالی نہیں ہے لیکن اتنا کام بھی کرنے کا مجھے موقعہ نہیں دیا جاتا اور میرے راستہ میں مواقع حائل کئے جاتے ہیں وقت ٹالا جاتا ہے اور معائنہ کے دوران میں برابر دق کیا جاتا ہے اور جیسا اس خط و کتابت سے ظاہر ہوگا جو میں بھیج چکا ہوں بعض نہایت ضروری اور اہم کاغذات کے دیکھنے کی مجھے اجازت نہیں دیجاتی مثلاً دونوں صاحبوں یعنی وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر نے باوجود میرے اصرار اور یقین دلانے کے کہ جو واقفیت میں حاصل کرنا چاہتا ہوں وہ قطعی صیغۂ راز میں رکھی جائے گی مجھے امتحانات کے نمبروں کے نقشہ دکھلانے سے قطعی انکار کر دیا ہے یہ ایسے نقشے ہیں جن کا تعلق گزشتہ امتحانات سے ہے جن کے نتیجے کو شائع ہوئے مہینے اور برس ہو گئے ہیں مجھ سے کہا جاتا ہے کہ نقشے صیغۂ راز میں ہیں ملاحظہ طلب یہ امر ہے کہ میں کورٹ کا ممبر ہوں اور کالج اور یونیورسٹی کی زندگی ترقی اور کام سے انچاس (۴۹) برس گزشتہ سے میرا تعلق رہا ہے اور اس کے سوا میں یونیورسٹی کا وائس چانسلر بھی رہ چکا ہوں۔ لیکن مجھ کو یہ ضروری کاغذات دیکھنے کی

اجازت نہیں دی جاتی یہ بھی غور طلب ہے کہ میرا کاغذات کا معائنہ کرنا صرف اس غرض سے ہے کہ تحقیقاتی کمیٹی کو مدد دوں۔ پس جہاں تک میری ناچیز رائے ہے وہ یہ ہے کہ یہ حالت میری برداشت سے باہر ہے۔

کچھ عرصہ سے منجملہ دوسری خرابیوں کے یونیورسٹی کے طرز عمل کے متعلق یہ شکایت بھی ہو رہی ہے کہ ممتحنوں کے پاس سے جب نتیجے آجاتے ہیں تو ان نتیجوں میں کاٹ چھانٹ کیجاتی ہے اور رعایتی نمبر اضافہ کر دینے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے چنانچہ یقین کے ساتھ جاننے کو ایسی شکایت کی کہاں تک اصلیت ہے یہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ چند سال کے نمبروں کے نقشے احتیاط کے ساتھ جانچ لئے جائیں اور جانچ کا نتیجہ تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے پیش کر دیا جائے پس میرا یہی مدعا تھا اور نمبروں کے نقشے میں نے اسی واسطے معائنہ کرنا چاہے تھے۔ لیکن وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر صاحبان نے مجھے یہ نقشے دکھانے سے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ میرے مرسلہ کاغذات سے یہ وضاحت معلوم ہوگا کہ میرے راستہ میں کیسے کیسے موانع حائل کیے گئے ہیں۔

براہ مہربانی حضور عالی ہر ہائی نس کو میری طرف سے یقین دلائے کہ میری ناچیز خدمات سرکار عالیہ اور تحقیقاتی کمیٹی کے لئے ہر طرح حاضر ہیں۔ لیکن ان حالات میں جو اوپر بیان ہوئے یہ بات میرے اختیار میں نہیں ہے کہ کمیٹی کے سامنے میں شہادت کے ذریعہ سے امداد دے سکوں یہ ضرور ہے کہ اگر مجھکو موقعہ دیا گیا تو خدا کے فضل سے جو کچھ میں جانتا ہوں بقدر امکان تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے پیش کر دینے کو تیار ہوں۔

لیکن ان حالات میں جو پیش آرہے ہیں میری حالت ایسی نہیں ہے کہ کمیٹی کے سامنے شہادت دینے کے لئے تیار ہو سکوں۔

یہ خط میں نے کل اتوار کو لکھا تھا لیکن آج ڈاک میں پہنچنے سے پہلے جب میں دفتر گیا تو یونیورسٹی کے رجسٹرار نے مجھے وائس چانسلر کا خط مورخہ ۵ ستمبر سنہ ۱۹۲۷ء

دیا۔ یہ خط اس خط کا جواب ہے جو میں نے وائس چانسلر کو ۲ ستمبر کو لکھا تھا وائس چانسلر نے مجھے جواباً لکھا ہے چونکہ بڑی تعطیل کی وجہ سے یونیورسٹی بند ہے اور متعلقہ افسران اور دفتر کے کلرک باہر ہیں اس لئے کاغذات مطلوبہ جب تک یونیورسٹی کھل نہ جائے حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔

اس جواب کا کھلا مطلب یہ ہے کہ کاغذات مطلوبہ اکتوبر میں دئے جائیں گے چنانچہ اکتوبر تک ڈسپلن وغیرہ کے متعلق بھی کاغذات میں نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس وقت پرووسٹ کا دفتر کھلا ہوا ہے اور ایک کلرک وہاں کام کر رہا ہے رہا افسروں کا تعطیل کی وجہ سے باہر ہونا تو مجھے یقین نہیں ہے کہ اس زمانہ میں کوئی پرووسٹ ہے بھی یا نہیں کیونکہ اصل پرووسٹ مسٹر ڈکن سن تو یونیورسٹی سے اپنا تعلق قطع کر چکے ہیں اور مجھے اس کی اطلاع نہیں ہے کہ دوسرا پرووسٹ مسٹر ڈکن سن کی جگہ مقرر بھی کیا گیا ہے یا نہیں لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وائس چانسلر صاحب پرووسٹ کے دفتر سے کاغذات کیوں حاصل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ڈسپلن کا اصل ذمہ دار تو پرو وائس چانسلر ہے اور پرووسٹ براہ راست پرو وائس چانسلر کا ماتحت ہے لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی وائس چانسلر صاحب مجھے کاغذات معائنہ کرنے کی اجازت نہیں دیتے اور یہ عذر ہے کہ پرووسٹ تو یہاں موجود نہیں ہے۔

اب اس سے زیادہ لکھنے کی مجھے ضرورت نہیں ہے ہر ہائی نس چانسلر کے حضور میں جہاں تک ممکن ہوا میں نے واقعات پیش کر دیئے ہیں۔

اس خط کے پہونچنے پر ہر ہائی نس بیگم صاحبہ کے پرائیوٹ سکریٹری کا جو مراسلہ نیم سرکاری نمبر ۹۸۵ مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۲۷ء وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کو بھیجا گیا اسکی نقل درج ذیل ہے:-

جناب من

سرکار عالیہ ہز ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال چانسلر مسلم یونیورسٹی نے مجھے حکم دیا ہے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کے مراسلہ خط کا اقتباس آپ کے ملاحظہ کے واسطے بھیجدوں۔ چنانچہ وہ اقتباس بھیجا جاتا ہے اور حسب ہدایت حضور سرکار عالیہ لکھا جاتا ہے کہ معاملات حاضرہ اور نیز یونیورسٹی کی نیک نامی کے لحاظ سے اس معاملہ پر توجہ فرمائی جائے اور ایسا انتظام فوراً کر دیا جائے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بے روک ٹوک وہ تمامی واقفیت کا ضروری مواد جمع کر سکیں جو تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے وہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔

"ایک نقل اسکی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی اطلاع کے واسطے بھیجی جاتی ہے"

جب صاحبزادہ صاحب کو مراسلہ بالا کی نقل موصول ہوئی تو انھوں نے پرائیویٹ سکریٹری بیگم صاحبہ بھوپال کو ایک اور مراسلہ ۱۷ ستمبر ۱۹۲۷ء کو حسب ذیل لکھا۔

"جناب من"

مجھے اس مراسلہ کا اقتباس ڈاک سے پہونچا جو سرکار عالیہ نے کاغذات کے معائنہ کے متعلق وائس چانسلر نواب سر محمد مزمل اللہ خاں بہادر کو ارسال فرمایا ہے اس کے متعلق میرا دلی شکریہ قبول فرمایا جائے اطلاعاً اتنا اور لکھنا چاہتا ہوں کہ چونکہ وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر صاحبان نے مجھے ایسے کاغذات معائنہ کرنے کی اجازت نہیں دی تھی جو میں معائنہ کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی کوشش سے دست بردار ہوجانا پڑا تھا۔ میں نے وائس چانسلر صاحب کو اطلاع دی تھی کہ ۱۵ ستمبر تک میں کاغذات کا معائنہ کر لینا چاہتا ہوں۔ لیکن چونکہ وائس چانسلر صاحب نے مجھے معائنہ کی اجازت نہیں دی۔ لہذا ۱۵ ستمبر کے بعد سے مجھے کام چھوڑ دینا پڑا۔

مہربانی فرما کر سرکار عالیہ کی خدمت میں میرا شکریہ پیش فرمائیے کہ میرے معروضہ

پر سرکار عالیہ نے ایسی توجہ فرمائی"

سطورہ بالا خط وکتابت سے ثابت ہوتا ہے کہ تحقیقاتی کمیشن کے سامنے شہادت کی تیاری کے لئے صاحبزادہ صاحب کے راستہ میں کیا موانع حائل تھے ورنہ صاحبزادہ صاحب کو یہ شکایتی خطوط لکھنے کی ضرورت نہ پیش آتی۔ لیکن سب سے زیادہ قابل توجہ صاحبزادہ صاحب کے وہ فقرے ہیں جو وائس چانسلر نواب سر محمد مزمل اللہ خاں بہادر کے متعلق انھوں نے لکھے ہیں یعنی وائس چانسلر صاحب کو ضروری کاغذات حاصل کرنے میں ابھی کامیابی نہیں ہوئی ہے وغیرہ۔ ان فقروں سے صاف ظاہر ہے کہ وائس چانسلر نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر ضرور کوشش کر رہے تھے کہ صاحبزادہ صاحب کے معائنہ کے لئے کاغذات مہیا کئے جائیں۔ لیکن کوئی دوسرا واسطہ ایسا حائل تھا جو نواب صاحب کو کامیاب نہیں ہونے دیتا تھا اور جو کچھ جواب وہ صاحبزادہ صاحب کو دے رہے تھے اس میں بھی وہی ہاتھ کام کر رہا تھا جو دراصل راستہ میں حائل تھا۔

بہر حال انھیں حالات میں صاحبزادہ صاحب نے اپنا وہ بیان جو انھیں کمیشن کے سامنے پیش کرنا تھا مرتب کیا اور شہادت کے واسطے مکمل تیاری کی جس کا ذکر آگے چل کر کمیشن کے کام کے سلسلہ میں آئیگا۔

تحقیقاتی کمیشن کے کام کا آغاز

اس کمیشن کے حسب ذیل اراکین تھے۔

(۱) آنریبل سر ابراہیم رحمت اللہ کے سی آئی۔سی۔ای۔۔۔۔۔ بمبئی۔ چیرمین۔

(۲) سر فلپ جوزلیف ہار ٹوگ کے۔ ٹی۔سی۔آئی۔ای۔ایم۔اے ایل ایل ڈی پبلک سروس کمیشن آف انڈیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ممبر

(۳) سر جارج اینڈرسن کے۔ٹی۔سی۔آئی۔ای۔ایم۔اے ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب۔۔۔۔۔ ممبر۔

(۴) مسٹر اے ایف رحمٰن ۔ ایم۔ اے (آکسن) پرووسٹ مسلم ہال ڈھاکہ یونیورسٹی (سکریٹری) کمیشن کے سپرد جن مواد کی تحقیقات کی گئی ان کی تفصیل یہ ہے :۔

(۱) مسلم یونیورسٹی اور اس کے متعلق افادہ گاہوں یعنی مسلم یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج علیگڈھ اسکول اور مسلم یونیورسٹی ۔ سٹی اسکول کے نظم ونسق کی جانچ

(۲) مسلم یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن یعنی ایکٹ ۔ اسٹیچوٹس ۔ آرڈیننس ۔ ریگولیشنز اور اور یونیورسٹی کی مجالس کی جانچ اور اس میں ضروری تبدیلیاں ۔

(۳) مسلم یونیورسٹی کی مالی حالت کی جانچ

(۴) اس طریقہ کار کی جانچ جس کے ماتحت انٹرمیڈیٹ کلاس یونیورسٹی سے جدا کئے گئے اور اس پر رپورٹ ۔

(۵) یونیورسٹی اسٹاف کے متعلق تعلیم دینے والے استادوں کلرکوں اور دوسرے افسروں کی خدمات اور قابلیت کی تحقیقات ۔

(۶) امتحانات کے معیار اور امتحان لئے جانے کے طریقوں کی جانچ ۔

(۷) مسلم یونیورسٹی کی ڈسپلین (قواعد کی پابندی) تندرستی اور بورڈنگ ہاؤسوں اور عمارتوں کی عام حالت کی تحقیقات ۔

اس امر کی تحقیقات کہ مسلم یونیورسٹی اور اسکے تعلیمی افادہ گاہیں تعلیمی فضا قائم کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئیں ۔

امور بالا کے متعلق سفارشات کرنا ۔

کمیشن کا کام اس طرح شروع ہوا کہ ۸ر اکتوبر ۱۹۲۷ء کو ممبران کمیشن پہلے بھوپال میں ہر ہائی نس چانسلر کی شرف ملاقات سے مشرف ہوئے اور ۱۱ر اکتوبر ۱۹۲۷ء کو انھوں نے علیگڈھ آکر باقاعدہ تحقیقات شروع کردی جو ۹ر نومبر ۱۹۲۷ء کو ختم ہوئی اور تحقیقات کا نتیجہ ایک رپورٹ کے ذریعہ سے مع اپنی سفارشات کے پیش کردیا ۔

کمیشن کے سامنے شہادتیں

۲ ستمبر ۱۹۲۷ء کو ہز ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال چانسلر مسلم یونیورسٹی کے حکم سے رجسٹرار مسلم یونیورسٹی نے ایک مطبوعہ اعلان شائع کیا تھا کہ ہز ہائی نس چانسلر نے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا ہے اس اعلان میں کمیشن کے اراکین اور مقاصد کی وہی تفصیل تھی جو ہم اوپر لکھ چکے ہیں سربرآوردہ اخبارات کے ذریعہ سے بھی کمیشن کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا تھا اور ایسے اشخاص سے جو یا تو براہ راست مسلم یونیورسٹی سے متعلق تھے یا مسلم یونیورسٹی کے حالات سے واقف تھے اور ان کو یونیورسٹی سے دلچسپی تھی خواہش کی گئی تھی کہ وہ اپنی شہادتوں سے کمیشن کو مدد دیں۔

ایسی شہادتیں جو پیش ہوئیں وہ تین قسم کی تھیں یعنی صرف تحریری۔ صرف زبانی اور تحریری اور زبانی دونوں۔

حیدرآباد سے ایک یادداشت تحریری شہادت کی حیثیت سے موصول ہوئی تھی جس پر دس با اقتدار اشخاص کے دستخط تھے مثلاً نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی۔ نواب سر مسعود جنگ بہادر۔ نواب حیدر نواز جنگ بہادر (سر اکبر حیدری)، دیگر اصحاب اس یادداشت میں کمیشن کو حسب ذیل امور کی طرف توجہ دلائی گئی تھی:۔

(۱) مسلم یونیورسٹی کے تعلیم دینے والے اسٹاف اور تعلیم دینے کی اصل جانچ کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ پچھلے دو سال ان لوگوں نے کس قدر کام کیا ہے۔

(۲) یہ بات اشد ضروری ہے کہ یونیورسٹی کے تعلیم دینے والے اسٹاف کے لکچر اس سے زیادہ پابندی اور قاعدہ کے ساتھ ہوا کریں جیسے اب تک ہوئے ہیں۔

(۳) تحقیقات کی مد نمبر ۲ کے متعلق ہماری یہ قطعی رائے ہے کہ یونیورسٹی میں تعلیم دینے والے اسٹاف کے کسی شخص کو یہ اجازت نہ ہونی چاہئے کہ صوبہ کی کونسلوں۔ قانون ساز

اسمبلی یا کونسل آف اسٹیٹ میں ممبر ہونے کے واسطے وہ اپنے تئیں بطور امیدوار کے پیش کرے۔

(۴) یہ قاعدہ بنا دینا چاہیئے کہ یونیورسٹی کا کوئی تنخواہ دار شخص یونیورسٹی کی ایسی مجالس کا ممبر نہ کیا جائے جن کے سامنے ان تنخواہ دار شخصوں کی تنخواہ یا الاؤنس وغیرہ کے سوال پیش ہوتے ہیں۔

(۵) تعلیمات کے نصاب کی احتیاط کے ساتھ نظرثانی کی جائے تاکہ امتحان کا صحیح معیار قائم ہو اسی طرح امتحانوں کی نگرانی کی پوری اصلاح کیجائے۔

(۶) یونیورسٹی کے تعلیمی اسٹاف کی تعداد اور استعداد تعلیم کے لحاظ سے یونیورسٹی میں طلبہ کا سالانہ داخلہ کیا جایا کرے۔

(۷) ہر سال میں یونیورسٹی میں خاص طریقہ سے یہ انتظام کرنا چاہیئے کہ علمی تحقیقات کے متعلق طلبہ کی ہمت افزائی ہو۔

(۸) تھرڈ ایر کلاس سے آگے ہوسٹلوں میں ایک کمرہ میں صرف ایک طالب علم رکھا جائے اور موجودہ طریقہ کہ ایک کمرہ میں ایک سے زیادہ سینیر طلبا رکھے جاتے ہیں موقوف کر دیا جائے۔

(۹) جونیر طلبا یونیورسٹی کو کسی فنڈ کے متعلق چندہ جمع کرنے کو یونیورسٹی کے افسروں کی طرف سے متعین نہ کیا جایا کرے۔

(۱۰) یونیورسٹی کے کسی طالب علم کو اجازت نہ دی جائے کہ وہ کونسل کی ممبری کے واسطے یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے اشخاص کے واسطے ووٹ حاصل کرنے کو گشت کرے۔

(۱۱) علوم کے مختلف شعبوں کو ترقی دینی چاہیئے اور درصورت ضرورت طلبا کو وظیفے دئے جایا کریں۔

(۱۲) پچھلے چند سال سے پبلک کی نظر میں مسلم یونیورسٹی کی وقعت گھٹ رہی ہے اس سے ہم کو بہت رنج ہے اور ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ جب تک موجودہ خرابیاں اور نقص دور نہ کئے جائیں گے ہندوستان کی مسلم جماعت کی تعلیمی معاشرتی اور سیاسی ترقی بہت زیادہ پیچھے ہٹ جائیگی۔

حیدرآباد کی یادداشت کے علاوہ ۴۳ اشخاص کا کمیشن نے زبانی بیان لیا جن میں مہاراجہ صاحب محمود آباد۔ صاحبزادہ صاحب۔ نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر سر شاہ محمد سلیمان صاحب ڈاکٹر ضیاءالدین احمد صاحب اور بہت سے مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر اور دوسرے معززز اور اصل حالات سے واقف لوگ شامل تھے اکسٹھ اشخاص کے تحریری بیان پیش ہوئے جن میں بعض بیان اس قدر محیط اور مفصل تھے کہ انکی ضخامت ٹائپ کے بڑے صفحات ۱۲۷ - ۶۹ اور ۸۴ تک پہونچ گئی تھی۔ ان دو گروہوں میں ایسے اشخاص بھی تھے جن کا زبانی بیان بھی ہوا اور جنھوں نے اپنے تحریری بیان بھی کمیٹی کے سامنے پیش کئے۔

حیدرآباد کی یادداشت ہم نے اس لئے دیدی ہے کہ وہ کمیٹی کی رپورٹ کے ساتھ شائع ہوچکی ہے باقی تمام شہادتیں صیغۂ راز میں رکھی گئی ہیں۔ لیکن کمیٹی کے اصلاحی سفارشوں سے ان بااصول بے لوث اور سچی شہادتوں کا راز خود بخود آشکارا ہوجاتا ہے

صاحبزادہ صاحب کے ۱۲۷ صفحات کے تحریری بیان کے متعلق بھی ہم اس سے زیادہ کچھ لکھنا مناسب خیال نہیں کرتے کہ وہ تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصہ میں علیگڈھ کالج کی ابتدا سے مفصل تاریخ ہے جس میں وضاحت کے ساتھ یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق بانی اعظم کا نصب العین کیا تھا۔ اور آیا موجودہ حالات میں مسلم یونیورسٹی جو ترقی یافتہ پرانے کالج کی دوسری شکل ہے اس نصب العین کے موافق طلبہ کی تعلیم و تربیت کر رہی ہے یا نہیں دوسرے حصہ میں اس خط و کتابت کی نقل ہے

جو شہادت کا مواد جمع کرنے میں صاحبزادہ صاحب نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاءالدین احمد صاحب پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار اور ہر ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال چانسلر مسلم یونیورسٹی کے باہم ہوئی تھی تیسرے حصہ میں تحقیقات سے متعلق تمامی مدات سے بہ تفصیل بحث کی گئی ہے اور اصلاحات کے متعلق صاحبزادہ صاحب نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اس میں سب سے زیادہ قابل لحاظ وہ بحث ہے جو یونیورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن کے نقائص سے متعلق ہے۔

کمیشن کی رپورٹ

بالآخر تحقیقات ختم کرنے کے بعد کمیشن نے اپنی رپورٹ ۹ر نومبر ۲۷ء کو پیش کردی جو ایک علحدہ رسالہ کی صورت میں شائع ہونے کے علاوہ اکثر اخبارات میں بھی شائع ہوئی رپورٹ بہت مبسوط ہے اور گو کہ وہ اس قابل ہے کہ اسکو بجنسہ یہاں نقل کیا جائے لیکن اس سوانح کے صفحات اسکے اعادہ کے متحمل نہیں ہو سکتے اس لئے رپورٹ مذکور سے ہم صرف چند فقرے یہاں درج کئے دیتے ہیں ۔ اس رپورٹ کی تمہید میں اس نصب العین سے پہلے بحث کی ہے جو بانی اعظم کا مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق تھا اور رائے ظاہر کی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی تعلیم و تربیت کا یہی نصب العین ہونا چاہئے ۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ گواہوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نصب العین مفقود ہوتا جاتا ہے ۔خود صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سابق وائس چانسلر نے بھی یہی امر محسوس کر کے ۱۹۲۶ء میں خان بہادر شیخ عبداللہ کی زیر صدارت ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی تھی اس کمیٹی نے ستمبر ۱۹۲۶ء میں اپنی رپورٹ پیش کردی تھی ہم کو بھی اس رپورٹ سے اپنی تحقیقات میں نہایت مفید مدد ملی ہے اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ قواعد ضوابط کی آئندہ نہایت سختی سے پابندی کی جائے اب تک ایسی پابندی میں بہت سستی کی گئی ہے ۔کسی کو اس بات سے انکار کرنے کی جراءت نہیں ہو سکتی کہ یونیورسٹی کا نظم و نسق

اسٹاف حتیٰ کہ طلبہ تک قواعد وضوابط کی پابندی میں سستی کے ذمہ دار ہیں اس بات کے کہنے سے کوئی نتیجہ نہیں ہے کہ ایسی سستی میں کس کا کتنا حصہ ہے یا یہ کہ مسلم یونیورسٹی کے ابتدائی دور میں سستی ناگزیر تھی۔ پس آئندہ اصول مدنظر رکھے جائیں اور قواعد وضوابط پر نہایت پابندی کے ساتھ عملدرآمد کیا جائے، شیخ عبداللہ کمیٹی کے یہ الفاظ نہایت قابل تعریف ہیں ہم بھی ان سے اتفاق کرتے ہیں کہ آئندہ قواعدضوابط پر نہایت پابندی سے عمل کیا جائے۔

کمیٹیوں میں ممبروں کا انتخاب

اپنی تحقیقات میں گواہوں کے بیانات سے ہم کو ثابت ہوگیا ہے کہ کورٹ کی مجلس اور ایگزیکیوٹو کونسل میں ممبری کے انتخاب فریق بندی کے لحاظ سے ہونے لگے ہیں تاکہ ایک فریق فائدہ اٹھائے چنانچہ یونیورسٹی میں علوم کے نئے نئے شعبے قائم کرنے کا اب یہ اصل منشا نہیں ہے کہ علوم کی ترقی ہو۔ نہیں بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ اکیڈیمک (شعبہ تعلیمی) کے فریق کو ووٹ زیادہ حاصل ہوں اور وہ اپنے حسب منشا یونیورسٹی کے انتظام میں دست اندازی کر سکے اسی مقصد سے لکچرار آنریری ریڈر بنا دیئے گئے ہیں کہ وہ اکیڈیمک کونسل میں ممبریاں پانے کے مجاز ہو جائیں۔ تعلیمی اسٹاف میں تقررات اس طرح کئے گئے ہیں کہ باضابطہ "تقرر کی کمیٹی" سے پوچھا تک نہیں گیا۔ یہ صرف اس لئے کہ ایک فریق کے حامیوں کی تعداد میں اضافہ ہو تعلیمی اسٹاف کے ممبروں کی قواعد شکنی محض اس وجہ سے نظر انداز کی گئی کہ یہ قواعد شکن ممبر ایسے فریق سے تعلق رکھتے تھے جس کا اسوقت پورا اقتدار تھا۔ وائس چانسلر کے ایسے اختیارات خصوصی جن کا ضرورت ناگہانی سے تعلق ہے یا تو شکست کئے گئے یا انکی تعمیل نہ کی گئی حتیٰ کہ یونیورسٹی کے کھیلوں کے متعلق بھی گواہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ کپتان اور سکریٹری وہی طلبہ بنائے گئے جو ایک خاص فریق سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ بے عنوانیاں ایسی یونیورسٹی میں عمل میں لائی گئی ہیں جسے مسلم جماعت کی روح کہنی چاہیئے چنانچہ ان بے عنوانیوں سے مسلم جماعت کی جان خطرہ میں پڑ گئی ہے اب آگے چلکر ہم اس مرض کی تشخیص اور علاج سے بحث کریں گے

طلبہ کا داخلہ یونیورسٹی ایکٹ کے واضعان نے طلبہ کے داخلہ کے متعلق قانون میں کافی احتیاط کو پیش نظر رکھکر داخلہ کی کمیٹی کا وجود قائم کردیا اور اس کے قواعد بنادے ہیں۔ اس کمیٹی کا چیرمین پرو وائس چانسلر مقرر کیا گیا ہے جس کو تاکید کی گئی ہے کہ داخلہ کی درخواستیں وہ کمیٹی کے داخلہ کے سامنے پیش کیا کرے اور یہی کمیٹی ہر طالب علم کے متعلق نصاب کا تعین کرے اور یہی فیصلہ کرے کہ بورڈنگ ہاؤس میں جگہ دیجائے اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان قواعد کی کس حد تک تعمیل کی گئی۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں داخلہ کی کمیٹی قائم کردی گئی تھی لیکن حیرت ہے کہ سنہ ۱۹۲۳ء میں اس کمیٹی کا ایک جلسہ بھی نہ ہوا۔ سنہ ۱۹۲۲ء سنہ ۱۹۲۴ء اور سنہ ۱۹۲۵ء میں کمیٹی کا صرف ایک ایک جلسہ ہوا لیکن ان جلسوں میں بھی داخلہ سے متعلق کوئی کام نہیں کیا گیا سنہ ۱۹۲۶ء میں کمیٹی کے چار جلسہ ہوئے جن میں صرف چند خاص داخلوں پر توجہ کی گئی یا چند معمولی رزولیوشن پاس کئے گئے۔ اسی سنہ ۱۹۲۶ء میں ایسے ریگولیشنز پر عملدرآمد شروع کردیا گیا کہ جنکا منشار یہ ہے ہر سال کے آغاز میں داخلہ کی کمیٹی طلبہ کے داخلہ کے کچھ قواعد بنایا کرے اور پرو وائس چانسلر کو اختیار دیا گیا کہ ان قواعد کے مطابق طلبہ کا داخلہ کرلیا کرے اس طرح داخلوں کا اختیار پرو وائس چانسلر کو حاصل ہوگیا۔ اور اب وہی جملہ طلبار کے داخلوں کا ذمہ دار ہوا۔ لیکن داخل ہونے والے طلبا کی فہرست داخلہ کمیٹی کے سامنے انھوں نے کبھی پیش نہیں کی۔ قواعد کی نقل ہم کو نہیں دی گئی۔

اب ہم یہ دکھاتے ہیں کہ ان جدید قواعد کے رُو سے داخلہ کا کام کس طرح کیا گیا طلبہ کی تعداد کا تو یہ حال ہوا کہ جہاں سنہ ۱۹۲۱ء میں ۲۶۱ طلبہ تھے وہاں سنہ ۱۹۲۶ء میں طلبہ

کی تعداد ۴،۱۱۳ ہوگئی۔ اس کثرت سے طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہونا بہت سے گواہوں کے رائے میں بانی اعظم کے نصب العین کے قطعی خلاف ہے ظاہر ہے کہ یونیورسٹی کے تعلیمی اسٹاف کی قابلیت اور تعداد یا بورڈنگ ہاؤسوں کی گنجائش کا اس داخلہ کے معاملہ میں لحاظ نہیں رکھا گیا ہے گواہوں نے بیان کیا ہے کہ تعلیمی شعبہ کے افسروں سے داخلہ کے معاملہ میں کبھی یہ مشورہ نہ لیا گیا۔ کہ اُن کے شعبوں میں کس تعداد کے طلبہ کو واقعی طریقہ سے تعلیم دینے کی گنجائش تھی اور نہ یہ دیکھا گیا کہ ہوسٹلوں میں گنجائش کا کیا حال تھا۔ اسکے سوا ہمارے سامنے نہایت معتبر شہادت موجود ہے کہ ایسے ایسے طلبہ مسلم یونیورسٹی میں داخل کر لئے گئے جو دوسری یونیورسٹی سے نکال دیے گئے تھے۔ مزید برآں یہ بھی کیا گیا ہے کہ سال کے اندر جب کبھی کسی طالب علم نے داخلہ چاہا وہ فوراً داخل کر لیا گیا۔ اسی حالت کے متعلق عبداللہ کمیٹی نے یہ سفارش کی تھی کہ طلبہ کے داخلہ کی آخری تاریخ ۵ رنومبر مقرر کیجائے" پرو وائس چانسلر نے شعبہ تعلیمی کے افسروں سے یہ مشورہ بھی نہ کیا کہ طالب علم کو کونسا نصاب دیا جائے۔

چنانچہ ہم سفارش کرتے ہیں کہ آئندہ داخلہ کی کمیٹی ایکٹ اور آرڈیننس کی پوری پابندی کے ساتھ داخلوں کا کام کیا کرے۔

تعلیم دینے والے اساتذہ اور علمی شعبے

مسلم یونیورسٹی کو اپنے تعلیمی اسٹاف میں دو قسم کے استادوں کی ضرورت ہے یعنی اول تو یہ استاد اعلیٰ درجہ کی تعلیمی ڈگریاں رکھتے ہوں ان کا چال چلن نہایت شریفانہ اور ارفع ہو اور اسکے ساتھ ان میں تعلیم دینے کی اعلیٰ قابلیت ہو تاکہ علیگڈھ کالج کی پرانی روایات برقرار ہیں دوسرے ایسے تعلیم والے استاد جو علوم کو ترقی دینے میں درحقیقت خود مشغول و منہمک ہوں۔

اس وقت مسلم یونیورسٹی میں ایسے دونوں قسم کے استاد موجود ہیں۔ پھر بھی ہمارے

رائے میں طلبہ کی جملہ ضروریات کے لحاظ سے یہ لوگ کافی تعداد میں نہیں ہیں ان تعلیم دینے والوں میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنکے پاس اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں نہیں ہیں۔ اور بعض علمی شعبوں میں طلبہ کی تعداد کی نسبت سے تعلیم دینے والوں کی تعداد نہایت کم ہے۔

سب سے پہلے اس مد کے متعلق ہم نے استادوں کی علمی قابلیت اور تنخواہوں کا ایک مفصل نقشہ طلب کیا۔ لیکن ایسا نقشہ ہم کو ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد دیا گیا اس تعویق سے ہمکو معلوم ہوا کہ یونیورسٹی میں ایسا کوئی مفصل نقشہ نہیں رکھا جاتا جس سے استادوں کی علمی قابلیت اور تنخواہوں کا پتہ چلے یہاں تک ہوا کہ ایسا نقشہ مہیا کرنے میں رجسٹرار کو بعض باتیں جو ہم جاننا چاہتے تھے خود اُستادوں سے پوچھنی پڑیں جب جاکر وہ نقشہ بنا سکا۔

اس کے بعد ہم نے اسٹیچوٹ ۲۰ کے ماتحت جس کا یہ منشا ہے کہ اُستادوں کا تقرر ایک خاص کمیٹی کی سفارش سے ہوا کریگا جس کا نام تقرر کی کمیٹی ہوگا واقفیت کرنی چاہی۔ پہلے ایک فہرست دی گئی جس پر رجسٹرار کے دستخط تھے اس فہرست سے معلوم ہوا کہ منجملہ چالیس تقرر کے اُنیس تقرر ایسے ہوئے تھے جن کا معاملہ تقرر کی کمیٹی کے سامنے پیش نہیں کیا گیا اس پر ہم نے پرو وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کا بیان لیا۔ انھوں نے اس فہرست کی صحت پر اعتراض کیا۔ چنانچہ اس فہرست کے بعد ہم کو ایک دوسری فہرست بھیجی گئی اس فہرست پر بھی رجسٹرار کے دستخط تھے اس فہرست میں بے ضابطہ تقرر کی تعداد نہایت ہی خفیف دکھائی گئی تھی پس ایسی کارروائی سے صاف ظاہر ہو گیا کہ جب تک ہم خود دفتر کے کاغذات کا معائنہ نہ کریں بے ضابطہ تقرر کی تعداد ہم کو ہرگز صحیح نہیں معلوم ہو سکتی لیکن ظاہر ہے کہ ذاتی طور پر کاغذات معائنہ کرنے کا ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔

لہٰذا ہم یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ استادوں کے تقرر میں ضرور بے ضابطگی کی گئی ہے اگر ایسے تقررات کے متعلق کافی اعلان کیا جاتا اور اشتہار دیا جاتا اور باضابطہ تقرر کی کمیٹی کے

سامنے تقرر کا معاملہ پیش کیا گیا ہوتا تو نا قابل آدمی جگہ نہ پا سکتے تھے۔

یونیورسٹی میں یہ بھی کیا گیا ہے کہ نیچے کے استادوں کو ترقیاں دیکر جگہیں پُر کردی گئی ہیں اور یہ نہیں دیکھا گیا ہے کہ جسے ترقی دیجا رہی ہے وہ اس نئی جگہ پر کام کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ ریڈروں کو پروفیسروں کے عہدہ پر اور لکچراروں کو ریڈروں کے درجہ پر ترقیاں دیدی گئیں اور یہ نہ دیکھا گیا۔ کہ کوئی دوسرا باہر کا شخص بھی جو واقعی ان عہدوں کا اہل ہو سکتا تھا۔ یا نہیں پس ہم سفارش کرتے ہیں کہ آیندہ ایسی بے ضابطہ کاروائیاں قطعی موقوف کردی جائیں آنریری ریڈروں کے مقرر کئے جانے کے بھی ہم قطعی خلاف ہیں جب تک قابل لوگوں سے یہ مشورہ نہ لیا جائے کہ ایسا آنریری ریڈر اہل بھی ہے یا نہیں آنریری ریڈر مقرر نہ کیا جائے ایک آنریری ریڈر نے ہم سے صاف صاف اقرار کیا کہ جس مضمون کے متعلق وہ آنریری ریڈر بنا دیا گیا ہے اس مضمون سے اسے کافی واقفیت نہیں ہے

بعض گواہوں نے اس پر زور دیا ہے کہ تقرر کی کمیٹی میں باہر کے ماہرین بھی شامل کئے جائیں چند دوسری یونیورسٹیوں میں ایسا کیا جاتا ہے اس رائے سے ہم کو اتفاق ہے اگر تقررات کے موقع پر باہر کے ماہرین سے مشورہ لیا جائے۔ اور ان کو سفر کے مصارف دئے جائیں تو ایسے مصارف بیجا نہیں ہو سکتے اس کے علاوہ تقرر کمیٹی کے ممبر جیسے اب تک انتخاب ہوتے رہے ہیں وہ طریقہ بھی قابل اطمینان نہیں ہے اس لئے ہم سفارش کرتے ہیں کہ جو شخص تقرر کا خود امیدوار ہو یا کسی تقرر طلب جگہ کا امیدوار خیال جا سکے وہ اس خاص تقرر کمیٹی کا ممبر نہ بنایا جائے خالی جگہ کے لئے ہمیشہ سختی کے ساتھ یہ عملدرآمد رکھا جائے کہ کافی اعلان کیا جائے اور اشتہار دیا جائے اور امیدواروں کی درخواستیں طلب کی جایا کریں اور لائق ترین امیدواروں کا تقرر کیا جایا کرے۔

جدید علمی شعبے۔ قواعد کی رُو سے مسلم یونیورسٹی میں پندرہ شعبے موجود ہیں لیکن ان کے سوا چار جدید شعبے یعنی فن تعلیم سنسکرت۔ علم حیوانات۔ اور علم نباتات کے اور قائم کیئے گئے ہیں مگر یہ لحاظ نہیں کیا گیا ہے کہ ان پر مصارف کس قدر ہوں گے یا ان شعبوں کے اساتذہ کو کس کس سامان کی ضرورت ہوگی یا ایسے شعبوں کی مانگ اور ضرورت بھی ہے یا نہیں چنانچہ جدید شعبہ کے متعلق ایسا لحاظ شدید طریقہ سے ضروری ہے اور جب تک موجودہ شعبے ہر طریقہ سے مستقل اور مستحکم نہ ہو جائیں جدید شعبوں کا قائم کرنا۔ دور اندیشی کے خلاف ہے

اسلامک اسٹڈیز۔ ۱۹۲۴ء میں پرو وائس چانسلر نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا اسلامک اسٹڈیز کے نصاب کا مسودہ تیار ہو گیا ہے اور اسکی تعلیم آئندہ تعلیمی سال کے آغاز سے شروع کر دی جائے گی۔ ہم کو نہایت معتبر طریقہ سے معلوم ہوا ہے کہ اگرچہ ۱۹۲۵ء میں اسلامک اسٹڈیز کا تنخواہ دار ریڈر مقرر ہو چکا تھا۔ لیکن ۱۹۲۵ء میں اسلامک اسٹڈیز کے متعلق صرف تین طالب علم تھے اس موقع پر یہ کہدینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یونیورسٹی کے اس عربی مدرس کو تین عہدوں پر پے در پے تین ترقیاں دی گئیں یعنی وہ لکچرار کیا گیا۔ اعزازی ریڈر بنایا گیا اور پھر تنخواہ دار ریڈر کر دیا گیا اور ان تینوں ترقیوں کے موقعوں پر کبھی تقرر کی کمیٹی کے سامنے ترقی کا معاملہ پیش نہ کیا گیا۔ پس جب ۱۹۲۱ء میں اسکی تنخواہ ایک سو پچہتر روپیہ ماہوار تھی وہ ۱۹۲۶ء میں ۴۰۰ روپیہ ماہوار کر دی گئی۔

یونیورسٹی کے امتحانات

امتحانات کی جانچ کا معاملہ نہایت پیچیدہ اور دشوار ہے یعنی صرف امتحانات کے سوالات کے پرچے ہی نہ دیکھنے ہوں گے بلکہ جوابات کی کاپیاں بھی جانچ کرنی ہونگی یہ کام ماہرین

کی ایک خاص کمیٹی کا ہے تاہم بعض ضروری امور کے متعلق ہم اپنی رائے لکھتے ہیں۔

(۱) یونیورسٹی کے امتحانوں میں باہر کے ممتحن بھی مقرّر کئے گئے ہیں لیکن اس تعداد سے زیادہ باہر کے ممتحن مقرّر کئے جایا کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

(۲) بلا امتیاز داخلہ کی کثرت کی بابت ہم اوپر بحث کر چکے ہیں اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ طلبہ اعلیٰ نمبروں پر کم پاس ہوتے ہیں پس داخلہ میں پوری احتیاط ہونی چاہیئے۔

(۳) بعض طلبا فائنل امتحان کے سال کے آغاز میں اپنے نصاب تبدیل کر لیتے ہیں اور پاس کر دیئے جاتے ہیں یہ طریقہ اصلاح طلب ہے۔

(۴) امتحانات کا انتظام کرنا صرف رجسٹرار کا فرض ہے۔ لیکن اس کام پر بہت کچھ پرو وائس چانسلر نے قبضہ کر رکھا ہے یہ نہ ہونا چاہیئے صرف رجسٹرار ذمہ دار ہے۔

(۵) یہ بھی ثابت ہوگیا ہے کہ امتحانات میں بعض طلبا نقل کرنے یا دوسری ناجائز حرکات کرتے پکڑے گئے لیکن وہ امتحان میں شریک رکھے گئے یا زیادہ سے زیادہ صرف ایک سال کے واسطے امتحان سے روکے گئے اور آئندہ سال وہ امتحان میں شریک کئے گئے یہ بات نہایت بے قاعدہ ہے یا تو ایسا طالب علم قطعی نکال دیا جائے یا کم سے کم دو سال کے واسطے امتحان سے روکا جائے۔

(۶) گواہوں کے بیانات سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے اگر طالب علم اصلی امتحان میں وقت پر شریک نہ ہوا تو اس اصل امتحان کے بعد اس کا علیٰحدہ امتحان لیا جاتا ہے یہ طریقہ بھی ٹھیک نہیں ہے اگر کوئی نہایت ہی مخصوص اس قسم کی ضرورت پیش آجائے تو ایسے طالب علم کے امتحان لینے میں باہر کے ممتحن بھی شریک کئے جائیں۔

(۷) یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ بہت سے طلبا کا بیماری کی حالت میں شفاخانہ اندر بھی امتحان لیا گیا ہے یہ طریقہ بند کیا جائے اور نہایت ہی مخصوص حالت میں پوری نگرانی کے ساتھ ایسا امتحان لیا جائے۔

(۸) یہ بھی ثابت ہے کہ باقیدار طلبہ یونیورسٹی کے امتحانوں میں پورے مطالبہ ادا کئے بغیر شریک کر لئے جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرو وائس چانسلر نے اس معاملہ میں اپنے کو خود مختار تعین کر لیا ہے اس رائے میں ہمارے ساتھ یونیورسٹی کا ٹریژرر بھی متفق ہے یہ طریقہ محفوظ نہیں ہے اسی وجہ سے بعض موقعوں پر ڈگری کے امتحانوں کے نتیجے روکے گئے ہیں اور اصل پہلا نتیجہ شائع ہو جانے کے چھ ماہ بعد روکے ہوئے نتیجے شائع کئے گئے ہیں یہ عمل قطعی بند کر دیا جائے اور اس قاعدہ پر نہایت سختی کے ساتھ عمل کیا جائے کہ باقیدار طالب علم جب تک پوری بقایا ادا نہ کرے ہرگز امتحان میں شریک نہ کیا جائے۔

پرائیوٹ طلبہ یونیورسٹی ایکٹ کی رُو سے ڈگری کے امتحانات خاص صورتوں میں تعلیم دینے والے استاد دیسکتے ہیں۔ لیکن ڈگری کے امتحان کے متعلق یونیورسٹی ایکٹ کے خلاف ورزی کی گئی یعنی امتحان کے بورڈ کی مٹینگ میں جس میں پرو وائس چانسلر اور صرف ایک ممبر تھے۔ پرو وائس چانسلر کے مختصر نویس اور لائبریری کے ایک کلرک کو ڈگری کے امتحان میں پرائیوٹ طور پر شریک ہونے کی اجازت دیدی گئی۔

انٹرمیڈیٹ امتحان میں بھی پرائیوٹ طلبہ کے متعلق قریب قریب ایسی ہی قیود ہیں ۱۹۲۵ء میں ۲۳۷ پرائیوٹ طلبہ شریک کئے گئے اور ۱۹۲۶ء میں ۴۰۲ اور ۱۹۲۷ء میں ۴۶۰ طلبا پرائیوٹ طریقہ سے امتحان میں شریک کئے گئے۔

ہائی اسکول امتحان کے متعلق اگرچہ کوئی مخصوص آرڈیننس نہیں ہے تاہم قواعد بنائے گئے ہیں۔ لیکن ان قواعد کی پابندی نہیں کی گئی۔ یہ دیکھنے سے کہ بمقابلہ باقاعدہ طلبہ کے پرائیوٹ طلبہ کی تعداد غیر معمولی طور پر زیادہ ہے ظاہر ہوتا ہے کہ قواعد پر عمل نہیں کیا گیا۔ پرائیوٹ امیدواروں کی درخواست میں یہ بھی ظاہر نہیں کیا گیا ہے کہ سب سے آخر وہ کس اسکول میں پڑھتے تھے یا وہ اسکول کے کسی درجہ میں تعلیم پاتے تھے۔ ان کے چال چلن پر ہیڈ ماسٹر یا انسپکٹر مدارس یا کسی گزیٹیڈ افسر کے بہت سی مثالوں میں دستخط تک موجود نہیں ہیں ہمارے

سامنے کثرت سے ایسی مثالیں پیش کی گئی ہیں کہ قواعد کی پابندی کی مطلق پروا نہیں کی گئی حتیٰ کہ ایک طالب علم کی ہمارے سامنے عجیب مثال پیش کی گئی یہ طالب علم مسلم یونیورسٹی اسکول کی آٹھویں جماعت میں تھا۔ سالانہ امتحان میں وہ ناکام رہا مزید اطمینان کی غرض سے اسکا دوبارہ امتحان لیا گیا اور پھر ناکام رہا۔ چنانچہ اسی آٹھویں جماعت سے اس نے مدرسہ چھوڑ دیا۔ مگر صرف سات مہینہ کے بعد ہی لڑکا ہائی اسکول امتحان میں پرائیویٹ طریقہ سے داخل کر لیا گیا۔ اور وہ پاس بھی کر دیا گیا اس طالب علم کے متعلق ہیڈ ماسٹر کی کوئی رپورٹ موجود نہیں ہے کہ اس نے کس جماعت سے اسکول چھوڑا تھا اسکا چال چلن کیسا تھا حیرت ہے کہ ایسا نالائق لڑکا اگر وہ مدرسہ میں پڑھتا رہتا تو دو سال کے بعد ہائی اسکول امتحان پاس کر سکتا تھا۔ صرف سات مہینہ میں پرائیویٹ طریقہ سے پاس ہو گیا۔

ہم کو یہ بھی معلوم ہوا کہ کامیاب طلبہ کے سرٹیفکٹ میں یہ نہیں لکھا جاتا کہ آیا باقاعدہ اسکول کا طالب علم تھا یا وہ پرائیویٹ تھا اس فروگذاشت کا یہ نتیجہ ہے کہ بہت سے نوجوان فخر کرتے پھرتے ہیں کہ وہ مسلم یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں درآں حالیکہ علیگڑھ کی تعلیم سے ان کو کوئی واسطہ نہیں۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ ان خرابیوں کا سدباب کیا جائے اور پرائیویٹ طلبہ کے بارے میں نہایت احتیاط سے کام ہو۔ پرائیویٹ نالائق طلبہ پاس ہو کر یونیورسٹی میں داخلہ کے حقدار ہو جاتے ہیں اور یونیورسٹی میں قابلیت کا معیار گرتا چلا جاتا ہے۔

یونیورسٹی اور سیاسیات

۱۹۲۳ء میں ڈاکٹر ضیاء الدین پرو وائس چانسلر اور ڈاکٹر ایل کے حیدر پروفیسر اقتصادیات سیاسیات کے میدان میں آئے اور صوبہ کی لیجسلیٹو کونسل اور لیجسلیٹو اسمبلی میں ممبر ہوئے ان حالات کو دیکھتے ہوئے جن سے مسلم یونیورسٹی اس زمانہ میں گذر رہی تھی یہ زمانہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ یہ دو صاحبان سیاسیات میں شریک ہوتے۔

۱۹۲۶ء میں ایل کے حیدر نے اپنا دوسری دفعہ انتخاب کرایا اور مسٹر حلیب پروفیسر تاریخ صوبہ کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر ہوئے ان باتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کی مسلسل غیر حاضریوں سے کے تعلیم کا کام خراب ہوا دوسرا نقصان یہ ہوا ۔ کہ ووٹ حاصل کرنے کو یونیورسٹی کے طلبہ کے گروہ برابر اضلاع کے گشت کرتے پھرے اور ان کی تعلیم کا اس غیر حاضری سے شدید نقصان ہوا ۔

ہم سفارش کرتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی کا کوئی تعلیم دینے والا استاد آئندہ کونسلوں کی ممبری کی امیدواری کے لئے کھڑا نہ ہو ۔

وائس چانسلر اسٹیچوٹس میں وائس چانسلر کے یہ فرائض لکھے ہیں کہ وہ ایکٹ اسٹیچوٹس آرڈیننسز اور ریگولیشنز کے متعلق یہ دیکھتا رہے کہ ان کی باقاعدہ تعمیل ہوتی ہے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے اپنی وائس چانسلری کے اواخر میں واقعی طور سے اس طرف توجہ کی کہ قواعد کی جو خلاف ورزیاں ہو رہی تھیں وہ رد کی جائیں ۔

یونیورسٹی کی مالی حالت یونیورسٹی کی مالی حالت مضبوط ہوتی ہے اگرچہ آئندہ جدید ترقیوں کے لئے مزید روپیہ کی ضرورت پڑے گی حساب کے متعلق یونیورسٹی میں تفصیلی قواعد نہیں ہیں جن سے یہ معلوم ہو کہ ٹریژرر چیف اکاونٹینٹ فائی نینس کمیٹی ۔ ایگزیکیوٹو کونسل یا ان اشخاص کے جن کا تعلق مصارف سے ہے جدا جدا کیا فرائض ہیں ایسے قواعد بنا لینے چاہئیں تاکہ انتظام ٹھیک ٹھیک ہو ۔

مستقبل مسلم یونیورسٹی کے موجودہ حالات پر ہم اپنی رائے کا اب اظہار کر چکے ہیں ہم اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ یونیورسٹی کی حالت تردد خیز ہے سازشیں اور فریق بندی یونیورسٹی کا خون چوسے لیتی ہیں ۔ یونیورسٹی کے قواعد بجائے اسکے کہ حفاظت کے ضامن ثابت ہوتے فریق بندی کے ہاتھوں میں ایک آلہ اور کھلونا ہو رہے

ہیں کاغذ پر لکھے ہوئے یہ قواعد تو جمہوریت کے اصول لئے ہوئے ہیں لیکن درحقیقت ان قواعد کی تاویل اس طرح کیجاتی ہے کہ کسی ایک فریق کے مقاصد پورے ہوں تمام ہندوستان کے مسلمان متردد ہیں یہ چاہتے کہ جس طرح بھی ممکن ہو علیگڈھ مسلم یونیورسٹی جملہ مسلم درسگاہوں سے اعلیٰ درجہ پر پہونچائی جائے یونیورسٹی کے بہت سے خیر طلب گواہ یہ خواہش ظاہر کر رہے ہیں کہ موجودہ بدنظمی دور کی جائے

طلبہ کی حالت امید افزا ہے اپنی تحقیقات کی دوران میں ہم طلبہ سے ملتے رہے ہم پر ثابت ہوا کہ طلبا کو علیگڈھ سے محبّت ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ علیگڈھ کی شہرت اور نیک نامی قائم ہو علیگڈھ میں عمدہ سامان موجود ہے لیکن ضرورت اسکی ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت عمدہ طریقہ سے ہو۔

کام کے کرنے کا راستہ صاف ہے اگر علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کو وسیع اور سرسبز بنانا ہے تو فریق بندی کی جڑ کاٹ دینا سب سے زیادہ ضروری ہے کورٹ اور اگزیکیوٹو کونسل میں تازہ روح کی حاجت ہے تاکہ یونیورسٹی کو ترقی ہو۔ ان مجالس میں ممبران کے درمیان فریق بندی کا خیال باقی نہ رہنا چاہئے۔ اگر کامیابی مطلوب ہے تو اسوقت تک یونیورسٹی میں نئی روح نہیں پھونکی جاسکتی جب تک ایسے افراد کا یونیورسٹی سے تعلق باقی ہے جنھوں نے پچھلے چند سالوں میں فریق بندی کی سرگرمی کی ہے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین کے متعلق ہم کو تسلیم ہے کہ وہ بڑے عالم بھی ہیں ایک عرصہ دراز تک انھوں نے کالج اور یونیورسٹی کی خدمت بھی کی ہے اور علیگڈھ سے ان کو گہری محبت بھی ہے لیکن ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ چونکہ زمانہ حال کی مصیبتوں سے انکا نہایت ہی قریب تعلق رہا۔ اس لئے یونیورسٹی کی ملازمت میں ان کا اب آئندہ باقی رہنا نئے اتحاد اور ترقی کے خلاف ہے اور یہ اتحاد اور ترقی یونیورسٹی کی کامیابی کے لئے اشد ضروری ہے پس ڈاکٹر ضیاء الدین کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ

رخصت لے لیں اور بعد کو کنارہ کش ہو جائیں۔

ہماری رائے میں ضروری ہے کہ پرو وائس چانسلر کے فرائض کسی دوسرے شخص کی سپرد کئے جائیں اور نیا شخص ایسا ہو جس کو علیگڈھ کے موجودہ جھگڑوں سے کبھی واسطہ نہ رہا ہو۔ ایسا شخص تحریری معاہدہ کے ساتھ تین سال کے واسطے رکھا جائے جسکے بعد وہ دوبارہ پرو وائس چانسلر نہ کیا جائے کوئی کار تعلیمی بھی اس کے سپرد نہ کیا جائے۔

یونیورسٹی کے موجودہ تعلیم دینے والے اسٹاف کی بابت اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ بہت سے اُستادوں کا بے قاعدہ تقرر ہوا ہے اور بہت ایسے ہیں جو اپنی قابلیت سے زیادہ تنخواہیں پا رہے ہیں بہت سے ایسے بھی ہیں جو فریق بندی میں شریک رہے ہیں یا گزشتہ احسانات کے مرہون منت ہیں چنانچہ نئے اصلاحی دور میں ہم توقع کرتے ہیں کہ ذاتی جھگڑوں کے بجائے علیگڈھ اور اس کی پرانی روایات سے محبت پیدا ہو کر مسلم یونیورسٹی کو پوری ترقی حاصل ہوگی فقط

(دستخط اراکین کمیشن)

۹ نومبر ۱۹۲۷ء

کمیشن کی رپورٹ پر ایک نظر

ان اوراق میں اس تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ کا پورا ترجمہ داخل نہیں کیا گیا لیکن جہاں تک ہو سکا چند ضروری و اہم سفارشیں اختصار کے ساتھ درج کر دی گئی ہیں۔ ان سفارشوں پر کسی تبصرہ کی بھی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں خرابیاں اور بدنظمیاں ثابت ہوئیں اور تحقیقاتی کمیشن نے ضروری اصلاحوں کی کافی تفصیل کر دی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحبزادہ صاحب نے جو خرابیاں یونیورسٹی کے انتظام میں محسوس کی تھی اور جس کے دور کرنے میں انھوں نے انتہائی کوشش کی تھی ان کو کمیشن نے اپنی رپورٹ میں تسلیم کیا اور ان کے دفعیہ کی تجاویز کورٹ کے سامنے

پیش کردیں جس پر کورٹ کے خاص اجلاس نے ۱۵ اپریل ۱۹۲۸ء کو غور کیا کورٹ نے ایک قانونی کمیٹی بنادی کہ وہ قانونی نقائص کے متعلق جو کمیشن کی رپورٹ میں لکھے تھے تجاویز پیش کردیں اور مسٹر ڈولنز اسپیشل افسر کو گورنمنٹ نے تعینات کیا۔ انھوں نے ایک مفصل رپورٹ تیار کی اور ان جملہ کمیٹیوں کی رپورٹ ۹ و ۱۰ فروری ۱۹۲۹ء کو کورٹ کے سامنے پیش ہوئی اور کورٹ نے ان رپورٹوں کو ایگزیکیوٹو کونسل اور اکیڈیمک کونسل کے پاس بھیجدیا۔ اور ان کی رپورٹیں آنے کے بعد کورٹ نے اصل منظوری رپورٹ پر ۲۷ مارچ اور ۷ جولائی ۱۹۲۹ء کو دی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب پرو وائس چانسلر نے ۲۷ اپریل ۱۹۲۸ء کو اس سے قبل استعفیٰ دیدیا تھا اور ۹ فروری ۱۹۲۹ء کو نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب وائس چانسلری کے عہدہ سے مستعفی ہوگئے اور سر شاہ محمد سلیمان صاحب قائم مقام وائس چانسلر نے چارج لیا۔ انھیں کے زمانہ میں کمیشن کی سفارشات پر عملدرآمد شروع ہوگیا۔ لیکن اصلی کام اصلاح کا اسوقت شروع ہوا کہ جب سر سید راس مسعود مستقل وائس چانسلر ہوکر علیگڈھ آگئے سر سید راس مسعود نے جب وائس چانسلری کا چارج لیا تو اس وقت مسٹر ہارن پرو وائس چانسلر تھے مسٹر ہارن نے کمیشن کی رپورٹ اور سفارشات پر بہت زیادہ چھان بین کی اور جن ممبران اسٹاف کو علیحدہ کرانا تھا ان کو علیحدہ کرادیا۔ سر راس مسعود کو بہت عمدہ موقع اصلاح کرنے کا مل گیا تھا تقریباً ۳ سال تک ایگزکیوٹو کونسل صرف تین اصحاب پر مشتمل رہی یعنی وہ خود ٹریزرر اور پرو وائس چانسلر بس ان کو یہ دُرین موقع حاصل ہوا تھا اور ایک حد تک وہ اپنے کوششوں میں کامیاب بھی ہوئے لیکن بعض وجوہ سے وہ اصلاحات کو اس حد تک نہ پہونچا سکے جو علیگڈھ کو از سر نو زندہ کرنے کے واسطے ضروری تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۳۵ء میں وہی حالات عود کر آئے جنکا ذکر رحمت اللہ کمیٹی کی رپورٹ میں بالتفصیل ہے اور جن کو کمیٹی مذکور نے بدل دینے کے واسطے سفارش کی تھی۔ افسوس صد ہزار افسوس۔۔۔۔

باب دہم

ذاتی حالات

صاحبزادہ صاحب کی پبلک زندگی کے کارنامے صفحات گذشتہ میں ناظرین نے ملاحظہ کئے یہ باب ان کی پرائیویٹ زندگی و حالاتِ خانگی پر مشتمل ہے۔

شکل و شمائل

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں لڑکپن میں بقول مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی (مرحوم) "اس قدر گورے تھے کہ بالکل یورپین معلوم ہوتے تھے۔ جوان ہو کر ان کے بال کسی قدر بھورے رنگ کے ہوگئے۔ لڑکپن میں سنہری تھے وہ بھی ہلکے رنگ کے سنہری تھے"۔ خود سرسید نے ایک دن کرکٹ فیلڈ میں آفتاب احمد خاں کو ایک معزز انگریز عہدہ دار کے دریافت کرنے پر اوّل مذاقاً بتلایا کہ یہ لڑکا آرمینیا کا ہے۔ اور پھر صحیح پتہ بتلایا کہ خاندان نواب کنجپورہ کا لڑکا ہے۔ صاحبزادہ صاحب جوانی میں جامہ زیب سڈول کسرتی بدن اور خوش رو چہرہ کی وجہ سے ہر مجمع میں جاذب نظر تھے۔ ایک مرتبہ لکھنؤ کے اسٹیشن پر جبکہ وہ ایک قومی جلسہ سے واپس ہو رہے تھے یہ دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ اس زمانہ میں اس ریلوے (اودھ روہیلکھنڈ ریلوے) پر ہندوستانی اور انگریزوں کے واسطے جداگانہ فرسٹ و سیکنڈ کلاس کی گاڑیاں ہوتی تھیں۔ صاحبزادہ صاحب (جو اس وقت انگریزی لباس میں تھے) مع اپنے چند دوستوں کے ہندوستانی فرسٹ کلاس میں آکر بیٹھ گئے۔ رفتہ رفتہ لوگ اور زیادہ آگئے۔ جب یہ حالت ہوئی تو اسٹیشن کے کسی اینگلو انڈین افسر نے صاحبزادہ صاحب سے آکر کہا کہ آپ کی گاڑی میں تو بہت

جگہ ہے آپ یہاں کیوں تکلیف سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس پر صاحبزادہ صاحب نے یہ جواب دیا کہ میں ہندوستانی ہوں اور یہاں اپنے دوستوں کے ساتھ آرام سے ہوں۔

لباس

بچپن میں اور ایم۔ اے۔ او کالج کے زمانہ قیام میں صاحبزادہ صاحب علی العموم ہندوستانی کپڑے پہنا کرتے تھے۔ اور اکثر کامدار ٹوپی اور کبھی کبھی زرّیں سیلا باندھا کرتے تھے۔ ولایت کے تعلیم کے زمانہ میں انھوں نے انگریزی لباس اختیار کیا لیکن کانفرنس اور علی گڈھ کے قومی جلسوں میں علی العموم وہ اُس زمانہ کی کالج یونیفارم (ترکی ٹوپی ترکی کوٹ اور پتلون یا پتلون نما پاجامہ) پہنا کرتے تھے۔ اور اپنے دوستوں کو بھی اسی لباس کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ بلکہ جس زمانہ میں وہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سکریٹری تھے تو انھوں نے ایک ریزولیوشن اسی مضمون کا منظور کرایا تھا کہ اولڈ بوائز و جملہ دیگر اصحاب جنکا علی گڈھ تحریک سے تعلق ہے اس لباس کو جس کو وہ قومی لباس کرانا چاہتے تھے اختیار کریں۔

انڈیا کونسل سے واپسی کے بعد انھوں نے انگریزی لباس تقریباً ترک کر دیا تھا اور ڈاڑھی بھی رکھ لی تھی۔ اس زمانہ میں وہ علی العموم شروانی پہنا کرتے تھے مگر دھوپ کے وقت ہیٹ (Hat) کا استعمال شیروانی پر کیا کرتے تھے اور گرمی میں ہیٹ کے ساتھ چھتری استعمال کرتے تھے اور چھڑی ہمیشہ ہاتھ میں رکھتے تھے اسکا یہ نتیجہ ہوا کہ علی گڈھ میں انگریزی لباس کا استعمال کم ہو گیا اور ہیٹ جو پہلے صرف انگریزی لباس کے ساتھ ہی پہنے جا سکتے تھے ہندوستانی کپڑوں کے ساتھ استعمال ہونے لگی۔ اور اب تک یہاں علیگڈھ میں یہی رواج ہے بلکہ بعض دیگر شہروں میں بھی اسی طرح عمل ہونا شروع ہو گیا ہے۔ ہیٹ کے متعلق صاحبزادہ صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ انگریزی چیزوں میں یہ بہترین چیز ہے اور امر واقعہ بھی یہی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ ہر شعبۂ زندگی میں خذ ما صفا ودع ما کدر کے زرّین اصول پر عامل تھے۔

سودیشی اشیاء کے ساتھ طبیعت کا لگاؤ

حتی الامکان ہندوستان کی بنی ہوئی چیزوں کا صاحبزادہ صاحب ہمیشہ استعمال کیا کرتے تھے یہ شوق ان کو عنفوان شباب سے تھا جبکہ ہندوستان میں سودیشی پرچار کا نام بھی نہ تھا اور نہ کھادی بھنڈاروں کے نام سے کوئی واقف تھا۔ جب سے وہ علیگڈھ میں سکونت پذیر ہوئے تھے ان کا یہ معمول تھا کہ ضلع کی نمائش میں خود جاکر ضلع کا بنا ہوا کپڑا خرید اکرتے تھے۔ اور پھر اپنے دوستوں کو دکھلایا کرتے تھے کہ ولایتی کپڑے کے مقابلہ میں یہ کس قدر مضبوط اور کفایت کا سودا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ مہاتما گاندھی نے ہندو قوم کو جو پہلے سے ہی کفایت شعار تھی کس قدر اسراف سے بچادیا ہے اور یہ کہ اصل میں کھدر پرچار مسلمانوں میں ہونا چاہئیے جو ہندوؤں کے مقابلہ میں مفلس قوم ہے اور جس کو ضرورت سادہ زندگی بسر کرنے کی ہے۔ خود ان کے مکان میں زیب و زینت کا سامان کم تھا۔ اور جو کچھ تھا تقریباً وہ سب ہندوستان کا ہی بنا ہوا ہوتا تھا۔ آخر عمر میں وہ کھدر کا زیادہ استعمال کرنے لگے تھے۔ حالانکہ اس کو ان کے بعض دوست جو انگریزیت کے دلدادہ تھے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن ان کو اس کی مطلق پروا نہ تھی۔ اور وہ سمجھتے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ مسلمانوں کو جس طرح بھی ممکن ہو ہر قسم کے اسراف اور بالخصوص مغربی طرز معاشرت سے بچانا چاہئیے۔

کھانا میں اسراف

علی گڈھ میں اسراف علی گڈھ تحریک کی ابتدا سے داخل ہو گیا تھا۔ ہر شخص (اِلّا ماشاء اللہ) اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتا تھا۔ صاحبزادہ صاحب نے کوشش کی کہ اس سیلاب کو جہاں تک ممکن ہو روکا جاوے چنانچہ انھوں نے تجویز کیا کہ چار قسم کے کھانوں سے (جس میں ایک دال بھی شامل تھی) زیادہ کسی دعوت میں نہ دیئے جاویں۔ اسکی ابتدا انھوں نے خود کی اور نواب وقار الملک بہادر جو اس زمانہ میں کالج کے آنریری سکریٹری تھے اس تجویز پر نہایت گرمجوشی کے ساتھ عمل فرمانے لگے۔ چند مقامی ٹرسٹی بھی اس میں شریک ہو گئے! اور دو تین سال تک اس طریقہ پر عمل ہوتا رہا۔

مگر جو چیز (اسراف) کہ قوم کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی وہ ایسی محدود کوششوں سے اس روز افزوں سیلاب کو کیسے روک سکتی تھی۔ نتیجہ وہ ہی ہوا کہ علیگڈھ اسراف کے گرداب میں حسب معمول پھنسا ہوا ہے۔

قومی خدمت کرنے والوں کی قدردانی

صاحبزادہ صاحب قومی خدمات انجام دینے والوں کے کاموں سے بہت جلد متاثر ہوتے تھے اور ابتدا ہی میں ان کی نسبت اعلیٰ درجہ کی رائے قائم کرکے انکے مداح بن جاتے تھے۔ کچھ دنوں کے تجربے کے بعد بعض صورتوں میں جب یہ اصحاب ان کے معیار پر پورے نہ اترے تو صاحبزادہ صاحب کو اپنی غلط رائے کا احساس ہوتا تو افسوس کرتے تھے کہ انھوں نے رائے قائم کرنے میں عجلت کیوں کی۔

بعض کاموں میں عجلت

بعض اوقات کاموں کی انجام دہی میں وہ کچھ عجلت کرتے تھے جس سے بعد کو خود انھیں افسوس ہوتا تھا وہ ہر شخص کو اپنے اعلیٰ درجہ کے اخلاقی معیار سے جانچتے تھے انکی انسانی کمزوریوں کا لحاظ نہ کرتے تھے حالانکہ دنیا میں اس بلند اخلاق کی مثالیں جس کے وہ متوقع تھے بہت کمیاب ہیں "باہمیں مرداں بباید ساخت" پر عمل کم کرتے تھے۔

اخلاق اور صداقت کا معیار ان کا اتنا بلند تھا کہ اس کے لئے وہ اپنے مخلص دوستوں اور عزیزوں کی آزردگی کی بھی پروانہ کرتے تھے اور سعدی کے اس قول پر عامل نہ تھے۔

آزردن دل دوستاں جہل ست و کفارہ یمین سہل

روزمرہ کا نظام العمل

صاحبزادہ صاحب اپنے روزانہ کام کا نقشہ اوقات ہر سال کے شروع میں بنا لیتے تھے اور حتی الامکان اس پر عمل کرتے تھے لیکن ایک مصروف زندگی رکھنے والے شخص کے لئے پوری پابندی دشوار ہوتی ہے پھر بھی وائس چانسلری کے زمانہ میں ان کے حسب ذیل معمولات آخر دم تک قائم رہے۔

(۱) پانچ بجے موسم سرما میں بیدار ہونا فجر کی نماز پڑھنا قرآن مجید کی تلاوت کرنا سورج نکلنے سے پہلے مختصر ناشتہ کے بعد ہوا خوری کو باہر نکل جانا۔

(۲) آٹھ بجے کے قریب ہوا خوری سے واپس ہوکر اخبار پڑھنا اور یونیورسٹی کے کاغذات جو مکان پر آئے ہوتے ان کو ختم کرنا اور لوگوں سے ملاقات، ۱۱ بجے تک کرنا۔

(۳) اس کے بعد غسل کرنا دوپہر کا ناشتہ کرکے ۱۱ بجے دفتر یونیورسٹی میں پہونچ جانا اور وہاں ۵ بجے تک کام کرنا۔

(۴) شام کو ہوا خوری۔ ملاقاتیں۔

(۵) مغرب کے کچھ بعد کھانا اور نماز عشاء کے بعد دس بجے شب بستر پر چلے جانا۔

روزنامچہ صاحبزادہ صاحب روزنامچہ لکھنے کے عادی تھے ان کا روزنامچہ مختصر نہ ہوتا تھا بلکہ مفصل مضامین اور اسکیمیں اس میں درج ہوتی تھیں لیکن کبھی کبھی دیگر مصروفیتیں ان کے اس مستمرہ عادت پر غالب آجاتی تھیں اور ہفتوں بلکہ مہینوں کے لئے روزنامچہ لکھنا ترک ہو جاتا تھا اسکی وجہ ایک تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر وہ کسی نئے کام میں مصروف ہوجاتے تھے تو اس میں انھیں حد درجہ کا انہماک ہو جاتا تھا اور اس کی وجہ سے ان کے بعض معمولات ترک ہوجاتے تھے دوسری وجہ یہ تھی کہ چونکہ وہ روزنامچہ میں تفصیلات لکھنے کے عادی تھے جسکے لئے زیادہ وقت کی ضرورت تھی۔ اس لئے جب ان کے پاس افراط سے وقت نہ ہوتا تھا تو وہ مختصر روزنامچہ لکھنا بھی پسند نہ کرتے تھے اب ہم ان کے روزنامچوں کی مدد سے انکے استقلال مستعدی۔ استغنا پابندی اصول ضبط و عمل جیسے اعلیٰ اوصاف کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

استقلال ۱۸۹۶ء میں علیگڈھ میں ہیضہ کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ کثرت سے موتیں ہو رہی تھیں اسی وبا میں سید محمد یامین شاہجہانپوری انسپکٹر پولیس کا عین جوانی میں انتقال ہوگیا ان کا انتقال ہونا تھا کہ محلہ کے لوگ بدحواس ہوکر اپنا اپنا مکان چھوڑ کر

دوسری جگہ جانے لگے۔ صاحبزادہ صاحب سے بھی لوگوں نے مکان چھوڑنے کے لئے اصرار کیا لیکن صاحبزادہ صاحب نے مکان سے حرکت نہ کی اور وہ وہیں بفضلہ تعالیٰ محفوظ رہے۔ ان کے استقلال کا دوسروں پر بھی اچھا اثر پڑا۔٭

مستعدی

صاحبزادہ صاحب دن دن بھر گھوڑے کی سواری کر سکتے تھے روزانہ میلوں پیدل ہواخوری کرنا ان کی عادت میں داخل تھا جنوری سنہ ۱۹۰۱ء کا ذکر ہے کہ وہ ایٹہ سے گھوڑا گاڑی میں سکندرہ راؤ کو روانہ ہوئے تھوڑی دور چل کر گھوڑا گاڑی ٹوٹ گئی تو وہ سکندرہ راؤ کو پیدل چل دئے اور ۱۱ میل چل کر اسٹیشن پر ایسے وقت آپہونچے کہ ۱۱ بجے شب کی ریل انھیں مل گئی۔

وکالت سے طبیعت کو لگاؤ نہ تھا

صاحبزادہ صاحب وکالت کے پیشہ کے متعلق اپنے روزنامچہ میں اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کرتے ہیں کہ "مجھے ہرگز یقین نہیں ہے کہ وکالت اخلاقی نقطہ نظر سے ایک جائز پیشہ ہے وہ ہرگز ایسا نہیں ہے"۔

طوائفیں روپیہ کی خاطر اپنی عصمت برباد کردیتی ہیں اور ہم وکیل روپیہ کی خاطر جرائم پیشہ اور بدترین آدمیوں کی حمایت اور وکالت میں اپنا راحت و آرام قوائے ذہنی دماغی اور جسمانی صرف کرتے ہیں لیکن یہ سب جانتے ہوئے مجھکو وکالت کے پیشہ سے مفر نہیں کیونکہ میرے ذمہ خاندان کی پرورش کی ذمہ داریاں ہیں پس میں یہی کرسکتا ہوں کہ خدائے قادر مطلق سے التجا کروں کہ وہ میرے متوسلوں کی پرورش اور کفالت کا کوئی دوسرا ایسا ذریعہ نکالدے کہ میں اس وکالت کے پیشہ سے آزاد ہو جاؤں۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس پیشہ کے کام میں مجبوریوں کی وجہ سے وہ سنہ ۱۹۱۶ء تک مصروف رہے۔

٭ صاحبزادہ صاحب اس زمانہ میں محلہ بالائی قلعہ ظفریاب خان (وکیل) والے مکان میں رہا کرتے تھے۔

استغنا ء

صاحبزادہ صاحب وکالت کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن اسی کے ساتھ سرکاری ملازمت اور بالخصوص دیسی ریاستوں کی طرف بھی ان کا میلان نہ تھا گوالیار کی چیف جسٹسی اور فائننس ممبری سے انھوں نے انکار کیا وکالت کے پیشہ کو ریاست کی ملازمت پر ترجیح دینے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ریاست کی ملازمت کی پابندیوں کو وہ اپنی آزادی میں مخل سمجھتے تھے دوسری وجہ یہ تھی کہ قومی کاموں کی دلچسپی اور کالج کی محبت کی وجہ سے علیگڈھ چھوڑنا پسند نہ کرتے تھے۔ اپریل ۱۹۰۵ء میں جب صاحبزادہ صاحب کے بڑے بھائی صاحبزادہ (سردار) سر سلطان احمد خاں صاحب جو گوالیار میں چیف جسٹس تھے رخصت پر ولایت روانہ ہوئے تو کرنل سر حشمت اللہ خاں صاحب گوالیار سے ان کے پاس آئے اور کہا کہ مہاراجہ صاحب گوالیار آپ کو ہزار روپیہ ماہوار پر چیف جسٹس مقرر کرنا چاہتے ہیں ان کو صاحبزادہ صاحب نے یہی جواب دیا کہ "میں علیگڈھ ہرگز نہ چھوڑوں گا"

۲۹ جون ۱۹۱۲ء کو صاحبزادہ صاحب کو مہاراجہ گوالیار سے اسی مسئلہ پر بالمشافہ گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ اپنی اور مہاراجہ کی اس گفتگو کو مکالمہ کے طور پر صاحبزادہ صاحب نے اپنے روزنامچہ میں تفصیل سے درج کیا ہے جس کو ہم یہاں بخوف طوالت نقل نہیں کرسکتے لیکن اس گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ علیگڈھ کی محبت میں وہ اسقدر ڈوبے ہوئے تھے کہ گوالیار کی ریاست میں جہاں ان کے موروثی حقوق تھے اور جس کے حکمران مہاراجہ ان پر بیحد مہربان تھے اور جہاں ان کے سب بچوں کی تعلیم انگلستان ریاست کی طرف سے ہونا یقینی تھا ان سب باتوں کے باوجود وہ علیگڈھ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے اور ریاست کی پندرہ سو روپیہ ماہوار کی ممبری کونسل قبول نہ کی۔

استغنیٰ کی مثال میں ہم ایک اور واقعہ لکھنا چاہتے ہیں جس کو صاحبزادہ صاحب نے اپنے روزنامچہ میں مہاراجہ سر محمد علی محمد خانصاحب مرحوم آف محمود آباد کی ملاقات کے سلسلہ میں لکھا ہے وہ لکھتے ہیں:

"راجہ صاحب محمود آباد بھی ایک مخصوص صفت کے رئیس ہیں۔ آج انھوں نے تیسری دفعہ

پھر مجھ سے کہا۔ میں آپکے بچوں کی تعلیم کے لئے آپ کو ایک لاکھ روپیہ کا چیک دینے کو تیار ہوں کہ آپ بچوں کی تعلیمی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر اپنا تمام وقت کالج کے کاموں میں اطمینان کے ساتھ صرف کر سکیں"۔ راجہ صاحب کی یہ باتیں مجھے پسند نہ آئیں اس لئے کہ میں یہ بات کبھی گوارہ نہیں کر سکتا کہ کوئی مجھے اتنا نیچا اور پست خیال کرے خدا میں یہ طاقت موجود ہے کہ بغیر ایسی امداد کے مجھے کالج کی خدمت اور اپنی ذمہ داریوں کے پورا کرنے کے قابل کر دے اور سوائے اپنی ذات پاک کے کسی دوسرے کا مجھے زیر بار احسان نہ ہونے دے۔

صاحبزادہ صاحب کی شرافت نفس اور رفعت خیال کا یہ ایک چھوٹا سا نمونہ تھا عام حالات زندگی پر نظر ڈالئے کہیں پر ان کو پست خیال نہ پائیگا جو کچھ مانگا انھوں نے خدا ہی سے مانگا اور خدا نے انھیں دیا۔ بڑے بڑے عہدے انکے سامنے پیش ہوئے لیکن انھوں نے منظور نہ کئے؟

۱۹۲۲ء کا ایک واقعہ ہے کہ جب صاحبزادہ صاحب انڈیا کونسل کی ممبری کے زمانے میں طلبار کی کمیٹی کے سلسلۂ تحقیقات میں سات ماہ کے لئے ولایت سے ہندوستان آئے تھے تو انکے ایک دوست نے خواہش کی کہ وہ صوبہ متحدہ کی ہوم ممبری کے عہدہ کے لئے کوشش کریں اپنے ان دوست کی رائے سے اختلاف میں جو خط ۳۱ مئی ۱۹۲۳ء کو لکھا تھا اس سے ان کے مستغنی ہونے کا پورا پتہ چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"ظاہر ہے کہ اس قسم کے عہدہ کی خواہش خاص طور پر دو وجوہ سے ہو سکتی ہے ایک اس غرض سے کہ معتدبہ معاوضہ حاصل ہو اور دوسرے اس لئے کہ ملک اور قوم کی خدمت کا موقع ملے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا عہدہ ملنے میں کامیابی ہو جائے تو معاوضہ معقول ملیگا اور اس کے ذریعہ سے مالی حالت میں ترقی ضرور حاصل ہو گی مگر سوال یہ ہے کہ مالی خوشحالی کے متعلق مجھ جیسے شخص کا پیمانہ اور معیار کیا ہونا چاہئے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس وقت سے مجھ کو ہوش ہے میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ خوشحال اور اپنی مالی حالت کو قابل اطمینان پایا۔

خوراک لباس مکان یہ تین سب سے مقدم ضرورتیں ہیں ان تینوں ضرورتوں کے لحاظ سے سوائے اس کے کہ میں صدق دل سے خالق اکبر کا شکر ادا کروں اور کچھ نہیں کرسکتا زندگی کی ذمہ داریوں میں سب سے بڑی ذمہ داری بیوی اور بچوں کی پرورش اور تعلیم اور تربیت ہے ان ذمہ داریوں کے لحاظ سے مجھکو کبھی کسی قسم کی دقت نہیں ہوئی بلکہ اپنے سے بہت زیادہ دولت مند افراد سے بہتر یہ ذمہ داریاں پوری کرسکا۔ اور کوئی وجہ اس قسم کی حسرت کی نہیں کہ کاش میں زیادہ آسودہ حال ہوتا اور اپنی یہ ذمہ داری بہتر طریقہ سے پوری کرتا۔

دنیاوی اعزاز کا اکثر لوگوں کو خیال ہوتا ہے جس کے لئے وہ طرح طرح کی کوشش کرتے ہیں۔ باوجود میرے استغنیٰ کے اور باوجود میری بے پروائی کے خدا نے مجھ کو ظاہری اعزاز بھی کچھ کم نہیں دیا انڈیا کونسل کی ممبری کا معاوضہ زیادہ نہ ہو لیکن اعزاز کے لحاظ سے وہ کم نہیں پس دولت اور اعزاز کے جو اعلیٰ سے اعلیٰ پھل ہو سکتے ہیں وہ مجھکو بغیر میری کوشش اور خواہش کے حاصل ہیں اور میری حیثیت اور درجہ کے شخص کی جو ذمہ داریاں ہوسکتی ہیں وہ کماحقہ میں پوری کرچکا ہوں اور کر رہا ہوں جس کے لئے وسائل مجھکو حاصل ہیں پس میں نہیں سمجھتا کہ جہاں تک دولت اور اعزاز کا تعلق ہے اس میں کسی اور اضافہ سے میری حقیقی خوشحالی یا خوشی یا اطمینان قلب میں کیا زیادتی ہوسکتی ہے؟

دوسری غرض اس قسم کے عہدہ سے ملک اور قوم کی خدمت کی خواہش ہوسکتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ میں کس حالت میں ملک اور قوم کی زیادہ خدمت کرسکتا ہوں۔ ملازمت کی حالت میں یا آزاد پبلک زندگی کے ذریعہ سے فی الحقیقت اس کل مسئلہ کا حل اسی سوال کے جواب پر منحصر ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جہاں تک دولت اور اعزاز کا تعلق ہے وہ میری عمر اور حالت کے لحاظ سے زیادہ اہم نہیں ہے اب میری پچپن سال کی عمر ہوچکی ہے خدا کے فضل سے سوائے ایک بچے کے سب کی تعلیم ہوچکی اور ان کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے کوئی عہدہ مجھے کیوں نہ مل جائے لیکن جو کچھ عزت میری ہے اس میں مجھکو اضافہ

کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔ پس دولت اور عزت کے خیال سے بالکل قطع نظر کرکے اس امر میں فیصلہ کرنا چاہئے اور دوسرے پہلو یعنی ملکی اور قومی خدمت کو مدنظر رکھکر رائے قائم کرنی چاہئے۔

"خدا اس سے بخوبی آگاہ ہے اور احباب بھی ایک حد تک واقف ہیں کہ ابتدائی عمر سے اس وقت تک جس قدر میری امنگیں اور ولولے رہے ہیں ان سب کا مقصود اصلی ہمیشہ ملکی اور قومی خدمت رہا ہے گو زندگی کی ذمہ داریوں کے سبب سے جو اصلی خواہش تھی اس کے مطابق اب تک مجھکو اپنے دل کا حوصلہ نکالنے کا موقع نہیں ملا لیکن دلی تمنا یہ ہے کہ خدا کرے وہ وقت آئے کہ اس میدان میں کچھ کرسکوں ایک طرف تو یہ خیالات ہیں لیکن دوسری طرف صحت میں روز بروز فرق آتا جاتا ہے اور عمر بھی اب انحطاط کے زمانے کے قریب آپہونچی اس لئے سوال یہ ہے کہ وہ وقت کب آئے گا جب سالہا سال کی مرادیں پوری ہوں گی۔ کبھی کبھی دل میں یہ خدشہ بھی گزرتا ہے کہ ممکن ہے کہ انتظار ہی انتظار میں زمانہ گزر جائے۔"

علاوہ میرے مذاق اور عمر اور صحت کے دوسرا عنصر جو ملکی اور قومی خدمت کے مسئلہ میں خاص اہمیت رکھتا ہے وہ ملکی اور قومی حالت ہے۔ ملکی اور قومی خدمت کے لئے موقعہ ملنا اور موقعہ ملنے پر کامیابی حاصل ہونا بہت کچھ ملکی اور قومی حالت پر منحصر ہے اس پہلو پر اگر نظر ڈال جائے تو معلوم ہوگا کہ میرے لئے ملکی اور قومی خدمت کا جو موقعہ تھا وہ بہت کچھ نکل گیا اور جو کچھ ہے وہ عنقریب جاتا رہے گا۔

میری پبلک زندگی کا تعلق ابتدا سے علیگڈھ تحریک سے ہے اور میں جو کچھ ملکی اور قومی خدمت کرسکتا ہوں وہ بہت کچھ علیگڈھ کے ہی ذریعہ سے کرسکتا ہوں۔ اور کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ پبلک زندگی اور قومی خدمت کا پہلا سبق علیگڈھ ہی سے سیکھا ہے اور اسی کے خدمت کے خواب سالہا سال سے دیکھے اور اس کو ترقی دینے کی

کوشش کی اور اسکو اوج ترقی پر پہونچانا ہمیشہ سے نصب العین رہا ہے۔

لیکن آج علیگڈھ کس حالت میں ہے اور کس تیزی کے ساتھ وہ پستی کی طرف جارہا ہے۔ وہ اب اس درجہ کو پہنچ گیا ہے کہ بہت سے اہل نظر کی رائے میں اسکی اصلاح اب ممکنات میں سے نہیں جو تعلق مجھکو علیگڈھ اور اس کی بقا اور ترقی سے ہے کیا اب ممکن ہے کہ کسی اور تحریک سے اس قسم کا ہوسکے اور علیگڈھ فنا ہوجائے تو کیا اس کے ساتھ تمام ان منصوبوں اور خوابوں کا بھی خاتمہ نہ ہوجائے گا جو سالہا سال سے میرے دل میں ولولے اور امنگیں پیدا کر رہے ہیں۔ وقت تو اسکا مقتضی ہے کہ میں فوراً موجودہ عہدہ چھوڑکر علیگڈھ آجاؤں اور جو کچھ بقیہ زندگی اور صحت ہے اسکو اسکی خدمت میں صرف کردوں اب میرا پروگرام یہ ہے کہ اگر خدا کو منظور ہے تو سال آئندہ میں آؤں گا۔ اور علیگڈھ کی خدمت میں مصروف ہونگا پس اگر اب از سر نو کسی عہدہ کے لئے امیدوار بنوں جیسا آپ کا اشارہ ہے تو غور فرمایئے کہ پھر میرے اس پروگرام کا انجام کیا ہوگا۔

میں اچھی طرح سمجھتا ہوں اور اس کا مجھکو کامل یقین ہے کہ اللہ جل جلالہٗ نے جو کچھ افضال مجھ پر کیے ہیں یہ محض اس وجہ سے ہیں کہ میں نے ہمیشہ حتی الامکان پبلک خدمت کے مقابلہ میں ذاتی فوائد کا خیال نہیں کیا۔ اب تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کے بعد اگر میں پھر ملازمت کا خیال کروں اور پبلک خدمت کو ملتوی کروں تو کیا یہ ناشکری نہ ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ فرمائیں گے کہ نئے عہدہ کی حالت میں بھی میں پبلک خدمت کرسکوں گا۔ اس کے متعلق نہایت ادب سے التجا ہے کہ اس وقت تک جو تجربہ مجھ کو اپنے متعلق ہوچکا ہے اسکو فراموش کرنا درست نہیں میں خوب جانتا ہوں کہ اس قسم کے عہدہ کے فرائض مجھ سے بہت زیادہ بہتر طور پر انجام دینے والوں کی تعداد قوم میں موجود ہے لیکن جس قسم کی پبلک خدمت ملک اور قوم کی میں کرسکتا ہوں اس کے کرنے والے زیادہ نہیں ہیں خدا آگاہ ہے کہ میں تعلی کی وجہ سے نہیں کہتا بلکہ میں جانتا ہوں کہ جس قسم کی ملکی اور

قومی خدمت کے لئے میری تربیت اور تیاری ہوئی ہے۔ اس کے اہل ہندوؤں میں بہت ہیں اور مسلمانوں میں بہت کم ہیں اور قوم کا حق ہے کہ جس خدمت کے میں قابل ہوں وہ اس کے لئے حاضر کی جائے۔

عہدہ زیر بحث کے لئے نہ میرے دل میں حوصلہ ہے اور نہ اسکے لئے میں موزوں ہوں برخلاف اس کے اور بہت سے مسلمان ایسے ہیں جن کے دل میں اس کے لئے خواہش بھی ہے اور مجھ سے زیادہ وہ اس کے اہل بھی ہیں پس جس چیز کے لئے نہ میرے دل میں حوصلہ ہو اور نہ موزونیت اسکے لئے ایسی عمر اور حالت میں جیسی کہ میری ہے خواہش کرنا کہاں تک مناسب ہے۔

بعد کامل غور کے میری قطعی رائے ہے کہ اب جس قدر عمر اور صحت باقی ہے اس کے لئے جو پروگرام ہے اس میں تنزلزل ہونے دینا کسی طرح مناسب نہیں۔ کچھ خبر نہیں کہ پروگرام جو میرے ذہن میں ہے وہ پورا ہوگا یا نہیں۔ کیونکہ انسانی منصوبوں کی کچھ حقیقت نہیں قدرت کی طرف سے دفعتاً ایسے اتفاق پیش آتے ہیں کہ انسانی پروگرام رکھے رہ جاتے ہیں لیکن جہاں تک مجھ جیسے ناچیز اور کمزور شخص کی خواہش اور ارادہ کا تعلق ہے میں اپنی آئندہ زندگی کے لئے پروگرام قرار دے چکا اور اپنے خالق سے عاجزانہ دعا ہے کہ وہ محض اپنے فضل سے اس کو پورا کرے اور جو بقیہ زندگی اور صحت ہے اسکو موجودہ عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد آزاد پبلک زندگی میں صرف کرنے کی توفیق عطا فرمایئے۔ آمین"

صاحبزادہ صاحب کی استغنار کی ایک اور مثال میں حیدر آباد کا یہ واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ صاحبزادہ صاحب انگلستان سے آئے ہوئے تھے اس وقت اعلیٰ حضرت نظام کا ایک تار اس مضمون کا موصول ہوا کہ آپ ریاست کی انتظامی کونسل کا عہدہ قبول کریں تین ہزار روپیہ ماہوار مشاہرہ ہوگا مگر انھوں نے شکریہ کے ساتھ اس سے معذرت کر دی۔

سرکاری خطاب کے متعلق خیالات

صاحبزادہ صاحب مدت العمر سرکاری خطاب سے کیوں محروم رہے۔ اس سوال کے جواب پر ذیل کے واقعہ سے بخوبی روشنی پڑتی ہے ظاہر ہے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی عمر کا بیشتر حصہ علیگڈھ تحریک کی خدمت میں گزرا جو بالواسطہ گورنمنٹ کی خدمت تھی اور جس کے صلہ میں خطاب کا ملنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اس کے بعد وہ انڈیا کونسل میں رہے جہاں سے بالعموم ہر ممبر کو سرکار (Knighthood) خطاب ملتاہے مگر باوجود ان تمام موقعوں کے صاحبزادہ صاحب کو کوئی خطاب نہ ملا۔ اسکی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ وہ باوجود اصولاً گورنمنٹ اسکول خیرخواہ ہونے کے اپنے خیالات اور نیز عمل میں آزاد تھے اور جب کوئی موقع حکام وقت سے اختلاف کا پیش آجاتا تھا تو صاحبزادہ صاحب اسمایں پیش پیش رہتے تھے اسکے علاوہ جب انھیں یہ شبہ ہوتا تھا کہ انھیں کوئی خطاب ملنے والا ہے تو فوراً اسکی روک تھام کر دیتے تھے چنانچہ ۱۹۱۱ء میں ان کے پاس چند چٹھیاں گورنمنٹ صوبہ متحدہ سے آئیں جن میں انھیں خان بہادر کے خطاب سے مخاطب کیا گیا تھا تو انھوں نے مسٹر ہوز چیف سکریٹری گورنمنٹ صوبہ متحدہ کو ایک چٹھی لکھی جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے :۔

گذشتہ دو ہفتوں میں میرے پاس چار چٹھیاں گورنمنٹ کے مختلف افسروں کے پاس سے آئی ہیں جن میں لفافہ پر مجھے خان بہادر کرکے لکھا گیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ کسی غلطی کی وجہ سے ہوا ہے تاہم چونکہ مسلسل چار بار ہوا ہے اسلئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بارہ میں اپنے خیالات کا اظہار کردوں۔ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ جو لوگ گورنمنٹ اور ملک دونوں کی خدمت کرنا چاہیں اور لوگوں کا اعتماد حاصل کرنا چاہیں تو انھیں ایسے مواقع سے بچنا چاہیے جس سے کام کرنے والوں کی نیتوں کے متعلق بدگمانی کیجائے۔

اسوقت بالعموم ملک کی اور بالخصوص ہماری قوم کی سب سے بڑی ضرورت

یہ ہے کہ بے لاگ کام کرنے والے لوگ ہوں اگرچہ وہ کیسے ہی ادنیٰ کیوں نہ ہوں اور مجھے اسکے بارہ میں اسقدر زیادہ احساس ہے کہ میں پبلک کے ہر سچے خادم کے لئے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ نہایت ادب اور عاجزی سے یہ عرض کرے کہ اسکی خدمت کا کوئی اعتراف گورنمنٹ کی طرف سے نہ کیا جاوے۔ البتہ جو اصحاب ملک وقوم کے بمنزلہ زیور کے ہیں انھیں ضرور خطاب دیئے جائیں مگر جو لوگ محض خدام اور کام کرنے والے ہیں انھیں ان کے حال پر چھوڑ دینا حاکم ومحکوم دونوں کے لئے مفید ہے اپنے ان خیالات کے معافی چاہنے کے بعد امید رکھتا ہوں کہ میری اس عرض داشت کے متعلق یادداشت لکھ لیجاوے گی"۔

اس چٹھی کے دس بارہ سال بعد جب صاحبزادہ صاحب انڈیا کونسل میں تھے تب ہی گورنمنٹ سے چند چٹھیاں ایسی آئیں جن میں آپ کے نام کے ساتھ سر لکھا گیا تھا اسوقت بھی صاحبزادہ صاحب نے اس قسم کی چٹھی گورنمنٹ کو لکھی تھی۔

قاعدے اور اصول کی پابندی

صاحبزادہ صاحب کی زندگی میں قاعدے اور اصول کی پابندی کی مثالیں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ پیشہ وکالت ہو یا انڈیا کونسل کی ممبری۔ کانفرنس ہو وائس چانسلری ہو یا پرائیوٹ زندگی ہر جگہ ہر موقع پر وہ اصول اور قاعدے کی پابندی چاہتے تھے خواہ اس میں ان کا کوئی دوست ناراض ہو یا ان کو اپنے نفس پر جبر کرنا پڑے ۱۹۰۸ء کا ایک واقعہ ہے کہ ۲۲ راپریل کو جب لارڈ منٹو علیگڈھ کالج میں آئے تو پریسیڈنٹ کالج کے آنریری سکریٹری اور چار ٹرسٹیوں نے جن میں ایک صاحبزادہ صاحب بھی تھے لارڈ موصوف کا ریلوے اسٹیشن پر استقبال کیا۔ جب کالج آنے کو لارڈ موصوف گاڑی میں سوار ہوئے تو خلاف روایات سابقہ پریسیڈنٹ کالج کی جگہ مسٹر پرٹ (Pert) کلکٹر گاڑی میں سوار ہوگئے تو صاحبزادہ صاحب نے یہ بات محسوس کی اور کالج پہونچتے ہی یہ بات مسٹر ڈنلاپ اسمتھ وائسرائے کے پرائیوٹ سکریٹری کے نوٹس میں لائے۔ پرائیوٹ سکریٹری ڈنلاپ اسمتھ

نے ان کی رائے سے اتفاق کیا اور مسٹر پرٹ (Pert) کو فہمائش کر دی کہ وائسرائے کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے کا حق کالج کے پریسیڈنٹ کا ہے نہ کہ کلکٹر ضلع کا۔ چنانچہ اس کے بعد واپسی کے وقت وائسرائے کے ساتھ کالج کے پریسیڈنٹ ہی سوار ہوئے اور اسکا نتیجہ یہ ہوا مسٹر پرٹ ہمیشہ کے لئے صاحبزادہ صاحب سے ناخوش ہو گئے جسکا اظہار صاحبزادہ صاحب کے انتخاب ممبر کونسل صوبہ متحدہ کے وقت ہوا۔

صاحبزادہ صاحب کی پرائیوٹ زندگی میں اصول کی پابندی کی ایک اور مثال سننے کے قابل ہے جب وہ انڈیا کونسل میں انگلستان میں تھے تو ان کے فرزند آباد احمد خاں نے جو اس وقت ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدہ پر مامور تھے۔ امپریل سروس میں شامل ہونے کے واسطے ان کو خط لکھا کہ وہ ان کی ترقی کے لئے کوشش کریں اس کے جواب میں انھوں نے آباد احمد خاں کو خط لکھا اس میں بیسیوں سوالات کئے تھے جن میں دریافت کیا تھا کہ تمہارا برتاؤ رعایا کے ساتھ کیا ہے۔ ماتحتوں کے ساتھ کیا سلوک ہے محنت اور دیانت کی کیا کیفیت ہے۔ قانونی واقفیت کس قدر ہے ان بیشمار سوالات کے بعد لکھا تھا کہ مفصل جواب آنے پر میں غور کروں گا میں تمہاری کیا امداد کر سکتا ہوں

یہ خط پڑھ کر آباد احمد خاں[1] نے یہ لطیفہ کہا کہ ترقی کے لئے اس کٹھن منزل سے گزرنے سے یہ کہیں اچھا ہے کہ موجودہ حالت پر قناعت کی جائے۔

جو شخص قاعدہ اور اصول کا اس قدر پابند ہو ظاہر ہے کہ وہ اپنے فرض منصبی کو کیسے انہماک اور دیانت داری کے ساتھ انجام دیتا ہوگا اسکی مثالیں ان کی زندگی میں قدم قدم پر ملتی ہیں اس موقع پر صرف ایک یہ مثال لکھنا کافی ہے کہ انڈیا کونسل کی ممبری کے زمانے میں انھوں نے اپنے ایک دوست کو لندن سے ۲۲ اپریل ۱۹۱۸ء کے خط میں لکھا تھا کہ تعلیم کے متعلق اب تک میں یہاں کچھ زیادہ کام نہ کر سکا کیونکہ دفتر کا کام اس قدر زیادہ ہے

[1] آباد احمد خاں اپنی کوشش سے سول سروس میں داخل ہو کر کامیاب ہو گئے اور پاکستان ہو چکنے پر پنجاب کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس ہو گئے۔

کہ مجھ کو اور کسی کام کے لئے وقت نہیں ملتا فی الحقیقت میں یہاں صوفیانہ زندگی بسر کر رہا ہوں۔
سوائے دفتر جانے کے اور کام کرنے کے اور کسی شخص یا چیز سے واسطہ نہیں۔ جلسوں وغیرہ میں بہت
کم جاتا ہوں۔ اکثر لوگ یہاں شاکی ہیں کہ میں کسی سے ملتا نہیں مگر میں مجبور ہوں اس خط سے
ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیم کے شعبہ سے آپ کو خاص ذوق تھا۔ لیکن فرض منصبی کے مقابلہ میں وہ
اپنے اس ذوق طبیعت کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔

ضبط و تحمل

انسان کی اعلیٰ اخلاق صفات میں سے ضبط و تحمل بھی ایک ایسی صفت ہے جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان نفس پر قابو پا لیتا ہے۔ اسکی مثالیں صاحبزادہ صاحب کی زندگی میں اکثر ظاہر ہوئی ہیں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ناگپور منعقدہ سنہ ۱۹۱۰ء کا ایک واقعہ ہے کہ اس کانفرنس کے جلسہ کے لئے انھوں نے مختلف صوبوں کی تعلیمی حالات کے نظری رنگین نقشے تیار کرائے تھے دفتر کانفرنس علیگڈھ کے ایک اہل کار سے جو ناگپور کانفرس میں موجود تھے انھوں نے پوری تاکید کے ساتھ کہہ دیا تھا کہ خبردار یہ رنگین نقشے جلسے کے اندر اپنے ہاتھ میں تیار رکھنا۔ جلسہ میں جس وقت میں طلب کروں مجھے فوراً دینا چنانچہ اپنی تقریر کے دوران میں انھوں نے وہ رنگین نقشے حاضرین کو دکھانے کے لئے اہلکار سے طلب کئے۔ لیکن اہلکار مذکور نے کہہ دیا۔ میں نقشے لانا بھول گیا اسی وقت ان کی قلبی کیفیت کا اندازہ بہ آسانی ہو سکتا ہے لیکن ان کا ضبط و تحمل دیکھنے کے قابل تھا۔ یعنی نہایت سکون کے ساتھ انھوں نے اپنی تقریر کا رخ بدل دیا۔ گویا خلاف مزاج کوئی بات پیش ہی نہ آئی تھی۔

والدین کا ادب اور احترام

صاحبزادہ صاحب کو اپنے والدین سے انتہا درجہ کی محبّت تھی اور وہ ان کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔

اس سے پہلے بھی ہم نے علیگڈھ میں بعض جلسوں میں اور لڈ بوائز کی صفائیاں بچشم خود دیکھی ہیں اور ان موقعوں پر بھی صاحبزادہ صاحب نے ضبط و تحمل کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا تفصیل طویل ہے نیز بعض واقعات اس سلسلہ میں حد شرافت اعتدال سے بہت گرے ہوئے تھے۔
اس لئے اب ان کا اعادہ کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

سنہ ۱۸۹۲ء کا ذکر ہے کہ ولایت سے انھوں نے ایک خط میں جو والد صاحب کو بھیجا تھا۔ ہندوستان اور انگلستان کی عورتوں کا مقابلہ کر کے رائے زنی کی تھی جس سے ہندوستانی عورتوں کی کچھ تنقیص ہوتی تھی۔ والد صاحب نے اسکے جواب میں ناخوشی کا اظہار کیا جس کا اُن پر بہت اثر ہوا اور آئندہ پھر اس قسم کی تحریر کی جرارت نہیں کی۔ والد صاحب کی اطاعت اور فرمانبرداری وہ ہر چھوٹے چھوٹے معاملہ میں بھی مدنظر رکھتے تھے مثلاً مارچ سنہ ۱۸۹۴ء میں جب وہ اپنی طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے انگلستان سے ہندوستان آرہے تھے تو راستہ میں پیرس اور روم جیسے مشہور شہر پڑتے تھے اور وہ ان کو دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن ان شہروں کی سیر والد صاحب کی بلا اجازت کرنا انھوں نے پسند نہ کیا اور والد صاحب کی اجازت حاصل کرنے کے بعد اس ارادہ کو پورا کیا ان کے والد (نواب غلام احمد خاں مرحوم) بھی اپنی اولاد کے ساتھ غیر معمولی شفقت کا برتاؤ کرتے تھے جس کا حال خود صاحبزادہ صاحب کے الفاظ[1] میں یہ ہے۔

"ہمارے ساتھ جو غیر معمولی محبت، شفقت ان کو تھی اسکی یاد ہمارے دل سے کبھی محو نہ ہوگی۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا اور والد مرحوم کے انتقال کے وقت تک جس قدر ہمکو ان کی صحبت میں خوشی ہوتی تھی اور کسی کے ملنے میں نہ حاصل ہوتی تھی چھوٹی عمر میں جب ہم وطن میں تھے اس زمانے میں والد صاحب سال بھر کے بعد رخصت پر تشریف لایا کرتے تھے ان کے آنے کا انتظار ہم کو بہت روز پیشتر سے رہتا تھا۔ علیگڈھ میں جب ہم تعلیم پاتے تھے تو چونکہ ہر ہفتہ ان کا خط آتا تھا۔ اسکے انتظار اور شوق میں چھٹی رساں کی طرف ہماری نگاہیں رہا کرتی تھیں غرضکہ انکی صحبت اور ان کی ہر ایک چیز ہم کو دل سے مرغوب تھی اور پیاری تھی اس برتاؤ اور تعلق کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کی شخصیت حسن اخلاق اور اطوار و عادات کا ہماری تمام زندگی پر ایسا گہرا اثر پڑا جس کو ہم ہر حالت اور ہر موقع پر محسوس کرتے تھے اور اس میں کچھ شک نہیں اس وقت تک زندگی میں ہم کو جس قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے اس میں ان کا بہت

[1] ماخوذ از حیات احمدی صفحہ نمبر ۲۳

بڑا حصہ ہے۔"

پدرانہ شفقت تو کوئی غیر معمولی چیز نہیں لیکن ہماری حالت میں خاص ذکر کے قابل وہ اس وجہ سے ہے کہ اس کے ذریعہ سے والد مرحوم نے اپنی اعلیٰ خدمات اور اخلاقی خوبیوں کو ہمارے لئے ایسا مرغوب اور محبوب کر دیا کہ بغیر کسی وقت یا کوشش کے غیر معلوم اور غیر محسوس طور پر انکا رنگ ہم پر بہت کچھ چڑھ گیا اور اس میں شک نہیں کہ اس حقیقت کا ثبوت کہ شفقت تربیت کا بہترین آلہ ہے ہماری حالت میں پوری طور پر ہمارے سامنے موجود ہے۔

صاحبزادہ صاحب نے اپنے والد کی آخر وقت تک خدمت کی اور ان کی وفات سے ان کو بیحد صدمہ ہوا۔

صاحبزادہ صاحب کو اپنی والدہ سے بھی کچھ کم محبت نہ تھی جس کا ذکر انھوں نے خود "حیات احمدی" میں کیا ہے اور جب ان کی وفات کی خبر صاحبزادہ صاحب کو انگلستان میں پہونچی تو اسکا تذکرہ انھوں نے اپنے روزنامچہ میں نہایت دردانگیز الفاظ میں کیا ہے والدہ صاحبہ کے انتقال سے میرے دل پر جو اثر ہوا ہے اس نے میری زندگی کے دو ٹکڑے کر دیے ہیں ایک کا تعلق روزانہ کاروبار سے اور دوسرے کا تعلق اس منزل سے ہے جو ازل اور ابد کے درمیان واقعہ ہے اور عالم کی تمام کائنات جس کا جزو ہیں جو بے شمار شیون قدرت ہیں اس میں ایک نہایت ہی ادنیٰ ذرہ میں بھی ہوں۔ جہاں تک انسان کی ذات کا تعلق خود اپنے نفس سے ہے زندگی کا ہر ایک رشتہ اور واقعہ خاص اہمیت رکھتا ہے لیکن بلحاظ اس غیر محدود وجود اور ہستی کے جو ازل اور ابد کے درمیان واقعہ ہے انسان کی زندگی اور اسکے واقعات کی کچھ بھی ہستی اور حقیقت نہیں رکھتے۔ غیر محدود زمانے سے یہ عالم ہے اور اسی طرح نہ معلوم کب تک چلا جائیگا اور اس اثنار میں بے شمار ہستیاں اور واقعات ہوتے رہیں گے۔

میری دلی خواہش ہے کہ اس زندگی کے عارضی تعلقات اور اعتبارات سے قطع نظر کرکے دائمی تعلق کے لحاظ سے حقیقت کا عکس دل میں پڑے۔ تاکہ طبیعت میں سکون پیدا ہو اسی غرض

کے لئے قرآن شریف کا مطالعہ میں کر رہا ہوں۔

دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ برتاؤ اور عام انسانی ہمدردی و رحم دلی

صاحبزادہ صاحب کو انگلستان کی تعلیم کے زمانے میں انگریزی معاشرت میں بہت سی خوبیاں نظر آنے لگیں تھیں اور ولایت سے واپسی کے بعد انھوں نے انگریزی طرز ماند و بود اختیار بھی کر لی تھی لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنے غریب بھائیوں کو نظر حقارت سے دیکھا ہو یا ان کی شادی و غمی میں شرکت ترک کر دی ہو یا اپنی کوٹھی کے دروازے ان کے لئے بند کر دئے ہوں ۱۸۹۶ء کا واقعہ ہے کہ صاحبزادہ صاحب کے ایک عزیز احمد علی خاں کی بیٹی کی پانی پت میں شادی تھی۔ برات کنجپورہ سے آنے کو تھی صاحبزادہ صاحب پانی پت گئے تو معلوم ہوا کہ احمد علیخاں اور ان کے بھائی محمد حسن خاں میں اس قدر زیادہ رنجش ہے کہ محمد حسن خاں نے اپنی بھتیجی کی شادی میں شریک ہونے سے قطعی انکار کر دیا تھا صاحبزادہ صاحب نے محمد حسن خان کو سمجھایا اور اصرار کیا کہ ایسے موقع پر غصہ اور ہٹ اچھی بات نہیں ہے۔ لڑکی کی شادی ہے۔ باوجود صاحبزادہ صاحب کی کوشش اور اصرار کے محمد حسن خاں نہ مانے اور اپنی ضد پہ قائم رہے۔ جب ادھر سے ان کو ناکامی ہوئی تو انھوں نے ایک دوسری تدبیر کی یعنی وہ محمد حسن خاں کی بیوی کے پاس گئے اور ان کو سمجھا بجھا کر برات میں شریک ہونے پر راضی کر لیا۔ جب بیوی راضی ہو گئیں اور برات کی شرکت کو آمادہ ہو گئیں تو اب محمد حسن خاں بھی مجبور ہوئے اور بھتیجی کی شادی میں شرکت کی۔ اس طرح دو بھائیوں میں انھوں نے صلح کرادی پس وہ خیر المومنین میں داخل ہو گئے۔

صاحبزادہ صاحب کو اپنے حقیقی بھائی صاحبزادہ (سر) سلطان احمد خاں منتظم الدولہ بہادر سے جو برادرانہ محبت تھی اسکا اظہار اکثر موقعوں پر ہوا ہے مثلاً جب ہز ہائی نس مہاراجہ گوالیار نے ان کو چیف جسٹس کا عہدہ دینا چاہا تو انھوں نے اپنی جگہ اپنے بڑے بھائی کا نام پیش کر دیا۔ ایسی ہی خواہش کا اظہار انھوں نے اس وقت کیا جب ان کو گورنمنٹ ہند

کی طرف سے انڈیا کونسل کی ممبری پیش کی گئی تھی لیکن اس موقع پر ان کی خواہش پوری نہ ہوئی
خلاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کی عزّت کو اپنی عزّت سمجھتے تھے ان کی خوشی سے خوش رہتے
تھے اور ان کے دکھ سے رنجیدہ۔ ۱۹۰۸ء کے روز نامچہ میں ہمیں ایک واقعہ ملتا ہے کہ یکم اکتوبر
کو صاحبزادہ صاحب کو معلوم ہوا کہ صاحبزادہ سر سلطان احمد خاں کو مہاراجہ صاحب گوالیار
نے خلعت دیگر "غاشیہ نشین" کا اعزاز عطا فرمایا۔ یہ وہ اعزاز تھا جو ریاست میں سب سے
اونچے درجہ کے سردار کو دیا جاتا تھا۔ اس خوشخبری پر صاحبزادہ صاحب نے نہایت
مسرّت کا اظہار کیا اور خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے دعا کی کہ بڑے بھائی اس سے بھی زیادہ
ریاست اور ریاست کے لوگوں کی خدمت انجام دیں اور مہاراجہ صاحب کی نظروں میں
ان کی عزّت روز افزوں ہو۔

دوستوں کے ساتھ بھی ان کا برتاؤ خلوص محبّت سے بھرا ہوا تھا۔ مولوی بہادر علی
ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) وکیل علی گڑھ ان کے مخصوص دوستوں میں سے تھے
۷ ستمبر ۱۹۰۳ء کو مولوی صاحب موصوف بمقام علیگڑھ ہیضہ میں مبتلا ہوئے یہ خبر صاحبزادہ
صاحب کو گیارہ بجے رات کو کالج کے ظہور وارڈ میں (جہاں وہ عارضی طور پر مقیم تھے) پہونچی
فوراً تن تنہا چھڑی ہاتھ میں لے کر بہادر علی صاحب کے مکان پر پہونچے۔ اور بچشم خود جاکر
ان کی حالت دیکھی ایک بجے جاکر ان کی حالت دیکھی ایک بجے شب کے خود جاکر ڈاکٹر کو لائے
تین بجے شب تک برابر تدبیر و علاج میں مصروف رہے۔ صبح ہوتے ہوتے مولوی بہادر علی
کا انتقال ہو گیا۔ ان کو نہایت صدمہ ہوا۔ شاہ جمال میں اپنے والد کی قبر کے قریب ان کو
دفن کیا۔ ان کی بیوہ اور بچّوں کی کفالت اور سرپرستی کرتے رہے۔ بہادر علی فیملی فنڈ کے
نام سے ایک فنڈ قائم کیا۔ اور اس میں خود معقول رقم دی اور اپنے دوستوں سے بھی
روپیہ لیا۔ حاجی احمد سعید خانصاحب برادر اکبر نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب سے ایک
حویلی بلا کرایہ حاصل کی جس میں مرحوم کا خاندان مدّت مدید تک سکونت پذیر رہا۔

عبداللہ خاں بلوچی جو ۱۹۰۹ء میں علیگڈھ کالج میں بی ۔ اے ۔ کلاس میں پڑھتے تھے صاحبزادہ صاحب کو ان کی خودداری اور ان کے اخلاق حسنہ کی وجہ سے ان سے بہت محبت کرتے تھے اکثر شام کی ہواخوری میں ان کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے ۔ بلوچی دوست کی عسرت کا یہ حال تھا کہ بی ۔ اے کلاس کی خواندگی کی کتابیں بھی نہ خرید کر سکتے تھے بلکہ ان کو خود نقل کر لیتے تھے ۔ اپنا کھانا خود پکاتے اور نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے صاحبزادہ صاحب نے اکثر موقعوں پر ان کی مدد کرنی چاہی لیکن انھوں نے انکار کر دیا ۔ یہاں تک کہ قرض حسنہ بھی لینا گوارا نہ کیا ۔ نہ یہ پسند کیا کہ ڈائیننگ ہال کے باورچی خانہ سے ان کا کھانا پکوا دیا جایا کرے خلاصہ یہ ہے کہ صاحبزادہ صاحب اپنے دوستوں کی (جو ہر درجہ اور حیثیت کے لوگ ہوتے تھے) نہایت قدر کرتے تھے ۔ ان کے روزنامچہ میں ایسے ریمارک ملتے ہیں جن میں انھوں نے دوستوں کے ازدیاد اعزاز پر مسرت اور ان کے حادثۂ وفات پر اظہار غم کیا ہے مثلاً جنوری ۱۹۱۲ء میں میر ولایت حسین صاحب کو خانصاحب کا اور مولانا خلیل احمد صاحب کو شمس العلما کا خطاب ملا اور کالج میں مبارک باد کا جلسہ ہوا ۔ اس موقعہ پر صاحبزادہ صاحب نے کہا تھا کہ ہم کو ایسے ہی امتیاز اور خطابوں پر اصل خوشی کرنی چاہیے کیونکہ یہ دونوں خطاب پانے والے ایسے ہیں جو خطاب کی تمنّا اور کوشش نہیں کرتے ۔ خطاب کے ایسے ہی لوگ مستحق ہیں جو خاموشی اور خلوص سے کام کرتے ہیں اور باوجود اہل اور قابل ہونے کے نہ ان میں نمائش ہے نہ امتیاز و خطاب کی خواہش ہے ایسے خطابوں پر جس قدر بھی اظہار مسرت کیا جاوے وہ کم ہے ''

بابو روپ نرائن بی ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی علیگڈھ میں ایک ممتاز وکیل تھے جنھوں نے صاحبزادہ صاحب کے ساتھ وکالت شروع کی تھی ۔ وہ گورنمنٹ پلیڈر (سرکاری وکیل) بھی رہے تھے ۔ ۱۹۱۵ء کے شروع میں یکایک ان کا دماغ خراب ہوگیا ۔ اس کا تذکرہ انھوں نے اپنے روزنامچہ میں اس طرح لکھ کر اظہار افسوس کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں

۱۰ مارچ ۱۹۱۵ء کو فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد جب میں نے اپنے دفتر کا دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بابو روپ نرائن صرف ایک دھوتی باندھے برآمدے میں کھڑے ہوئے کہہ رہے ہیں گھر والوں نے مجھے مار کر گھر سے نکال دیا ہے اور کتّے کا دماغ میرے سر میں بھر دیا ہے۔ اور مجھے زہر دیئے دیتے ہیں اسی طرح کی مجنونانہ باتیں اور بھی کر رہے تھے یہ دیکھکر میرا حال غیر ہو گیا کس قدر تاسف کا مقام ہے کہ ایسا تعلیم یافتہ شخص پاگل ہو کر برباد ہو جائے آخر یہ انسان ہے کیا چیز یہ کیسی مشین ہے۔ حیات و ثبات انسانی کا راز کیا ہے جو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ اس معمّہ کا حل انسان کی عقل و ادراک سے باہر ہے۔“

اس نوٹ کے ساتھ صاحبزادہ صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ انھوں نے روپ نرائن صاحب کی کیا امداد کی کیونکہ اس قسم کی باتوں کا اظہار وہ کسی نوع سے بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

ہم نے سطور بالا میں چند واقعات کا تذکرہ کیا ہے ان سے ظاہر ہوگا کہ وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کی خوشی سے کس قدر خوش اور ان کے رنج و مصائب سے کس قدر ملول ہوتے تھے اور جذبہ رحمدلی ان میں اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ سڑک اور راستہ پر چلتے چلتے اگر کہیں پر کانٹے کنکر پتھر یا اینٹیں پڑی دیکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ کسی آدمی کو ان سے ٹھوکر لگ جائے گی تو اس کو اپنے ہاتھ سے اٹھا کر دور پھینک دیتے تھے اور غریب طبقے کے لوگوں کے ساتھ بلا تفریق مذہب و ملّت نہایت انکسار اور محبّت سے پیش آتے تھے۔ مدت دراز تک کالج کے صیغۂ تعمیر کا انچارج ہونے کی وجہ سے ان کو گرد و نواح کے معمار اور مزدور ذاتی طور پر اچھی طرح سے جانتے تھے، شام کی چہل قدمی میں جب یہ لوگ مل جاتے تو نہایت عاجزی کے ساتھ سلام کرتے تو ان میں سے وہ ایک آدھ بات کر لیتے اور ان کے متعلقین کی بابت پوچھ لیتے جس سے وہ غربا باغ باغ ہو جاتے تھے، اس وقت صاحبزادہ صاحب کھڑے ہو جاتے تھے اور ان میں سے ہر ایک سے اس کا اور اس کے گھر والوں کا حال پوچھا کرتے۔ اس طرح یہ درماندہ طبقہ ان کو نہایت محبّت اور ادب سے دیکھا کرتا تھا۔

انسانوں کے علاوہ ان کی رحمدلی جانوروں تک پہنچ گئی تھی۔ ان کی اپنی ایک گھوڑی جب
کام کے قابل نہ رہی تو انھوں نے اس کو اپنے اصطبل میں اسی طرح رکھا جیسے کہ وہ جوان اور
کارآمد حالت میں تھی اور اس کا سائیس تک علیحدہ نہ کیا بعض لوگوں نے ان سے کہا کہ یہ
بے کار خرچ ہے جس کا جواب انھوں نے دیا کہ بے شک اس کے فروخت کرنے سے مجھ کو کچھ
روپئے مل جائیں گے لیکن خریدار اس بوڑھے جانور سے سختی سے کام لے گا۔ اور یہ مجھ کو گوارا نہیں
کہ جس جانور نے اپنی جوانی میں مجھ کو آرام پہنچایا اس کو اس کے بڑھاپے کی حالت میں تکلیف
پہنچاؤں چنانچہ وہ گھوڑی صاحبزادہ صاحب ہی کے اصطبل میں مرگئی اور اس کا سائیس
بھی اخیر دم تک ملازم رہا۔

ایک اور واقعہ سے ان کی غیر معمولی رحمدلی کا پتہ چلے گا سنہ ۱۹۲۴ء کے موسم گرما میں
راقم الحروف (حبیب اللہ) اور مولوی طفیل احمد صاحب صاحبزادہ صاحب کے ساتھ دو تین دن
واسطے نورا گئے راج گھاٹ سے نورا تک انجینیر صاحب نہر نے مہربانی کر کے اپنا ٹھیلہ
Trolly بھیج دیا تھا۔ اس ٹرولی پر ہم لوگ راج گھاٹ اسٹیشن سے نورے کو روانہ ہوئے یکایک
کیا دیکھتے ہیں کہ صاحبزادہ صاحب اپنا رومال نکالکر اور ریل کی پٹڑی سے جس پر Trolly
چلتی تھی کوئی چیز جھک کر ہاتھ سے صاف کرتے جاتے تھے۔ اور ٹرولی چلانے والوں سے کہتے
تھے روکو، روکو جب ٹھیلہ رکا تو دیکھا کہ ایک قطار چیونٹیوں کی ریل کی پٹڑی پر چل رہی ہے
چنانچہ سب نے اتر کر صاحبزادہ صاحب کی تقلید کی۔ اپنے رومالوں اور Trolly
والوں نے کپڑوں سے پٹڑی کو صاف کیا اور جب وہ موقع گزر گیا تو Trolly اپنی معمولی
چال سے چلی۔ ہم لوگوں کو Trolly کے چلنے میں اس طرف خیال بھی نہ ہوا تھا لیکن صاحبزادہ
صاحب کی آنکھ نے ایک عاجز ترین مخلوق کو خطرہ کی حالت میں دیکھ لیا اور ان کو کچلنے سے
بچایا! ؏ سلیمان باہمہ حشمت نظرہا بود با مورش

صاحبزادہ صاحب کے جذبۂ رحمدلی کو کمزوری قلب پر محمول نہ کرنا چاہیئے کیونکہ ہم نے

دیکھا ہے کہ کسی خطرہ کے وقت وہ اوروں سے ہمیشہ آگے رہتے تھے جب رات کو چوروں کا غل غپاڑہ ہوتا تھا (اس زمانہ میں آفتاب منزل کے چارطرف آبادی بھی نہ تھی) تو سب سے پہلے وہ لکڑی لے کر رات میں پہونچ جاتے تھے۔ اور سانپ جس سے کہ مخلوق کو نقصان پہونچتا تھا اس کے وہ دشمن تھے اور اپنی لکڑی سے خود مارتے تھے، جہاں کہیں بھی ملتا تھا۔

عام صحت اور تندرستی صاحبزادہ صاحب کی عام تندرستی ۱۹۰۵ء تک اچھی رہی (کیمبرج) سے واپسی کے بعد تقریباً پندرہ برس تک کچھ شکایتیں پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ ۱۹۰۸ء میں سب سے پہلے آنکھوں کی شکایت محسوس ہوئی اور یہ شکایت اور تکلیف اس قدر بڑھ گئی کہ لکھنا پڑھنا چھوٹ گیا۔ یہاں تک کہ اخبار اور کتاب وہ دوسرے سے پڑھوا کر سنتے تھے۔ اتفاق سے ڈاکٹر میجر سید حسن صاحب بلگرامی اس زمانے میں علیگڈھ آئے ہوئے تھے انھوں نے آنکھوں کی جانچ کی اور عینک تجویز کردی چنانچہ اسی سال سے صاحبزادہ صاحب نے عینک کا استعمال شروع کیا جو آخر تک جاری رہا۔

ہواخوری کے بڑے شایق تھے صبح کئی کئی میل آبادی سے باہر ہواخوری کو جایا کرتے تھے اور حتی کہ سفر میں بھی وہ اپنے اس معمول کو اسطرح پورا کرتے تھے کہ فرسٹ کلاس کے درجہ میں برابر ٹہلتے تھے اور اسٹیشنوں پر جتنی دیر گاڑی ٹھہرتی تھی وہ پلیٹ فارم پر برابر چکر لگاتے رہتے تھے علی ہذا شدت برسات میں آفتاب منزل کے برآمدے میں چہل قدمی کرتے تھے اور تعداد مقررہ برآمدے کی لمبائی قدموں سے گن کر پوری کر لیتے تھے۔ ۱۹۱۲ء کے شروع ہوتے پر باوجود ہواخوری کے معمول کے معدہ کی شکایت رہنے لگی ڈاکٹر کے مشورہ سے گوشت کا استعمال قطعی ترک کردیا۔ غذا میں چاول مکھن دودھ اور ترکاری کا استعمال رہنے لگا۔ کچھ دنوں بعد مرغ کے چوزہ کا گوشت اور ترکاری کا معمول کردیا جب سفر میں جاتے تو اپنا باورچی ساتھ رکھتے۔ اور پرہیز ومعمول کو ترک نہ کرتے یہ غذا انکی علیگڈھ میں پرہیزی کے نام سے مشہور ہوگئی تھی

لیکن مٹھائی ہر قسم کی کثرت سے کھاتے رہے۔ کوشش کرتے تھے کہ کمی ہو جائے لیکن اپنی اس کمزوری پر آخر عمر تک غالب نہ آسکے۔ ہمارے خیال میں یہ عادت ان کی تندرستی بگڑنے کی ابتدا اور انتہا ہے جب انڈیا کونسل کے ممبر ہو کر پہلی بار ولایت گئے تو ایک سال تک باورچی ساتھ نہ گیا تھا۔ جس کا مضر اثر صحت پر پڑا دوسری مرتبہ جب انگلستان واپس گئے تو اپنے باورچی (ابراہیم) کو ساتھ لے گئے۔ لیکن چونکہ صحت پہلے ہی سے خراب ہو چکی تھی اسلئے اس مرتبہ بھی ان کی تندرستی اچھی نہ رہی جنوری ۱۹۱۸ء میں زکام اور حرارت کے علاوہ پیشاب کی شکایت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ رچمنڈ کے مشہور حمام (مشکاف ہائڈرو باتھ) میں کئی ہفتہ تک غسل کیا جس سے یہ شکایات بڑی حد تک رفع ہو گئیں اس کے بعد ۱۹۱۹ء میں انگلستان ہی میں قلب کے مرض کا حملہ ہوا۔ اس بیماری کی وجہ سے ہندوستان آنا پڑا ان کی تندرستی کے توازن قائم نہ رہنے کا سبب ان کی شدید محنت تھی یہ محنت روپیہ کمانے کے لئے نہ تھی بلکہ قومی اور ملکی کاموں میں انہماک اس کا سبب تھا۔

شادی اور اولاد

صاحبزادہ صاحب کی شادی ۱۸۸۶ء میں اپنے خاندان میں محمد حسین خاں صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جو نواب صاحب کنجپورہ سے براہ راست زیادہ قریب تھے)۔ بیگم صاحبہ[1] حیات ہیں صاحبزادہ صاحب علیگڈھ میں تعلیم پا رہے تھے۔ اسی زمانے میں ۱۸۸۸ء کو صاحبزادہ شمشاد احمد خاں پیدا ہوئے۔

شمشاد احمد خاں علیگڈھ کالج میں بی۔ اے کے درجہ تک پہونچ کر ولایت گئے اس کے بعد ۱۹۱۲ء میں بیرسٹری پاس کر کے ولایت سے واپس آگئے اور انھوں نے صرف بیرسٹری ہی نہیں پاس کی۔ بلکہ کیمبرج یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ کی ڈگری بھی حاصل کی بیرسٹری کا کام علیگڈھ میں صاحبزادہ صاحب کی حیات ہی میں شروع کر دیا تھا۔ صاحبزادہ صاحب کے انتقال کے بعد ریاست بڑودہ میں ملازمت اختیار کی۔ اس وقت وہیں قانونی مشیر (Legal Remembrancer) کے عہدہ پر ممتاز ہوئے اور اب وہاں سے

[1] افسوس ہے بیگم صاحبہ کا انتقال ۱۷ دسمبر ۱۹۳۹ء بروز شنبہ کو ہو گیا۔

مستعفی ہوکر لاہور میں مقیم ہیں۔ اور بیرسٹری کر رہے ہیں۔

صاحبزادہ شمشاد احمد خاں کے بعد خاتون جہاں بیگم اور شہزادہ احمد خاں توام پیدا ہوئے خاتون جہاں بیگم نے عین عالم شباب میں ۵ جولائی ۱۹۰۸ء کو گوالیار میں انتقال کیا۔ اس حادثہ کا تار صاحبزادہ صاحب کو بجنور میں جہاں وہ ایک مقدمہ کی پیروی کر رہے تھے ملا۔ اس سے ایک دن پہلے خطرناک علالت کی اطلاع کا تار ملا تھا۔ ان کو اس بچی سے نہایت انس تھا۔ اس واقعہ کو انھوں نے جن الفاظ میں اپنے روزنامچہ میں لکھا ہے اس سے ان کی نہ صرف دلی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کے احساس فرض اور رضا و تسلیم کا بھی پتہ چلتا ہے۔

خاتون نہایت نیک مزاج اور محبت والی تھی اور دوسروں کا کام بڑے شوق سے کرتی تھی۔ چونکہ اب وہ سیانی ہو گئی تھی ہیں اس کے مستقبل کے لئے متردد رہتا تھا اور کسی معقول لڑکے کی مجھے جستجو تھی۔ لیکن خاتون رخصت ہو گئی۔ اور ہم کو اپنے متعلق فکر اور تکلیف سے آزاد کر گئی۔ اس کی رحلت سے رنج اور صدمہ ہے لیکن ہمارا رنج اور صدمہ بس فوری ہے۔ یہ رنج اور صدمے عرصہ دراز تک باقی نہیں رہتے۔

ایک تار سے مجھے اب یہ خبر پہونچی کہ خاتون کا جنازہ گوالیار سے علیگڈھ لایا جا رہا ہے۔ بس میں نے فوراً یہ طے کیا کہ علیگڈھ پہونچکر خاتون کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوں چنانچہ چھ بجے شام بجنور سے روانہ ہو کر میں سات بجے صبح علیگڈھ پہونچا۔ اور اسٹیشن سے سیدھا قبرستان گیا۔ جہاں دیکھا کہ میرے پہونچنے سے کچھ پہلے خاتون دفن کیجا چکی تھی۔ میرے اکثر مہربان ہنوز قبرستان میں موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ خاتون کو چار پانچ دن بخار آیا تھا۔

جب میں قبرستان سے مکان کو آیا۔ یہ منظر غمناک تھا یعنی والدہ اور دوسرے عزیز جو گوالیار سے علیگڈھ آئے تھے مجھے ملے اور ان سے میرا سامنا ہوا اب تک تو میں نے ضبط کیا تھا۔ لیکن عزیزوں کے اس گروہ کے درمیان طبیعت پر میرا قابو نہ رہا۔ اور میں بے اختیار پیاری خاتون کو خوب دل کھول کر رویا۔ لیکن بس یہی زار زار رو لینا انسان کے صدمہ

کی حد کمال ہے اور پھر تھوڑے ہی عرصہ میں یہی انسان ہے اور وہی دنیا کے بکھیڑے ہیں۔

صاحبزادہ شہزاد احمد خاں نے علیگڈھ کالج میں ایف۔ اے تک تعلیم پانے کے بعد اگست ۱۹۱۲ء میں ولایت میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم زراعت کی اور بیچلر آف ایگریکلچر کی ڈگری کیمبرج سے حاصل کی اور ریاست گوالیار میں ضلع کے اعلیٰ افسر ہوئے اور نیز دیگر چند بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے بعد ریاست کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر اب علیگڈھ میں مقیم ہیں اور آجکل اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے آنریری سکریٹری کی حیثیت سے یونیورسٹی کی خدمت انہماک سے کر رہے ہیں تیسرے لڑکے کا نام صاحبزادہ آباد احمد خاں ہے۔ علیگڈھ کالج میں ایف۔ اے تک پڑھا۔ ۲۵ جولائی ۱۹۱۷ء کو بحیثیت ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس میں داخل ہوئے اب امپیریل پولیس سروس میں ہیں اور آجکل لاہور (پاکستان) ڈپٹی انسپکٹر جنرل ریلوے پولیس ہیں۔

صاحبزادہ خورشید احمد خاں چوتھے فرزند ہیں آپ نے بھی علیگڈھ کالج میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۲۱ء کو انڈین سول سروس میں داخل ہوئے آجکل دہلی میں چیف کمشنر ہیں۔

صاحبزادہ خورشید احمد خاں کے بعد زہرہ بیگم ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی (نواب) سر سید راس مسعود جنگ نبیرہ سر سید احمد خاں مرحوم کے ساتھ ہوئی تھی۔ جن کے دو بیٹے سید انور اور اکبر مسعود ہیں۔

صاحبزادہ صاحب کی سب سے چھوٹی اولاد انیس احمد خاں آجکل میجر جنرل ہندوستانی فوج میں ہیں اور دہلی میں مقیم ہیں۔

صاحبزادہ صاحب کی پرائیوٹ زندگی پر تبصرہ ان کے ایک دوست کے قلم سے

قبل اسکے کہ یہ باب ختم ہو یہ ضروری ہے کہ صاحبزادہ صاحب کے پرانے دوست مولوی عنایت اللہ صاحب بی۔ اے کے خط کا وہ حصہ جس میں ان کے اخلاق وعادات

پر تبصرہ کیا گیا ہے نقل کردیں اس خط کا پہلا حصہ طالب علمی کے حالات کے سلسلہ میں لکھا جا چکا ہے مولوی عنایت اللہ صاحب لکھتے ہیں۔

جیسی حقیقی عزت اور خالص محبت آفتاب احمد خاں کے دل میں سرسید کی تھی ایسی بہت کم طالب علموں کے دل میں تھی۔ سرسید علیہ الرحمتہ کے مداح اور ان سے ایک خوف آمیز محبت کے رکھنے والے بالخصوص جب طالب علمی کے زمانے سے نکلکر دنیا میں قدم رکھا بہت تھے مگر آفتاب احمد خاں اس گروہ میں بھی ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ جو سرسید کی بزرگی اور ان کے احسانات سے مرعوب ہو کر ان کو تقریباً ایک بے عیب ہستی مانتا تھا اور یہ طلبار ایسے تھے کہ ان میں جو مر گئے وہ اسی اعتقاد پر مرے اور جو جیتے ہیں وہ اسی مذہب پر مرینگے۔

کیمبرج سے واپسی کے بعد آفتاب احمد خاں کے اخلاق میں اور زیادہ جلا ہو گئی۔ بے انتہا محبت اور سچی محبت سے ملتے تھے۔ جب باتیں ہوتی تھیں تو گھنٹوں تک ہوتی تھیں اور بہت خوشی سے وقت گزرتا تھا۔ ولایت سے ایسی مفید باتوں کا سبق لے کر آئے تھے اور ان کو اس قدر واضح طور پر بیان کرتے تھے کہ ان کی تقریر نہایت سبق آموز ہوتی تھی۔ بعض دوست ایسے بھی واپس آئے تھے جن کو اپنے سوٹوں (پوشاک) کو اوروں کے سوٹوں پر ترجیح دینے اور انگریزوں کو ذلیل سمجھنے کے سوا دوسرا کام نہ تھا۔

انڈیا آفس کی ممبری سے جب آفتاب احمد خاں واپس آئے اور ان کے مضامین میں نے پڑھے تو ان میں آفتاب احمد خاں کچھ اور ہی چیز تھے۔ ان کی دماغی قابلیتوں کا دائرہ عمل اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میرے دل میں بار بار یہ خیال گزرتا تھا کہ جس روح میں اتنی اولوالعزمیاں ہوں وہ جسم کو ضرور فنا کر دیگی۔

آفتاب احمد خاں نہایت نیک خیال اور شریف طبیعت کے انسان تھے درد میں ضبط ان کا سب سے بڑا جوہر تھا۔ انانیت اور خودستائی ان میں مطلق نہ تھی۔ تعریف تک سے گھبراتے تھے۔ سچے دل اور ایمان سے دماغ پر پوری جان اور روح کا زور ڈالکر

قوم کا فائدہ سوچتے تھے۔ اسی کو راہ مستقیم سمجھتے تھے۔ پھر دوسروں کی مخالفت سوہان روح ہو جاتی تھی۔ مگر اس تکلیف میں ان کا ضبط انتہا کو پہونچا ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں جب میں ان سے آخری مرتبہ ملا تو شکایت کی کہ میرے پاس کیوں نہیں ٹھیرے۔ دوسرے دن صبح کے وقت کھانے پر بلایا۔ کھانے کے بعد جو باتیں ہوئیں ان میں کوئی خاص بات نہ تھی صحت کی خرابی سے طبیعت پر ایک ضعف معلوم ہوتا تھا۔ البتہ کالج کے ذکر سے ان کے دل پر ایک چوٹ سی لگتی تھی۔ مگر کوئی شکایت زبان پر نہ تھی۔ اسی دن میں تین بجے کی گاڑی سے بریلی روانہ ہوا۔ علیگڈھ سے ایک صاحب ہمسفر ہوئے انھوں نے باتوں میں کہا کہ کل آفتاب احمد خانصاحب کا نام اگزیکیٹو کونسل سے خارج کر دیا گیا۔ یہ سنکر مجھے سخت حیرت ہوئی کیونکہ آج ہی صبح کو میں ان سے ملا تھا۔ اور انھوں نے اس کا مجھ سے مطلق اس کا ذکر نہ کیا اور نہ کسی قسم کی شکایت کا کوئی جملہ ان کی زبان پر آیا۔

آفتاب احمد خاں سرسید کے نہایت عزیز طالب علموں میں سے تھے اور آفتاب احمد خاں کو بچپن سے لیکر آخر عمر تک سرسیدؒ کی عظمت اور بزرگی اور جس دار العلوم میں تعلیم پائی تھی اس سے تعلق رکھنے کا ایسا خیال تھا کہ میں سمجھتا ہوں اسی وجہ سے انھوں نے علیگڈھ کو اپنا وطن بنایا اور سرسید کی وفات کے بعد تعلقات ایسے بڑھے کہ دونوں خاندانوں کی نسل آئندہ مشترک رہ کر چلے گی۔ ظاہر ہے کہ سرسیدؒ کے انتقال کے بعد ان کے کاموں کو ترقی دینے والا علیگڈھ کا کوئی طالب علم اس مرتبہ کو ابھی نہیں پہونچا ہے جو رتبہ آفتاب احمد خاں حاصل کر گئے ہیں ایک ایسے قدیم متعلم کا ماتمی ہوں (خدا انھیں غریق رحمت کرے) جو ماں باپ کے مرنے پر زیادہ نہ روئے تھے لیکن جب کالج کا انتظام سپرد ہوا اور اُسے خطروں میں دیکھا تو زار وقطار رو کر سر پیٹتے تھے۔

یہ ان میں تھے جو سرسیدؒ اور ان کے کاموں کے لئے جان تک وقف کر دیتے

اور کردی۔ آفتاب احمد خاں نے جوانی سے کالج کی خدمت شروع کی۔ دل تو ملا ہی تھا وقت بھی مل گیا۔ پس قدیم طلبا میں جو فخر ان کو حاصل ہوا وہ اور دوسرے کو نصیب نہ ہوا۔ ممکن ہے کہ آئندہ کالج کے طالب علم کالج کی خدمت میں ان سے بڑھ جائیں لیکن اس کو چاہے خود غرضی کہئے یا خود ستائی وہ ہمارے زمانے کے نہ ہوں گے انکے ہاتھ میں مفت کی دولت ہوگی۔ ان کا ذکر نہیں جنھوں نے آفتاب احمد خاں کے ساتھ کام کیا ان کی دولت محنت کی کمائی ہے اور وہ ہر عزّت کے مستحق ہیں اس وقت تو اپنے نظام شمسی اور چاند تاروں کا ذکر ہے؟ کہکشاں کی کسے خبر ہے کہ اس میں کتنے آفتاب ہیں؟"

باب یازدہم

صاحبزادہ صاحب کے مذہبی عقائد اور خیالات

قبل اس کے کہ ہم صاحبزادہ صاحب کے مذہبی عقائد کی تفصیل بیان کریں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان کے روزنامچوں میں جابجا ایسے خیالات درج ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے ہی سے ان کے دل میں مذہبی لگن موجود تھی۔ مثلاً ۱۳۱۲ء میں جبکہ وہ انگلستان میں موجود تھے وہاں کی منہیات اور ترغیبات سے متنفر ہو کر انھوں نے خدا کی طرف اپنا قلب رجوع کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

"خدا کے فضل و کرم سے صبح حسب معمول اٹھا۔ ٹہلنے کو باہر چلا گیا۔ اپنے خالق کے حضور میں سجدہ کیا۔ سجدہ سے اٹھکر ایک ٹیلہ پر اب بیٹھا ہوں یہ ہری کچھ گھاس سے ڈھکا ہوا ہے۔ نیچے ایک چشمہ رواں ہے۔ عجیب منظر اور سماں ہے اسی حال میں خدا سے دعا کرتا ہوں۔ الٰہی بڑے بڑے وساوس شیطانی و نفسانی سے مقابلہ ہے میری مدد فرما۔ مجھے یہ ہر وقت ستاتے رہتے ہیں یہ میری روحانی مسرت کو برباد کئے ڈالتے ہیں۔ یہ کسی وقت مجھے ان بے پایاں الطاف کا حظ اٹھانے نہیں دیتے جو تو نے محض اپنے فضل سے مبذول فرمائے ہیں۔ خود بینی۔ تکبر۔ احمقانہ ہوس پیش پیش ہے اسی طرح دوسرے چھوٹے چھوٹے جذبات کا ایک لشکر ہے جو کسی وقت بھی مجھے ستانے سے باز نہیں رہتا۔ اے رحمان و رحیم مجھے ان کے دکھ اور عذاب سے محفوظ فرما دے مجھے توفیق عطا فرما کہ اپنی زندگی قناعت اور جمع خاطر سے گزاروں۔ آمین!"

سیر کو باہر گیا۔ مجھ پر شیطان نے شدید حملہ کیا ہے۔ لیکن میں خدا سے نصرت و امداد

کی دعا کرتا ہوں۔ اس خبیث سے میں جنگ کر رہا ہوں۔ اس جنگ کو عرصہ ہو چکا ہے یعنی کئی سال گزر گئے ہیں لیکن میں اب تک یہ ہی دیکھ رہا ہوں کہ یہ لعین قوی اور اس قابل ہے کہ مجھے ضرر پہونچاوے اور بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مجھے پچھاڑ دیا۔ لیکن میرا قصد بھی انشا اللہ تعالیٰ صمیم ہے کہ اس مردود کا مقابلہ کروں گا۔ اس سے کشتی لڑوں گا۔ اس سے جنگ کروں گا اور ایسی جواں مردی ہمت استقلال کے ساتھ جنگ کروں گا جیسی میرا خدا مجھکو اپنے فضل سے سمجھ اور طاقت کی توفیق عطا فرمائیگا یہ بات میں جانتا ہوں کہ یہ کام کس قدر دشوار ہے لیکن شیطان کا محکوم ہو کر جینا تو کیا جینا ہے اس ملعون شیطان کی حکومت کا مہلک اور منحوس اثر یہ ہے کہ ہر ایک نیکی انسانی صفت اور صائب عقل کا وہ قطعی تختہ الٹ دیتا ہے۔"

نظری طریقہ سے میں آزاد نظر آتا ہوں لیکن عملی پہلو کا یہ رنگ ہے کہ اپنے بہترین فطری قویٰ کے کام میں لانے کی مجھے ذرہ برابر اجازت نہیں دی جاتی قنانہ ہونے والی خود بینی۔ جذبات رذیلہ اور حسد ایک حد تک میرا پیچھا نہیں چھوڑتے اور نہایت بے رحمی سے میری جان عذاب میں ڈالے ہوئے ہیں۔ لیکن ان سب کو جو کچھ ان سے ہو سکتا ہے کرنے دو مگر ہاں۔ اگر میں بھی خدا کا بندہ اور مرد ہوں تو خدا کے فضل سے ان کو دیکھ لونگا لیکن یہ بھی تو قدرتی امر ہے کہ میں ان کے ہاتھ میں ہوں۔ با ایں ہمہ جہاں تک مجھ میں طاقت ہے میں ہر ایک ممکن ذریعہ سے چارہ جوئی کروں گا کہ ان کے پنجہ سے خلاصی ہو۔ خدا میری مدد فرمائے۔ آمین۔"

سنہ ۱۹۰۱ء میں جبکہ صاحبزادہ صاحب کو بیرسٹری کرتے ہوئے قریب سات سال گزر چکے اور وکالت کا کام روز بروز بڑھ رہا تھا ان کے دل میں جو مذہبی دھن شروع سے لگی تھی اس نے ان کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر کے چھوڑا اور ان کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ کلام مجید کا مطالعہ معنی و تفسیر کے ساتھ کریں چنانچہ مارچ ۱۹۰۱ء

میں صاحبزادہ صاحب نے ایک عالم مولوی سے کلام مجید باقاعدہ پڑھنا شروع کیا یہ ضرورت کیوں محسوس ہوئی ۔ اس کی تفصیل ان کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔

"آج رات سے میں نے ایک عالم مولوی صاحب سے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا ہے میرا مقصد یہ ہے کہ احکام اسلام جیسے کلام پاک میں لکھے ہوئے ہیں سمجھوں۔ انسان کے لئے اپنے مذہب کے احکام مطالعہ کرنا اور اچھی طرح سمجھنا اشد ضروری بات ہے۔ چنانچہ ایسے مطالعہ کے اعتبار سے ابھی میری زندگی کا ورق کورا سادہ ہے میں مسلم کہلایا جاتا ہوں لیکن اپنی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں ہوں مذہب ایسی چیز نہیں کہ انسان اس کی طرف سے بے پرواہ رہے۔ میں اصلی مسلم اس وقت تک نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ اپنا مذہب اچھی طرح نہ سمجھوں اور اس کی قدر نہ پہچانوں پس میرا مقصد ہے کہ قرآن مجید اور دوسری مذہبی کتب کا مطالعہ کروں اس کے عبور میں ضرور وقت صرف ہوگا کیونکہ یہ کام مشکل ہے لیکن اب تو عزم ارادہ یہی ہے کہ اپنا مذہب اچھی طرح سمجھ جاؤں۔

وجود باری تعالیٰ اور وحدانیت پر صاحبزادہ صاحب کا مضمون

قرآن مجید کا مطالعہ جس قدر ضروری ہے اسی قدر مشکل بھی ہے لیکن باوجود اس مشکل کے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے اور اس کے لئے کوشش کرنا ہر مسلم کا عین فرض ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس مطالعہ کے لئے نہ صرف عربی کا پورا پورا علم درکار ہے بلکہ اسلامی تاریخ اور اسلام کی ابتدا اور رسم کے مفصل حالات سے آگاہی بھی ضروری ہے اس لئے مجھ جیسے جاہل شخص کے لئے ایسی کتاب کا مطالعہ کرنا اور اسکا سمجھنا ظاہر ہے کہ نہایت دشوار ہے باایں ہمہ اس مقصد میں سعی کرنا میرا فرض ہے اس لئے اسی کے نام پر جس کا یہ کلام ہے میں اس میدان میں قدم رکھنے کی جرات کرتا ہوں اور اس سے صدق دل سے دعا کرتا ہوں کہ وہ محض اپنے فضل سے میری مدد فرمائے"۔

کلام مجید کے مطالعہ کے علاوہ حضرت امام غزالی کی مشہور کتاب کیمیائے سعادت بھی
ان کے مطالعہ میں رہنے لگی اور رفتہ رفتہ قرآن مجید کی تلاوت اور مطالعہ میں ان کا انہماک
اس قدر بڑھا کہ بعض وقت پچاس صفحات تک تلاوت کی نوبت پہونچ جاتی تھی ۱۹۰۹ء
میں آپ نے قرآن مجید کے متعلق ایک اہم خدمت شروع کی یعنی قرآن مجید کی ایسی
آیات کا انتخاب کرنا شروع کیا جن کا تعلق معاشرت اور انسانی اخلاق حسنہ سے ہے
صاحبزادہ صاحب نے اپنے قلم سے لکھی ہوئی چار ضخیم جلدیں چھوڑی ہیں جن میں قرآن مجید
کی آیات کا انتخاب مذکورہ بالا اصول پر کیا گیا ہے ہر پارہ علیحدہ علیحدہ لیا گیا ہے پھر
اس کی صورتیں لی ہیں اور سورتوں سے آیات نکالی ہیں پھر ان آیات سے اوامر و نواہی
معاشرتی اور اخلاقی تعلیم کے احکام لکھے ہیں۔ اصل متن کے ساتھ اردو میں معنی لکھ لئے ہیں
اور پھر شرح بھی کی ہے۔

جب صاحبزادہ صاحب نے قرآن مجید کی تعلیم اس کاوش سے شروع کی تو کون شبہ
کر سکتا ہے کہ یہ محنت بے نتیجہ تھی بلکہ ان کے اکثر کارنامے اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ اسلامی
اخلاقی اور معاشرتی تعلیم ان کے دل و دماغ نے جذب کر لی تھی اور کوئی شک نہیں کہ وہ بڑے
رتبہ کے عملی مسلم تھے اسی تعلیم کی بدولت ان کا ایمانی احساس اس قدر نازک ہو گیا تھا کہ جو
کام دوسرے لوگ پالیسی یا ضرورت وقت سمجھ کر کرتے تھے صاحبزادہ صاحب اسے معصیت
جان کر اس سے بچتے تھے چنانچہ ان کے ساتھ کام کرنے کو ان ہی جیسے ایماندار اور ذکی الحس شخص درکار
تھے۔ اور افسوس کے ساتھ اعتراف ہے کہ اس جنس کی علیگڑھ میں بہت کمی تھی۔

صاحبزادہ صاحب کی یہ تحریریں اگر ترتیب دی جائیں تو تعلیم القرآن پر ایک مجلہ
تیار ہو سکتا ہے۔

مشتے نمونہ از خروارے کے مقولہ کے مطابق ہم کو یہاں پر یہ دکھا دینا بھی ضروری ہے
کہ وہ کیا اخلاق و احکام ہیں جو صاحبزادہ صاحب نے قرآن مجید سے اخذ کئے ہیں اور جب

اخذ کئے تو وہ سب ان کے علم میں تھے اگر چند پر بھی وہ عمل کر سکے ہوں گے تب بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے
کہ وہ پاکیزہ صفات کے مسلم تھے۔ ظاہر ہے کہ ذیل کی چند سطور کل مبحث پر حاوی نہیں ہو سکتیں
پس چند ہی باتیں لکھی جاتی ہیں۔

یہ مکرر گذارش ہے کہ جو اخلاقی تعلیم صاحب زادہ صاحب نے لکھی ہے اسکا ماخذ
بھی لکھ دیا ہے کہ فلاں آیت سے یہ تعلیم نکلی ہے ملاحظہ ہو؟

دوسروں کے مکان میں خاص تین اوقات میں نہ جانا چاہیئے۔ نماز فجر سے قبل دوپہر
کا کھانا کھانے کے بعد۔ بعد عشاء ۔ ۲ بری باتوں کا چرچہ نہ کرنا۔ ۳ عورتوں کو شرعی
پردہ کرنا ۴ بیوہ کا نکاح کر دینا ۵ حق باطل کا سر کچل دیتا ہے ۶ نا شکری اور دغابازی کو
خدا پسند نہیں کرتا ۷ مغرور تباہ کر دیا جاتا ہے ۸ دنیاوی ساز و سامان عارضی اور ہیچ ہے
۹ نیکی کا پھل ضرور ملتا ہے ۱۰ انسان سب سے زیادہ جھگڑالو اور جلد باز ہے ۱۱
والدین کا نہایت ادب اور احترام کرو ۱۲ رشتہ داروں غریبوں مسافروں اور بے
زبان جانوروں اور ماتحتوں کے حقوق پہچاننا ۱۳ خیرات میں اعتدال ۱۴ ناپ اور
تول ٹھیک کرنا ۱۵ وعدہ پورا کرنا ۱۶ عہد پر قائم رہنا ۱۷ یتیم کا مال نہ لو ۱۸
زنا اور قتل کے پاس نہ جاؤ ۱۹ انتقام میں زیادتی نہ کرنا ۲۰ شیخی نہ مارنا ۲۱ اکڑ کر تکبر
سے نہ چلنا ۲۲ بغیر پورے علم کے کسی بات کے پیچھے نہ ہو جاؤ ۲۳ احسان کرو لیکن احسان
نہ جتاؤ ۲۴ بحث احسن طریقہ سے کرو ۲۵ مخالفت سے تنگدل نہ ہو ۲۶ حرام سے بچو ۲۷
کسب حلال کی جستجو کرو ۲۸ کبھی جھوٹی گواہی نہ دو ۲۹ خدا کا خیال کر کے سچی گواہی میں
والدین رشتہ دار۔ امیر۔ غریب کسی کا پاس نہ کرو ۳۰ گواہی نہ چھپاؤ ۳۱ سود حرام
۳۲ تجارت حلال ہے ۳۳ رزق مقسوم پر قناعت کرو ۳۴ جتنی سعی ممکن ہو کرو ۳۵
حق اللہ حق العباد کا خیال رکھو ۳۶ عمل صالح کرو ۳۷ نماز روزہ۔ زکوۃ حج فرض ہے۔
۳۸ ظاہر اور پوشیدہ خیرات دو ۳۹ تکالیف اور نقصان پر صبر کرو ۴۰ قصور کو معاف

کرو ۴۱ غصہ، طمع، لالچ، حرص، خوشامد سے بچو ۴۲ ملک میں فساد نہ پھیلاؤ ۴۳ فساد قتل سے اشد ہے ۴۴ اولاد کو افلاس کے خوف سے قتل نہ کرو ۴۵ تواضع اور انکسار اختیار کرو۔ ۴۶ خدا لوگوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود اپنے افعال کا نتیجہ پاتے ہیں ۴۷ چوری اور خیانت نہ کرو ۴۸ مال اور اولاد امتحان ہیں اور دنیا کی محض زینت ہیں ۴۹ بہتان نہ لگاؤ ۵۰ سب سے اچھی اور محبوب چیز خیرات کرو ۵۱ اتفاق و اتحاد سے رہو ۵۲ مسلم آپس میں بھائی ہیں ۵۳ معاملات میں مشورہ سے کام کرو ۵۴ رحم کرو ۵۵ ہمت نہ ہارو ۵۶ سادہ روش اختیار کرو ۵۷ اسراف نہ کرو وغیرہ وغیرہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت اور محبت

صاحبزادہ صاحب کو جس طرح قرآن مجید کے مطالعہ میں شغف تھا اسی طرح آنحضرت صلعم کے حالات کے مطالعہ کا بھی شوق تھا۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ آنحضرت صلعم کی سیرت میں ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں حضورؐ کے حالات تحقیق و تدقیق کے ساتھ مندرج ہوں۔ ان کے روزنامچہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب ۳۰ مارچ ۱۹۱۲ء کو لکھنؤ میں مولانا شبلی سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے مولانا سے اصرار کیا کہ وہ سرکار دوعالم کی ایک مبسوط و مکمل سوانحعمری لکھیں جس میں حضور صلعم کے شمائل فضائل تفصیل کے ساتھ دکھائے جائیں صاحبزادہ صاحب کی یہ خواہش پوری ہوئی اور علامہ موصوف نے حضورؐ کی سوانح عمری لکھی اور جس کی تکمیل علامہ موصوف کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی نے کی یہ کتاب سیرت النبی کے نام سے کئی جلدوں میں صاحبزادہ صاحب کی حیات ہی میں شائع ہوگئی تھی جس پر انھوں نے نہایت خوشی کا اظہار کیا تھا اور فرمایا تھا کہ مولانا شبلی نے ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا۔

باب دوازدہم

علالت اور وفات

بیماری اور علاج یکم جنوری ۱۹۲۷ء کو صاحبزادہ صاحب وائس چانسلری کی خدمات سے سبکدوش ہوئے۔ اس سال کے تقریباً آٹھ ماہ اس کمیشن کے متعلق تیاری میں صرف ہوئے جو سر ابراہیم رحمت اللہ کمیشن کے نام سے مشہور ہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ پہلے ہو چکا ہے اس کام کے علاوہ جو کچھ وقت ملا وہ احمدی اسکول نابینایان علیگڈھ کی تکمیل میں صرف ہوا اس کا ذکر بھی کیا جا چکا ہے صحت تو پہلے ہی سے خراب تھی اس سال کی محنت مزید اور جانکاہی سے اور زیادہ خراب ہوگئی شروع ۱۹۲۸ء سے طبیعت زیادہ مضمحل ہوگئی تھی باوجود احتیاط کے ۲۲ جنوری ۱۹۲۸ء کو بعد شام فالج کا پہلا دورہ پڑا۔ ۲۴ جنوری کی شب میں دوسرا دورہ پڑا۔ جس سے بیہوشی ہوگئی۔ علاج ڈاکٹری نہایت احتیاط اور اہتمام سے شروع ہوا۔ پہلے معالج کرنل لوانڈ سول سرجن تھے۔ اور مقامی ڈاکٹر ان کی ماتحتی میں نگراں تھے۔ کرنل رحمن صاحب آگرہ سے آکر دیکھ جاتے تھے کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب نے بھی دہلی سے آکر دیکھا مرض کی تشخیص اور علاج میں سب ڈاکٹروں کی رائے متفق تھی مقامی ڈاکٹروں میں سے باری باری سے ایک ڈاکٹر شبانہ روز موجود رہتا تھا۔ چار چار نرسیں متعین رہتی تھیں مختصر یہ کہ ہر ممکن تدبیر و کوشش کی گئی لیکن مرض میں آثار تخفیف پیدا نہ ہوئے بلکہ "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"۔ کرب و بیچینی بدستور موجود تھی۔

اب مارچ کا مہینہ شروع ہوا۔ اور گرمی میں ڈاکٹروں نے علی گڈھ کا قیام خطرناک قرار دے کر دہرہ دون لے جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ وہاں ایک کوٹھی کا انتظام کر کے سول سرجن خود جاکر بڑی احتیاط سے صاحبزادہ صاحب کو پہونچا آئے۔ اور اب دہرہ دون کے سول سرجن نے علاج شروع کیا اور وہاں کے دوسرے ڈاکٹر بھی مشورہ میں شریک ہوئے کچھ دنوں بجلی سے بھی علاج کیا گیا جس کے واسطے دہرہ دون مشہور رہے۔ مگر مرض میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ کرب اور بے چینی کا حال بدستور رہا مجبوراً علاج تبدیل کرنا پڑا۔ ایک مشہور وید سنٹرل انڈیا سے صاحبزادہ سر سلطان احمد خاں کی معرفت بڑی فیس پر بلایا گیا۔ لیکن اسکا علاج ناموافق آیا اور پندرہ دن بعد تبدیل کرنا پڑا۔ اب حکیم محمد احمد خانصاحب نے غیر معمولی توجہ کی۔ ایک نائب حکیم ان کی طرف سے مستقلاً تعینات رہے۔ اس علاج سے کرب و بے چینی میں بہت جلد کمی ہوگئی اور رفتہ رفتہ یہ تکلیف نہ رہی آخر اکتوبر میں جب موسم ٹھنڈا ہوا ان کو دہرہ دون سے علیگڈھ لے آئے۔ یہاں بھی حکیم محمد احمد خاں صاحب کا علاج جاری رہا۔ حکیم صاحب ہر ہفتہ دہلی سے تشریف لاتے تھے اور ایک رات اور ایک دن قیام کر کے حسب ضرورت نسخہ میں ترمیم و تبدیل کرتے تھے اور اپنے نائب حکیم کو ہدایت دے جاتے تھے ان کے علاج سے طاقت میں کچھ بیشی ہوئی اور ہاتھ پاؤں میں خفیف حرکت پیدا ہوئی۔ لیکن طاقت گفتار جو شروع سے جاتی رہی تھی عود نہ کرسکی۔ خلاصہ یہ کہ باوجود ہزارہا روپیہ صرف کرنے اور ہر قسم کی احتیاط کے آرام نہ ہوا۔ اس دوران میں گھر میں دعائے خیر خیرات مبرات اور ورد و وظائف کا سلسلہ جاری رہا ۷ ارجنوری سنہ ۱۹۳۰ء کو تیسرا دورہ پڑا اور ۱۸ ارجنوری کے سہ پہر کو دو بجکر پچاس منٹ پر صاحبزادہ صاحب نے رحلت کی انا للہ و انا الیہ راجعون۔

تجہیز و تکفین

مرحوم کی خبر وفات شہر میں فوراً پھیل گئی۔ تمام عدالتیں و دفاتر یونیورسٹی اور کل مدارس بند کر دئے گئے۔ شہر میں اکثر لوگوں نے کاروبار بند کر دیا اور جوق جوق کوٹھی پر پہونچنا شروع ہوئے۔ صاحبزادہ سردار سر سلطان احمد خاں صاحب اور

شہزادہ احمد خاں اور خورشید احمد خاں وفات سے پہلے ہی علیگڈھ آچکے تھے دوسرے صاحبزادگان کے انتظار میں تجہیز و تکفین ملتوی کی گئی ۱۹ تاریخ کی صبح ہی سے کوٹھی پر مجمع شروع ہوگیا۔ قریب قریب تمام یونیورسٹی ہندو مسلمان انگریز حکام شہر و سول لاین کے معززین جمع ہوگئے۔ ساڑھے نو بجے دن کے مولانا طفیل احمد صاحب منگلوری نے غسل دیا۔ اعزّا اور مرزا ابراہیم بیگ صاحب ایڈیٹر اخبار سرگذشت نے جنازہ تیار کیا۔ دس بجے دن کے یونیورسٹی کرکٹ لان پر زائد از دو ہزار مسلمانوں نے نماز جنازہ ادا کی اس کے بعد مرحوم کی محبوب ترین عمارت یعنی احمدی مدرسہ نابینایان کے احاطہ میں سب نے بصد حسرت و یاس یہ عزیز ترین ہستی تھی جس کی شہرت ہندوستان سے لیکر سمندر پار تک پہونچی ہوئی تھی۔ ہمیشہ کے لئے سپرد خاک کردی۔

جلسہ تعزیت دفن سے فراغت کے بعد اسٹریچی ہال میں جلسہ تعزیت ہوا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اوّل مولانا مولوی محمد ابوبکر شیث صاحب ناظم دینیات نے تلاوۂ کلام پاک فرمائی۔ بعدہٗ نواب مسعود جنگ وائس چانسلر نے ایک نہایت پر درد مختصر لیکن جامع تقریر کے ساتھ تعزیت کا رزولیوشن پیش کیا جس کو حاضرین نے کھڑے ہوکر بالاتفاق پاس کیا۔ آخر میں خان بہادر شیخ عبداللہ صاحب ٹریژرر مسلم یونیورسٹی نے مرحوم کے حالات زندگی مختصراً بیان کئے اور جلسہ بعد فاتحہ یونیورسٹی میں ایک دن کی تعطیل کے اعلان کے ساتھ ختم ہوا۔

اس کے کئی دن بعد ایک جلسہ شہر کی لائل لائبریری میں جو ضلع اور شہر کے ہندو مسلمان معززین کی طرف سے طلب کیا گیا تھا مسٹر پی۔ ڈبلیو مارش کلکٹر ضلع کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ہر قوم کے معززین اور ہر طبقہ کے لوگ شریک تھے مارش صاحب نے منجملہ دیگر حالات کے ایک واقعہ یہ بیان کیا کہ جب وہ انگلستان گئے ہوئے تھے تو انڈیا آفس کے سر دفتر نے مارش صاحب سے کہا کہ جب صاحبزادہ صاحب ممبر ہوکر گئے تھے تو یہ سر دفتران کے سامنے مسلوں کا ایک انبار دستخط کرانے لے گئے۔ صاحبزادہ صاحب نے حیرت سے
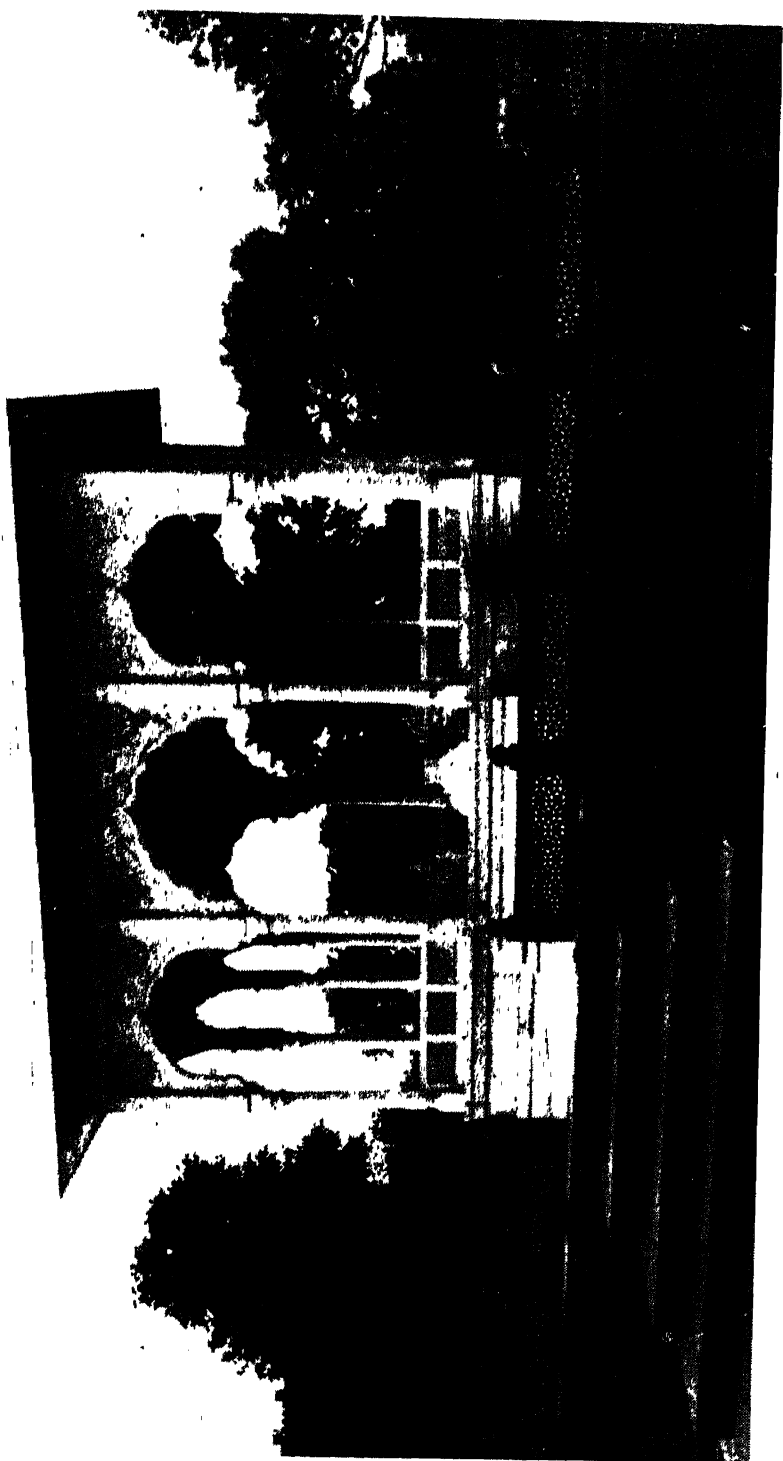
کہاکہ اتنے کاغذات پر میں اس وقت کیسے دستخط کرسکتا ہوں سر دفتر نے کہاکہ یہاں تو اسی طرح دستخط ہوتے ہیں انھوں نے فرمایاکہ آپ کاغذات چھوڑ جایئے میں تو انھیں پڑھے بغیر دستخط نہ کروں گا۔ سر دفتر کہتے ہیں کہ میں نے اپنے دل میں کہاکہ میں بھی دیکھوں گاکہ یہ ہر کاغذ کو کس طرح پڑھتے ہیں۔ مگر چند روز بعد دیکھاکہ صاحبزادہ صاحب نہ صرف مسلوں کو پڑھنے پر اکتفا نہیں کرتے ہیں بلکہ ہر کاغذ کو پڑھتے ہیں اور لمبی لمبی یادداشتیں لکھتے ہیں اور یہی ان کا معمول آخر تک رہا۔ اس شہر کے جلسہ تعزیت میں چودھری خوشی محمد خاں ناظر صاحب کا لکھا ہوا مرثیہ ایک طالب علم نے خوش الحانی سے پڑھا جس سے حاضرین بہت متاثر ہوئے اور نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب صاحبزادہ صاحب کے خاص دوست زار وقطار روتے رہے۔

وفات کے بعد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی وفات کی خبر اخباروں اور تاروں کے ذریعہ سے تمام ہندوستان اور یورپ وغیرہ میں مشتہر ہوگئی اس موقع پر تمام ملک میں ماتمی جلسے ہوئے اظہار وافسوس اور ہمدردی کے ریزولیوشن پاس ہوئے۔

لندن کی انڈیا کونسل گورنمنٹ آف انڈیا کی اسمبلی اور صوبہ کی کونسل وغیرہ نے بھی اظہار تعزیت کیا۔ صاحبزادہ صاحب کے بڑے فرزند شمشاد احمد خاں کے پاس صدہا تعزیتی خطوط اور تار آئے۔ ان میں ان کے ذاتی دوستوں کے علاوہ ملک کے دوسرے اصحاب نے بھی تعزیت اور اظہار ہمدردی کیا اس میں ہندوؤں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔

ہندو لیڈران اور معززین نے صاحبزادہ صاحب کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد اور ہندوستان کے خیر طلبی کا بڑا حامی تسلیم کرتے ہوئے لکھا تھاکہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی وفات کل ہندوستان کے لئے ایک شدید ناقابل تلافی نقصان ہے۔

خطوط۔ مرثیہ قطعے تاریخ صاحبزادہ صاحب کی وفات کے بعد ان کے احباب سے

استدعا کی گئی تھی کہ ان کے حالات اور ان کی پبلک زندگی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریں اس استدعا کے جواب میں جو خطوط موصول ہوئے ان میں سے بعض کا ذکر سوانح عمری میں آچکا ہے۔ چند اہم خطوط اس موقع پر درج کیے جاتے ہیں۔ خطوط کے علاوہ ہم نے متعدد مرثیہ قطعات تاریخ میں سے خان بہادر چودھری خوشی محمد خاں ناظر صاحب سابق گورنر کشمیر کا مرثیہ اور حضرت سید علی احسن صاحب احسن مارہروی اُردو لکچرار مسلم یونیورسٹی کا قطعہ تاریخ درج کیا ہے جس کو ناظرین ملاحظہ کریں گے آخر میں "لیڈر" کے ایک لندن نامہ نگار کا نوٹ بھی لکھ دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان میں ان کی وفات پر کس حد تک افسوس کیا گیا۔

چودھری خوشی محمد خاں صاحب کا خط

"مجھے اس امر کا افتخار بخشا گیا ہے۔ کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے احباب خاص میں محسوب ہو کر ان کے زمانہ طالب علمی کے حالات قلمبند کر کے ارسال کروں میں زور روں سے اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ صاحبزادہ صاحب کی طالب علمانہ زندگی کے حالات سے متعلق میرا علم محدود ہے گو قلبی ارادات کے لحاظ سے ان کے خاص نیاز مندوں میں شمار ہو سکتا ہے اس کی وجوہ یہ ہیں کہ اوّل تو ان کی ابتدائی طالب علمی میں میرا ان کا ساتھ نہیں رہا کیونکہ میں انٹرنس پاس کرنے کے بعد علیگڈھ پہونچا اور صرف ایف۔ اے میں ان کے ہم جماعت ہونے کا مجھے شرف حاصل ہوا۔ دوسرے یہ کہ ان کی طالب علمانہ زندگی کا معیار بھی اس قدر بلند تھا۔ اور اوقات عزیز کی تقسیم اس شدت اور پابندی سے کر رکھی تھی کہ خاص نیاز مندوں کو بھی ان کا قیمتی وقت ضائع کرنے کی جرارت نہ ہوتی تھی نیز ان کے ذاتی حالات اور قومی اور ملکی خدمات کی تفصیل و تحقیق ان کے مورّخ کا فرض ہوگا اور ان کے احباب سے صرف یہ توقع کیجا سکتی ہے کہ اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر ان حالات اور اثرات کا ذکر یں۔ جن سے وہ خود متاثر ہوں لہٰذا میں مختصر طور پر بعض ایسے حالات کا ذکر کرتا ہوں۔

جن احباب نے اس مادر العلوم کے دامان عاطفت میں کچھ پرورش پائی ہے ان سب

پر نظیری کا یہ شعر صادق آئے گا۔

طفلی و دامانِ مادر خوش بہشتے بودہ است

چوں بہ پائے خود رواں گشتیم سرگرداں شویم

جو دل شگفتگی اور فارغ البالی اس زمانے میں حاصل ہوتی ہے وہ کامیاب مستقبل میں بھی کبھی نصیب نہیں ہوتی یہی حالت صاحبزادہ صاحب کی بھی تھی اور اس زمانے میں سوشل تعلقات میں وہ عموماً خنداں رو اور شگفتہ طبع نظر آتے تھے۔ اور اس شگفتگی میں "خون صالح" کی ایک لہر ان کے چہرہ پر دوڑتی نظر آیا کرتی تھی مگر باوجود اس کے وہ انضباط اوقات کے اس قدر پابند تھے۔ کہ پاسبان عقل کو دماغ پر ہر وقت مسلّط رکھتے تھے اور کسی غیر موزوں تفریح اور دل لگی میں شریک نہ ہوتے تھے اور جب ان کے بعض ہمعصر بورڈنگ کے اوقات فرصت و تفریح میں "بھنگ کا پیالہ" گایا کرتے تھے وہ تبسم کناں پاس سے گذر جایا کرتے تھے۔ اور ہمیشہ اس آیۃ کریمہ پر عمل تھا۔ وَاِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا۔

حالانکہ ان کے ہمعصر جو بعد میں "خان بہادر" سی۔ آئی۔ ای۔ مولانا حاجی حرمین شریفین اور نہایت متقطع اور مقدّس ڈاڑھیوں کے حامل ہوئے شوخی و شرارت واسباب تفریح میں آئے دن نئی نئی ایجادیں کیا کرتے تھے اور طلبہ کی استعداد وضع قطع کے مطابق القاب و خطاب تجویز کرتے رہتے تھے یہ اعزاز گویا علیگڈھ کا طرّہ امتیاز ہوگیا ہے یہاں تک کہ احقر ناظر بھی اس امتیاز سے محروم نہ رہا۔ اور یہ اتفاق کی بات ہے کہ یونین کلب کے ایک جلسہ میں صاحبزادہ صاحب نے میرے لئے "لانگ فیلو" کا لقب وضع فرمایا تھا۔

غرض صاحبزادہ صاحب کی ایسی بااصول اور کتابی زندگی تھی کہ ان کے روزانہ مشاغل اور معمولات کی حدود معین تھیں اور ان میں کمی بیشی بہت کم واقع ہوتی تھی ان کے معمولات کا

ے (لانگ فیلو انگلستان کا ایک مشہور شاعر تھا، چودھری صاحب لاغر اور طویل القامت تھے اس مناسبت سے لانگ فیلو کا خطاب ان کے لئے خاص معنی رکھتا ہے۔

یہ ایک ضروری جزو تھا کہ اپنے روزنامچہ روزانہ بستر پر جانے سے بیشتر باقاعدہ لکھتے تھے۔ اور دن بھر کے کام کا احتساب اور تبصرہ کرتے تھے۔ اور اگر کسی کام میں تساہل یا کوئی فروگزاشت ہو جاتی تو ضرور اس کا اعتراف کرتے تھے۔

صاحبزادہ صاحب کی تعلیم و تربیت پر اگرچہ علیگڈھ کے قیام اور سرسید مرحوم کے اعلیٰ شخصیت کا بڑا اثر پڑا مگر میرا یہ خیال ہے کہ اس عمارت کی خشت اوّل ان کے والد بزرگوار نواب غلام احمد خاں مرحوم نے ایسے اعلیٰ اصول پر رکھی کہ صاحبزادہ صاحب نے مدت العمر میں ان اصول سے سرمو تجاوز نہیں کیا۔ نواب صاحب ایک اعلیٰ پایہ کے مصنف اور قادر الکلام شاعر تھے مگر بازاری تغزل میں انھوں نے اپنے وقت عزیز کو ضائع نہیں کیا۔ صاحبزادہ صاحب نے ایک جلد نواب صاحب کے مجموعہ کلام کی مجھے عنایت فرمائی تھی۔ نواب صاحب کا کلام نہایت پختہ اور متین تھا اور تعلیم اخلاق کے لئے بہترین نصاب کا کام دے سکتا تھا۔

صاحبزادہ صاحب وقت کی نہایت قدر کرتے تھے۔ اور عمر گرامی کا ایک لمحہ بھی ضائع کرنا ان کو ناگوار ہوتا تھا گویا مولٰنا حالی کی اس رباعی پر ان کا عمل تھا ؎

رُباعی

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو   روداد جہاں کو ایک کہانی سمجھو

پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا   ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

"معلوم ہوتا ہے کہ آغاز شباب ہی سے خدمت قوم کی اعلیٰ امنگیں اور ارفع ارادے انکے دل میں موجزن تھے۔ اور ان کو اس امر کا احساس تھا کہ وہ کسی بڑے کام کے لئے پیدا کئے گئے تھے"۔ محنت اور مشقت میں ان کو لطف آتا تھا اور خدمت قوم کے مقابلہ میں وہ صحت کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔ چنانچہ اس محنت شاقہ نے ان کی صحت کو نقصان پہونچایا اور ان کی عمر گرامی کا قبل از وقت خاتمہ کر دیا۔

دوسرا نمایاں پہلو ان کی اعلیٰ سیرت کا یہ تھا کہ سرسید مرحوم اور علیگڈھ کالج اور

یونیورسٹی سے ان کی دلبستگی عشق کے درجہ تک پہونچ گئی تھی۔ سر سیّد ان کو نہایت عزیز رکھتے تھے اور صاحبزادہ صاحب اپنے دل و دماغ میں سر سیّد کی حبِ قوم ایثار اور عزم و استقلال کو جذب کرتے رہتے تھے۔ اور اپنی زندگی کا نصب العین وہی قرار دے لیا تھا جو سر سیّد کا تھا۔

علیگڈھ کالج مسلم یونیورسٹی اور تعلیم مسلمانان کے متعلق جو خدمات جلیلہ صاحبزادہ صاحب نے انجام دیں ان کی تفصیل کی سعادت ان کے مورخ کے حصّہ میں آئے گی۔ مگر ان کی حُبِ کالج کے متعلق بارہا تجربہ ہوا کہ علیگڈھ کالج اور یونیورسٹی کی عام شہرت اگر کسی مجلس میں معرضِ بحث میں آجاتی تو آفتاب کے چہرہ پر تمازت کے آثار ضرور نمایاں ہوجاتے تھے۔ تمام عمر علیگڈھ ہی ان کا مسکن رہا اور علیگڈھ ہی میں مدفن ہوئے انحطاطِ صحت کے آخری اسٹیج میں بھی ان کا دل و دماغ اصلاح یونیورسٹی میں مصروف رہا اور میں نے جس حسرت بھری نگاہ کا ان کے مرثیہ میں اشارہ کیا ہے کہ:۔

حسرت بھری نگاہ وہ چشم پُر آب کی
یہ آخری کرن تھی میرے آفتاب کی

"وہ حسرت بھری نگاہ" کالج ہی کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

اس سلسلہ میں اپنے خاص ذاتی تعلقات کا بھی مختصر طور پر ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ صاحبزادہ صاحب کے ہم جماعت ہونے کا فخر مجھے ۱۸۹۰ء میں حاصل ہوا جبکہ ہم دونوں ایف۔ اے میں داخل ہوئے۔ معمولی تعارف تو کالج میں داخل ہونے پر ہوگیا تھا مگر خاص رابطۂ اتحاد میری ایک نظم سے شروع ہوا۔ جو میں نے فرسٹ ایر میں روضۂ ممتاز محل کے متعلق لکھی تھی۔ یہ نظم ایک جلسہ میں یونین کے پڑھی گئی اور بہت مقبول ہوئی تھی اس کا مطلع یہ تھا ؎

کچھ بتا احوالِ دل اے منزلِ خامش بیان
کیوں نظر آتا ہے حسرت خیز تیرا آستان

اور آخر کا شعر جو بہت مشہور ہو گیا تھا حسب ذیل تھا ؎

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

اس نظم کا صاحبزادہ صاحب پر بھی خاص اثر ہوا۔ اور جلسہ سے فارغ ہو کر وہ بڑے تپاک سے مجھ سے ملے اور فرمایا " میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ تم بڑے کام کے آدمی ثابت ہو گے " میں نے عرض کیا کہ میں نے اگر شعر میں ترقی بھی کرلی تو کیا نتیجہ ہو گا سیکڑوں شاعر مارے مارے پھرتے ہیں فرمایا " مگر میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ آپ بڑے آدمی ہوں گے۔ اور قوم کے بڑے بڑے کام انجام دیں گے " افسوس ہے کہ میرا آب و دانہ سنگلاخ زمینوں (کشمیر) میں لے گیا۔ اور مجھ سے نہ شاعری ہو سکی اور نہ کوئی قومی خدمت انجام کو پہونچی مگر اس بات کا مجھے فخر حاصل ہے کہ میری پیشین گوئی آفتاب احمد خاں کے بارے میں صحیح ثابت ہوئی۔

ان پیشینگوئیوں کے تبادلہ کے بعد صاحبزادہ صاحب سے میرا زیادہ میل جول رہا مگر ہماری ملاقاتوں میں ایسی تحریکات کے متعلق گفتگو ہوتی تھی جو اس زمانہ میں استحکام کالج کے متعلق ہوتی تھیں۔ بالخصوص دو تحریکوں کے متعلق بارہا ہمارا باہم مشورہ رہا پہلی تحریک " انجمن الفرض " کا قیام تھا جس کے بانی مبانی صاحبزادہ صاحب اور معاون خاص مولوی بہادر علی صاحب مرحوم اور مولانا سید طفیل احمد صاحب (جو اس وقت بھی مولانا تھے) حبیب اللہ خاں صاحب (خان بہادر) اور چند دیگر برادران تھے اس کام میں نے حتی الامکان حصہ لیا اور بعض بزرگان پنجاب سے ایک معقول رقم وصول کی۔ دوسری تحریک ' ایم۔ اے۔ او، کالج برادرہڈ (انجمن اخوان) تھی جس کا سنگ بنیاد رکھنے کا فخر بندہ ناظر کو حاصل ہے۔ میری استدعا پر مسٹر (بعدہ سر) تھیوڈور مارسین نے " برادرہڈ " کا سکرٹری ہونا منظور فرمایا۔ اور فراہمی چندہ بشرح ایک فیصدی معقول تعداد تک ہونے لگی۔ صاحبزادہ صاحب بھی اس کے

خاص معاون تھے۔ رپورٹ پیش ہونے پر سرسید علیہ الرحمۃ نے ایک نہایت رقت آمیز چٹھی لکھی جس کا خلاصہ یہ تھا "بہ حیثیت طالب علم ہونے کے میں بھی اولڈ بوائے ہوں لہٰذا مجھکو بھی ممبران "برادرہڈ" میں شامل کیا جائے" میرے کالج چھوڑنے کے بعد کسی جلسہ میں "برادرہڈ" کا نام "اولڈ بوائے[1] ایسوسی ایشن قرار پایا۔

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلہ میں صاحبزادہ صاحب نے ایک عرصہ تک جوان تھک مسلسل کوششیں کیں ان کی ایک مثال ان کا "سفر کشمیر" تھا صاحبزادہ صاحب کو انجمن نصرت السلام کے پریسیڈنٹ صاحب نے کشمیر میں مدعو کیا تھا۔ صاحبزادہ صاحب کے داخلہ کشمیر میں ریاست کی طرف سے رکاوٹ پیدا کی گئی لیکن میری کوشش سے ریاست کی غلط فہمی دور ہوگئی۔ اور صاحبزادہ صاحب کشمیر گئے ان کے قیام کشمیر میں ان کی شبانہ روز کی محنت اور ہر کام کو مکمل طور پر انجام دینے کا مجھے دوبارہ ذاتی علم حاصل ہوا جبکہ سات آٹھ روز کے قلیل عرصہ میں محکمہ تعلیم ریاست اور تعلیم مسلمانان کشمیر میں ان اعداد شمار اس صحت اور تحقیق سے ترتیب دیئے کہ کسی کو اس سے انکار نہ ہوسکا۔ بذریعہ مسلسل لکچروں کے مسلمانان کشمیر کے مختلف فرقوں میں تعلیمی بیداری پیدا کر دی۔

سب سے آخری ملاقات کالج کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقعہ پر ہوئی جب کہ صاحبزادہ صاحب کے چہرہ پر ضعف و اضمحلال کے آثار نمودار تھے۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ ان کی عمر کا آفتاب لب بام ہے اور تھوڑے عرصہ میں مسلم یونیورسٹی کا عزیز ترین فرزند آغوش لحد میں ہمیشہ کے لئے آرام کرنے والا ہے انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ ان کے احباب و اعزہ ان کی بے ہنگام وفات پر آنسو بہلاتے رہیں گے۔ مگر اس سے قومی نقصان عظیم کی تلافی نہیں ہوسکتی ؎

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال   صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

[1] یہ جداگانہ انجمن قائم ہوئی تھی برادرہڈ کا نام نہیں بدلا گیا تھا اس کی تفصیل اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے نام کے سلسلہ میں پچھلے صفحات میں دی گئی ہے۔

(احقر خوشی محمد (علیگ)

(خان بہادر چودہری خوشی محمد خاں صاحب۔ ایم۔ بی۔ اے ریٹائرڈ گورنر د ریونیو ممبر کونسل ریاست کشمیر المتخلص بہ ناظر)

مولوی عبدالماجد۔ بی۔ اے دریابادی کا خط

کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔اے کرنے کے بعد اکتوبر ۱۹۱۲ء

میں علی گڈھ آکر میں نے فلسفہ میں ایم۔ اے کرنا چاہا۔ بہ حیثیت طالب علم آفتاب منزل میں حاضر ہو کر صاحبزادہ صاحب سے ملا۔ اب پہلی بار بات چیت کرنے کی نوبت آئی وہ ایک بڑے مقتدر ٹرسٹی۔ میں ایک معمولی طالب علم وہ آفتاب میں ذرہ یوں ہی ان کی شخصیت زبردست تھی اور ادھر میں ضرورت سے زیادہ شرمیلا۔ خیال تھا کہ ایک بات بھی نہ کر سکوں گا۔ لیکن مرحوم کی فرطِ شفقت نے دلیر بنایا۔ بڑی شفقت اور کشادہ جبینی سے پیش آئے۔ علیگڈھ میرا رہنا چار مہینہ سے زیادہ نہ ہو سکا پھر بھی اس درمیان میں کئی بار ملا۔ مرحوم ہمہ تن مسلم یونیورسٹی کے کاموں میں منہمک تھے۔

دسمبر ۱۹۱۳ء میں کانفرنس کے اجلاس آگرے کے سلسلہ میں صاحبزادہ صاحب سے سرسری ملاقاتیں رہیں واپسی پر ریل میں ساتھ ہوا مرحوم کئی دن کی مسلسل محنت کی خستگی سے مغلوب ہونے کی وجہ سے بے قرار ہو رہے تھے میری بے تمیزی کہ میں نے اس وقت بھی سلسلہ گفتگو شروع کر دیا۔ اور مرحوم کا ضبط و تحمل کہ برابر خندہ پیشانی سے جواب دیتے رہے۔

دسمبر ۱۹۱۲ء میں کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا اور اسی کے ساتھ مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا نہایت اہم اور معرکتہ الآرا اجلاس ہوا جو دیکھنے والوں کو غالباً تمام عمر نہ بھولے گا۔ علیگڈھ کی صاحب اقتدار جماعت پر یہ شدید ترین حملہ تھا مسٹر محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی سحر بیانیوں نے سارے جلسہ کو علیگڈھ کا مخالف بنا دیا تھا۔ حالت یہ تھی کہ ادھر حضرات علیگڈھ کی تقریر شروع ہوئی اور ادھر پورا ہال تحقیری نعروں سے گونجنے لگا۔ زبان کھولنی

دشوار تھی۔ اس حالت میں ایک صاحبزادہ صاحب مرحوم کی ہی ایسی تقریر تھی۔ جو ساری جماعت علیگڈھ میں توجہ اور ادب سے سنی جاتی تھی۔ اور خود مرحوم کی متانت کا یہ عالم تھا کہ اتنا ہنگامہ برپا رہا لیکن ان کے مزاج، الفاظ، اندازِ تقریر کسی شئے میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوا۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں دو ماہ لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے دفتر کانفرنس علیگڈھ میں میں نے صاحبزادہ صاحب کی ماتحتی میں بھی کام کیا۔ اس دو مہینہ کی مدت میں میں نے انھیں خوب پڑھ لیا۔ ذہانت درجہ اوسط کی تھی۔ لیکن جفاکشی یا اصول پختگی عمل باضابطگی اور فرض شناسی میں یقیناً وہ معمولی انسانوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ اور اپنی دھن کا اتنا پکا میں نے کم انسانوں کو دیکھا ہے بہت زیادہ وسیع المطالعہ نہ تھے لیکن فن تعلیم کے متعلق لٹریچر خوب پڑھ لیا تھا ایک دو نہیں بیسیوں کتابیں فن تعلیم کے متعلق کانفرنس کی لائبریری میں اب بھی موجود ہوں گی۔ جن کا ایک ایک صفحہ مرحوم کے لگائے ہوئے سُرخ نشانوں سے رنگین اور ایک ایک ورق مرحوم کے لکھے ہوئے حواشی سے مزین ہے حیرت ہوتی ہے کہ اتنے کامیاب و نامور بیرسٹر ہونے کے باوجود اتنا وقت مطالعہ کے لئے کہاں سے نکال لیتے تھے۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں مسلم یونیورسٹی کورٹ کی پہلی میٹنگ میں جب میں شریک ہوا تو سردی کا موسم تھا۔ صاحبزادہ صاحب ولایت سے علیگڈھ آئے ہوئے تھے اور ایسے بیمار تھے کہ میٹنگ میں بھی نہ آسکتے تھے میں گھر جاکر ملا۔ اس درمیان میں میں پوری طرح تحریک خلافت و ترک موالات میں شریک ہو چکا تھا۔ مرحوم نے پہلی بار مجھے کھدر کی وردی میں دیکھا مختلف نشستوں میں کئی گھنٹہ تک اختلافی مسائل پر سلسلہ بحث جاری رہا۔ وہ ہر حیثیت سے میرے بڑے تھے۔ چاہتے تو مجھے ڈانٹ سکتے تھے۔ لیکن کمال ضبط و متانت یہ تھا کہ ڈانٹنا اور بگڑجانا الگ ایک بار بھی نہ آواز بلند ہوئی نہ لہجہ بدلا۔ نہ الفاظ میں گرمی پیدا ہوئی نہ چہرہ پر کوئی تغیر آیا۔

آخری مفصل ملاقات ختم سنہ ۱۹۲۵ء پر جوبلی کے موقع پر ہوئی:۔

بیماری اور کثرتِ افکار نے عمر سے زائد بوڑھا بنادیا تھا۔ کچھڑی ڈاڑھی چہرہ پر ویسے ہی

بھلی معلوم ہوتی تھی جیسے اس سے قبل صاف گورا چٹا چہرہ سہ پہر کی ایٹ ہوم میں ایک سے ایک معزز مہمان جمع اور سب کو صاحبزادہ صاحب کی طلب۔ لیکن وہ مرحوم سب سے الگ لٹن لائبریری میں ایک گوشہ میں ایک صوفے پر مجھ گمنام دبلے حیثیت کو بٹھائے ہوئے بدستور انھیں اختلافی مسائل پر بحث اور گفتگو میں مشغول میں بے دردی اور قساوت قلبی کے ساتھ ان کی سب سے زیادہ لاڈلی چیز یعنی جوبلی پر نکتہ چینیاں کر رہا ہوں اور وہ ہیں کہ خندہ پیشانی سے ایک ایک اعتراض کا جواب دے رہے ہیں :۔

خط و کتابت کا سلسلہ بھی وقتاً فوقتاً جاری رہتا تھا۔ خود ابتدا کم کرتے تھے۔ لیکن جواب بڑی پابندی اور مستعدی سے دیتے تھے۔ خطوط میں تقریباً ہر قسم کا موضوع چھڑتا رہتا کبھی میں ان کے عزیز ترین دوست سید طفیل احمد صاحب کے جواز سود کے مظالم کی فریاد ان سے کرتا اور وہ ان کی صفائی میں پوری بیرسٹری صرف فرماتے۔ کبھی انکی خدمت میں کالج یونیورسٹی اور کانفرنس کی بابت مختلف تجاویز میں پیش کرتا وہ ہر تجویز پر سکون و سنجیدگی سے غور فرماتے اور خواہ ان کے نقطۂ نظر سے کتنی ہی لغو و مہمل وہ تجویز ہوتی۔ لیکن دل شکن جواب نہ دیتے باوجود اختلافِ مسلک کے میرے "اخبار سچ" کی بڑی قدر افزائی کرتے اور خاص توجہ سے مطالعہ کرتے رہتے ۔

پٹھان تھے اور خانصاحبان کی حرارت مزاج مشہور ہے لیکن میں نے مرحوم کو باوجود صاحب اختیار و اقتدار ہونے کے کبھی مغلوب الغضب نہیں پایا۔ غصّہ اوّل تو آتا ہی بہت کم تھا لیکن جب کبھی آتا تو حدود سے متجاوز نہ ہونا اشتعال کے موقع پر بھی میں نے متانت میں فرق آتے نہ دیکھا بے حس نہیں تھے بحث بڑی گرمجوشی سے کرتے تھے لیکن وہی حدود کے اندر سنبھلے سنبھلے ۔ جذبات سے مغلوب نہ تھے خود ان پر غالب تھے ۔ اعتدال و احتیاط ہر شے میں ملحوظ تھی اگر شروع سے تصوّف کے رنگ پر گئے ہوتے تو ایک زبردست سالک ہوسکتے تھے ۔ کھانا عموماً بہت ہی سادہ کھاتے تھے ۔ دعوت تک کے موقع پر مسرفانہ تکلف کے روادار

نہ تھے۔ دیانت امانت و فرض شناسی میں اپنی مثال آپ تھے۔ مسلمانوں کی ہوا خواہی نس نس میں رچ گئی تھی اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اس کی دھن اور اس کا نسخہ اشاعت تعلیم کو سمجھتے تھے۔ انگریزیت کے دلدادہ تھے۔ لیکن محض اس لئے کہ اس کو قوم کے حق میں مفید خیال کرتے تھے۔ ذاتی غرض مندیوں اور جاہ پسندی سے آشنا نہ تھے خلوص کے ساتھ یقین رکھتے تھے کہ مسلمانوں کی فلاح انگریزوں سے موالات میں ہے۔ دیسی مصنوعات کی ترویج کے بہت قائل تھے آخر میں خود بھی کھدر پہننے لگے تھے اعتقاداً ہمیشہ سے پختہ مسلمان تھے۔ آخر عمر میں خدا کے فضل سے عملاً بھی بہت بہتر ہو گئے تھے۔ چہرہ پر داڑھی رکھا لی تھی۔ نماز کے پابند عرصہ سے تھے اب جماعت کا بھی حتی الامکان خیال رکھتے تھے۔ ایک معتبر راوی نے بیان کیا ہے کہ ولایت کے سفر میں اس نامور بیرسٹر اور انڈیا کونسل کے ممبر نے پی اینڈ او کمپنی کے انگریزی جہاز پر خود اذان دی۔ کلام مجید کی تلاوت برابر کرتے رہتے۔ اور مختلف ترجموں کی مدد سے مطالب پر بھی غور کرتے رہتے تھے۔ یونیورسٹی کے ہوسٹلوں میں بھی کبھی کبھی بڑے تڑکے پہونچ جاتے۔ اگر مسجد میں اکر کوئی موذن نہ ملتا تو خود ہی اذان دیتے آخر عمر میں بعض ماتحتوں کی خودسری نے سخت پریشان کر رکھا تھا اس وقت بھی مرحوم کو ایک بڑی شکایت یہ تھی کہ یونیورسٹی کے اساتذہ عملاً مذہب سے بے پرواہ ہیں خلوص کے پتلے تھے اور جس کسی میں خلوص کی جھلک پاتے اس کی قدر دل سے کرتے خواہ اس کی رائے کے کتنے ہی مخالف ہوتے۔ والدہ ماجدہ کی خدمت گزاری باعث سعادت سمجھتے ماں، بیوی، اولاد، احباب قوم سب کے حقوق پہچانتے اور اپنے امکان بھر پوری طرح ادا کرتے رہتے۔ شاعری، طراری۔ لفاظی کے قائل بالکل نہ تھے شئے میں مغز ڈھونڈتے تھے ہر جگہ عمل کی تلاش میں رہتے۔ اللہ مغفرت کرے اور اپنے مدارج قرب میں انھیں بڑی سے بڑی ترقی نصیب کرے ایسے مخلص اور اتنی خوبیوں کے جامع انسان اس دور میں کم دیکھنے میں آتے ہیں۔" فقط"

عبد الماجد

(مولوی عبد الماجد صاحب بی۔ اے دریابادی۔ اڈیٹر اخبار "سچ")

اقتباسِ خط مسٹر عبداللہ یوسف علی سی۔ بی، ای۔ آئی، سی، ایس۔

(ریٹائرڈ)

انگلستان۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جبکہ ہم دونوں کیمبرج یونیورسٹی میں طالب علم تھے۔ مرحوم کی وفات تک بہت سے موقعوں پر میرا مرحوم سے واسطہ رہا۔ خانگی زندگی کے لحاظ سے وہ بے ریا اور نہایت قابل عزت دوست تھے۔ بیرسٹری یا کسی پیشہ کے متعلق جس سے ہم اپنا کفاف زندگی پیدا کرتے ہیں مرحوم کا خیال یہ تھا کہ ہر پیشہ کے ساتھ بلند اور اعلیٰ مقاصد مخلوط ہوا کرتے ہیں۔ اس زمانے میں جب وہ انڈیا کونسل کے انگلستان میں ممبر تھے اپنے ملک اور اپنی قوم کی تعلیم کے مقاصد ہمیشہ ان کے پیش نظر رہے۔ اپنی زندگی کے آخر چند سالوں میں جبکہ وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اپنے تعلیماتی تجربہ اور تخیل کو عملی شکل میں لانے کی شدید محنت اور جدوجہد اور مایوسیوں سے ان کو ایسا واسطہ پڑا کہ ان کی زندگی کا جلد خاتمہ ہوگیا۔ اور اب یہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ مرحوم کی مخلصانہ خدمات کی قدر کرتے ہوئے اس بڑے تعلیمی کام کو جاری رکھیں جس پر قوم کی آئندہ ترقی کا انحصار ہے۔ میں کیمبرج میں سنہ ۱۸۹۱ء سے سنہ ۱۸۹۳ء تک رہا پس ان تین سال تک آفتاب احمد خاں سے میرا برابر ساتھ رہا وہ کھیلوں میں دلچسپی نہ لیتے تھے نہ وہ کیمبرج یونین میں سربرآوردہ تھے وہ انڈین مجلس کے ممبر تھے۔ یہ ہندوستانی طلبہ کی ایک انجمن تھی جو سوشل اور مختلف دوسرے مضامین پر تقریریں کرنے کے لئے انجمن کے ممبروں کے کمروں میں باری باری سے جلسہ کیا کرتے تھے۔ اس مجلس میں صاحبزادہ صاحب اپنے خاموش اور دوستانہ اطوار کی وجہ سے بہت محبوب تھے۔

ہندوستان کے سیاسی معاملات میں مرحوم کے خیالات پرانی وضع کے تھے۔ لیکن بعد کو ان خیالات میں بہت تبدیلی ہوگئی تھی اور ان کا یہ کہنا مجھے یاد ہے کہ "ہندوستان

میں نیشنل تحریک قومی ہوتی جاتی ہے'' اگرچہ ابتدا میں مرحوم کانگریس کے حامی نہ تھے لیکن بعد کو یہ حال نہ رہا تھا۔ اس اتحاد استقلال پر جو ہندوستانیوں سے ظاہر ہو رہا تھا انھیں مسرت تھی لیکن ہر حال میں صاحبزادہ صاحب کے خیالات اعتدال کے درجہ پر رہے۔ ان کو نمایشی کارروائیوں اور چالوں پر اعتماد نہ تھا وہ تدریج ترقی پر بھروسہ کرتے تھے تعطیلوں کے زمانہ میں مرحوم سے میری کیمبرج سے باہر بھی ملاقاتیں رہیں اس زمانے کے قابل ذکر طلبا محمد احمد۔ ہز ہائی نس جام صاحب آف نوانگر (رنجیت سنگھ) سلطان احمد خان ہری سنگھ گوڑ دولت رام سیٹھ مسٹر جناح مسٹر دہلوی۔ مولوی برکت اللہ۔ مولوی رفیع الدین احمد۔ عبداللہ سہروردی تھے اور اسی گروہ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم بھی تھے۔

سنہ ۱۸۹۵ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک میرا سول سروس کا ہندوستانیوں میں ماننا رہا اس دوران میں صاحبزادہ صاحب سے بہت دفعہ ملاقات ہوئی۔ اس زمانہ میں وہ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے بغیر کسی قسم کی نمائش کے استقلال کے ساتھ خدمات انجام دے رہے تھے اور مجھے یقین ہے کہ اپنی بیرسٹری کی آمدنی کا ایک حصہ وہ علیگڈھ کی تعلیم میں برابر دیتے رہتے تھے۔ علیگڈھ کالج کے ٹرسٹی کی حیثیت سے میں نے ہمیشہ دیکھا کہ مرحوم نہایت صبر و استقلال کے ساتھ تعلیمات کے کام میں قطعی منہمک تھے۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں ناگپور کی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں میں خود تھا۔ پانچ روز تک برابر صاحبزادہ صاحب سے مشورہ اور ملاقاتیں رہیں اور مجھ کو یقین ہو گیا کہ کانفرنس اور علیگڈھ کی تحریک کی روح یقینی آفتاب احمد خاں ہی تھے۔ میری پگڑی اور قطعی دیسی لباس ان کو اس لئے پسند نہ آیا کہ وہ علیگڈھ کی علامت تو ترکی ٹوپی شیروانی یا انگریزی کوٹ کو یقین کرتے تھے اس سے مجھے اتفاق نہ تھا۔ کیونکہ اب بھی اور اس وقت بھی میرا عقیدہ ہے۔ اور تھا کہ اگر علیگڈھ کی تحریک کو واقعی با اثر بننا ہے تو اس تحریک کو لازم ہے کہ مسلم جماعت کے قدیم نقوش و عناصر سے پورا پورا اتحاد عمل اور قطعی ہمدردی اپنے اندر داخل کرلے سوائے اتنے اختلاف کے باقی تمام امور میں مرحوم اور میرے درمیان میں پورا

اتحاد عمل رہا اور ہم دونوں نے کانفرنس میں نہایت سرگرمی سے کام کیا میں نے کانفرنس کے ہنگام میں بھی کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ ناگپور کی کانفرنس کی ایسی پوری کامیابی محض صاحبزادہ صاحب کی تنہا کوشش کا نتیجہ تھی۔ اس کانفرنس میں ہز ہائی نس سر آغا خاں بھی شریک ہوئے ممالک متوسط کے چیف کمشنر اور تمام مقامی افسر اور عمائدین بھی کانفرنس کے اجلاس میں آئے۔ اسی ناگپور میں ہم نے مسلم یونیورسٹی کا خاکہ تیار کیا۔ اگرچہ یونیورسٹی ہم کو ۱۹۲۰ء میں ملی۔

جب صاحبزادہ صاحب انڈیا کونسل کے انگلستان میں ممبر تھے تو اس زمانے میں لندن میں میری ان سے اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ اور ہم مسلمانوں کی تعلیم کے مسائل پر بحث کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں صاحبزادہ صاحب کی تندرستی پوری طرح اچھی نہ تھی۔ رچمنڈ کی پہاڑی کی آدھی بلندی پر ان کا مکان تھا لیکن وہ اس بلندی پر پیدل جایا کرتے تھے وہ کہتے تھے کہ پیدل چڑھائی سے ان کی تندرستی کو فائدہ ہوتا ہے۔ تعلیمی جلسوں اور کانفرنسوں میں ہم دونوں ملکر کام کیا کرتے تھے۔ صاحبزادہ صاحب ہر قسم کی تعلیمی افادہ گاہیں برابر دیکھتے رہتے تھے۔ اور مجھ سے مشورہ اور مدد لیتے تھے۔

ولایت میں مارچ تا مئی ۱۹۱۹ء ہم دونوں نے خلافت کے متعلق ملکر کام کیا یورپ اور امریکہ میں عام رائے ٹرکی کے خلاف تھی۔ یہاں تک اخبار لکھ رہے تھے کہ ٹرکی کا وجود باقی نہیں ہے لارڈ کرزن ٹرکی کے قطعی خلاف تھے۔ البتہ مسٹر مانٹیگو ہندوستان کے مسلمانوں سے ہمدردی تھی ہم نے مسٹر مانٹیگو سے درخواست کی کہ ہم کو اجازت دی جائے کہ ہم پیس کانفرنس (Peace Conference) یعنی پیرس کی سپریم کونسل میں اپنا وفد لیجائیں۔ اسی کونسل میں ٹرکی کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ ہم نے ایک یادداشت بھی لکھی۔ آخر کار ہم تین شخصوں کا وفد پیرس گیا۔ اس وفد میں آغا خاں اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور خود میں تھا سر آغا خاں پیرس میں پہلے سے موجود تھے ۱۶ مئی ۱۹۱۹ء کو آفتاب احمد خاں اور خود میں علی الصباح لندن سے پیرس روانہ ہوئے۔ اس سفر

کے دوران میں صاحبزادہ صاحب ہمارے نظام العمل کے متعلق برابر گفتگو کرتے رہے اور ان کا یہی اصرار تھا کہ پیرس پہونچنے کے قبل ہم اپنے بیان کا مسودہ تیّار کرلیں چند سرخیوں کا میں نے مسودہ کیا لیکن پھر یہ قرار پایا کہ پیرس میں اپنے دوستوں کے مشورہ کے بعد ہمارے اصل بیان کا مسودہ ہونا چاہئے پیرس میں ہمارے دوست ہز ہائی نس سر آغا خاں مسٹر مانٹیگو اور لارڈ سنہا (انڈر سکریٹری) تھے پیرس میں پہونچکر ہم اسی ہوٹل میں مقیم ہوئے جس میں مسٹر مانٹیگو اور لارڈ سنہا مقیم تھے یہاں ہم کو مہاراجہ بیکانیر بھی ملے۔ جو پیس کانفرنس (کانفرنس صلح) میں ہندوستان کی طرف سے قائمقام تھے مسٹر مانٹیگو نے ہم سے کہا "اراکین اربع" کی سپریم کونسل میں ہم صبح کو پیش ہوں گے اور ہم کو رات ہی میں اپنی سب تیاری کرنی چاہئے" اب یہ تجویز ہوئی کہ رات میں جو بیان ہم تیّار کریں وہ کونسل میں مہاراجہ بیکانیر پڑھیں۔ اور اس کے بعد مزید وضاحت کے لئے ہم زبانی تقریریں بھی کریں۔

اب ہم مہاراجہ بیکانیر کے کمرے میں آئے۔ جہاں لارڈ سنہا بھی ہماری مدد کو آگئے میں نے بیان کا مسودہ لکھا تمام امور کا متحد کرنا کوئی آسان کام نہ تھا کیونکہ ہم کو مغربی دوَل کو مطمئن کرنا تھا اسلام کے مقاصد بھی محفوظ رکھنے تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات وجذبات بھی دکھانے تھے۔ ہمارے باہم تو اس پر قطعی اتفاق تھا کہ "ٹرکی" پر کسی دوسرے کی حاکمانہ نگرانی سے ہم مخالفت کریں گے لیکن اسی کے ساتھ ہم کو وہ طریقہ بھی پیش کرنا تھا جس سے "ٹرکی" کے سوال کا حل واقعی ہوتا ہو چونکہ "ٹرکی" کو ہزیمت ہو چکی تھی اور رمانی نقطہ نظر سے وہ برباد ہو گیا تھا۔ لہٰذا وہ متحدین کے قطعی اختیار میں آگیا تھا۔ چنانچہ تمام رات ہم سخت محنت کرتے رہے۔ اور ایک مسودہ تیار کرلیا۔ جس پر ابتدا سے اس وقت صبح تین بجے تک انیس گھنٹے ہم مسلسل محنت کرتے رہے تھے:۔

"اتفاق یہ ہوا کہ کونسل کا اجلاس بجائے صبح کے گیارہ بجے شروع ہوا۔ اس وقفہ میں ہماری تجویز بھی تبدیل ہو گئی۔ اور یہ قرار پایا کہ ہم کونسل میں زبانی تقریریں کریں اور کوئی

تحریری مسودہ پیش نہ کیا جائے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ صاحبزادہ صاحب۔ عراق، فلسطین اور ملک شام پر تقریریں کریں۔ ہز ہائی نس سر آغا خاں ایشیائے کوچک اور آرمینیا پر اور میں خلافت کے معنی اور مفہوم پر تقریر کروں ارا کین اربع سپریم کورٹ کے یہ چار عظیم الشان شخص پریسیڈنٹ ولسن (امریکہ) مسٹر لائڈ جارج (انگلستان) مانیشور کلی منسو (فرانس) سنگنار آرلینڈ (اٹلی) چنانچہ ہم تینوں کی مسائل محولہ بالا پر تقریریں ہوئیں۔ جو صبر اور استقلال کے ساتھ سنی گئیں پریسیڈنٹ ولسن اور مسٹر لائڈ جارج نے کچھ سوالات بھی کئے۔ لارڈ سنہا اور مہاراجہ بیکانیر نے ہماری تائید کی میرا خیال ہے کہ "ارا کین اربع" پر ہماری تقریروں کا کافی اثر ہوا جس کا ثبوت وہ کاروائی ہے جو بعد کو "ٹرکی" سے متعلق کی گئی۔

۲۴ مئی سنہ ۱۹۱۹ء کو ہم نے لندن میں بھی ایک کامیاب میٹنگ کی جس میں میرے رزلیوشن کی آفتاب احمد خاں مرحوم نے تائید کی ہم نے اس میٹنگ کے رزولیوشن میں کانفرنس صلح سے مطالبہ کیا کہ "ٹرکی" کے معاملہ میں مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ رکھا جائے اور نہایت الفاظ کے ساتھ فیصلہ کیا جائے اور کانفرنس کو وہ وعدے یاد دلائے جو دوران جنگ میں مسٹر لائڈ جارج اور پریسیڈنٹ ولسن نے کئے تھے[1]۔ جب صاحبزادہ صاحب انڈیا کونسل سے علیحدہ ہوئے اور علیگڈھ واپس آئے تو وہ تعلیمات کے متعلق نہایت ہی وسیع واقفیت اور علم حاصل کر چکے تھے اُن کی خواہش تھی کہ وہ علیگڈھ میں اس سے کام لیں گے۔ لیکن افسوس کہ ان کی تندرستی اچھی نہ رہی اور شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جو اس جدید طریقہ تعلیم کے رواج سے علیگڈھ کی اندرونی حالت پر پڑنے والا اثر سمجھتا ہو۔

میں نے صاحبزادہ صاحب سے ملنے کا وعدہ کیا تھا سنہ ۱۹۲۳ء کے بڑے دن کی تعطیل میں ان سے ملا۔ یہی وہ ہفتہ تھا جس میں علیگڈھ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہوئی جس کے صدر خود صاحبزادہ آفتاب احمد خاں تھے۔ چار روز میں ان کے مکان پر مقیم رہا۔ اور

[1] ٹرکی کے سلسلہ میں جو کارروائی صاحبزادہ صاحب نے کی وہ تفصیل کے ساتھ باب ہفتم میں درج ہے

جدید ترین تعلیماتی ترقیوں پر ہمارے باہم گفتگو ہوتی رہی اس کانفرنس کو یادگار بنانے کے خاطر صاحبزادہ صاحب نے نہایت شاقہ محنت برداشت کی تھی اور کانفرنس میں بہت سے جدید خدوخال نمایاں کئے تھے۔ انھوں نے محکمہ جات گورنمنٹ تعلیماتی کارخانوں۔ ہندو اور عیسائی تعلیمی افادہ گاہوں اندھوں کی تعلیم کے ماہرین بوائے اسکاوٹ کے استادوں کا اتحاد عمل حاصل کر لیا تھا۔ انھوں نے کانفرنس کو ہر طریقہ سے محیط بنانے میں کوئی سعی و محنت کا دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ اور ان کے خطبہ صدارت میں بھی محیط تخیل موجود تھا۔ دلچسپی بڑھانے کو انھوں نے ہر روز کی کارروائی کے متعلق نئے نئے صدر منتخب کئے۔ ان کا اپنا خطبہ صدارت انگریزی میں[1] تھا۔ اور یہ فرض کر کے کہ وہ خطبہ پڑھنے والوں نے پڑھ لیا۔ اجلاس میں خطبہ صدارت کا اردو ترجمہ ضابطہ کے طور پر ذرا سا پڑھ کر باقی تمام وقت صرف اس مدعا سے بچا دیا کہ دوسرے مباحثہ پر گفتگو اور تقریروں کا وقت نکل آئے۔ میرے متعلق انھوں نے جسمانی تعلیم کا مضمون رکھا تھا۔ پس اس کے متعلق میں نے نیشنل اور اخلاقی پہلو سے تقریر کی۔ مستورات بھی کانفرنس میں اچھی طرح سے شریک ہوئیں۔ ولایت کے طرز پر تعلیمی نمائش بھی قائم کی تھی۔ اور سر ولیم میرس گورنر صوبہ متحدہ نے اس نمائش کا افتتاح کیا تھا۔ صاحبزادہ صاحب نے کانفرنس کے بعد ہی مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کا چارج لیا اور ہر بات سے ثابت ہو رہا تھا کہ نہایت محنت اور کامیابی سے یہ کام انجام دیں گے اور یونیورسٹی اور تعلیم مسلمانان پر اپنی یادگار کا گہرا نقش چھوڑ جائیں گے۔

۱۹۲۵ء کی کالج کی جوبلی کے سلسلہ میں میرا علیگڈھ پھر آنا ہوا۔ لیکن صد افسوس میرے دوست آفتاب احمد خاں ایسے بیمار تھے کہ جوبلی کی خوشیوں اور دلچسپیوں میں شریک ہونے کے قابل نہ تھے کس قدر صدمہ اور افسوس کی بات تھی کہ وہی ہستی کہ جس نے شدید محنت برداشت کر کے اس جوبلی کی ایک ایک تفصیل کا خود اپنے ہاتھوں سے انتظام کیا عین جوبلی کے ہنگام میں اسکی شرکت کرنے کے قابل نہ ہو۔ انھوں نے شرکت تو کی لیکن جلسوں میں تقریریں نہیں کیں بجز اسکے

[1] اس کا اردو میں ترجمہ پہلے سے ہو گیا تھا اور اجلاس میں تقسیم ہوا تھا۔

کہ ایک افتتاحی جلسہ کے جس میں ہز ہائی نس مہاراجہ الور کی تقریر کے بعد ایک مختصر تقریر علیگڈھ کی بابت کی تھی) (مؤلف)

"آفتاب احمد خاں مرحوم سے بس یہ میری آخری ملاقات تھی اور یہی آخری دیدار تھا افسوس! تعلیمات کے متعلق صاحبزادہ صاحب کی نہایت مخلصانہ تیاریاں جن میں انھوں نے گویا اپنی ذات فنا کر دی تھی زیادہ نہ ایک خواب کی طرح کے خیال اور دماغ ہی میں رہیں کیونکہ صاحبزادہ صاحب کو پھر تندرستی نصیب ہی نہ ہوئی۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی مالی حالت کا مستقل کرنا اور کانفرنس کو از سر نو ترتیب دینا صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کا ایسا کارنامہ ہے کہ وہ نہایت گہرے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اب نواب صدر یار جنگ بہادر صاحبزادہ صاحب جیسے مخلص اور بے غرضانہ قومی کام کرنے والے شخص کی سوانحعمری لکھوا رہے ہیں۔ یہ کام نہایت ہی قابل تحسین و تعریف ہے اور جس کی کامیابی کا میں آرزومند ہوں۔ اسلام علیکم۔

عبد اللہ یوسف علی

سی۔ بی۔ ای۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ ریٹائرڈ از انگلستان)

(اقتباس از اخبار لیڈر۔ الہ آباد مورخہ ۸ رفروری ۱۹۳۰ء)

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی وفات کے حادثہ کی خبر ایسے حلقوں میں تو غیر متوقع طریقہ سے نہ سنی گئی جن کو صاحبزادہ صاحب کی مہلک بیماری کی پہلے سے اچھی طرح اطلاع تھی لیکن باقی تمام ملک میں اس خبر سے صاحبزادہ صاحب کے دوستوں کو نہایت رنج و افسوس ہوا یہ دوست صاحبزادہ صاحب کی حب الوطنی اور ملک و قوم کی خدمت کبھی فراموش نہ کریں گے ستمبر ۱۹۱۷ء میں جب صاحبزادہ صاحب انڈیا کونسل کے ممبر ہوئے اور انگلستان آنے کو جہاز میں سفر کر رہے تھے تو میں (مسٹر چینتامنی) بھی اسی جہاز میں ان کا رفیق تھا۔ جہاز میں سفر کرنے والوں کے درمیان سب سے زیادہ معزز آفتاب احمد خاں ہی تھے۔ اور وہ اپنے احباب

کے ساتھ جہاز پر کھانا کھایا کرتے تھے۔ جہاز کے کپتان کی کھانے کی میز پر جب وہ نہ دیکھے گئے۔ تو کپتان سے پوچھا گیا کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جیسا معزز شخص اس کی میز پر کیوں نہیں ہوتے۔ اس پر کپتان کو بڑا خیال ہوا اور اس نے فوراً معذرت کی ایک چھٹی لکھی اور صاحبزادہ صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس کی میز پر کھانا کھایا کریں۔ یہ چھٹی پڑھ کر صاحبزادہ صاحب نے صاف انکار کیا اور بڑی منکسر المزاجی سے جواب دیا۔ کہ میں کپتان کی میز پر اس لئے کھانا نہیں کھا سکتا کہ جن احباب کے ساتھ میں کھاتا ہوں مجھے اس سے بڑی مسرّت ہوتی ہے اور اس صحبت کو میں زیادہ پسند کرتا ہوں۔"

مرثیہ

از

خان بہادر چودھری خوشی محمّد خاں صاحب ایم۔بی۔ای ناظر سابق گورنر کشمیر

(۱)

حسرت برس رہی ہے یہ کیوں صحن باغ میں
بزم چمن میں آج وہ رنگیں فضا نہیں

کل بزم گل میں جن کے ترانوں کی دھوم تھی
گلشن میں اب وہ بلبلِ دستاں سرا نہیں

ہے غم سے آفتاب کے ہر سینہ داغ داغ
وہ دل نہیں کہ جس کے یہ چیپکا لگا نہیں

اٹھتا ہے کارواں سے بس آہوں کا اک دھواں
شور جرس نہیں کہیں بانگ درا نہیں

طے ہوگی اپنی منزل مقصود کس طرح
گم کردہ راہ قوم ہے اور رہنما نہیں

یارانِ نجد قیس کو رولیں کہ دشت میں
پھر رہ نوردِ شوق کوئی دوسرا نہیں

ہوگا کسی فلک پر وہ خورشید جلوہ گر
کہتے ہیں "آفتاب" کبھی ڈوبتا نہیں

(۲)

قامت پہ اس کے پڑتی تھی سرو سہی کی آنکھ ۔۔۔ گلزار احمدی میں وہ جب نونہال تھا
اس جنت نظارہ میں سورج مکھی کی طرح ۔۔۔ ناظر بھی آفتاب کا محوِ جمال تھا
گرد و غبارِ دہر کی آلائشوں سے پاک ۔۔۔ پاکیزہ دامنی میں وہ برف جبال تھا
تحریر اس کی بحر فصاحت کی موج تھی ۔۔۔ تقریر اس کی چشمۂ آبِ زلال تھا
عمر عزیز خدمت قومی میں صرف کی ۔۔۔ اس دھن میں محو روز و شب ماہ و سال تھا
علم و عمل کی ہاتھ میں مشعل لئے ہوئے ۔۔۔ تنہا وہ رہ نورد جنوب و شمال تھا

لایا پیام قوم میں تعلیم عام کا
سید کا خاص قاصدِ فرخندہ فال تھا

(۳)

افسوس بزم قوم میں جو انتخاب تھا ۔۔۔ اس پر پڑی اجل کی نگہ انتخاب کی
ظلمت کی رات مطلع قومی پہ چھا گئی ۔۔۔ جس دن سے بند ہو گئی آنکھ آفتاب کی
پہلو میں درد قوم کا طوفاں لئے ہوئے ۔۔۔ ڈوبی فنا کی موج میں کشتی حباب کی
شام و پگاہ اس کے امانت تھی دوش پر ۔۔۔ محبوب قوم سید عالی جناب کی
کرتا تھا نیک و بد کا ہمیشہ موازنہ ۔۔۔ طفلی سے عادت اسکی رہی احتساب کی
حسرت بھری نگاہ وہ چشم پر آب کی ۔۔۔ یہ آخری کرن تھی میرے آفتاب کی

ظلمت میں جس کی نور سحر کا گزر نہ ہو
حالت وہی ہے اب دلِ خانہ خراب کی

تن پہ ہو آفتاب کے یارب ردائے نور ۔۔۔ جنت کی جلوہ گاہ میں وہ ضو فشاں رہے

چمکے یہ آفتاب نئے آسمان پر
اور اس کے گرد حلقۂ سیارگاں رہے

یہ کشتگان عشق ہیں" "وہ طائران قدس"
برقِ فنا سے جنکا بلند آشیاں رہے

گلزار آفتاب میں تا دورِ آفتاب"
شمشاد و سرو و لالہ و گل کا سماں رہے

اس ایک آفتاب کے پانچ آفتاب ہوں
اور انکی آب و تاب بہ آسماں رہے

لایا تھا کوہسار سے جس کو یہ کوہ کن
وہ زندگی کا چشمہ شیریں رواں رہے

اس آفتاب نے رخ انور چھپا لیا
ناظرؔ شبِ فراق میں اب نوحہ خواں رہے"

قطعہ تاریخ وفات

از

حضرت احسن مارہروی

انا اللہ

دنیا کی زندگی سے ہو کیا کوئی مطمئن
ہوتے ہیں ایک دن میں جہاں لاکھ انقلاب

ہر آن اپنی شان دکھاتی ہے نو بہ نو
ہر لمحہ سوزِ مہر میں ہے تازہ التہاب

المختصر تغیر پیہم سے رات دن
پھیلا ہے آسماں سے زمیں تک اک اضطراب

وہ آفتاب احمد خاں نامیِ زمن
واقف ہیں جنکے کام سے دنیا کے شیخ و شاب

کرتے تھے خوب باطل و حق میں وہ امتیاز
ہوتا تھا اپنے نفس سے راتوں میں احتساب

تھے رزم قومیات کے اک مرد بے ہراس
تھے بزم کائنات کی اک فرد لاجواب

خدمات قوم و ملک و سیاست میں عمر بھر
مشغول و منہمک رہے بیخوف و بے حجاب

کی محنت اتنی خدمت دار العلوم میں
افراطِ کار و بار سے صحت ہوئی خراب

فالج کی بے خودی رہی چوبیس ماہ تک
زندہ رہے مگر نہ رہی زندگی کی آب

بالآخر آگئی وہ گھڑی جو نہ رک سکی ہر چند حکمتوں نے کیا اس کا سدِ باب
شنبہ کو جنوری کی تھی اٹھارویں کہ آہ بعدِ زوالِ مہر کھنچی سانس کی طناب
تاریخ جس کی احسنِ مغموم نے کہی
افسوس ہے غروب ہوا آج آفتاب
۱۹۳۰ء

نوٹ۔ یہ قطعہ سید علی احسن صاحب احسن مارہروی اردو لکچرار مسلم یونیورسٹی نے عین صاحبزادہ صاحب مغفور کی وفات کے دن لکھا تھا "مصرع"
"افسوس ہے غروب ہوا آج آفتاب"
مادہ تاریخ ہے جس سے ۱۹۳۰ء برآمد ہوتے ہیں۔

آفتاب احمد خاں کے نام پر نام

نام کے سلسلہ میں ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ انیسویں صدی کے آخر تک اس نواح میں صرف ایک نام ایسا سُنا جاتا تھا کہ لفظ آفتاب جس کا ایک جزو تھا۔ اور یہ صاحب (آفتاب حسین) محکمہ نہر صوبہ متحدہ میں ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے آفتاب احمد خاں کے قومی کاموں کی شہرت جسطرح ملک میں پھیلتی گئی اسیطرح انکے نام کو بھی مقبولیت عام ہوتی گئی حتی کہ اس صوبہ میں اور پنجاب میں لوگوں نے اپنے بچوں کے نام آفتاب احمد رکھے اس نام کے چند نوجوانوں نے علیگڈھ میں بھی تعلیم پائی ہے اور یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ اس سوانح کے مسودہ کا آخری مقابلہ کرنیوالا آفتاب احمد ہی ہے یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ صاحبزادہ صاحب کے انتقال کے بعد چند رسالے اور اخبار جاری ہوئے جن میں لفظ آفتاب بطور ایک جزو کے شامل کیا گیا۔ اس قسم کی قدردانی صرف مسلمانوں ہی کی طرف سے ظاہر نہیں ہوئی بلکہ ہندوستان کے مشہور و معروف کارخانہ ویسٹ اینڈ واچ کمپنی (West and Watch) نے اپنی گھڑیوں کی فہرست میں ایک گھڑی کا نام آفتاب واچ (Aftab Watch) اضافہ کیا۔ یہ خوبصورت گھڑی علیگڈھ میں بعض لوگوں کے پاس بطور ایک عزیز یادگار کے موجود ہے سچ ہے کہ یہ حسن قبول عام اس شعر کے مصداق ہے ؎

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

آفتاب ہوسٹل۔ یادگار صاحبزادہ صاحب مرحوم
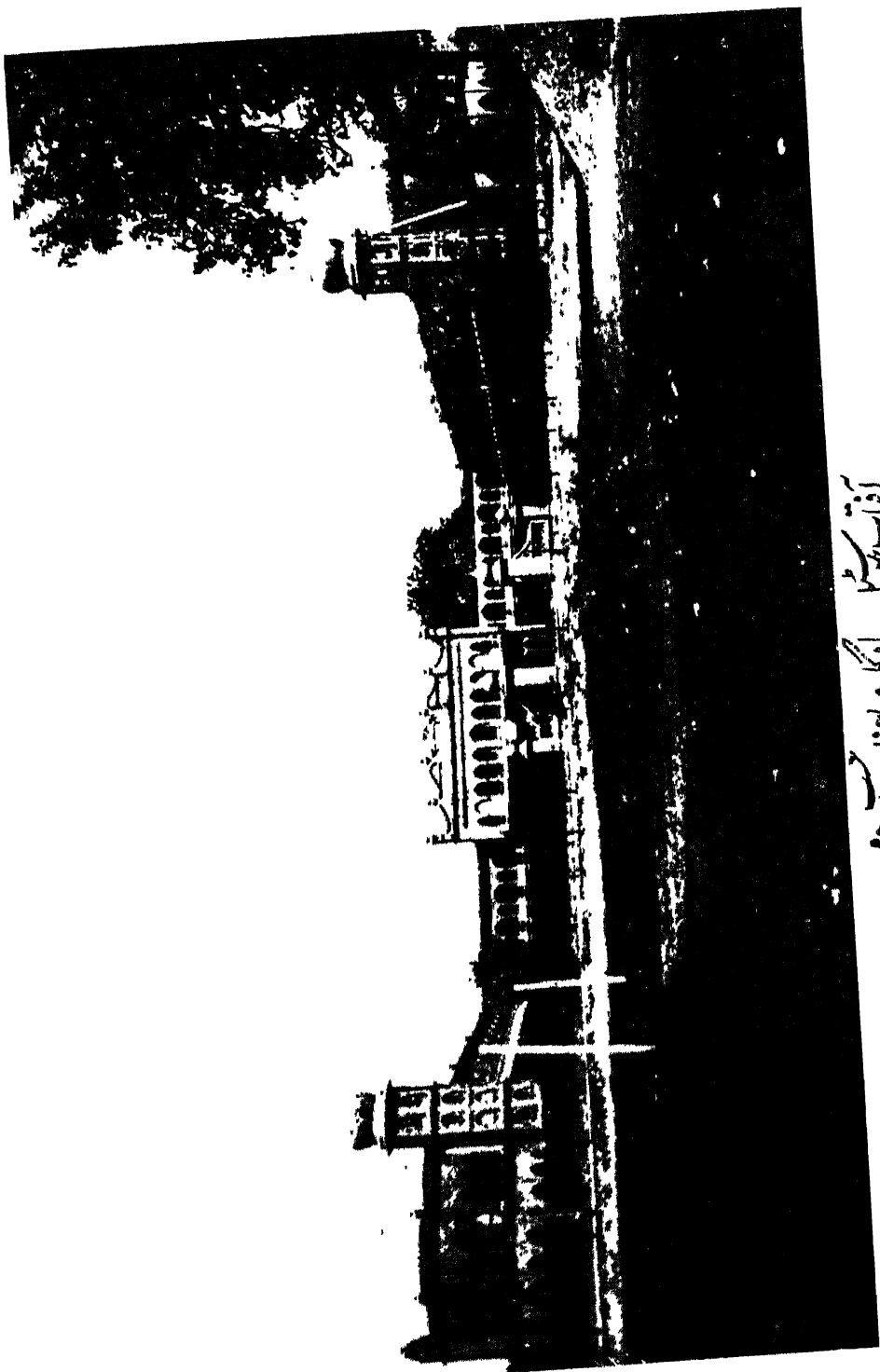
باب سیزدہم

صاحبزادہ صاحب کی یادگار۔ آفتاب ہوسٹل

جن حالات میں یہ یادگار قائم ہوئی ان کی تفصیل طویل ہے اس لئے ہم یہ مناسب خیال کرتے ہیں کہ اُس کتبہ کو جو آفتاب ہوسٹل کے سنٹرل ہال میں نصب کیا گیا ہے یہاں پر نقل کر دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آفتاب ہوسٹل

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کا تعلق علی گڈھ کے ساتھ ۱۸۷۸ء میں شروع ہوکر ۱۸ جنوری ۱۹۳۰ء (مطابق ۱۶ شعبان ۱۳۴۸ھ) کو ختم ہوا جبکہ مرحوم کو ان کے بناکردہ "احمدی اسکول نابینایان" واقع علی گڈھ کے گوشۂ جنوب و مشرق میں سپرد خاک کیا گیا۔ اس پنجاہ سالہ مدت میں علیگڈھ کے اس نامور سپوت کے نادر المثال کارنامے اتنے مختلف النوع، طویل و تابناک ہیں کہ ان کے تفصیل کے واسطے ایک دفتر کی ضرورت ہے "کالج"، "کانفرنس" اور "یونیورسٹی" کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو مرحوم کے ایثار، خلوص، سعی پیہم کا رہین منت نہ ہو۔ "انجمن الفرض" (ڈیوٹی سوسائٹی) اور "اولڈ بوائز ایسوسی ایشن" کی تو بناء ہی ان کے دستِ حق پرست سے ہوئی۔ بالخصوص آخر الذکر انجمن کو ان کے ابتدائی دورِ زندگی کے دشوار گذار مراحل میں کامیاب و کارگذار بناکر ایسی ممتاز حیثیت پر پہونچا دیا کہ اس کو ۱۹۰۶ء میں کالج کے بورڈ آف ٹرسٹیز" میں حق نمائندگی حاصل ہوسکا۔ صاحبزادہ ہی کے غیر معمولی ذاتی اثر، سعی و انہماک کا ایک روشن کارنامہ ہے جس نے ان کے عہد نظامت انجمن مذکور کو ہمیشہ کے واسطے ناقابل فراموش یادگار بنا دیا ہے۔ صاحبزادہ صاحب مرحوم کا یہ پختہ

خیال تھا کہ علیگڈھ کی بقا اور کامیابی اس کے فرزندوں ہی کی ہمّت و کوشش پر منحصر ہے۔ اور وہ مدت العمر اسی جذبہ کے تحت میں کوشاں رہے کہ اولڈ بوائز کی حقیقی تنظیم ہو اور ان کی ایک جماعت علیگڈھ میں اقامت گزیں ہو تاکہ ان کا اصلی و عملی تعلق مادر درسگاہ کے ساتھ قائم و دائم رہے۔

یادگار کی ضرورت و نوعیت

علیگڈھ کے اس مایۂ ناز فرزند و مخلص کارکن کی وفات پر اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے ۱۶ مارچ ۱۹۳۰ء کے سالانہ اجلاس میں اپنے محترم و محسن بھائی کے احسانات و حسن خدمات کے اعتراف و اظہار تشکر میں یہ قرار داد منظور کی کہ اسّی کمروں کا ایک دارالاقامہ موسوم بہ "آفتاب ہوسٹل" اسّی ہزار روپیہ کی لاگت سے تیار کرایا جائے۔ اور اس کے کرایہ کی آمدنی سے ضرورت مند اولڈ بوائز کے بچّوں کو وظائف از نام "آفتاب اسکالرشپ" دئے جایا کریں۔

ہوسٹل کی تعمیر کا آغاز

چنانچہ اس تجویز کو عملی شکل میں لانے کی خدمت یعنی فراہمی سرمایہ اور تعمیر ہوسٹل کے متعلق جملہ انتظامات کی ذمہ داری ایسوسی ایشن کے ایک دیرینہ خادم حبیب اللہ (شاہجہانپوری) مقیم ولایت منزل علیگڈھ پر عاید کیگئی۔ چندہ کی ابتدا تو اسی جلسہ میں ہو گئی تھی لیکن یونیورسٹی کے حکام سے ضروری مراحل طے ہونے میں چند مہینے گذر گئے۔ اور آخرکار ۱۹۳۰ء کے ختم سے پہلے متوکلاً علی اللہ تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔

وجوہ ترمیم نقشہ و تخمینہ

اس سلسلہ میں پہلی دقت یہ پیش آئی کہ یونیورسٹی کی عطا کردہ زمین نہایت ناقص قسم کی ثابت ہوئی اور اس لئے دو منزلہ عمارت کے واسطے بنیادیں چھ فیٹ سے پندرہ فیٹ تک گہری کرنا پڑیں۔ اور اس طرح صرف بنیادوں کے بھرنے اور مضبوط کرنے میں ایک کثیر رقم کا اضافہ تخمینہ میں کرنا پڑا۔ اس کے بعد جبکہ عمارت تقریباً مکمل ہو گئی تھی "یونیورسٹی کورٹ" کے ایک رزولیوشن کی تعمیل میں جس کا

مقصد طلباء کے تعلیمی اخراجات میں تخفیف کرنا تھا۔ وائس چانسلر سر سید راس مسعود (مرحوم) کی پر اصرار فرمائش پر ایسوسی ایشن کو اکتوبر ۱۹۳۲ء سے آفتاب ہوسٹل کو آفتاب ہال کی حیثیت سے چلانے کی ذمہ داری قبول کرنا پڑی۔ چونکہ اس مجوزہ "ہال" کے اجرار سے ایسوسی ایشن کے پیش نظر "سادہ اسلامی روح" پیدا کرنا تھا۔ لہذا اس مقصد کے حصول کے واسطے عمارت کے اصلی نقشہ و تخمینہ میں معتد بہ ترمیم و اضافہ ناگزیر ہوا۔ کمروں کی تعداد اسّی سے بڑھا کر اٹھاسی کی گئی۔ ریڈ ڈائننگ ہال باورچیخانہ اور اس کے جملہ متعلقات بالائی منزل پر "نماز" "مجلس مباحثہ" و لائبریری کیلئے وسیع ہال متعدد کمرے مہیّا کرنے پڑے ان جملہ ترمیمات وغیرہ کی وجہ سے یہ ہوسٹل جس میں ہر طالب علم کے واسطے جداگاہ کمرہ اور طالب علم کی ہر ایک ضروری آسائش کا لحاظ رکھا گیا ہے بصرف مبلغ ۱۱۳۴۵۰ پایۂ تکمیل کو پہونچا[۱]

خصوصیات ہوسٹل

علی گڈھ کی جملہ عمارات میں اس ہوسٹل ہی کو یہ خصوصیت حاصل ہوئی ہے کہ اس کی تعمیر فنڈ میں شرکت کے واسطے کسی غیر اولڈ بوائے کو تکلیف نہیں دی گئی بلکہ ۸۲۳ اولڈ بوائز کے چندۂ خاص سے مبلغ ۵۶۳۰۰ فراہم کئے گئے۔ "کمرہ نماز" کے واسطے بھی اولڈ بوائز کی محترم خواتین اور ان کے خاندان کی دوسری مستورات نے نہایت کشادہ دلی سے مبلغ ۱۴۰ عطا فرمائے۔ بقیہ رقم ایسوسی ایشن نے اپنے جنرل فنڈ سے مہیّا کی

معطیان کی بابت کچھ تفصیل

چندہ دہندگان میں سے ہر ایک ہزار کے معطی کا نام نامی ایک ایک کمرہ پر کندہ کیا گیا ہے۔ پانچ پانچ سو کے معطیان کے نام کے کتبے ڈائننگ ہال میں علیحدہ نصب ہوئے ہیں۔ ایک سو یا اس سے زائد اگر پانچ سو روپیہ سے کم) کے عطیات کی نام بنام تفصیل اسی ہال میں تین بڑے سنگین کتبوں پر موجود ہے۔ اور خود یہ ہال "احمد مزمل ہال" نام سے اس لئے موسوم ہوا کہ نواب بہادر الحاج ڈاکٹر سر محمد مزمل اللہ خاں رئیس بھیکم پور نے پانچ ہزار روپیہ بلا طلب و بطیب خاطر اپنے مرحوم فرزند

---

[۱] چندا و ضروری سامان فراہم پہونچانے کی وجہ سے تقریباً سوا لاکھ روپیہ کی رقم ایسوسی ایشن کو خرچ کرنا پڑی۔

احمد اللہ خاں (اولڈ بوائے کالج) کی یادگار میں عنایت فرمائے نیز جن اولڈ بوائز نے اپنے
اعزہ و احباب کی یادگار میں مبلغ ایک سو روپیہ عنایت فرمائے ہیں ان کے نام زیر عنوان
"یادرفتگان" ایک بڑے پتھر پر منقش کئے گئے ہیں۔

"غرض نقشیست کز ما یاد ماند ۔ کہ ہستی را نمی بینم بقائے"

آفتاب ہال اور اسکا کام

"آفتاب ہال" جس کو چار سال تک ایسوسی ایشن نے ناسازگار ماحول میں چلایا۔ اور جس کو ملک و ملت میں ایک خاص درجہ امتیاز و مقبولیت حاصل ہوا۔ اور پھر جن وجوہ سے وہ ایسوسی ایشن کے اہتمام و انصرام سے علیحدہ کیا گیا۔ ان سب امور کی تفصیل کے واسطے اس لوح میں گنجائش نہیں ہے لیکن جس جذبہ اخلاص و ایثار کے تحت میں اولڈ بوائز اور ان کی انجمن نے یہ قومی خدمت انجام دی ہے اور جو "اِنمٹ روح" علیگڈھ میں پھونکی ہے اور جس سادہ "اسلامی زندگی" کا بیج بویا ہے۔ اس سے انشاء اللہ العزیز نہ صرف وہ "تناور درخت (جس کا ذکر سر سید اعظم نے ۱۸۷۳ء کے مشہور ایڈریس میں فرمایا تھا) پیدا ہوگا۔ بلکہ وہ "اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ" کا مصداق بھی ہوگا۔ اور اس دارالاقامہ کے تربیت یافتہ ملک و ملت کے حقیقی خدمت گذار و جاں نثار ثابت ہونگے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم ۞

آنریری سکریٹری اولڈ بوائز ایسوسی ایشن مسلم یونیورسٹی علیگڈھ خلیل احمد مراد میاں احسان الحق۔ ڈاکٹر ازہر ندوائی
پرووسٹ آفتاب ہال ـــ پروفیسر محمد حبیب، سید مجید الدین احمد
ممبران ہال کونسل ـــ (خان صاحب) میر ولایت حسین، سید طفیل احمد منگلوری
انچارج ڈائننگ ہال
چیرمین ہال کونسل ـــ حبیب اللہ (شاہجہاں پوری) مقیم ولایت منزل علیگڈھ

نقل کتبہ مذکور الصدر میں یونیورسٹی کورٹ کے ایک ریزولیوشن کا حوالہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی تشریح یہاں پر کردی جائے کیونکہ اس ریزولیوشن کی تعمیل میں جو کارروائی ہوئی اس نے

طلبہ کی علمی و اخلاقی زندگی پر نہایت خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ اور یونیورسٹی میں اسلامی ماحول پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ رسالہ موسومہ آفتاب ہال کے تاریخی حالات از مرتبہ حبیب اللہ سے مندرجہ ذیل اقتباس پیش کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) سالانہ جلسہ سنہ ۱۹۳۲ء میں خان بہادر قاضی عزیز الدین احمد صاحب بلگرامی کی تحریک پر کورٹ (مسلم یونیورسٹی) نے ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کی کہ مسلمانوں کے عام افلاس و اقتصادی مشکلات کا لحاظ کر کے طلباء کے اخراجات کم کرنے کی تجاویز عمل میں لائی جائیں۔ اس کمیٹی کا میں بھی ایک ممبر مقرر کیا گیا تھا۔ جب کمیٹی کا اجلاس ہوا تو منتظمین موجودہ وقت کی کثرت رائے سے نہایت خفیف رقم یعنی صرف چار آنہ کی تخفیف کی تجویز منظور ہوئی۔ چونکہ یہ کارروائی مسلمانوں کے درد کی دوا نہ تھی۔ اس لئے میں نے کمیٹی کے اس فیصلہ کے خلاف جناب وائس چانسلر صاحب (سر سید راس مسعود صاحب) کی خدمت میں عرضداشت پیش کی۔ اور کمیٹی کی کارروائی کو غیر مناسب قرار دیتے ہوئے یہ عرض کیا کہ جناب موصوف مسلمانوں کی سقیم حالت کا لحاظ فرما کر اخراجات طلباء میں تخفیف فرماویں۔

(۲) میری اس عرضداشت کا جناب وائس چانسلر صاحب نے اخلاق اور ہمدردی کے ساتھ جواب دیا اور گو کہ کمیٹی کی کارروائی کو انھوں نے غیر واجب نہیں قرار دیا۔ لیکن مسلمانوں کی سقیم حالت کا اعتراف فرمایا اور ان مشکلات کو حل کرنے کے واسطے آمادگی ظاہر کی اور طریقہ کار یہ تجویز کیا۔ کہ میں (راقم الحروف، حبیب اللہ اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن ملکہ آفتاب ہوسٹل میں (جو کہ اس وقت قریب تکمیل تھا) عملی طور پر تخفیف اخراجات کا نمونہ قائم کردیں۔

۵۔ خط سر راس مسعود

۱۴ر جون سنہ ۱۹۳۲ء

مکرمی جناب خان بہادر حبیب اللہ خاں صاحب قبلہ تسلیم

آپ کا گرامی نامہ نمبری ۴۷۶۴ مورخہ ۱۳ر جون مجھے آج صبح اس وقت ملا جب کہ میں اگزیکٹو کونسل کی میٹنگ میں (۴)

تواس وقت جناب موصوف یونیورسٹی کے اور سب ہوسٹلوں میں اسی پیمانہ پر تخفیف اخراجات کر دیں گے۔

(۳) مجھ کو یہ جواب جناب ڈاکٹر سر سید راس مسعود صاحب کا اس وقت موصول ہوا جب کہ جناب ممدوح یورپ کو روانہ ہو چکے تھے۔ اور موقع کسی گفتگو اور مشورہ کا نہ رہا تھا بہر حال جہاں تک بھی جلد ممکن ہوا۔ میں نے یہ مسئلہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں پیش کیا۔ اور وہاں غور کے بعد یہ

(ص ۲) مشغول تھا۔ اسی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی۔ مجھے یہ پڑھکر نہایت استعجاب ہوا کہ اب آپ فرماتے ہیں کہ کمیٹی تخفیف مصارف تعلیم طلبا کی کارروائی میں عجلت سے کام لیا گیا۔ میرے خیال میں اس کمیٹی نے ہر پہلو پر کافی غور و خوض کیا اور ہر مد پر پوری بحث کی گئی۔ کیا میں یاد دلا سکتا ہوں کہ کمیٹی مذکور کا اجلاس مسلسل تقریباً چار گھنٹے جاری رہا۔ اور کسی مسئلہ پر اسوقت تک رائے نہ لی گئی جب تک اس پر ہر ممبر کو اظہار خیال و رائے کا موقع نہ دیا جا چکا اور میں یہ بھی عرض کروں گا کہ اس وقت کسی صاحب نے عجلت کی کارروائی پر کوئی اعتراض نہ کیا اور نہ آپ نے اعتراض فرمایا میٹنگ کو جاری رکھنے پر آمادہ تھا۔ اور یہ کارروائی اسی وقت ختم کی گئی جبکہ مجھے یقین ہو گیا کہ مزید بحث کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ نہ کوئی صاحب اسوقت کچھ کہنے پر آمادہ نظر آئے اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے معاف فرمائینگے اگر میں یہ کہوں کہ آپ کا اعتراض بعد از وقت ہے اور مبنی بر واقعات نہیں۔ میں خود محسوس کرتا ہوں کہ تعلیمی اخراجات میں جہاں تک ممکن ہو سکے تخفیف ہونی چاہیے اور ہر ایسی تحریک سے مجھے ہمدردی ہے اور مسلمانوں کی اقتصادی حالت کا بھی مجھکو احساس ہے ایسے ہی خیالات کا میں نے میٹنگ میں اظہار بھی کیا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ مجھی پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ میں یہ کہوں کہ مصارف میں اس حد تک تخفیف کی جائے جو ممکن العمل ہو۔ اور یونیورسٹی کی آمدنی پر اس کا ایسا اثر نہ پڑ سکے کہ آمد و خرچ میں توازن قائم نہ رہ سکے۔ علاوہ ازیں اس وقت کمیٹی مذکور بغیر کسی اختلاف کے ایک متفقہ فیصلہ پر پہونچی اور جو جو سہولتیں بہم پہنچانا مناسب سمجھی گئیں ان کی کمیٹی نے سفارش کی اس لئے میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس وقت آپ نے یہ شکایت کیوں پیش کی۔ جہاں تک پرووسٹ صاحب کی اظہار رائے پر آپ کا اعتراض ہے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اسکا میری ذات سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر انھوں نے یہ دھمکی دی ہے تو نامناسب ہے۔ لیکن اس وقت مجھے بحیثیت صدر کمیٹی مناسب نہ تھا کہ ان کی ذاتی رائے کے اظہار سے ان کو روکتا جب کہ وہ مشورہ میں شریک کیے گئے تھے۔ جہاں تک مجھے علم ہے ان کی اس (صفحہ آئندہ پر ص ۳)

طے ہوا کہ وائس چانسلر صاحب کے اس ارشاد کی تعمیل کی جائے۔ چنانچہ ایسوسی ایشن نے اپنے قائمقام (۱) مولوی سید طفیل احمد صاحب (۲) خانصاحب میر ولایت حسین صاحب (۳) پروفیسر محمد حبیب صاحب (۴) مسٹر عبدالستار خیری صاحب (۵) مسٹر خلیل احمد مراد صاحب (۶) وراقم الحروف (حبیب اللہ) مقرر کر دیے۔ اور ہدایت کی کہ حکام یونیورسٹی سے مراسلت کرکے اور کل معاملات طے کرکے آفتاب ہوسٹل کو مقرر کردہ پروگرام (یعنی تخفیف مصارف تعلیم کے ساتھ طلبہ میں سادہ اسلامی زندگی کی ترغیب وترویج) کے ساتھ چلایا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ضروری کارروائی ہوتی رہی۔ اور آخرکار ۲۷ ستمبر ۱۹۳۲ء کو اسکیم تین سال کے واسطے منظور ہوئی۔ اور یکم اکتوبر ۱۹۳۲ء کو آفتاب ہوسٹل کو آفتاب ہال قرار دے کر اسّی طلبا کا داخلہ کیا گیا۔ قائم مقامان ایسوسی ایشن نے اپنی ہال کونسل قائم کرکے اور چند دیگر ممبران اسٹاف کو شریک کرکے اس ہال کو ایک سال تک چلایا۔

(۴) دوسرے سال کے شروع میں وائس چانسلر صاحب کی خدمت میں عرضداشت

---

(۴۴) دھکی کا کسی کی رائے پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اگر آپ مجھے معاف فرمائیں تو یہ عرض کروں کہ آفتاب ہوسٹل جو انشاءاللہ آپ کی سعی سے عنقریب مکمل ہو جائیگا۔ اس کو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نیز آپ حضرات کم سے کم اخراجات پر چلا کر عملاً ثابت کردیں کہ طلبا کے اخراجات میں کیا کیا تخفیف کی جاسکتی ہے تاکہ دوسرے ہوسٹلوں میں بھی اسی پیمانہ پر انتظام کیا جاسکے اور یہ دوسط صاحبان کے لئے نمونہ پیش کیا جاسکے۔ میرے خیال میں اس سے کوئی بہتر طریقہ اس مسئلہ کے حل کا نظر نہیں آتا۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ میری رائے کو کسی طنز پر محمول نہ کریں گے بلکہ میری یہ دلی تمنا ہے کہ کوئی صاحب عملاً تخفیف مصارف کے نمونہ قائم کردیں جس کی پیروی کرنے کے لئے میں ہر وقت تیار رہوں گا۔ اور جس وجہ سے ان حضرات کی رائے کو تقویت پہونچے گی جو تخفیف مصارف کے حق میں ہیں۔ والسلام۔

نہایت

میں ہوں جناب کا ادنیٰ خادم

(دستخط) سید راس مسعود

پیش کی گئی کہ ان کے ارشاد کے بموجب یہ تجربہ کیا گیا۔ اور اس کی کامیابی ثابت ہوئی۔ لہٰذا اب اپنے وعدہ کے مطابق یونیورسٹی کے تمام دیگر ہوسٹلوں میں اخراجات کی تخفیف فرمادیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ آفتاب ہال کونسل کے سپرد مارلیسن کورٹ کر دیا گیا۔ چنانچہ دوسرے سال میں ایک سو ساٹھ طلبا، آفتاب ہال میں رہے۔ نتائج امتحان کے بعد پھر وہی درخواست کی گئی کہ اب دو سال کا تجربہ کامیاب ثابت ہو چکا ہے۔ اس لئے اس طریقہ کو تمام یونیورسٹی میں رائج فرمایا جائے اس کا حشر بھی مثل سال گذشتہ کے ہوا اور لاٹوش ممتاز ہوسٹل اور میکڈانل ہاوس بھی آفتاب ہال کے سپرد کر دے گئے۔ اب آفتاب ہال کے طلبار کی تعداد تین سو کے قریب ہوگئی۔ اور نتائج امتحانات وغیرہ حکام یونیورسٹی کے سامنے پیش ہوئے۔

آفتاب ہال کے کام کی کچھ تفصیل

آفتاب ہال سے یونیورسٹی کو فوائد

آفتاب ہال کے قیام سے قبل طلبار کے داخلہ میں ہر سال کمی ہوتی جاتی تھی۔ اس افسوس ناک حالت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ سرسیّد ہال (پختہ بارک) میں ہر پانچ کمرہ کے بعد ایک پورا کمرہ بطور پینٹری (Pantry) استعمال ہونے لگا جس میں بیرے کھانے کا سامان رکھتے ہیں۔ اور خود ان میں رہنے لگے۔ اور باایں ہمہ متعدد کمرے خالی پڑے رہتے تھے لیکن ۱۹۳۲ء سے یہ روز افزوں کمی رک گئی۔ اور اس کے بعد تو ہر سال معتد بہ اضافہ داخلہ میں ہوتا گیا کہ جو صریح نتیجہ آفتاب ہال کے قیام کا ہے۔ اس طریقہ سے یونیورسٹی کی آمدنی فیس تعلیم، کرایہ ہوسٹلوں وغیرہ وغیرہ میں قرار واقعی بیشی ہوتی گئی۔ اور بالواسطہ دیگر ہال یونیورسٹی بھی زیادہ معمور ہوتے گئے۔ گو کہ اس خدمت میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو اپنے مملوکہ آفتاب ہوسٹل کے کرایہ میں بحساب تین روپیہ ماہوار کمی کرنا پڑی اور قریب دس ہزار کے نقصان اٹھانا پڑا۔ اور یہ رقم علاوہ اس صرف کثیر کے ہے جو آفتاب ہوسٹل کو آفتاب ہال

کی شکل میں لانے میں ناگزیر تھا۔ اور اس صرفہ کی مقدار پندرہ ہزار سے کم نہیں ہے۔ مگر چونکہ یہ یونیورسٹی کی خدمت تھی۔ اور علاوہ بریں اپنے بھائیوں کی اولاد و رشتہ داروں کے کانٹ تعلین کے بچوں کی تعلیم میں امداد اور سہولت مدنظر تھی لہذا یہ سب بار بہ طیب خاطر اٹھایا گیا۔

آفتاب ہال کی مالی حالت

آفتاب ہال کی مالی حالت کا صحیح اندازہ ان واقعات پر غور کرنے سے ہو سکتا ہے کہ اس ہال میں فیس تعلیم معالجہ فیس کھیلوں اور یونین کی یونیورسٹی کے دیگر ہال کے برابر تھی۔ ہماری کونسل کے واسطے ایسی صورت میں صرف ڈائننگ ہال اور اخراجات بورڈنگ ہاؤس میں کمی کرنا ہی ممکن تھا۔ بہرحال جس قدر کفایت شعاری ممکن تھی کی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ جملہ مندرجہ بالا اخراجات کو شامل کرنے کے بعد بھی آفتاب ہال میں طلبہ کو بقدر ایک ثلث کے (بمقابلہ یونیورسٹی کے دیگر ہال کے) کم خرچ ادا کرنا پڑا۔ اور اگر ناشتہ کے خرچ پہ نظر ڈال جائے تو کم سے کم دو ثلث کی تخفیف رہے۔ نوعیت کھانے کی بابت اس سے زیادہ عرض کرنا بے محل ہوگا کہ جن اصحاب نے بلا اطلاع کسی وقت کھانے میں شرکت فرمائی ہے تو انھوں نے یہ ہی ہمیشہ ارشاد فرمایا کہ چھ روپیہ ماہوار میں اس سے بہتر کھانا مہیا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان سب حالات کے باوجود بھی خدا کا شکر ہے کہ جب ہال کونسل نے ۹ مئی ۱۹۳۶ء کو چارج پرو وائس چانسلر صاحب کے سپرد کیا تو اس وقت امپیریل بنک میں دس ہزار سے زائد رقم بحق آفتاب ہال جمع تھی۔

نتائج امتحان و تربیت طلبہ

(۱) پہلے ہی تعلیمی سال کے اختتام پر ان دونوں امور میں بین ترقی ظاہر ہوئی اور دوسرے سال کے داخلہ اور سالہائے مابعد میں اس کا یہ اثر ہوا کہ جو نیا طالب علم آتا تھا اس کی آرزو اسی ہال میں داخلہ کی ہوتی تھی اور طلبا کے مربی بھی اسی پر مصر ہوتے تھے کہ ان کے بچوں کو اسی ہال (بالخصوص آفتاب ہوسٹل میں جگہ دی جائے) باہر سے اکثر خطوط سفارشی موصول ہوتے تھے۔ اور یہ خواہش داخلہ اس ہال کی صرف کمی اخراجات کی وجہ سے نہ تھی بلکہ اکثر

صاحب ثروت اصحاب نے اس ہال کی تربیت کی وجہ سے اپنے بچوں کو بہ اصرار اس میں داخل کرایا
اور یہ کیفیت اس صورت میں تھی کہ آفتاب کونسل نے داخلہ کا معیار نہایت سخت رکھا تھا تھرڈ
ڈویژن کے طلبا شاذ و نادر ہی لیے جاتے تھے کسی طالب علم کو اپنا ذاتی ملازم رکھنے کی اجازت نہ
تھی نماز روزہ اور دیگر شعائر اسلامی پر سختی کے ساتھ عملدرآمد کرایا جاتا تھا حاضری کلاس و
فیلڈ (کھیل ورزش) کی پوری پابندی تھی۔ امتحانات میں شرکت اور اس کے نتائج پر بہت زیادہ
لحاظ رکھا جاتا تھا۔

(۲) شروع میں عموماً لوگوں کا یہ خیال تھا کہ آفتاب ہال صرف نادار طلبہ کا مسکن ہے اور
یونیورسی کے دیگر ہوسٹلوں کے طلبا بالخصوص اس ہال کے طالب علموں کو ایک گونہ حقارت سے
دیکھتے تھے لیکن دوسرے ہی سال میں آفتاب ہال کے طلبہ جو پہلے ڈیڑھ سال تک "اچھوت خیال
کیے جاتے تھے رفتہ رفتہ یونیورسٹی کے ہر شعبہ میں اپنی عملی زندگی کا ثبوت پیش کرنے لگے تھے
ہال کے اندر آفتاب ہال کے ذریعہ سے جو تربیت ان کو دی گئی وہ ان کے ایک ممبر کو یونیورسٹی
یونین میں پریسیڈنٹ کی کرسی تک پہنچا سکی۔ انجمن الفرض (ڈیوٹی سوسائٹی) کے واسطے
انفرادی و مجموعی چندہ وصول کرنے والے طلبہ زیادہ تر اسی ہال کے تھے۔ صوبہ متحدہ کے
اولمپک گیمس (Olympic Games) میں علیگڈھ کا نام روشن کرنے والے آفتابی
ہی تھے اور یہ ہی صورت انٹرکالج و انٹر یونیورسٹی ڈیبیٹس سے ظاہر ہوئی طلبا کی مذہبی زندگی
باوجود ناخوشگوار و ناموافق ماحول کے کچھ نہ کچھ بہتر ہی رہی۔

ان واقعات سے ملک کے ہر گوشہ کے مسلمانوں میں آفتاب ہال کی ایک خاص وقعت
پیدا ہو گئی۔ اخبارات میں اس کا غلغلہ بلند ہوا۔ بعض علماء و اکابر ملت نے تکلیف فرما کر
اسلامی شعائر پہ لکچر دئے اور خود طلبہ سے ملکر ان کو یہاں کی تربیت کا صحیح اندازہ ہوا۔ اور
انھوں نے پبلک مجامع میں عمدہ الفاظ میں اس کا اعتراف کیا۔ حکام یونیورسٹی نے اس
ہال کا تذکرہ اپنے ایڈریسوں میں کیا جو گورنر و مربیان علیگڈھ کی خدمت میں پیش کئے گئے کانوکیشن

ایڈریس میں مرحوم سر شاہ سلیمان نے نہایت شاندار الفاظ میں آفتاب ہال کا حوالہ دیا یونیورسٹی ایگزیکٹو کونسل نے آفتاب ہال کے منتظمین کو مبارکباد بھیجی۔ اور ہر سال کونسل کی اور پرووائس چانسلر کی رپورٹوں میں اس ہال کے عمدہ کام کا اعتراف کیا گیا۔

ہم ان سب کی تفصیل سے قاصر ہیں اور صرف پرووائس چانسلر رئیس بالقلم کی ایک سال کی رپورٹ کا اقتباس درج کر کے اس باب کو ختم کرتے ہیں:۔

"۱۹۳۲ء کی رپورٹ میں میں نے آفتاب ہال کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ یہ کوئی اتفاقی فروگذاشت نہ تھی بلکہ میں چاہتا تھا کہ ۱۹۳۳ء کی رپورٹ میں تفصیلاً اس کے قیام مقاصد اور کامیابی کے متعلق حالات بیان کروں اور مجھے خوشی ہے کہ میری امید پوری ہوئی۔

آفتاب ہال کے قیام کے باعث علی گڈھ کے اولڈ بوائز ہیں جن کی فیاضی کی بدولت عمارت کے لئے کل سرمایہ مہیا کیا گیا ایک کمیٹی جس کے ممبر خان بہادر حبیب اللہ خاں صاحب مولانا طفیل احمد صاحب، میر ولایت حسین صاحب، اے۔ ایس خیری صاحب پروفیسر محمد حبیب صاحب اور کے۔ اے مراد صاحب ہیں۔ ہال کی تشکیل کے مشکل کام کو انجام دینے کے لئے بنائی گئی۔ اور ہال اکتوبر ۱۹۳۲ء میں رہائش کے لئے کھول دیا گیا معطیان کی خواہش پر اسکو بجائے ایک ہوسٹل کے جو کسی دوسرے ہال کا ایک جزو ہو ایک مکمل ہال بنا دیا گیا۔

اس میں ۴۸ طالبعلموں کی رہائش کا انتظام ہے اور ہر ایک طالب علم کے لئے ایک کمرہ ہے اور یہ ہال قائم ہوتے ہی بالکل بھر گیا۔ اس ہال کے مقاصد یہ ہیں کہ مسلمان طالب علموں کے لئے اقامتی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے مواقع پیدا کئے جائیں۔ اور اس قدر کم خرچ پر کہ جس کا اب تک امکان نہ تھا۔ نیز اسلام کے سلف صالحین کی سادہ زندگی کی روایات کو مضبوطی کے ساتھ قائم رکھنا اور اس اصول کو آئندہ نسلوں کے دلوں میں راسخ کرنا ہے اور مزید برآں علیگڈھ کے اُن اولڈ بوائز کے بچّوں اور رشتہ داروں کی رہائش

کے لئے عمدہ اور سستا انتظام ہے جو اس یونیورسٹی میں معمول اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہ ہوں۔

ایک سال کے تجربہ کے بعد مجھ کو یہ اعلان کرنے کی مسرت حاصل ہے کہ یہ ہال قطعی طور پر کامیاب ثابت ہوا ہے حتیٰ کہ ماریسن کورٹ بھی آفتاب ہال میں شامل کر دیا گیا ہے۔ تاکہ اس ہال میں اور زیادہ طلبار کی رہائش کا انتظام ہو سکے۔ چنانچہ یہ توسیع شدہ ہال بھی فوراً پُر ہو گیا۔ اس موقع پر میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ آفتاب ہال غبی اور علمی حیثیت سے ناکارہ طلبہ کا مسکن و مامن نہیں ہے بلکہ اس سال اس میں صرف اول اور دوم درجہ کے پاس شدہ طلبہ داخل کئے گئے ہیں اس جدید انتظام کی کل کامیابی کا سہرا بدرجہ اولیٰ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن اور اور اس کی مقرر کردہ قابل کمیٹی اور بالخصوص خان بہادر حبیب اللہ خاں صاحب، پروفیسر محمد حبیب صاحب اور ایس۔ اے۔ حلیم (لکچرر شعبۂ تاریخ و وارڈن آفتاب ہوسٹل) کے سر پہ ہے۔ ان میں اول الذکر بزرگ جس دن سے کہ ہال کی بنیادیں قائم ہوئیں وہ مثل اس کے محافظ فرشتہ کے اس کے نگراں رہتے ہیں۔ پروفیسر محمد حبیب صاحب کے کام عمدہ پرودسٹ کی میں پوری تعریف کرنے سے قاصر ہوں انھوں نے اس زمانہ میں جبکہ یونیورسٹی کھلی ہوئی تھی۔ نیز زمانہ تعطیل میں اس جدید ہال کی کامیابی کے واسطے مسلسل محنت کی ہے اور ہر طالب علم کی بہبودی کو اپنا ذاتی کام قرار دیا ہے اور ابتدا سے طلبا میں اخوت قواعد کی پابندی اور محنت کا احساس پیدا کر دیا ہے اور ایک سال کے نادر کام کا یہ نتیجہ ہے اور اس قابل ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں اس کو ایک مستقل اور معزز جگہ دی جائے۔ اس کل کام میں محمد حبیب کو ان کے ریذیڈنٹ وارڈن مسٹر ایس اے حلیم صاحب اور مسٹر اے۔ ایس خیری صاحب کی ان تھک اور مخلصانہ امداد حاصل ہوئی ہے اور ہال کے طلبار کی شرکت عمل اور رضا کاری بھی اس میں شامل رہی ہے۔ میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ پروفیسر محمد حبیب مسٹر ایس اے حلیم اور مسٹر اے ایس خیری آفتاب ہال میں کام کرنے کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ اور میں

نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ جس نوعیت کا کام وہ کر رہے ہیں ان کے لئے وہ کورٹ کے باضابطہ شکریہ اور اعتراف کے مستحق ہیں جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں مارسین کورٹ آفتاب ہال کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے ہم کو امید ہے کہ جو عمدہ مثال اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے ہمارے سامنے قائم کر دی ہے ہم اس سے مستقل طور پر فائدہ اٹھائیں گے اور دوسرے ہوسٹلوں میں بھی طلبہ کے اخراجات میں معقول کمی کر سکیں گے۔ اور یہ معاملہ اب تک میرے اور پرووسٹ صاحبان کے زیر غور ہے۔ اسی سلسلہ میں آپ کی توجہ ان فوائد کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ جو مختلف ہوسٹلوں میں مختلف معیار رہائش قائم کرنے سے یونیورسٹی کو حاصل ہوں گے۔ فی الحقیقت اس طریقہ کے اختیار کرنے سے مستحسن نتائج پیدا ہوں گے اور اس امر کی کوشش ہونا چاہئے کہ کفایت شعاری ڈسپلن (باقاعدہ زندگی طلباء) اور محنت کا لحاظ کرتے ہوئے ہر ہال میں ایسی خصوصیت جداگانہ پیدا ہو جاوے کہ قوم کی توجہ اس طرف مائل ہو۔ اور یہی حالت آکسفورڈ کیمبرج کی ہے جہاں ہر ایک کالج یونیورسٹی کے مجموعی اتحاد کو قائم رکھکر اپنی مخصوص جداگانہ ہستی کو قائم رکھتا ہے۔"

پچھلے صفحات کے ملاحظہ کے بعد یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے۔ کہ جو کام باوجود ناسازگار حالات کے چار سال تک کامیابی کے ساتھ ہوتا رہا۔ وہ اب بھی جاری ہے یا نہیں۔ اس کا جواب دیانت کے ساتھ تو نفی میں ہے لیکن اس نفی کی تفصیل کے واسطے یہ مقام مناسب نہیں ہے۔ ناظرین اگر چاہیں تو رسالہ "آفتاب ہال کے تاریخی حالات" اور "گذارش" (آخر الذکر اول الذکر کی دوسری کڑی ہے) میں تفصیل سے ملاحظہ فرما دیں۔ یہاں پر ہم صرف اسی قدر عرض کر دینا کافی خیال کرتے ہیں۔ کہ صاحبزادہ صاحب اپنی زندگی میں جس طرح "خیر الناس من ینفع الناس" کے مصداق تھے۔ اسی طرح انکی "یادگار" کی بھی حالت ہے۔ اور اب گو اس "یادگار" کی نفع رسانی ایک جزوی تخفیف مصارف تعلیم چند صد طلبہ تک محدود ہے لیکن اس کی روح ہنوز مردہ نہیں ہے۔ اس لئے یقین کامل ہے کہ ایک دن وہ اپنی اصلیت پر انشاء اللہ ضرور عود کریگی۔" وما ذالك علی اللّٰہ بعزیز"

تمام شد

ملنے کا پتہ

دفتر اولڈ بوائز ایسوسی ایشن
مسلم یونیورسٹی۔ علی گڈھ

قیمت پانچ روپے

غلط نامہ حیات آفتاب

صفحہ	غلط	صحیح	سطر
۹	عبارت	عمارت	۲۰
۱۱	کرکٹ الیون نے علیحدہ	کرکٹ الیون علیحدہ	۲۱
۱۲	بورڈوں	بورڈروں	۱۹
۱۳	ہوائی	بنوائی	۱۹
۱۴	ملے	ملتے	۴
۱۵	قدرداں تھا	قدرداں نہ تھا	۲
۴۳	آپ	آپ کو	۲
۵۳	نواب نواب صاحب	نواب صاحب	۱۲
۶۷	مرغوب	مرعوب	۷
۸۳	جملہ امورے ہوگئے	جملہ امور طے ہوگئے	۵
۹۳	نام و نہاد	نام نہاد	۳
۱۱۰	یہ تلمیح	بہ تلمیح	۶
۱۱۰	برداشت تت	برداشتت	۹
۱۱۹	مدراس	مدارس	۱۲
۱۵۴	کئی	گئی	۵
۱۹۸	آرجیولڈ	آرچیولڈ	۲۱
۲۰۰	سریک	شریک	۱۷
۲۱۲	پلایا	بلایا	۱۶
۲۴۰	چیہ	چیز	۱۷
۲۴۳	خوسی	خوشی	۱۱
۲۷۱	برارت	جرارت	۸
۳۲۹	دارالاقانوں	دارالاقامون	۱۱
۳۳۵	کی	ان کی	۱۸
۳۳۶	ییر	پیر	۲
۳۵۵	anny	annexy	۴
۳۵۵	۷	۶	نوٹ
۳۶۲	خطو	خطوط	۲۰
۴۱۴	سرکار	سرکا	۶
۴۴۸	حماعت	جماعت	۱۹
۴۵۳	محجے	مجھے	۱۸
۴۵۷	حطبہ	خطبہ	۷
۴۷۵	یعزیز	بعزیز	۲۰